اظہارِ حقیقت

بجواب

خلافت و ملوکیت

جلد سوم

مصنفہ

مفکر اسلام مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی

سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

اسلامی کتب خانہ

علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی نمبر ۵

فہرست عنوانات

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ افضل المرسلین خاتم النبیین سیدنا محمد الامین وعلیٰ اہل بیتہ امہات المومنین وعلیٰ اصحابہ الراشدین المھدیین وعلیٰ سائر آلہ الطیبین .... اما بعد ....

اظہار حقیقت جلد اوّل وثانی کو شائع ہوئے ایک زمانہ گذر گیا اور الحمد للہ اہل سنت میں بہت مقبول ہوئی اور کتاب "خلافت وملوکیت" کے زہر کا تریاق ثابت ہوئی۔ الحمد للہ کہ اس کے ذریعہ سے بکثرت ایسے لوگوں کو ہدایت حاصل ہوئی جو صراط مستقیم سے بھٹک گئے تھے۔ ان دونوں جلدوں میں تحکیم تک جملہ مباحث آ گئے ہیں اس حد تک پہنچ کر دوسرے ضروری کام درپیش ہو گئے جنکی وجہ سے اس کام کو روکنا پڑا پھر مسلسل ایسے اسباب پیش آتے رہے کہ اس کام کی طرف توجہ کا موقع ہی نہ مل سکا مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ موقع نکالنے کے لئے میں نے کوئی کدو کاوش بھی نہیں کی۔ جس کی دو وجہیں ہوئیں۔

اوّل :۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اظہار حقیقت جلد اوّل دوم پڑھنے سے متوسط ذہن کے قاری میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ غور کر کے بقیہ اعتراضات مندرجہ خلافت وملوکیت کا جواب خود

سمجھ سکتا ہے ان دونوں جلدوں میں صرف جزئی بحثیں نہیں ہیں بلکہ ایسے اصول کا تعارف بھی ہے جنکی روشنی میں بقیہ اعتراضات کی کمزوری واضح ہو جاتی ہے اس لئے قلب میں خلافت و ملوکیت کے باقی حصے کا جواب لکھنے کا کوئی شدید تقاضا نہیں پیدا ہوا۔

دوم :۔ حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "براۃ عثمان" مولانا سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "عادلانہ دفاع" مولانا صلاح الدین یوسف صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت" اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب "حضرت معاویہؓ" میں بھی خلافت و ملوکیت کا شافی جواب آگیا ہے اس لئے بھی بقیہ حصے کا جواب لکھنے کا کوئی خاص تقاضا نہیں پیدا ہوا۔

لیکن ماضی قریب میں مودودی صاحب کی اس گمراہ کن کتاب کی طرف توجہ کرنے کا ایک نیا داعیہ پیدا ہوا۔ ایران میں سیاسی انقلاب ہو گیا ایک شیعہ مذہب کے عالم روح اللہ خمینی نامی انقلاب کے قائد بنے۔ شاہِ ایران معزول ہو کر وہاں سے مفرور ہو گئے اور جلاوطنی کی حالت میں مر گئے۔

اس انقلاب کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی حکومت نے جو امریکہ اور روس کی سرپرستی میں قائم ہے۔ یہ منصوبہ تیار کیا کہ دنیائے اسلام پر شیعوں کو مسلّط کر دیا جائے تاکہ وہ اہل اسلام یعنی اہلسنّت کو تباہ و برباد کر دیں۔ اور دین حق کو معاذ اللہ مٹا دیں۔ امریکہ، روس فرانس۔ اور بعض دوسری مغربی مسیحی طاقتیں جنمیں یہود کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔ اس ناپاک منصوبے پر متفق ہو گئیں، اسی پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے خمینی کو اُبھارا اور ان کی اعانت

کر کے انہیں ایران پر مُسلّط کیا۔
ایران کا زیرِ گفتگو انقلاب سراسر اسرائیلی یہود، امریکہ، روس اور فرانس کی امداد و اعانت بلکہ ان کی سرپرستی کا رہینِ منّت ہے۔ خمینی صاحب اس دعوے کے ساتھ برسرِ اقتدار آئے کہ وہ اپنے مزعومہ ومفروضہ امام مہدی کے نائب ہیں۔ ان کے ساتھ روحانی ربط رکھتے ہیں اور ان سے ہدایات واحکام حاصل کرتے رہتے ہیں۔
نائب امام ہونے کی وجہ سے شیعوں نے خود خمینی کو بھی امام کا لقب دیا۔ انہوں نے یہود، امریکہ اور روس کی امداد سے شاہِ ایران کو معزول کر کے اپنی حکومت قائم کرلی۔ جس کی بنیاد شیعی افکار وعقائد پر رکھی اس میں خود سے سوشلزم کی پیوند کاری کی پھر اس پر اسلامی نظام کا لیبل چسپاں کر کے ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ ہم نے اسلامی نظام قائم کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ نظام الحادی ہے اسلامی نہیں ہے۔ متوفی مودودی صاحب اور خمینی صاحب کا تعلق بہت پُرانا تھا موصوف بھی خمینی صاحب کی طرح اسلام اور اہلسنت کے خلاف اس یہودی سازش کے ایک اہم رکن تھے برسوں سے دونوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا اور صلاح مشورے بھی ہوتے رہتے تھے۔ انقلاب ہوتے ہی انہوں نے خمینی اور انکی پارٹی کی تائید کی اس شیعی انقلاب کو اسلامی انقلاب اور اس کے الحادی شیعی نظام کو اسلامی نظام کا لقب دیا۔ اور اس پر حد سے زائد مسرت کا اظہار کیا ان سے اسی کی توقع تھی کیونکہ وہ پکے شیعہ تھے اور اہلسنت کے خلاف مذکورہ بالا سازش کے اہم رکن تھے۔ اس سازش کی کامیابی کی ایک منزل پر وہ اپنے رفیق دیرینہ کو مبارک باد کیوں نہ دیتے۔ اور ان کی

تائید کیوں نہ کرتے۔ اس کامیابی پر وہ بے حد مسرور ہوئے مگر یہ خوشی بہت ناپائیدار ثابت ہوئی۔ ابھی پوری طرح خوش نہ ہونے پائے تھے کہ فرشتۂ اجل آپہونچا اور ستمبر ۱۹۷۹ء بروز شنبہ کو امریکہ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

انقلاب ایران کے بعد اہل ایمان کو اس فتنۂ عجم میں مبتلا کرنے کے لئے مودودی صاحب کے بعض متبعین و معتقدین نے ان کی کتاب خلافت و ملوکیت کے دو ٹکڑوں کو دوبارہ اچھالنا شروع کیا ایک تو وہ حصہ جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہے۔ دوسرے ان مغالطہ انگیز سوالات کو جو موصوف نے آخر کتاب میں اہلسنّت سے کیے ہیں۔ اس لئے خیال ہوا کہ کتاب مذکور کے ان دونوں حصوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ یہ حصہ اسی ضرورت کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ انشاءاللہ سابق دو جلدوں کی طرح اظہارِ حقیقت کی یہ تیسری جلد بھی ہدایت پھیلنے اور ضلال دور ہونے کا ذریعہ بنے گی۔

اظہارِ حقیقت کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ کتبِ عقائد و کلام کی صف میں ہے اس کا اصل مقصد اہلسنت کے عقائد کی اصلاح ہے سبائیوں نے ہماری تاریخ کو بگاڑنے اور اس پر سیاہی پھیرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اثر ہماری قوم پر پڑا اور اہلسنت کی ایک معتدبہ تعداد ان سے متاثر ہوئی یہ اثر محض تاریخی افکار تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے ان کے عقائد پر بھی اثر ڈالا ان میں بعض فاسد و کاسد عقیدے پھیل گئے یہ عقیدے درحقیقت سبائیت کے اجزاء ہیں مگر شیعوں سے میل جول اور اپنی تاریخ سے متعلق ان

غلط تصورات کی وجہ سے جو شیعہ مؤرخین اور سُنی نما شیعہ تاریخ نگاروں کے ارجاف و تشہیر سے مسلمانوں یعنی اہل سنت تک پہونچائے ہیں۔ اہلسنّت کے ایک گروہ میں پھیل گئے۔

ان عقائد کی اصلاح کرنا اور ان کی جگہ صحیح عقائد وافکار کی تبلیغ کرنا اور عقائد و اعمال سب چیزوں میں کتاب و سنت کی پیروی کی ترغیب دینا اس کتاب کا مقصد ہے۔ بدیہی بات ہے کہ عقیدے کے لئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔ عقیدے کے لئے اہل ایمان کا مرجع قرآن مجید ہے خبر واحد حدیث سے بھی عقیدہ ثابت نہیں ہوسکتا چہ جائے کہ تاریخ مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ خود اہلسنت کے ایک گروہ نے تاریخ پر اس قدر اعتماد کیا ہے کہ سبائیوں کی فریب کاریوں کا شکار ہو کر بہت سے عقائد کو بھی تاریخ سے وابستہ کر دیا۔ اور اس کی بنا پر بعض فاسد و باطل عقائد وافکار کو ذہن میں جگہ دے کر ضعف ایمان کی بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں۔

اس قسم کے عقائد فاسدہ اور افکار کاسدہ کی تردید کر کے ذہنوں کو ان سے پاک کرنے اور ان کی جگہ صحیح عقائد وافکار ذہن نشین کرنے کی کوشش کرنا اس کتاب کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اور اپنے کرم اور اپنی رحمت سے اس ادنیٰ کوشش کو قبول فرمائے آمین۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

محمد اسحٰق صدیقی عفا اللہ عنہ۔

کراچی ۱۵ ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ ۲ جون ۱۹۸۸ء

"

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق غلط بیانی

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی نے اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں خلافت اور اس کے متعلقہ مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مسلک۔ کا عنوان قائم کر کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کی ہیں اور انہیں اپنے مسلک کا مؤید ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس مضمون کا ماخذ ایک شیعہ مورخ جسٹس امیر علی اور سُنّی نما شیعہ مصنفین علامہ رشید رضا اور شیخ ابوزہرہ مصری کی تحریریں ہیں۔ مودودی صاحب نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش کی ہے۔

پہلے انہوں نے ایک لمبی چوڑی تمہید باندھی جسمیں امام صاحب موصوف کا طریق اجتہاد بیان کیا ہے۔ یہ محض زیب داستان کے لئے ہے ورنہ اس کی اس بحث میں کوئی ضرورت نہ تھی دراصل جو بات وہ کہنا چاہتے تھے وہ یہ ہے جو خلافت کے انعقاد کا صحیح طریقہ کا عنوان قائم کر کے انہوں نے لکھی ہے۔

"خلافت کے متعلق امام ابوحنیفہ رح کی رائے یہ تھی کہ پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورہ سے قائم ہو" ص ۲۴۹

تبصرہ ۱:۔ یہ رائے صرف امام ابوحنیفہ کی نہیں ہے بلکہ جملہ مجتہدین اہل سنت بلکہ جملہ اہلسنت کی یہی رائے ہے۔ اس مسئلہ سے کسی سنی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا مگر مودودی صاحب جس مسئلہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کا نام ونشان بھی اس میں نہیں ملتا۔

مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی خلافت صحیح طریقہ کے بجائے مذکورہ غلط طریقے سے قائم ہو گئی ہو تو وہ شرعاً خلیفہ ہو گیا یا نہیں؟ حدود شرعیہ کے اندر اس کی اطاعت واجب ہے یا نہیں ؟ کیا اسے معزول کرنے کی کوشش واجب ہے ؟ کیا اس کے خلاف خروج بالسیف جائز ہے ——— ان مسائل پر مصنف کی منقولہ بالا عبارت کوئی روشنی نہیں ڈالتی ۔ حالانکہ چند سطروں بعد جو کہانی انہوں نے الکردری کی کتاب مناقب الامام الاعظم سے نقل کی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو خلیفہ اور سربراہِ مملکت اسلامیہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

منصور نے امام مالک رح، ابن ابی ذئب رح اور امام ابو حنیفہ رح کو بلایا اور ان سے کہا یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مجھے عطا کی ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کیا میں اس کا اہل ہوں ؟ ص ۲۴۹

تبصرہ ۲:۔ منقبت نویس عموماً شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں احتیاط تو کجا اس خواہش سے بھی محروم ہوتے ہیں کہ صرف صحیح بات لکھیں۔

الکر دری کی کوئی خاص حیثیت نہیں جو اس سے مستثنیٰ ہوں وہ بھی انہیں میں شامل ہیں ۔ پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین ـ خلیفۃ المسلمین منصور رح برسر اقتدار ہو چکے تھے اور اس وقت کی پوری دنیائے اسلام انہیں خلیفۃ المسلمین تسلیم کر چکی تھی ۔ انہیں بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی اور کیوں سوجھی کہ ان تین حضرات سے سند خلافت حاصل کریں ؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ امام مالک رح باستثنار سفر حج عمر بھر مدینہ منورہ سے باہر نہیں نکلے ۔ پھر یہ منصور کے پاس بغداد کیسے پہنچ گئے ؟ تیسری چیز یہ ہے کہ امیر المؤمنین منصورؒ کے سوال اور تینوں حضرات کے جوابات کا مقابلہ کیجئے تو امام مالکؒ کا جواب سوال سے مطابقت رکھتا ہے ابن ابی ذئب کا جواب طویل ہونے کے باوجود مبہم ہے تاہم سوال پر منطبق کیا جا سکتا ہے لیکن امام ابو حنیفہ رح کا جواب تو "سوال از ریسماں و جواب از آسمان " کا مصداق ہے منصور تو منصب خلافت کے لئے اپنی اہلیت و نا اہلیت پوچھ رہے ہیں اور امام صاحب جواب دیتے ہیں کہ آپ کی خلافت پر دو اہل فتویٰ کا بھی اجماع نہیں ہوا یعنی آپ کا انتخاب ہی صحیح نہیں ہوا آپ خلیفہ ہی نہیں ہیں مگر یہ تو سوال کا جواب نہیں ہے وہ خلیفہ تھے یا نہ تھے ان کی خلافت جائز تھی یا نہیں تھی سوال یہ نہیں تھا سوال تو یہ تھا کہ وہ خلافت کی اہلیت رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اس کا کوئی جواب امام صاحب نے نہیں دیا ۔ یہ بات بھی صراحتہً غلط تھی کہ منصور کی خلافت پر دو اہل فتویٰ کا بھی اجماع نہیں ہوا ۔ ایسی لغو بات معمولی فہم رکھنے والا عام آدمی بھی نہیں کہہ سکتا تھا چہ جائیکہ امام اعظم رح ـ

روایت کی ایک غلطی کی نشاندہی تو خود مودودی صاحب نے کی ہے

وہ لکھتے ہیں۔

الکردری کی اس روایت میں صرف ایک
بات ایسی ہے جس کو میں اب تک نہیں سمجھ
سکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ اہل یمن کی بیعت آنے تک چھ مہینے
فیصلے کرنے سے رکے رہے۔ (حاشیہ ص۲۵۱)

واقعی اعتراض صحیح ہے۔ کیونکہ یہ بات تو خبر متواتر کے خلاف ہے۔ لیکن اس خطار فاحش کے علم کے باوجود ان کا اس لغو اور مکذوبہ روایت کو صحیح سمجھنا اور اس سے استدلال کرنا بہت تعجب خیز ہے زیر بحث روایت میں اور بھی لغویات ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت قطعًا موضوع من گھڑت اور کارخانہ سبائی کی ڈھلی ہوئی ہے واضع نے ایک تیر سے کئی شکار کرنا چاہے امیرالمؤمنین منصورؒ کو مطعون کرنے کے ساتھ ساتھ ان تینوں ائمہ ھدیٰ کی طرف لغو اور غلط اقوال منسوب کر کے ان کی عظمت اور ان کے علمی وقار کو گرانے کی بھی ناپاک کوشش کی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان بزرگانِ امت پر کسی سبائی کا افترا ہے یہ حضرات اس سے بری ہیں۔

الکردری کے زمانہ میں سبائی زہر فضار میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ بھی اس سے متاثر ہو کر سنی ذہن سے محروم ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے نقل ما چہ عقل پر عمل کر کے اسے جز کتاب بنا لیا۔

خون ناحق کی چھینٹوں سے بچانے کے لئے کپڑے سمیٹ لینے کے ٹکڑے پر تو سبائی کارخانے کا ٹریڈ مارک صاف صاف نظر آرہا ہے۔ گویا خلیفۃ المسلمین ہلاکو اور چنگیز کی طرح خون خوار تھے کہ خلاف

مزاج بات بر برسرِ مجلس سرِتن سے اتروا دیتے تھے۔

اس بہتان طرازی کے ساتھ ساتھ سبائی راوی نے امام صاحب کی حق گوئی اور بے باکی کو بھی یہ دکھا کر افسانہ بنادیا کہ انہیں اپنے کپڑوں کی تو فکر ہوئی مگر ان کے دل میں یہ جذبہ نہ پیدا ہوا کہ اگر ابن ابی ذئب کا سر کاٹنے کا ارادہ کیا گیا تو میں جلاد کا ہاتھ پکڑ لوں گا اور حق کے لئے اپنا سر بھی کٹوا دونگا۔ شیعوں اور متشیعین خصوصاً خاندانی تعصب اور ہوس جاہ و اقتدار کے اسیروں نے خلفائے اسلام کو بدنام کرنے کے ہماری تاریخ کو تاریک بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ان کے اس رویہ پر علامہ شبلی النعمانی کا یہ شعر قدرے ترمیم کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اموی تھے بہت ظالم تو عباسی ستمگر تھے

سبائی کارخانہ کی ڈھلی ہوئی اس جھوٹی کہانی کو پیش کرنے کے بعد مودودی صاحب نے مسئلہ خلافت کے بارے میں بزعم خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ بعنوان "اہلیت خلافت کی شرائط"، لکھتے ہیں:۔

"امام ابو حنیفہ کے زمانے تک اہلیت خلافت کی شرطیں اس تفصیلی طریقے سے بیان نہیں کی جاتی تھیں جس طرح بعد کے محققین ماوردی اور ابن خلدون وغیرہ نے انہیں بیان کیا ہے البتہ دو چیزیں ایسی تھیں جو اس زمانے میں زیر بحث آچکی تھیں اور جن کے متعلق صراحت

مطلوب تھی ایک یہ کہ ظالم و فاسق جائز خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں دوسرے یہ کہ خلافت کے لئے قرشی ہونا ضروری ہے یا نہیں؟"

(صـ۲۰۱)

اس کے بعد" فاسق و ظالم کی امامت" کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں :۔

"پہلی چیز کے متعلق امام کی رائے کے دو پہلو ہیں جنکو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے جس زمانہ میں انہوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا ہے ۔ وہ عراق میں خصوصًا اور دنیائے اسلام میں عمومًا انتہا پسندانہ نظریات کی سخت کشمکش کا زمانہ تھا ایک طرف بڑے زور شور سے کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق کی امامت قطعی ناجائز ہے ۔ اور اسکے ماتحت مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام بھی صحیح نہیں ہو سکتا ۔ دوسری طرف کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق خواہ کسی طرح بھی ملک پر قابض ہو جائے اس کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد اس کی امامت و خلافت پوری طرح جائز ہو جاتی ہے ان دونوں کے درمیان امام اعظم نے ایک نہایت متوازن نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل یہ ہے ۔ الفقہ الاکبر میں وہ فرماتے

ہیں مومنوں میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز
جائز ہے" (بحوالہ الفقہ الاکبر ملا علی قاری ص۱۱۹)
اور عقیدۃ الطحاویہ میں امام طحاوی اس حنفی
مسلک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
اور حج اور جہاد مسلمانوں کے اولی الامر کے
ماتحت قیامت تک جاری رہیں گے خواہ
وہ نیک ہوں یا بد ان کاموں کو کوئی چیز
باطل نہیں کرتی اور نہ ان کا سلسلہ منقطع کر سکتی
ہے۔" (ص۲۵۲ بحوالہ ابن ابی العز الحنفی شرح طحاویہ ۳۲۲)
اس کے بعد لکھتے ہیں:۔
"یہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے دوسرا پہلو یہ ہے
کہ امام کے نزدیک خلافت کے لئے عدالت
شرط لازم ہے کوئی ظالم و فاسق آدمی جائز
خلیفہ یا قاضی یا حاکم یا مفتی نہیں ہو سکتا۔
اگر وہ بن بیٹھے ہو تو اس کی امامت باطل
ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب
نہیں،، (ص۲۵۲)

تبصرہ:۔ اس مسئلہ میں مودودی صاحب نے مسلک حنفیہ کی صحیح ترجمانی نہیں کی یہ غلط بیانی خواہ قصداً کی ہو یا وہ ان کے مسلک کو سمجھے ہی نہ ہوں۔ ان کی غلط ترجمانی کی دلیل ان کا تناقض بیان ہے۔ جب لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں تو حج و جہاد اور دوسرے امور کا اس کے ماتحت جاری رہنا چہ معنیٰ

وارد ؟ ۔ اگر وہ جہاد کے لئے کہتا ہے اور قوم پر اس کی اطاعت واجب نہیں تو فوج جہاد کے لئے جانے سے صاف انکار کر سکتی ہے وہ کسی کو امیر الحجاج مقرر کرے تو حجاج اس کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پابندی سے انکار کر سکتے ہیں پھر آخر اجتماعی زندگی کے کام اس کے ماتحت انجام دینے کی کیا صورت ہے ؟

ایک طرف آپ اسے کالعدم خلیفہ کہتے ہیں اور دوسری طرف اسکے ماتحت اجتماعی زندگی کے کام شرعی طریقے سے انجام دینے کی تلقین کرتے ہیں دونوں باتوں میں کھلا ہوا تناقض ہے گویا بیک وقت اس کی اطاعت واجب بھی ہے اور غیر واجب بھی۔

یعنی چہ ؟ " اگر وہ بن بیٹھا" کا فقرہ بہت مبہم ہے اور یہ ابہام انہوں نے قصداً پیدا کر کے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کلیدی بات تو یہ ہے کہ خلیفہ بن بیٹھنے کی صورت کیا ہے ؟ تنہا ایک شخص دو چار آدمیوں سے بیعت لے کر امام بن بیٹھے یعنی اعلان کر دے کہ میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کی اطاعت کسی پر بھی واجب نہیں اس مسئلہ میں صالح اور فاسق کے درمیان کوئی فرق نہیں ۔ یہ شخص خواہ فاسق ہو یا اعلیٰ درجہ کا صالح اور متقی دونوں صورتوں میں اس کی اطاعت واجب نہیں ہوتی ۔ مگر یہ صورت محض فرضی ہے اور اس کا وقوع غیر ممکن ہے دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت جس میں ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں قوم کے ارباب حل وعقد یعنی قوم کے نمائندوں اور قائدین کا درجہ دیا جا سکتا ہو کسی شخص کو جو فاسق ہو خلیفہ منتخب کر لیں اور وہ اقتدار پر قابض ہو جائے ۔ اگرچہ ایک جماعت

اس کے اقتدار کو ناپسند کرتی ہو مگر وہ مغلوب ہو جائے اور مغلوب ہونے کے بعد اس کے اقتدار کو تسلیم کر لے اس صورت میں اس کی خلافت کے حدود میں بسنے والے جمہور مسلمین پر اس کے جائز احکام کی اطاعت واجب ہے یا نہیں ؟ مودودی صاحب کے نزدیک اس صورت میں اس کی خلافت ناجائز ہے اس لئے علی الاطلاق اس کی اطاعت یعنی اس کے کسی حکم کی تعمیل واجب نہیں خواہ وہ حکم شرعاً جائز ہو یا ناجائز ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور باطل ہے اپنے اس لچر دعوے کو وہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سر تھوپنا چاہتے ہیں وہ اس سے بالکل بری ہیں ۔

— اپنی اس غلط رائے کو وہ امام صاحب رح کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ انہوں نے اپنی تائید میں علامہ ابوبکر جصاص کی عبارت کا اردو ترجمہ نقل کیا ہے اور دکھایا ہے کہ ان کے نزدیک بھی حضرت امام ابو حنیفہ رح کا مسلک یہی تھا ۔

جواب میں گذارش ہے کہ جصاص کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے وہ خود جصاص کا مسلک ہو تو ہو مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک قطعاً نہیں ہے امام صاحب کا مسلک جب ہم نقل کریں گے اس سے یہ بات صاف ہو جائے گی کہ جصاص اور مودودی صاحب کا مسلک یکساں ہے اس لئے جو تناقض مودودی صاحب کے کلام میں پایا جاتا ہے وہی اس کے یہاں ہے اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رح کا مسلک جو تواتر کے ساتھ ان سے منقول ہے اور جو صرف ان کا نہیں بلکہ ائمۂ اربعہ اور جملہ مجتہدین فقہاء و محدثین علماء اہلسنت بالفاظ مختصر جمہور اہلسنت کا مسلک بدرج ذیل ہے ۔ اسی عقیدۃ الطحاویہ میں جسکا

حوالہ انہوں نے دیا ہے یہ مسلک اسطرح منقول و مذکور ہے۔

"ولا نری الخروج علیٰ ائمتنا وولاة أمورنا و ان جاروا ولا ندعوا علیهم ولا ننزع یدا من طاعتهم ونری طاعتهم من طاعة الله فریضة مالم یامروا بمعصیة وندعولهم بالصلاح والمعافاة"۔

(صفحہ ۵)

اور ہم اپنے ائمہ (سربراہانِ مملکت) اور حکام کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظلم کریں اور ہم انہیں بددعا دینا (بھی جائز نہیں سمجھتے) اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا بھی جائز نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے تقاضے سے ہم ان کی اطاعت کو اسوقت تک فرض سمجھتے ہیں جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں اور ہم ان کے لئے صلاح اور معافاۃ کی دعا کرتے ہیں۔

یہ ہے امام ابوحنیفہ رح اور جمہور اہلسنت کا مسلک جو تواتر کے ساتھ ان سے منقول اور کتب فقہ وعقائد میں مسطور ہے۔ اسے سامنے رکھنے کے بعد جصاص کے قول مذکور کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں رہ جاتی اس سے استدلال کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی رائے جو تشیع اور اعتزال سے ناشی ہے امام صاحب کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک حوالہ اور ملاحظہ ہو۔

فقہ حنفی کی مشہور و معتبر کتاب ردالمحتار المعروف بہ شامی باب البغاۃ میں علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں۔

واذا ولی عدلاً ثم جار وفسق لا ینعزل ولکن یستحق العزل ان لم یستلزم فتنۃ۔	اگر کسی عادل کو خلیفہ بنایا گیا پھر وہ ظلم و فسق کا مرتکب ہوا تو معزول نہیں ہو جاتا لیکن عزل کا مستحق ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کا معزول کرنا کسی فتنہ کا سبب نہ بنے

اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی خلافت منعقد ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت فی المعروف واجب ہوتی ہے۔

یہ تنہا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک نہیں بلکہ ائمہ اربعہ اور جمہور اہلسنّت کا مسلک یہی ہے۔ مسلم شریف جلد ثانی کتاب الامارۃ ص۱۲۵ کی مندرجہ ذیل حدیث بھی ان حضرات کے مذکورہ بالا کے مسلک کا ایک ماخذ ہے[۱] اس حدیث صحیح کے راوی حضرت عبادۃ بن الصامت ہیں اس کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق اور مناسبت رکھنے والا حصہ درج ذیل ہے۔

"قالَ دعانا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فبایعنا فکانَ فیما اُخِذ عَلینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا و مکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وَلا ننازع	حضرت عبادہ بن الصامت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو بلایا اور ہم سے بیعت لی جن باتوں پر بیعت لی ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم اپنے امیر کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں خواہ یہ

[۱] اس حدیث شریف کے علاوہ دوسرے احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے۔ بلکہ خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

الأمر أهله الا ان تروا	ہمیں پسند ہو یا نہ ہو اور خواہ
كفرًا بواحًا عندكم	ہمیں (اس پر عمل کرنے میں)
من الله فيه برهان "	دشواری ہو یا سہولت اور خواہ

ہمارے او پر کسی کو بلا وجہ ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم حکومت (خلافت و سلطنت) کے بارے میں حکمران سے منازعت (جھگڑا) نہ کریں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مگر یہ کہ (یعنی اس صورت میں اس سے منازعت کر سکتے ہو) اس میں واضح کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف (کتاب و سنت) سے واضح دلیل ہو۔ (مسلم شریف ص ۱۲۵ ج ۲)

شرح مسلم شریف میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

" ومعنى الحديث لا	"اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ
تنازعوا ولاة الامور	اولی الامر سے ان کی ولایت
في ولايتهم ولا تعترضوا	(امارت وخلافت) کے بارے
عليهم الا ان تروا	میں منازعت (جھگڑا) نہ کرو
منهم منكرًا محققا تعلمونه	سوا اس صورت کے کہ تم ان
من قواعد الاسلام.	سے کسی منکر کا صادر ہونا دیکھو
فاذا رأيتم ذالك فانكروا	جس کا (ان سے صدور اور جس کا
عليهم وقولوا بالحق حيث	منکر ہونا) اسلامی قواعد سے تمہیں
ما كنتم . "	واضح طور پر معلوم ہو پس جب

تم یہ دیکھو تو ان پر نکیر (اعتراض) کرو اور تم جس پوزیشن میں ہو حق بات کہو۔ "

پھر اسی سلسلہ میں اس صورت حال کا حکم شرعی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ۔

اما الخروج عليهم وقتالهم فحرام باجماع المسلمين وان كانوا فسقة ظالمين وقد تظاهرت الاحاديث بمعنى ماذكرته واجمع اهل السنة انه لا ينعزل السلطان بالفسق ۔"

"لیکن ان خلفاء کے خلاف خروج تو وہ باجماع اہل اسلام حرام ہے خواہ یہ لوگ (خلفاء) فاسق ظالم ہی کیوں نہ ہوں اور یہ بات جو میں نے کہی ہے یعنی (خلیفہ فاسق کے خلاف خروج کا حرام ہونا) بکثرت احادیث سے مشترک طور پر ثابت ہے جو ایک دوسرے کی مؤید ہیں ۔"

پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں ۔

فلو طرأ على الخليفة فسق قال بعضهم يجب خلعه الا ان يترتب عليه فتنة وحرب وقال جماهير اهل السنة من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين

پس اگر خلیفہ میں بعد انتخاب فسق پیدا ہو گیا تو اس مسئلہ میں بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اسے معزول کر دینا واجب ہے بشرطیکہ اسے معزول کرنے کی وجہ سے کوئی فتنہ پیدا نہ ہو اور جنگ نہ چھڑ جائے اور جمہور

کی گنجائش نہیں اس سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ مودودی صاحب یا جصاص نے اس مسئلہ میں امام صاحب کا جو مسلک بیان کیا ہے وہ قطعًا ان کا مسلک نہیں اور وہ اس خلافِ کتاب وسنت مسلک سے بری ہیں۔

اسی باب میں بیت المال کا عنوان قائم کر کے مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

"اپنے وقت کے خلفاء کی جن باتوں پر امام
سب سے زیادہ معترض تھے ان میں سے ایک
سرکاری خزانہ پر ان کے بے جا تصرفات اور
لوگوں کے املاک پر ان کی دست درازیاں
تھیں۔"

تبصرہ۔ انہوں نے اعتراض کی ایک مثال بھی نہیں پیش کی اگر امام صاحب نے یہ مسئلہ شرعیہ بیان کیا کہ خلیفہ کے لئے بیت المال سے اپنے ذاتی صرف سے زیادہ لینا جائز نہیں یعنی جتنا اس کی ضرورت کے مناسب اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہو اتنا ہی لے سکتا ہے تو کیا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے کسی خلیفہ پر اعتراض کر رہے ہیں؟ اور کیا اس مسئلہ کے بیان کرنے کے لئے یہ لازم ہے کہ کوئی خلیفہ اس جرم کا مرتکب پایا گیا ہو؟ اسی طرح اس مسئلہ کا بیان کہ خلیفہ کے لئے کسی کے املاک پر بغیر معاوضہ قبضہ کر لینا جائز نہیں اس کو قطعًا مستلزم نہیں کہ اس قسم کا واقعہ بھی پیش آیا ہو۔ موصوف کو دکھانا یہ چاہیئے تھا کہ فلاں خلیفہ نے اس قسم کے بے جا تصرفات کئے اور امام صاحب نے خود جا کر ان پر نکیر کی یا کوئی خط بھیجا جسمیں ان کے

اس گناہ کو بیان کرکے اس کے ترک اور اسکی تلافی کی ہدایت فرمائی ہو محض مسئلہ بیان کردینے پر یہ حکم لگادینا کہ امام صاحب اپنے وقت کے خلفاء پر معترض تھے محض سبائی نوعیت کا لغو مغالطہ ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ الزام سرے سے بالکل غلط ہے خلفاء بنی امیہ یا خلفاء بنی عباس میں سے کسی ایک پر بھی یہ الزام ثابت نہیں کیا جاسکتا یہ محض افتراء و بہتان ہے۔

اگر وہ عطیات قبول نہ کرتے تھے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ انکا لینا حرام سمجھتے تھے۔ کیا انہوں نے اپنے معاصرین میں سے کسی پر خلفاء کے عطیات قبول کرنے کی بناء پر اعتراض کیا ؟ طبائع اور مزاج کا اختلاف ایک بدیہی حقیقت ہے بعض لوگوں کے مزاج پر استغناء اور غیرت کا غلبہ ہوتا ہے وہ کسی سے کچھ لینا پسند نہیں کرتے نہ کسی کا احسان مند ہونا انہیں اچھا لگتا ہے۔ امام صاحب کا مزاج یہی تھا۔ کسی سے کچھ لینا اور کسی کا بار احسان اٹھانا انہیں بہت گراں گذرتا تھا اس لئے وہ خلفاء کے عطیات قبول کرنے سے انکار فرما دیتے تھے موصوف کی یہ ساری بحث جصاص کی بحث سے ماخوذ بلکہ اس کی ڈپلیکیٹ کاپی ہے جصاص اسی بحث میں لکھتے ہیں۔

وقد کان الحسن وسعید بن جبیر
والشعبی وسائر التابعین یأخذون
أرزاقھم من ھؤلاء الظلمۃ۔

(احکام القرآن الجزء الاول)

ترجمہ:۔ حسن بصری، سعید بن جبیر شعبی اور سب تابعین یہ وظیفہ ان ظالموں سے لیتے تھے۔

تبصرہ :- پھر کیا امام صاحب ان سب کو حرام خور سمجھتے تھے ؟
جصاص نے اپنا من گھڑت اور غلط مسلک امام ابوحنیفہ رح کی طرف منسوب کر کے ان پر ظلم کیا امام صاحب اس سے بالکل بری ہیں۔ اس کے بعد مودودی صاحب نے "عدلیہ کی انتظامیہ سے آزادی" کا عنوان قائم کر کے خلفاء بنی عباس پر بایں عنوان اعتراض کیا ہے کہ امام صاحب نے عہد منصور میں عہدۂ قضاء صرف اس لئے نہیں قبول کیا کہ انہیں ظلم کا ذریعہ بن جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ عدلیہ آزاد نہ تھا وغیرہ وغیرہ
تبصرہ :- عدلیہ کی آزادی کو سلب کرنے اور انہیں ظلم کا ذریعہ بنانے کا الزام تو سراسر بہتان و افتراء ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں سبائی کذابوں اور طبری کے ایسے رافضی مؤرخین کی من گھڑت جھوٹی کہانیوں کے بعد اس بدگمانی اور پروپیگنڈے کو کوئی جائے پناہ نہیں مل سکتی۔
ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان خلفاء کا عدل وانصاف تو اتنا مشہور و معروف ہے کہ غیر اور مخالفین بھی مدح وستائش کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

عہدۂ قضاء قبول کرنے سے انکار کی توجیہہ مذکورہ بھی قطعًا غلط ہے اور اس ضمن میں کوڑے مارے جانے اور قید کیئے جانے نیز زہر خورانی سے وفات کے قصے سراپا کذب و دروغ ہیں یہ سب کہانیاں سبائیوں اور امام صاحب کے مخالفین کی گڑھی ہوئی ہیں علامہ شبلی نے سیرۃ النعمان میں اس غلط بیانی کی تردید کر کے قبول قضاء سے انکار کی یہ توجیہہ ذکر کی ہے کہ حضرت امام صاحب پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ تھا اور ان کے لئے طبعًا عدالتی کاروائیوں کا انجام دینا ناقابل برداشت تھا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ مثل مشہور ہے۔

"لِکُلِّ فنٍ رجال "، "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ ایک فقیہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قضاء کا کام بھی کر سکے قضاء اور حکومت کا کام امام صاحب اپنے بس کا نہیں سمجھتے تھے اس لئے انکار فرما دیا انہیں کے شاگرد اسی عباسی خلافت میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔

رہا کوڑے مارے جانے کے قصے تو وہ سبائیوں اور امام صاحب کے مخالفین کے من گھڑت جھوٹے افسانے ہیں ان افسانوں کا تناقض خود ان کے سراپا کذب و دروغ ہونے کا ثبوت ہے ملاحظہ ہو خود مودودی صاحب ص۲۰۷ بحوالہ المکی نقل کرتے ہیں۔

اور پھر جب المنصور نے عہدہ قضا قبول نہ کرنے پر انہیں ۳۰ کوڑے مارے تو خلیفہ کے چچا عبد الصمد بن علی نے اس کو سخت ملامت کی کہ یہ تم نے کیا کیا اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں کھینچوا لیں یہ عراق کا فقیہ ہے بلکہ یہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں امام صاحب کی اتنی عظمت تھی اور عوام و خواص میں انہیں ایسی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کی حمایت کے لئے ایک لاکھ تلواریں نیام سے نکلنے کیلئے مچل رہی تھیں اسی طرح المکی ہی سے نقل کرتے ہیں۔

"اس موقع پر ابن ہبیرہ چاہتا تھا کہ بڑے بڑے فقہاء کو ساتھ ملا کر ان کے اثر سے فائدہ اٹھائے چنانچہ اس نے ابن ابی لیلیٰ

--- داؤد بن ابی البند ابن شبرمتہ وغیرہ کو بلا کر اہم
مناصب دیئے پھر ابوحنیفہ کو بلا کر کہا کہ میں
آپکے ہاتھ میں اپنی مہر دیتا ہوں کوئی حکم نافذ نہ
ہوگا جب تک آپ اس پر اپنی مہر نہ لگائیں
اور کوئی مال خزانے سے نہ نکلے گا جب
تک آپ اس کی توثیق نہ کریں "

امام صاحب کا کتنا اثر اس حکایت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ گورنر عراق اپنی مُہران کے حوالے کر رہا ہے دوسری طرف دکھایا جاتا ہے کہ ابن ہبیرہ نے امام صاحب کو پٹوایا اور قید کیا المنصور نے کوڑے لگوائے مگر ایک لاکھ تلواروں میں سے ایک تلوار بھی ان کی حمایت کے لئے نہ نکلی تلوار تو درکنار اس فقیہ مشرق کے لئے پوری مشرقی دنیائے اسلام میں کسی فرد نے سفارش کے لئے بھی زبان کو جنبش نہ دی۔

ان روایات کے جھوٹے اور من گھڑت ہونے کے لئے ان کا یہ تناقض ہی کافی ہے علاوہ تناقض بیانات ان افسانوں کے جھوٹ اور افتراء ہونے کا ثبوت خود افسانوں میں مل جاتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی فہم سے کام لے۔ ابن ہبیرہ کے متعلق یہ قصہ بھی مصنف نے بحوالہ مکی نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ امام صاحب ان سے کچھ مہلت مانگ لیں امام صاحب کو جب یہ بات پہنچی تو انہوں نے دوستوں سے مشورہ کے بہانے مہلت مانگی۔

"ابن ہبیرہ نے یہ پیام ملتے ہی انہیں چھوڑ
دیا اور وہ کوفہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے جہاں سے
بنی امیہ کی سلطنت ختم ہونے تک وہ پھر

نہ پلٹے"۔ (ص۲۵۹)

سوال یہ ہے کہ ابن ہبیرہ انہیں عوام میں اسقدر ذی اثر سمجھتے تھے کہ اپنی مہر بھی انہیں دینے کو تیار تھے اور ان کے تعاون کو خلافت بنی امیہ کی بقاء کا ذریعہ جانتے تھے تو پھر انہوں نے ایسے سخت وقت میں جبکہ بقول مصنف عراق میں اموی خلافت کے خلاف ہنگامہ برپا تھا انہیں کوفہ سے باہر جانے کیوں دیا؟ جبکہ بقول راوی وہ یہ جانتے تھے کہ امام صاحب اموی خلافت کے سخت مخالف ہیں اور انہوں نے ان پر تشدد کر کے انہیں اور زیادہ مخالف بنالیا تھا پھر انہیں یہ اندیشہ کیوں نہ ہوا کہ کہیں یہ باہر جا کر خلافت کے خلاف کوئی ساز باز نہ کریں؟ امام صاحب کچھ نہ کرتے تو کم از کم مکہ معظمہ پہنچکر اپنے حالات تو بیان کرتے بنوامیہ کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ کیا ابن ہبیرہ اس قدر نادان تھے کہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ کوڑے لگوانے اور مار پیٹ قید و بند وغیرہ کی سب روایتیں سراسر جھوٹی اور سراپا کذب و دروغ ہیں۔

لیکن بات یہ ہے کہ جملہ مذاہب باطلہ کا مدار دلائل کے بجائے پروپیگنڈے پر ہوتا ہے۔ اس آرٹ کے ماہر سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں نے پروپیگنڈا اتنی شدت اور قوت کے ساتھ کیا کہ اچھے اچھے اہل علم بھی اس سے متاثر ہو گئے اور بغیر سوچے سمجھے ان باطل اور جھوٹی روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا۔

مثل مشہور ہے کہ "ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیب است"؛

مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا بنوامیہ و بنو عباس کو چشم عداوت ہی سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لئے انکی خوبیاں بھی انہیں برائیاں

محسوس ہوتی ہیں ان حضرات خلفاء میں سے کسی نے اگر کسی عالم دین سے کوئی مسئلہ پوچھ لیا تو اسے بھی اسطرح ذکر کیا جاتا ہے جیسے وہ کسی معصیت کے ارتکاب میں ان علماء کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہوں حالانکہ یہ حضرات خلفاء خود صاحب علم اور مجتہد تھے باوجود اس کے ان کا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا کسی دوسرے عالم کبیر سے کوئی مسئلہ پوچھنا ان کے ورع و تقویٰ اور ان کی تواضع کی علامت اور دلیل ہے یہ خوبی ہے نہ کہ عیب مگر سبائی ذہن والے اسے بھی عیوب میں شمار کرتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے اہم بحث زیر عنوان "ظالم حکومت کے خلاف خروج کا مسئلہ" کی گئی ہے مودودی صاحب نے اس مسئلہ میں جصاص کی عبارتیں پیش کی ہیں جصاص صاحب درحقیقت

(حاشیہ) لے ابوبکر جصاص حنفی مصنف احکام القرآن (کنیت اور نسبت سے دھوکہ نہ کھایئے یہ نقاب تقیہ کے تانے بانے ہیں) اسی مقام پر بذیل آیۃ کریمہ موصوفہ جسکا حوالہ مودودی صاحب نے دیا ہے ان کے ایسے اقوال موجود ہیں جو ان کی شیعیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) "اور اسی بناء پر شریح اور تابعین میں جو قضاۃ تھے انہوں نے عہدۂ قضاء بنی امیہ کی طرف سے قبول کر لیا۔ اور شریح کوفہ میں حجاج کے زمانے تک قاضی رہے اور عبدالملک سے زیادہ ظالم اور اس سے بڑا کافر اور اس سے بڑا فاجر کوئی نہیں تھا اور اس کے عمال میں حجاج سے بڑا کافر اور اس سے زیادہ ظالم اور اس سے زیادہ فاجر کوئی نہ تھا۔

اس تحریر میں جصاص نے امیرالمؤمنین عبدالملک اور حجاج رحمہما اللہ دونوں کو أظلم (سب سے بڑا ظالم) أفجر (سب سے بڑا فاجر) أکفر (سب سے

معتزلی شیعہ ہیں ۔ جہاں موقع ملتا ہے ان کا رفض خفی جوش میں آتا ہے ۔ اور انہیں زہر چکانی پر مجبور کر دیتا ہے ۔ لبعض سابق بحثوں میں اس کے نمونے پیش کئے جا چکے ہیں اس بحث میں تو وہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بڑا کافر) کہہ کر سب بنو امیہ وآل مروان رض کو صرف فاجر وظالم ہی نہیں بلکہ کافر کہا ہے اس بہتان طرازی اور خبث باطن کی سزا تو انہیں انشاء اللہ آخرت میں ملے گی ۔ یہاں ہمیں اتنا کہنا ہے کہ ان کا یہ فتویٰ تکفیر ان کے رافضی ہونے کی دلیل ہے ۔ کوئی سنی بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا ۔

(۲) عبدالرحمٰن بن الاشعث ایک ظالم مفسد اور باغی تھا اس کے متعلق جصاص لکھتے ہیں ۔

"اس کے ساتھ ہو کر چار ہزار علماء وفقہا نے جو خیار تابعین میں سے تھے عبدالملک سے قتال کیا ۔"

تبصرہ :- جصاص کا یہ بیان بالکل غلط ہے ۔ تاریخ بتاتی ہے ۔ کہ جمہور علماء وتابعین اور اہل ایمان نے ابن الاشعث کو قطعاً منہ نہیں لگایا اسے ضال مضل مفسد اور باغی سمجھتے رہے ۔ چند علماء جن کے ذہنوں میں رفض اور سبائیت کے جراثیم داخل ہو گئے تھے اس کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے یہ سبائیت زدہ گمراہ مولوی تھے ۔ انہیں علمائے اہل سنت کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا ، (۱) اور ان کے اس طرز عمل کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا جیسے اس وقت لبعض شیعیت نواز علماء اہل سنت خمینی کے فریب میں مبتلا ہو گئے اور اس

(۱) حاشیہ کا حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

دشمنِ اسلام کی مدح وستائش کرتے رہتے ہیں۔

(۳) جصاص پھر لکھتے ہیں۔

حسن سعید بن جبیر شعبی اور جملہ تابعین ان ظالموں سے
اپنا روزینہ اس لئے نہیں لیتے تھے کہ وہ ان کے حامی
ہیں۔ بلکہ وہ ان کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے تھے
اور اپنا وظیفہ اس لئے لیتے تھے کہ وہ ان کے حقوق ہیں
جو فاجر کے اختیار میں ہیں۔

(۴) پھر آگے چل کر رفض کا جوش اور بغض صحابہ کا خروش اور زیادہ بڑھ جاتا ہے
تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء صحابہ کی شان میں بھی گستاخی
کرتے ہیں۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

(حاشیہ کا حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ)

(۱) جب حجاج نے ابن الاشعث کو سجستان کی طرف جہاد کے لئے بھیجا ہے تو علماء فقہاء کی ایک بڑی تعداد حسبۃً للہ جہاد میں شریک ہونے کے لئے بطور رضا کار مجاہدین اس کے ساتھ گئی تھی جب اس نے غداری اور بغاوت کی تو ان حضرات نے ان کا ساتھ نہیں دیا مگر واپس آنے سے بھی قاصر تھے اور قیدیوں کی طرح اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ جصاص اور دوسرے سبائی ذہن کے مؤرخین نے اس جہاد میں ان کی شرکت کی بنا پر یہ مغالطہ دیا ہے کہ وہ بغاوت میں بھی اس کے شریک تھے یہ محض جھوٹ اور مغالطہ ہے۔ چار ہزار کی تعداد میں بھی مبالغہ ہے۔ آئندہ ہم اِن شاء اللہ اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

امامین ہمامین پر افتراء کے اسباب

امام ابوحنیفہ و امام مالک رحمہما اللہ کی طرف مودودی صاحب نے غلط باتیں منسوب کی ہیں ان پر مذکورہ رد و قدح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو واضح کر دیا جائے کہ ان دونوں بزرگوں خصوصاً امام ابوحنیفہؒ پر سبائیوں اور سبائیت زدوں نے اس قسم کی افتراء پردازیاں اور بہتان طرازیاں کیوں کیں؟ اور اس کے اسباب کیا تھے؟ اس نے اس قسم کی دوسری سبائی غلط بیانیوں اور دروغ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) " کذالک کان سبیل من قبلھم مع معاویۃ حین تغلب علی الامر بعد قتل علی علیہ السلام وقد کان الحسن والحسین یأخذان العطاء وکذالک من کان فی ذلک العصر من الصحابۃ وھم غیر متولین لہ بل متبرئین منہ علی سبیل الذی کان علیہا علی علیہ السلام الیٰ ان توفاہ اللہ الیٰ جنتہٖ و رضوانہٖ۔"

(احکام القرآن للجصاص الجزء الاول ص۷۱ مطبوعہ بیروت تفسیر آیت لاینال عہدی الظالمین)

ترجمہ :- "ان سے پہلے والوں کا معاویہ کے ساتھ بھی یہی طرز عمل رہا جب وہ (معاویہ) علی علیہ السلام کے قتل کے بعد خلافت پر قابض ہو گئے تھے اور حسن و حسین اور اس زمانہ میں جو صحابہ تھے ان سے عطیات لیتے رہے حالانکہ وہ (موصوفین) انکے حامی نہیں تھے بلکہ ان سے برات

بانیوں کی دھجیاں بھی بکھر جائیں گی سبائیوں کو امام احمد بن حنبل رح سے بھی بہت عداوت ہے آخر بحث میں انشاء اللہ اس عداوت کے سبب پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

پہلا سبب ۱۔ امام ابوحنیفہ رح جب منصب اجتہاد و امامت پر فائز ہوئے تو رفض کا فتنہ پھیل رہا تھا۔ شیعوں کا ایک مرکز کوفہ تھا جہاں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے پروردہ ایرانی غلاموں کی موجود تھی جنہیں ان کے عرب آقاؤں نے آزاد کر دیا تھا یہ سب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ظاہر کرتے تھے جس طرح علی علیہ السلام ان سے تبرا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت اور اپنی رضامندی کی طرف اٹھالیا۔"

تبصرہ ۱۔ جصاص نے اپنی منقولہ بالا عبارتوں میں سب بنوامیہ کو معاذ اللہ کافر کہا ہے عبدالرحمٰن بن الاشعث کی حمایت و تائید کی ہے حالانکہ وہ ضال مضل غدار مفسد اور باغی تھا۔ اس جوش حمایت باطل میں صریح جھوٹ بولا اور علماء و فقہاء اہل سنت پر اس فتنہ پرداز مفسد کا حامی ہونے کا بہتان باندھا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "متغلب" تو صراحتہً کہا اور درپردہ ان کی تکفیر کی ہے (معاذ اللہ) مگر اس کے لئے پُرفریب سبائی طرز اختیار کیا ہے دوسرے خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال کو ظالم اور کافر کہنے کے بعد۔ کذالک (اسیطرح) کہہ کر پھر حضرت علی و حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دوسرے بزرگوں کا ان سے اظہار برأت کرنے یعنی ان پر تبراء بھیجنے کا مکروہ

شیعہ یہیے اور اہل ایمان کے خصوصا عرب سنیوں کے دشمن تھے یہی گروہ تھا جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا تھا۔ ایران میں یہودی مراکز تھے شیعہ مذہب کا بانی ابن سبا یہودی تھا۔ اور شیعیت درحقیقت یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے روافض اور یہود کے درمیان مودت، تعاون اور اتحاد کا تعلق شروع ہی سے ہے۔ اور اب تک بدستور قائم ہے چنانچہ اس وقت بھی خمینی کی تحریک اور اسلام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جھوٹ بول کر منافقانہ طرز سے انہیں یعنی حضرت معاویہ رض کو بھی معاذ اللہ ظالم و کافر کہا ہے۔ اس تبرائیت و بغض صحابہ کے ساتھ جو مصنف کے رفض و ضلال کی کھلی ہوئی علامت ہے۔ شیعیت کے اصطلاحی "تولاّ" کا ایک نمونہ یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب میں حضرت علی رض کے اسم گرامی کے ساتھ علیہ السلام لکھتے ہیں احکام القرآن میں ان کی شیعیت کے علامات و شواہد اور بھی ہیں متعدد مقامات پر انہوں نے شیعیت کا زہر ٹپکایا ہے مگر ایک سُنی پر ان کی شیعیت آشکارا کرنے کے لئے اتنے ہی شواہد کافی ہیں ان پر نظر کرنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان کے سنی ہونے پر اصرار کرے تو یہ اس کی علامت ہے کہ ضرور اس کا ذہن شیعیت کے جراثیم کا شکار ہے۔ شیعیت کے ساتھ ان کے اعتزال کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ "وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ،، الآیۃ کی تفسیر کرتے ہوئے احکام القرآن میں حدیث سحر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وَلَا یظن بابی یوسف انہ اعتقد فی

و مومنین کے خلاف انکے معاندانہ وظالمانہ اقدامات کو یہود کی پشت پناہی حاصل ہے بلکہ درحقیقت اس فتنہ کے بانی یہود ہی ہیں۔
شیعوں نے اسلام کے خلاف دو محاذ کھولے تھے۔ایک محاذ فکری تھا۔ وہ اسلام پر طرح طرح کے لغو اعتراضات کر کے اسلامی عقائد کے متعلق وسوسے پیدا کرنے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے وہ صرف اپنے مذہب باطل کی اشاعت نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اہل ایمان یعنی اہل سنت کے ایمان کو متزلزل کردیں اور انہیں کسی طرح گمراہی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) السحر مایعتقدہ الحشویۃ من ایصالھم الضرر الی المسحور من غیر مماسۃ ولا سقی دواءٍ ،، (ص۵۱)

ترجمہ:۔" ابو یوسف کے متعلق یہ گمان نہ کرنا چاہیئے کہ وہ حشویہ کی طرح اس بات کے قائل ہوں گے کہ ساحر بغیر چھوئے ہوئے اور بغیر کوئی دوا پلائے مسحور کو ضرر پہنچا سکتا ہے۔"

محدثین کو ،، حشویہ ،، یعنی تجسم باری تعالیٰ کا معتقد کہنا معتزلہ کا ایک شعار ہے یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے اور بعض دوسرے محدثین بھی اپنی کتابوں میں اسے لائے ہیں ان سب کو "حشویہ" کہا گیا ہے مخصوص طور پر روئے سخن امام بخاریؒ کی ایسی جلیل القدر شخصیت کی طرف ہے حضرات محدثین پر حشویہ ہونے کا الزام محض بہتان وافترا ہے وہ اس سے بری ہیں۔

میں مبتلا کر دیں شیعی مزاج یہی ہے جو یہودی مزاج کا پرتو اور اس کے مطابق ہے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور انہیں صراط مستقیم سے متزلزل کرنے کا اصل محرک تو وہ شعلۂ بغض و عداوت و حسد تھا جو شیعوں کے دلوں میں قرآن، صاحب قرآن اور اسلام اور اہل اسلام خصوصًا صحابۂ کرام کے خلاف بھڑک رہا تھا اس کے ساتھ ان کے سامنے ایک مقصد تھا جو درحقیقت اسی عداوت اسلام نے ان کے سامنے پیش کیا تھا اس مقصد کو ایک شیعہ فاضل آقائی کاظم زادہ ایران شہر نے اپنی مشہور کتاب "تجلیات روح ایرانی" میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

"از برکت و قوت ہمیں روح است کہ ملت ایران پس از قبول دین اسلام و گذراندن چند قرن در اسارت معنوی چنان رونق ولسطی بدیانت اسلامی دادہ و آنرا چنان با خلاق و روح و شعائر خود موافق ساختہ کہ یک اسلام مترقی و متعالی و ایرانی بوجود آوردہ است [1]"

ترجمہ:- یہ اسی روح کی برکت و قوت تھی کہ ملت ایران نے دین اسلام قبول کرنے کے بعد ایک زمانہ تک معنوی قید میں مبتلا رہنے کے بعد دین اسلام کو ایسی رونق اور شگفتگی دی اور اسے اس طرح اپنے اخلاق و شعائر اور اپنی روح کے موافق بنایا کہ ایک ترقی یافتہ اور برتر ایرانی اسلام پیدا کر دیا۔"

اسلام کو مٹانے کے لئے یہودیت و مجوسیت کی آمیزش سے یہودیت جدیدہ وجود میں لا کر اسے اسلام کے نام سے پھیلانے کی مندرجہ بالا ناپاک جہنمی تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس کا ایک مرکز کوفہ تھا۔

---

[1] تجلیات روح ایرانی ص ۹ نشر کردہ بنگاہ بازرگانی پروین تہران لالہ زار سن طباعت فروردین ماہ ۱۳۲۰

امام اعظم رح نے اس کا مقابلہ پوری قوت کے ساتھ کیا اس کے علاوہ مرجئہ وغیرہ دوسرے گروہ بھی سر اٹھا رہے تھے اور اپنے مذاہب باطلہ کی طرف دعوت دے رہے تھے درحقیقت ان سب کی نکیل شیعوں ہی کے ہاتھ میں تھی وہ اہلسنت کو مختلف راستوں سے بھٹکانا چاہتے تھے اور متعدد محاذوں پر مشغول کرنا چاہتے تھے امام اعظم قدس سرہٗ نے ان سب باطل شورشوں اور زیغ وضلال کی تحریکوں کا مقابلہ کیا ان کے سرکردہ لوگوں سے مناظرے کیے تقاریر ومواعظ میں ان پر رد کیا اس زمانہ میں جتنے طریقے ابلاغ عامہ کے ممکن تھے وہ ان اہل باطل کا ضلال دور کرنے اور مسلمانوں کو صراط مستقیم پر رکھنے کی کوشش کے لئے استعمال کیے[1]

امام مالک رح کو بھی ان اہل باطل خصوصاً روافض سے واسطہ پڑا لیکن نسبتاً بہت کم کیونکہ حجاز خصوصاً حرمین شریفین میں نومسلم بہت کم تھے زیادہ تر پختہ مسلمان تھے جو شیعوں وغیرہ اہل باطل کے دام تزویر میں نہیں پھنس سکتے تھے بخلاف اس کے عراق وغیرہ اطراف میں ایسے نومسلموں کی کثرت تھی جو ابھی اسلام سے کماحقہ واقفیت نہ رکھتے تھے اور اہل باطل کے لئے ان کو دام فریب میں پھانس لینا نسبتاً آسان تھا۔

دوسرے عراق جس میں کوفہ اور بصرہ وغیرہ مرکزی حیثیت رکھتے تھے ایران اس کے قریب اور حجاز اس سے دور تھا ایران ہی ان باطل اور مخالف اسلام تحریکوں خصوصاً شیعیت کا مرکز تھا۔ شیعیت کے بانی یہود بھی ایران ہی میں مقیم تھے اس لئے عراق میں اپنے کفریات کی اشاعت شیعوں کے لئے آسان تھی حجاز تک اسے پہنچانے میں

---

[1] سیرۃ النعمان علامہ شبلی رح

دشواریاں حائل تھیں تاہم مشہور واقعہ ہے کہ امام مالکؒ سے کسی نے استواء علی العرش کے معنیٰ پوچھے موصوف نے جواب میں فرمایا۔

"الاستواء معلوم والکیف مجہولٌ والسوال عنہ بدعۃ"

ان کا یہ ایمان افروز جواب بہت مشہور ہے اس سوال وجواب کے معنیٰ یہ ہیں کہ اہل ضلال کے ساتھ مقابلہ انہیں بھی کرنا پڑا۔ امام صاحب موصوف کو شیعوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آں محترم نے شیعوں کو کافر کہا ہے روافض کی تکفیر کا یہ فتویٰ امام شاطبی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور ومقبول کتاب "الاعتصام" میں برسبیل استدلال ذکر فرمایا ہے واقعہ درج ذیل ہے:۔

"قال مصعب الزبیری وابن نافع "دخل هارون (یعنی الرشید) المسجد فرکع ثُمَّ اَتٰی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسلم علیہ ثم اتٰی مجلس مالك رح فقال السلام علیك ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ثم قال لمالك رح هل لمن سبّ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الفیئ حق؟ قال لا ولا کرامۃ ولا مسرۃ"	"مصعب زبیری اور ابن نافع نے بیان کیا کہ خلیفہ ہارون رشید مدینہ منورہ مسجد شریف میں حاضر ہوئے اور نماز پڑھ کر روضۂ اطہر پر حاضری اور صلوٰۃ وسلام کے بعد امام مالک کی مجلس میں آئے اور سلام کے بعد دریافت کیا کہ "فیئ" میں اس شخص کا کوئی حصہ ہے جو اصحابؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہتا ہوا امام مالک نے فرمایا نہیں اور اس کے لئے کوئی اعزاز اور مسرت نہیں (ہارون رشید نے) کہا کہ یہ آپ کس دلیل سے کہہ"

قالَ من این قلت ذالک قال اللّٰہُ عــزوجل (لِیَغِیظَ بِھِمُ الکُفَّارُ) فمن عابھم فھو کافــر وَلاحق لکافــر فی الفیئ ،، (الاعتصام للامام ابراھیم بن موسٰی الشاطبی ص۸۳ ج۲)	رہے ہیں امام صاحب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (تاکہ کفار اصحابہ کرام رض کی ترقی وقوت کو دیکھ کر غیظ میں آئیں) تو جو شخص ان (صحابہ) کی طرف عیوب اور برائیاں منسوب کرے وہ کافر ہے اور فیئ میں کافر کا کوئی حق نہیں ہے ۔

اس سے عیاں ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ شیعوں کو کافر سمجھتے تھے اور یہی ان کا فتویٰ تھا لے فتنۂ شیعیت اس وقت شباب پر تھا اس فتنۂ عظیمہ کو فرو کرنے کے لئے جن علماء ربانیین نے کام

لے امیر المومنین ہارون رشید رہ نے جو مسئلہ پوچھا تھا اس کے دو پہلو تھے ایک تو یہ کہ نفس واقعہ در حقیقت از روئے اصول شریعت شیعہ مسلمان ہیں یا کافر دوسرا یہ کہ دستور اسلامی میں انہیں کیا حیثیت دیجائے ۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا جواب ان دونوں پہلوؤں کے حکم شرعی پر مشتمل ہے ان کا فتویٰ یہ تھا کہ از روئے قرآن مجید شیعہ کافر ہیں اور دستور اسلامی میں بھی ان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہیئے جو اسلامی حکومت کا کافر رعایا (ذمی یا معاہد) کے ساتھ ہوتا ہے ان کے دعویٰ اسلام کی وجہ سے انہیں منافق قرار دے کر ظاہری معاملہ مسلمانوں کی طرح بھی صحیح نہیں ہے ۔ امام صاحب کا یہ اجتہاد بہت قیمتی ہے دستور خلافت کی اس اہم دفعہ کو واضح کر کے انہوں نے بہت سے اجتماعی مسائل حل کر دیئے (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کیا ان میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اسم گرامی سر فہرست ہے لیکن ان کے بعد امام مالک رح کا نام اندراج کا مستحق ہے۔ اس لئے شیعوں کو ان دونوں بزرگوں سے سخت عداوت اور دشمنی ہو گئی اور انہوں نے اپنی مذہبی فطرت اور تعلیم کے مطابق ان دونوں بزرگوں کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا انبار لگا دیا۔ انکی وقعت اور عظمت کم کرنے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے شیعہ جو کچھ کر سکتے تھے اس میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس گھناؤنے مقصد کے پیش نظر شیعوں نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق بہت سی جھوٹی کہانیاں وضع کر کے مشہور کیں انہیں باطل حکایتوں میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جناب جعفر صادق رحمہ اللہ کے شاگرد تھے یہاں تک کہ یہ قول امام صاحب کی طرف منسوب کر دیا "لولا السنتان لهلك النعمان"۔ شیعوں نے اس کا اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ بعض سُنّی علماء نے بھی اس سے متأثر ہو کر اپنی کتابوں میں یہ باطل بازاری قصّے نقل کر دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کی ہستی تو بڑی ہے ان کے شاگردان رشید مثل امام ابو یوسف، امام محمد و امام زفر و امثالهم رحمهم اللہ کا مرتبہ بھی علم و تفقہ اور خدمتِ اسلام کے اعتبار سے جناب جعفر صادق رح سے بہت بلند و برتر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) افسوس ہے کہ ان نے اس فتویٰ کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس پر پورے طریقہ سے عمل نہ ہو سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ خود سنیوں میں شیعوں کے ہمدرد پیدا ہو گئے جن میں ہاشمی خصوصاً علوی نمایاں تھے اس لئے امیر المومنین ہارون رشید اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب

درحقیقت خود جناب جعفر صادق رح کو امام اعظم ابوحنیفہؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ امام شعرانیؒ نے اپنی مشہور کتاب میزان کبریٰ میں ایک واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رح مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو جناب جعفر صادق رح ان سے ملنے گئے اور بہت سے علمی سوالات کرتے رہے یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا سب سوالات کا اطمینان بخش جواب پاکر اور اپنی علمی پیاس بجھا کر جناب جعفر صادق رحؒ نے امام صاحب کے ہاتھوں اور گھٹنوں کو بوسہ دیا اور ان کی علمی برتری و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ "انت سید العلماء" (آپ علماء کے سردار ہیں)۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ مگر اس میں جناب جعفر صادق رح نے امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم رح جب مدینہ منورہ آتے ہوں گے تو جناب جعفر صادق رح ان سے استفادہ کرتے ہوں گے مختصر یہ کہ شیعوں نے امام اعظم رحمہ اللہ کی عظمت کم کرنے کے مقصد سے اس قسم کی بہت سی جھوٹی روایتیں گھڑ کر مشہور کیں جو درحقیقت بالکل بے اصل ہیں۔

امام مالک رح کے متعلق بھی شیعوں کا رویہ یہی رہا ان پر بھی بہتان وافترا کیا گیا مثلاً یہ روایت گھڑی کہ انہوں نے محمد الارقط حسنی کے خروج کی تائید کی اور ان کے جرم بغاوت کی تصویب کی یا یہ کہ گورنر مدینہ نے انہیں کوڑے لگوائے اور ان کے شانے اتروا دیئے وغیرہ وغیرہ یہ سب بازاری قصے ہیں جو بالکل بے اصل اور شیعوں کے وضع کئے ہوئے ہیں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نہ ہو سکے اور ایک مدت گذرنے پر یہ بھلا دیا گیا۔ اس پر تعامل کا فقدان امت کے دینی و دنیاوی زوال خصوصاً خلافت عباسیہ کی بربادی کے اسباب میں ایک اہم سبب ہے۔

سراپا کذب و دروغ ہیں۔

دوسرا سبب:۔ ان دونوں کبار ائمہ پر شیعوں کی افترار پردازی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے دور میں شیعوں کے ورغلانے سے جن حسنی و حسینی حضرات نے اموی یا عباسی خلافت کے خلاف خروج کیا ان کے اس فعل کو عام طور پر اہلسنت خصوصاً ان کے علمار نے خلاف شریعت ، ناجائز اور معصیت سمجھا اور جمہور اہلسنت نے ان میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا ایک مُدت کے بعد جب شیعوں نے ان صاحبان کو ہیرو بنانا چاہا اور اپنے تصور "امامت" کے مطابق انہیں مفروضہ مرتبہ "امامت" پر فائز کرنے کی کوشش کی تو یہ سوال سامنے آیا کہ اگر یہ خروج کرنے والے حضرات حق پر تھے تو اس دور کے اکابر علمار نے ان کی تائید کیوں نہ کی؟ اس سوال کا جواب فریب کارانہ انداز میں شیعوں نے اس طرح دیا کہ ان بزرگوں خصوصاً امام ابوحنیفہ و امام مالک رحمہما اللہ کو ان خروج کرنے والوں اور ان کی بغاوت کا مؤید ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے جھوٹے قصّے وضع کیے اور ان کا اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ یہ جھوٹی کہانیاں بعض سنی مؤرخین و علمار کی کتابوں میں بھی جگہ پا گئیں انہیں بازاری کہانیوں میں سے ایک یہ ہے جو مودودی صاحب نے اس طرح نقل کیا ہے۔

"ابراہیم بن عبداللہ نفس زکیہ کے بھائی کے خروج (۱۴۵ھ ۷۶۳ء) کے زمانہ میں امام ابوحنیفہ رح کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ علانیہ ان کی حمایت اور المنصور کی مخالفت کرتے تھے۔ حالانکہ المنصور اس وقت کوفہ ہی میں موجود تھا۔"

(ص۲۶۲)

تبصرہ :- اس روایت کا غلط اور کذب و دروغ ہونا اس کی ساخت سے ظاہر ہے سوال یہ ہے کہ امام صاحب جب اس طرح ایک باغی کی حمایت کر رہے تھے تو خلیفۃ المسلمین المنصورؒ نے ان پر گرفت کیوں نہ کی ؟ اگر امام صاحب عوام میں اس قدر ذی اثر تھے کہ منصور ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا تو انہوں نے ابراہیم کے لئے فوج کیوں نہ فراہم کی اور اپنے معتقدین کو منصور کے لشکر پر حملہ کرنے کی ترغیب کیوں نہ دی؟ پھر یہ بات بھی بہت عجیب ہے کہ خلیفہ منصورؒ امام صاحب کے اس معاندانہ و باغیانہ طرز عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ان کے اس قدر معتقد رہے کہ انہیں قاضی بغداد بنانے کیلئے مصر رہے اور تعمیر بغداد کی نگرانی ان کے سپرد کردی ۔

پھر سو بات کی ایک بات یہ ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں امام صاحب اس قسم کے خروج کو بالکل ناجائز اور معصیت سمجھتے تھے یہی ان کا فتویٰ اور مسلک تھا جو ان سے تواتر کے ساتھ منقول ہے ہم چند صفحات پیشتر نقل کر چکے ہیں پھر کیا وہ فتویٰ کچھ دیتے تھے اور عمل کچھ اور کرتے تھے ؟

بات صاف ہے یہ حکایت قطعاً من گھڑت ہے شیعوں کی وضع کی ہوئی ہے جسکی کوئی اصل و بنیاد نہیں امام اعظمؒ نے ابراہیم کی ادنیٰ تائید بھی کبھی نہیں کی بلکہ وہ انکے خروج کو ناجائز اور گناہ سمجھتے تھے ۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز وہ من گھڑت کہانی ہے جو جناب زیدؒ کے متعلق مودودی صاحب نے ص۲۶۶ پر نقل کی ہے وہ لکھتے ہیں ۔

" پہلا واقعہ زید بن علی کا ہے جن کی طرف فرقہ زیدیہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے یہ امام حسین رضؓ کے پوتے اور امام محمد الباقرؒ کے بھائی

تھے اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر عالم
فقیہ اور متقی اور صالح بزرگ تھے خود امام ابوحنیفہ
نے بھی ان سے علمی استفادہ کیا تھا۔ "

تبصرہ ۱۔ جناب زید کا علم و تفقہ میں کیا درجہ ہے؟ اس کے متعلق ہم اس وقت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ
"پیراں نمی پیرند بلکہ مریداں می پیرانند"
جن لوگوں نے اپنے مخصوص مصالح کے پیش نظر انہیں امام بنایا انہوں نے ان کی مدح و ستائش میں جی بھر کر مبالغہ سے کام لیا ہے امام صاحب کا ان سے استفادہ کرنے والا فقرہ تو خالصتاً سبائی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے جو قطعاً جھوٹ ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردان رشید کا درجہ بھی علم و تفقہ کے اعتبار سے جناب زیدؒ سے بہت بلند و برتر ہے۔

اگر یہ کوئی بلند پایہ فقیہ و مجتہد ہوتے تو دنیا میں دو چار سُنّی تو ان کے مقلد نکلتے حالانکہ ان کا کوئی مقلد بھی سنیوں میں نہ آج ہے اور نہ کبھی ہوا۔ ان کے مقلدین کا اہلسنت سے الگ ایک فرقہ بن جانا اور اہل سنت کا انہیں اپنی جماعت سے خارج قرار دینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اہل سنت نے انہیں اس درجہ کا عالم دین نہیں سمجھا کہ ان کی تقلید کی جائے۔

اس کے بعد موصوف نے جناب زیدرح کے خروج کی قدرے تفصیل درج کی ہے ملاحظہ ہو:-

"۱۲۰ھ م ۷۳۸ء میں جب ہشام بن عبدالملک
نے خالد بن عبداللہ القسری کو عراق کی گورنری

سے معزول کر کے اس کے خلاف تحقیقات
کرائی تو اس سلسلے میں گواہی کے لئے حضرت
زید کو بھی مدینے سے کوفے بلایا گیا ایک مدت
کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ خاندان علیؓ کا ایک
ممتاز فرد کوفہ آیا تھا۔ یہ شہر شیعان علی رضہ کا
گڑھ تھا اس لئے ان کے آنے سے یک لخت
علوی تحریک میں جان پڑ گئی اور لوگ کثرت
سے ان کے گرد جمع ہونے لگے۔
ان لوگوں نے زید رح کو یقین دلایا کہ کوفہ
کے ایک لاکھ آدمی آپ کے ساتھ ہیں اور
پندرہ ہزار آدمیوں نے بیعت کر کے باقاعدہ
اپنے نام بھی ان کے رجسٹر میں درج کرا دیئے
اس اثنا میں کہ خروج کی تیاریاں اندر ہی اندر
ہو رہی تھیں اموی گورنر کو ان کی اطلاع پہنچ
گئی۔ زیدؒ نے یہ دیکھ کر کہ حکومت خبردار ہو گئی
ہے صفر ۱۲۲ھ مطابق ۷۴۰ء میں قبل از وقت خروج
کر دیا جب تصادم کا موقع آیا تو کوفہ کے شیعان
علیؓ ان کا ساتھ چھوڑ گئے جنگ کے وقت
صرف ۲۱۸ آدمی ان کے ساتھ تھے۔
دوران جنگ میں اچانک ایک تیر سے
وہ گھائل ہو گئے اور ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا"
(ص۲۶۶ و ص۲۶۷)

تبصرہ :- اس وقت اس واقعہ پر بحث وتمحیص ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ قاری کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ جناب زید کو خروج وبغاوت پر آمادہ کرنے والوں ان سے وعدۂ رفاقت اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں صرف شیعان علی رضؓ نظر آتے ہیں کسی سنی کا نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا۔ خروج کے محرک اور ایک لاکھ موعودہ رفقار بھی شیعہ تھے اور بیعت کرنے والے ۱۵ ہزار بھی شیعہ تھے۔ جیساکہ بیان دواقعات سے ظاہر ہے کسی سُنّی نے نہ تو انہیں خروج کی ترغیب دی نہ اُن سے کوئی تعاون کیا۔ اس سے عیاں ہے کہ اہل سنت عوام وخواص جناب زید کے اس خروج کو بالکل ناجائز اور مذموم سمجھتے تھے اور اس میں شرکت کو گناہ جانتے تھے۔ کوفہ جس طرح "شیعان علی رضؓ" کا گڑھ تھا اسی طرح اہلسنت کا مرکز بھی تھا یہاں بکثرت علماء اہل سنت، محدثین فقہار موجود تھے اور خدمت دین میں مصروف تھے اگر اس خروج کے جواز کی ذرہ برابر بھی گنجائش نکل سکتی تو محدثین وفقہار کے اس جم غفیر میں سے کم ازکم دوچار علمار متبحرین توضرور ان کا ساتھ دیتے۔ لیکن جب وہ اسے ناجائز اور معصیت سمجھ رہے تھے تو علمار کی شرکت یا تائید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں اس کے بعد لکھتے ہیں :-

(الف) اس خروج میں امام اُبوحنیفہ رحؒ کی پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی (بحوالہ الجصاص ج ۱ ص ۸۱)

(ب) ”انہوں نے ان کے خروج کو جنگ بدر میں
رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے خروج سے تشبیہہ
دی۔ (بحوالہ المکی ج ۱ ص ۲۶۰)
جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جسطرح اس
وقت آنحضرت ؐ کا حق پر ہونا غیر مشتبہ تھا
اسی طرح اس خروج میں زید بن علی کا بھی حق پر
ہونا غیر مشتبہ تھا۔“

مگر باوجود اس کے امام ابوحنیفہ رح کا طرز عمل ان کے بارے میں کیا رہا؟ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

(ج) ”لیکن جب زید کا پیغام ان کے نام آیا کہ آپ
میرا ساتھ دیں تو انہوں نے قاصد سے کہا کہ
اگر میں یہ جانتا کہ لوگ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں
گے اور سچے دل سے ان کی حمایت میں کھڑے
ہوں گے تو میں ضرور ان کے ساتھ ہوتا اور
جہاد کرتا کیونکہ وہ امام حق ہیں لیکن مجھے اندیشہ
ہے کہ یہ لوگ اسی طرح ان سے بے وفائی کریں
گے جس طرح ان کے دادا (سیدنا حسینؓ)
سے کر چکے ہیں۔ البتہ میں روپئے سے ان کی
مدد ضرور کرونگا“ (بحوالہ المکی ج ۱ ص ۲۶۰)

تبصرہ ۱:- ہم نے اس مقام پر ”خلافت و ملوکیت“ کی تین عبارتیں نقل کی ہیں جو مسلسل ہیں مگر ہم نے انہیں تین حصوں میں الگ الگ نقل کیا ہے اور ان ٹکڑوں پر الف، با۔ ج کے علامات امتیاز کے لئے لگا دیئے ہیں

ان عبارتوں کا ربط ظاہر ہے اس لئے اس تقسیم سے ان کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا نہ ان کے مفہوم میں کوئی فرق یا اشتباہ پیدا ہوتا ہے، اس تقسیم و امتیاز میں مصلحت یہ ہے کہ اس مسلسل عبارت میں تین باتیں کہی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک قابل توجہ ہے ہر ایک پر الگ بحث سے انشاء اللہ تفہیم میں سہولت ہوگی۔ اور قاری ہر مسئلہ کو کما حقہٗ سمجھ سکیں گے۔

(الف) اس کے متعلق ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ قصہ بالکل غلط اور جھوٹا ہے امام اعظم ابوحنیفہؒ اس سے بالکل بری ہیں انہوں نے قطعاً زیدؒ کا ساتھ نہیں دیا اور انہیں ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں تھی یہ کہانی شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے جس کا کوئی ثبوت اوراق تاریخ میں نہیں ملتا اس کا وقوع ممکن بھی نہ تھا کیونکہ امام صاحب ممدوح خلافت اسلامیہ کے خلاف خروج بالسیف کو حرام اور بغاوت کو معصیت کبیرہ سمجھتے تھے ان کا مسلک اور فتویٰ یہی تھا اپنے مسلک اور فتوے کے خلاف وہ زیدؒ کی تائید وامداد کیسے کر سکتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النعمان میں اس من گھڑت روایت کی تردید کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح بھی تحفۂ اثنا عشریہ میں اس حکایت کو غلط اور خلاف واقعہ قرار دیتے ہیں ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ الجصاص اپنے تشیع کی وجہ سے اس سلسلہ میں قطعاً قابل اعتماد نہیں۔ اگر حضرت شاہ صاحبؒ یا علامہ شبلی رح اس کی تردید نہ بھی کرتے تو بھی مسئلہ پر کوئی اثر نہ پڑتا کیونکہ یہ روایت خود اپنے کذب و دروغ کا اعتراف کر رہی ہے یہ امام صاحبؒ

بلکہ جمہور ائمہ مجتہدین اور جمہور اہلسنت کے مسلک کے بالکل خلاف ہے اور یہ بات کسی طرح قابل فہم نہیں کہ امام صاحبؒ نے اپنے اور جملہ اہلسنت کے مسلک کی خلاف ورزی کر کے زید کی حمایت کی ہو امام صاحبؒ اور جمہور اہلسنت کا یہ مسلک صفحات گذشتہ میں بحوالہ کتب معتبرہ منقول ہو چکا ہے

(ب) اس قابل نفرت سراپا کذب و دروغ روایت کے متعلق ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ جس شخص نے روایت گھڑی ہے وہ یقیناً کوئی پکا سبائی رافضی تھا جس کا دل نور ایمان سے خالی ہو چکا تھا اور یقیناً وہ امام اعظم رح کا سخت دشمن تھا امام صاحب کی طرف اس قول کی نسبت ان پر نہایت مکروہ افترا اور بہتان عظیم ہے وہ اس سے بالکل بری ہیں وہ تو وہ ان کا کوئی کافر غلام بھی اس قول کی جسارت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی اور گستاخی ہے اور اس کی جسارت دار الاسلام میں رہنے والا کوئی کافر بھی نہیں کر سکتا اگر کرے تو قتل کر دیا جائے جناب زید کی اس بغاوت کو جسے شرعاً کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا جو مسلمانوں کے مقابلے میں برپا کی گئی تھی جس کا مقصد سوائے حصولِ اقتدار کے اور کچھ نہ تھا غزوۂ بدر سے تشبیہ دینا جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا جو کافروں کے مقابلے میں تھا جہاد فی سبیل اللہ کی توہین اور شریعت اسلامیہ میں تحریف ہے دوسرا مکروہ پہلو یہ ہے کہ جس جنگ کے شرکا امت کے افضل ترین افراد اور اللہ تعالیٰ کے وہ عباد مخلصین ہوں جن کا مقبول عند اللہ ہونا قطعی اور یقینی ہو اور جس جنگ کے سپہ سالار افضل الخلائق سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اس کی برابری کوئی جنگ نہیں کر سکتی۔ جناب زید کے خروج کو

اس کے برابر اور مشابہ قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔ زید کو اگر ہم ولی کامل بھی تسلیم کرلیں تو بھی انکے ایسے سینکڑوں مل کر بھی کسی ادنی سے ادنی صحابی رضہ کی خاک پا کی بھی برابری نہیں کرسکتے چہ جائیکہ ان کے خروج کو اس جنگ سے تشبیہ دینا جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوں اور امت کی افضل ترین جماعت یعنی جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین معروف جہاد ہو یہ صرف صحابۂ کرام کی شان میں ہی نہیں بلکہ خود نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بھی گستاخی اور بے ادبی ہے ۔(العیاذ باللہ) امام اعظم رح اس قول شنیع و باطل سے بالکل بری ہیں اور ان کی طرف اس کی نسبت ان پر افترار اور بہتان ہے ۔

اس گستاخانہ سبائی قول باطل کی جو تشریح مودودی صاحب نے کی ہے اس سے بھی امام صاحب بالکل بری ہیں اس بات کا وسوسہ بھی انہیں کبھی نہ ہوا ہوگا کیونکہ اس میں تو عقیدۂ امامت ملفوف کرکے پیش کیا گیا ہے ۔ جناب زید کا زیر بحث معاملہ میں حق پر ہونا ایسا باطل دعوی ہے جسکی جسارت شیعی زبان ہی کرسکتی ہے آخر اس دعوی کی دلیل کیا ہے ؟ امام صاحب اگر انہیں حق پر سمجھتے تھے تو اسکی کیا دلیل انہوں نے بیان کی ؟ پھر غضب یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تشبیہ دی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق پر ہونا تو جزو ایمان ہے جو شخص اس میں ذرہ برابر بھی شک کرے وہ کافر خارج از اسلام ہے

توکیا زید کے خروج کو حق سمجھنے کو بھی امام صاحبؒ ایمانیات میں شمار کرتے تھے اور کیا اس کے منکر کو کافر سمجھتے تھے۔؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے برسرحق ہونے کی شہادت تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے کلام قرآن مجید میں دی تو کیا جناب زید کے برحق ہونے کی شہادت بھی کتاب اللہ دے رہی ہے؟

جس شخص نے امام اعظم رحمہ اللہ پر یہ افترار پردازی اور بہتان طرازی کی ہے وہ اول درجہ کا کذاب و مفتری ہونے کے ساتھ ختم نبوت پر ایمان سے بھی محروم تھا وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ زیدؒ امام تھے اس لئے خلافت کا پیدائشی اور خداداد حق DEVINERIGHT انہیں حاصل تھا واقعہ یہ ہے کہ زیر بحث معاملے یعنی خروج مذکور میں جناب زید کا غلطی پر ہونا اور ان کے اقدام کا ناجائز ہونا بالکل بدیہی حقیقت ہے عقیدہ امامت بالکل باطل ہے۔

اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف قول مذکور یا اسکی تشریح مذکور کی نسبت بالکل غلط ہے امام صاحب اس سے بالکل بری ہیں اہلسنت کے نزدیک امامت کا حق خداداد DEVINE RIGHT کسی امتی کو بھی حاصل نہیں ہوا نہ ہوسکتا ہے۔

(ج) جناب زیدؒ کے پیغام کا جواب اس عبارت میں امام صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے اسے موصوف کی ہجو ملیح کے سوا اور کیا کہا جائے۔ اعانت سے گریز کی کیا خوب توجیہہ ہے کہ وہ آپ کامیاب نہ ہوسکیں گے، سوال یہ ہے کہ پھر دوسروں کو گردن پھنسانے کی ترغیب کیوں دیتے تھے جب کامیابی کی کوئی توقع نہ ہو

تو ایسا اقدام کرنا فساد انگیزی اور اقدام خودکشی ہے امام صاحبؒ نے زیدؒ کے اس اقدام کو جائز کیسے سمجھا؟ اور انہیں اس گناہ کبیرہ یعنی اقدام خود کشی اور فساد انگیزی سے منع کرنے کے بجائے اس کی ہمت افزائی کیوں کی؟ اور اس سے منع کرنے کے بجائے اس کی تحسین کیوں کی؟ نیز ان کی مالی امداد کیوں کی؟ کیا کسی ایسے کام میں کسی کی امداد کرنا جس کا نتیجہ مسلمانوں کے درمیان فساد اور انکی خونریزی کے سوا کچھ نہ نکلے معصیت نہیں ہے؟ کسی کذاب نے یہ باتیں امام اعظم رحؒ کی طرف منسوب کرکے ان کی کردار کشی کی ناپاک کوشش کی ہے وہ ان سے بالکل بری ہیں اور پوری کہانی سبائی کارخانے کی بنی ہوئی جھوٹ کی پوٹ ہے اس سبائی کہانی کا یہ فقرہ "کیونکہ وہ امام برحق ہیں" مخصوص طور پر قابل توجہ ہے یہ سبائی کارخانہ دروغ بافی کا ٹریڈ مارک ہے امام صاحب کی طرف اس فقرے کو منسوب کرکے کذاب راوی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو شیعہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ فقرہ شیعوں کے عقیدۂ امامت ہی کا مختصر عنوان ہے۔ ورنہ یہ ایک لفظ بے معنی ہے۔ جناب زیدؒ کا جمہور مسلمین نے انتخاب نہیں کیا تھا۔ ایک شہر کے روافض نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی یہ روافض اپنی گمراہی کی وجہ سے ازروئے اصول شریعت حق رائے دہی بھی نہیں رکھتے تھے اہل ایمان کا نمائندہ تو انہیں کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا ان کے انتخاب سے موصوف "امام اور برحق" کیسے ہو گئے؟ بالفرض اگر روافض کے بجائے صالح اور متقی اہل ایمان کی اتنی سی جماعت بھی انہیں منتخب کرتی تو بھی شرعاً وہ امام اور خلیفہ نہیں بن سکتے تھے اتنی وسیع و عریض مملکت میں صرف ایک شہر کے چند نفر کے انتخاب سے کوئی شخص جائز خلیفہ اور سربراہ مملکت نہیں بن سکتا۔ چہ جائے کہ جب

انتخاب کرنے والے ضال ومضل اور فساق وفجار ہوں انہیں "امام برحق"
اور "خلیفہ" قرار دینا ایسی لچر اور لغو بات تھی کہ امام صاحب کی گلی کے خاکروب
کی زبان سے بھی نہیں نکل سکتی تھی اسے امام صاحب کی طرف منسوب کرنا
آں محترم پر ظالمانہ بہتان وافترا ہے۔ اس پر تو تعجب نہیں ہوتا کہ سبائیوں
نے یہ سراپا دروغ لچر کہانی کیسے گڑھی کیونکہ یہ ان کے مذہبی مزاج کا تقاضا
اور ان کی عادت ہے مگر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ المکی نے اسے کیسے
نقل کر دیا؟

چند سطروں کے بعد موصوف لکھتے ہیں۔

"امام ابوحنیفہ رح کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ تحریک
صرف کوفہ میں ہے پوری سلطنت بنی امیہ اس
سے خالی ہے"

تبصرہ:۔ امام صاحب کو یہ تو معلوم تھا مگر کیا اس حکم شرعی کا انہیں
علم نہ تھا کہ اتنی بڑی عظیم الشان سلطنت کے سربراہ اور کروڑوں مسلمانوں
کے مانے ہوئے خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں صرف ایک شہر کے ایک
گروہ کے جس کی تعداد اسلامی ممالک کی پوری مسلم آبادی کی ایک فیصد
بھی نہ تھی ایک شخص کو امام منتخب کر لینے سے وہ امام برحق نہیں ہو سکتا
بلکہ بوقت ضرورت جمہور مسلمین پر اس کے خلاف قتال کرنا واجب ہو
جاتا ہے۔ بالکل بعید از قیاس ہے کہ امام صاحب کو اس حکم شرعی کا علم نہ
ہو پھر اس علم کے باوجود انہوں نے زید کی حمایت کیوں کی اور انہیں امام
برحق کیسے کہدیا؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ زیر بحث روایت سفید جھوٹ
اور امام اعظم رحمہ اللہ پر بہتان وافترا ہے۔ آں محترم نے کبھی زید کی حمایت
یا نصرت نہیں کی اور وہ ان کے خروج کو جائز بھی نہیں سمجھتے تھے۔

اسی قسم کی ایک دوسری بغاوت کی حمایت کو امام ابوحنیفہ رح کی طرف منسوب کرتے ہوئے مودودی صاحب زیرعنوان "نفس زکیہ کا خروج"
لکھتے ہیں :۔

"دوسرا خروج محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ)
اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کا تھا
جو امام حسنؓ بن علیؓ کی اولاد میں سے تھے یہ
۱۴۵ھ - ۷۶۲ - ۷۶۳ ء کا واقعہ ہے
جب امام ابوحنیفہ اپنے پورے اثر و رسوخ کو
پہنچ چکے تھے ان دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک
بنی امیہ کے زمانے سے چل رہی تھی ۔"

(۲۶۸ - ۲۶۹)

تبصرہ :۔ خلافت عباسیہ ۱۳۲ھ میں قائم ہوئی اور محمد بن عبداللہ نے ۱۴۵ھ میں خروج کیا گویا خلیفۃ المسلمین المنصور العباسی کی خلافت پر آٹھ سال گذر چکے تھے عرب سے لے کر ہندوستان تک پھیلی ہوئی اس سلطنت کے مسلمان موصوف کی خلافت پر متفق تھے ایسی حالت میں کسی کا دعویٰ خلافت کر کے خروج کرنا اور شیرازہ ملت کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرنا کھلا ہوا فساد فی الارض تھا ۔

ان خروج کرنے والے بزرگ کا لقب الارقط تھا جن سبائیوں نے انہیں ورغلا کر خروج پر آمادہ کیا تھا انہیں نے انہیں "نفس زکیہ" کا لقب بھی دیا اور یہ بھی مشہور ہوا۔ شریعت اسلامیہ سے معمولی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خروج بغاوت کے حدود میں داخل تھا اور شرعاً بالکل ناجائز اور معصیت کبیرہ تھا بظاہر مطیع ہو کر بغاوت

ے کیونکہ وہ ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے تھے

ومخالفت کی خفیہ تحریک چلانا اسلامی اخلاقیات بلکہ عام اخلاقیات میں بھی ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے لیکن مودودی صاحب کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسے جائز کہا بلکہ ابن الارقط موصوف کی حمایت ونصرت بھی کی موصوف لکھتے ہیں :۔

"اس خروج کے موقع پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا طرزِ عمل پہلے خروج سے بالکل مختلف تھا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں انہوں نے اس زمانہ میں جبکہ منصور کوفہ ہی میں موجود تھا اور شہر میں ہر رات کرفیو لگا رہتا تھا بڑے زور شور سے کھلم کھلا اس تحریک کی حمایت کی یہاں تک کہ ان کے شاگردوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم سب باندھ لئے جائینگے۔" (۲۷۰)

تبصرہ :۔ اس سے پہلی والی کہانی کی طرح یہ کہانی بھی قطعاً جھوٹی اور سراپا دروغ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر سبائیوں کا بہتان وافتراء ہے امام موصوف اس سے بالکل بری ہیں اس حکایت کے غلط اور جھوٹ ہونے کی ایک دلیل تو وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ امام صاحب اور بلکہ جملہ ائمہ مجتہدین بلکہ جمہور اہلسنت کے مسلک کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ غیر ممکن ہے کہ امام اعظم اپنے اور جملہ اہلسنت کے مسلک کے خلاف اس بغاوت اور باغی کی حمایت وامداد کر کے معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں یہ بات قطعی ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے کبھی ابن الارقط کی حمایت وتائید نہیں کی بلکہ یقیناً ان کی مخالفت کی ہو گی اور انہیں اس ناجائز اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی ہو گی اس واضح دلیل کے علاوہ

خود اس کہانی میں اس کے سبائی افتراء اور سراپا دروغ ہونے کے شواہد وقرائن موجود ہیں ملاحظہ ہوں۔

اول :۔ امیرالمومنین منصور رحمہ اللہ کی موجودگی میں امام اعظمؒ بقول واضع روایت ابن الارقط کی حمایت ونصرت کر رہے تھے تو منصور نے ان کے خلاف کوئی کاروائی کیوں نہیں کی؟ اگر امام صاحب اسقدر ذی اثر تھے کہ منصور رحؒ ان سے ڈرتے تھے تو بقول سبائی دروغ بافان ان کے کوڑے کیسے لگوائے پھر یہ کہ اتنے بڑے مخالف کو عہدۂ قضاء کیوں سپرد کرنا چاہتے تھے؟

دوم :۔ امام صاحب ابن الارقط کے ساتھ خود کیوں نہ شریک ہوئے جبکہ وہ ان کی رفاقت کے فضائل کے انبار لگا رہے تھے؟ اول تو اس وقت ان کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی شریک ہو کر جنگ میں حصّہ لے سکتے تھے لیکن بالفرض وہ خود نہیں شریک ہو سکتے تھے تو اپنے بیٹے یا اپنے نوجوان شاگردوں ہی کو ان کا ساتھ دینے پر مجبور کرتے؟ انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟۔

سوم :۔ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ ابن الارقط کے خروج کے زمانہ میں "امام ابوحنیفہ اپنے پورے اثر و رسوخ کو پہنچ چکے تھے مگر اس "اثر و رسوخ" کا ذرہ برابر بھی اثر ظاہر نہ ہوا کوفہ کا ایک سنی بھی ابن الارقط کا ساتھی نہیں بنا یہاں تک کہ خود امام صاحب کے شاگردان رشید بھی بقول راوی ڈرتے تھے کہ "ہم سب باندھ لئے جائیں گے"۔ پھر امام صاحب کا خاک "اثر و رسوخ" تھا؟ "اثر و رسوخ" کا اثر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ سنیان کوفہ امام اعظمؒ کی قیادت میں امیرالمومنین منصور رحؒ کے قصر پر حملہ آور ہو جاتے اور وہیں انہیں ختم کر کے ابن الارقط کی خلافت کا اعلان کر دیتے۔

اس زمانہ میں ٹینک توپیں اور مشین گنیں تو تھیں نہیں، تیر، تلوار وغیرہ جو اسلحہ حکومت کے پاس تھا وہی عوام کے پاس تھا اگر یہ نہیں ممکن تھا تو کم از کم اتنے بڑے شہر سے دو چار ہزار آدمی تو امام صاحب کی دعوت پر لبیک کہہ کر ابن الازقط کے پاس پہونچے ہوتے مگر وہاں سے تو ایک سنی بھی نہ گیا! اس کی توجیہ کیا ہے ؟

چہارم :۔ امام صاحب رحمہ اللہ منصور رحمہ اللہ سے بیعت کر چکے تھے اس بیعت کے باوجود کسی دوسرے مدعیٔ خلافت کی حمایت و نصرت کرنا کیا غداری نہیں تھی ؟ خصوصاً جبکہ انہوں نے منصور کو نقض بیعت کی اطلاع بھی نہیں دی تو کیا معاذ اللہ امام صاحب غداری اور فریب کاری کے مرتکب ہوئے ۔؟

ان قرائن پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منقولہ بالا روایت بالکل من گھڑت سراپا کذب و دروغ اور سبائی ذہن کی اختراع ہے ۔ امام اعظم رحمہ اللہ اس بہتان سے بالکل بری ہیں ۔

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں ۔

"وہ لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے اور ان سے بیعت کرنے کی تلقین کرتے تھے وہ ان کے ساتھ خروج کو نفلی حج سے ۵۰ یا ۷۰ گنا ثواب کا کام قرار دیتے تھے ۔ ایک شخص ابو اسحاق الفزاری سے انہوں نے یہاں تک کہا کہ تیرا بھائی جو ابراہیم کا ساتھ دے رہا ہے اس کا یہ فعل تیرے اس فعل سے کہ تو کفار کے خلاف جہاد کرتا ہے افضل ہے ۔ (۲۷) "

تبصرہ:۔ بغاوت کو جو ایک معصیت ہے نفلی حج سے جو عبادت ہے یا کفار کے مقابلے میں جہاد سے جو اعلیٰ درجہ کی طاعت اور فرض علی الکفایہ ہے افضل قرار دینا تحریف شریعت اور افترا علی اللہ تعالیٰ ہے جو مستلزم کفر ہے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت آں محترم پر کھلا ہوا بہتان و افترا ہے۔ روایت بالکل جھوٹی سراپا دروغ و بہتان اور کسی سبائی شقی کی گڑھی ہوئی ہے۔

بالفرض کفرض المحال اگر امام صاحب موصوف یہ یا اس قسم کی اور کوئی غلط اور گمراہ کن بات کہتے تو آج دنیا میں کسی حنفی کا وجود نہ ہوتا ان کے سب شاگرد و احباب انہیں گمراہ سمجھ کر دور سے سلام کر کے ان سے رخصت ہو جاتے اور کبھی ان سے بات کرنا یا ان کی بات سننا بھی گوارا نہ کرتے یہ جھوٹی روایت تو سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہے لیکن شیعوں کے علاوہ بعض سنیوں نے بھی اسے شہرت دی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ خلافت عباسیہ کے دور میں ایک زمانے کے بعد جب کسی ایک امام کی تقلید کا رواج ہوا تو مجتہد فیہ عملی مسائل میں اختلافات نے بہت شدت اختیار کر لی۔ حنفی شافعی وغیرہ مختلف مکاتب فقہ کے بکثرت علماء حدود سے گذر کر تعصبات میں مبتلا ہو گئے اس زمانہ میں بعض غیر حنفی علماء نے امام صاحب رحمہ اللہ سے عداوت کی بناء پر ان کے خلاف غلط پروپیگنڈا بھی کیا اور اس قسم کی سبائی روایتوں کو خوب شہرت دی اس کی ایک مثال خطیب بغدادی مرحوم ہیں بعض علماء نے ایسی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ امام صاحب کے خلاف پروپیگنڈا کیا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ایسے جلیل القدر محدث بھی ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور ان کے متعلق لکھ

دیا کہ کان یری السیف علی الامہ (یعنی مسلمانوں کا خون بہانا روا رکھتے تھے) بعض تو تعصب سے مغلوب ہو کر فریب کاری سے بھی نہ چوکے انہوں نے تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ بظاہر امام صاحب کے مناقب میں کتاب تالیف کی اور اس میں اس قسم کی سبائی بہتان طرازیوں اور من گھڑت روایتوں کو بھی جگہ دی تاکہ امام اعظم رح سمجھدار اور دین سے واقف اہلسنت کی نظروں سے گر جائیں بعض ایسے لوگوں نے جو درحقیقت شیعہ تھے لیکن تقیہ کی نقاب ڈال کر اہلسنت میں شامل ہو گئے تھے ...
...... شیعی افکار پھیلانے اور امام اعظم کو اہلسنت میں بدنام کرنے اور ناواقف سنیوں کی نظر میں انہیں شیعیت نواز ظاہر کر کے انہیں گمراہ کرنے کی غرض سے موصوف کے مناقب و فضائل میں کتابیں لکھیں اور ان میں اس قسم کی سبائی سراپا کذب و دروغ روایتیں درج کر کے آں محترم پر افترا کیا[1]

---

[1] ہند کے صوبہ بہار کے ایک نامور عالم دین نے "امام ابوحنیفہ رح کی سیاسی زندگی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا ماخذ دراصل مصر کے سنی نما شیعہ فاضل شیخ ابوزہرہ کی کتاب ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسی کتاب کا آزاد ترجمہ ہے البتہ اس میں خلفاء اسلام اور ان کے معاونین پر تبرے میں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے موصوف کا انتقال ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے درحقیقت کتاب اپنا شوق تبرا پورا کرنے ہی کے لئے لکھی تھی امام صاحب کی سوانح نگاری تو صرف بہانہ تھی۔ مصنف موصوف نسلی تعصب اور وطنی تعصب دونوں کے مریض تھے اور دونوں بیماریوں میں ہمیشہ شدت (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) رہتی تھی نسلی تعصب کیوجہ سے ان پر شیعیت کا خاصا گہرا اثر تھا۔ انکے مضامین و تصانیف دیکھنے اوران سے ملاقات کرنے سے اندازہ ہوا کہ موصوف کا ذہن ۸۰٪ فیصد شیعہ اور صرف ۲۰٪ فیصد سُنّی تھا یہ بہت محتاط اندازہ ہے ورنہ شاید شیعیت کا تناسب اس سے زائد نکلے کتاب مذکور میں بھی اسی خاندانی تعصب کے جذبے اور شیعیت کے قوی رجحان سے مغلوب ہو کر انہوں نے امام ابوحنیفہ رح کو اموی و عباسی خلافت کے خلاف خروج کرنے والے علوی حضرات کا مؤید ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ان سب مضامین باطلہ کا ابطال اور ان کی تردید ہم اس کتاب میں کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی کتاب میں خلفاءِ اسلام خصوصًا امیرالمؤمنین منصورؒ پر بہت غلط اور بے بنیاد الزام عائد کئے گئے ہیں۔ جو قطعًا ثابت نہیں اس مقصد سے انہوں نے مغالطہ دہی اور غلط بیانی اور الزام تراشی سے بھی پرہیز نہیں کیا مثال کے طور پر بعض شیعہ عمالِ خلافت کی غلط روی کو خلیفۃ المسلمین کے سر تھوپنے کی کوشش کر کے قاری کو مغالطے کے راستہ سے خلیفۃ المسلمین المنصور رح بلکہ پورے دور خلافت کے خلاف بدگمانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے بطور نمونہ خالد القسری کی بے راہ روی ہے جسے انہوں نے خوب اُچھالا ہے اور اسکی بناء پر خلیفۃ المسلمین منصور رح کو مطعون کیا ہے حالانکہ خالد القسری پکا رافضی تھا در پردہ خلافت عباسیہ کا مخالف اور دشمن تھا بظاہر دوست بنا ہوا تھا جتنے شیعہ خلافت عباسیہ کے دور میں کسی خدمت پر مامور تھے سب کا یہی حال تھا۔ منافقت اور اہلسنت سے عداوت تو شیعی مزاج اور طبیعت ہے اسے وہ کیسے ترک کر سکتے ہیں۔ مصنف موصوف نے اسلامی (بقیہ آئندہ صفحہ)

یہ کام زیدی شیعوں نے زیادہ کیا ہے[۲] یہ لوگ عملی زندگی میں اکثر وبیشتر مسائل میں فقہ حنفی کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرات شیخین رح کی شان میں گستاخی نہیں کرتے۔ لیکن حضرت عثمان، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص حضرت مغیرہ بن شعبہ، اور جو صحابہ ان کے ساتھ تھے رضی اللہ عنہم ان سب کے سخت دشمن ہیں اور ان کی شان میں سخت بے ادبی کرتے ہیں۔ ظاہری اعمال میں اہلسنت کی موافقت کی وجہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تاریخ کو تاریک بنانے کی مذموم کوشش میں شیعوں کا ہاتھ بٹایا۔ اسکے ساتھ نادانستہ عداوت خلافت عباسیہ وامویہ کے جوش میں خوارج کے ہاتھ میں بھی ایک حربہ دیدیا وہ اسی طرز کا اتباع کرکے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شیعی عمال و ملازمین حکومت مثل مالک اشتر وغیرہ کی بے راہ روی کو معاذاللہ حضرت علی کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ بلکہ کرتے ہیں ایک سُنی تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔!
لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ کی سیاسی زندگی کے فاضل مصنف ان کے اس غلط اور بے بنیاد اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ ہم اہلسنت ہی اس کا تسکین بخش اور مسکت جواب دے سکتے ہیں۔ جناب زید کے خروج کی فضیلت والی سراپا دروغ کہانی اور بے ادبانہ وملحدانہ قول کی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف نسبت بھی اس گمراہ کن کتاب میں موجود ہے۔ ان سب باتوں کی تردید ہم کرچکے ہیں۔
۲ الموفق ابن احمد المکی کی کتاب مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ رح بھی جس کا حوالہ مودودی صاحب نے کئی جگہ دیا ہے اسی قسم کی کتاب ہے۔

اہلسنت میں ملے رہتے ہیں اس لئے انہیں گمراہ کرنے کا موقع خوب ملتا ہے
شیعوں کے اس فرقہ یعنی زیدیہ کے ذریعہ اہلسنت میں بہت گمراہیاں پھیلیں
یہ لوگ سخت گمراہ اور گمراہ گر ہوتے ہیں اہلسنت سے عداوت رکھنے میں
اثنا عشریوں سے کم نہیں ہوتے۔ بعض شیعہ یا شیعیت زدہ گلابی
شیعہ مؤرخین اور سوانح نگاروں نے امام مالک رحمۃ اللہ کی طرف بھی یہ
بات منسوب کی ہے کہ وہ ابن الارقط اور ان کے بھائی ابراہیم کے
حامی تھے یہ بھی امام موصوف پر بہتان وافترا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ
کے تعلقات امیر المومنین منصور سے عمر بھر بہت مخلصانہ اور خوشگوار رہے
اگر وہ ابن الارقط یا انکے بھائی کی حمایت کرتے تو منصور سے ان کے تعلقات
خوش گوار کیسے رہ سکتے تھے؟ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ روایت غلط ہے
درحقیقت امام مالک رح ابن الارقط اور ان کے بھائی ابراہیم کو باغی
سمجھتے تھے اور ان کے مخالف تھے۔

مودودی صاحب کے سوالات اور اُن کے جوابات

موصوف خلافت و ملوکیت کے آخر میں خاتمہ کلام کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں

"اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں معترض حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ اگر ان کے نزدیک میرا استدلال اور وہ مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے اور وہ نتائج جو میں نے اس استدلال سے اخذ کئے ہیں سب کچھ غلط ہے تو بخوشی اس کی نفی کر دیں۔ مگر صرف نفی کر دینے سے کام نہیں چل سکتا ان کو خود مثبت طریقے سے صاف صاف بتانا چاہیئے کہ

(۱)۔ قرآن و سنت کی رو سے اسلامی ریاست کے قواعد اور اسلام کے اصول حکمرانی فی الواقع کیا ہیں ؟

(۲)۔ خلافت راشدہ کی وہ اصل خصوصیات کیا ہیں جن کی بنا پر وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قرار دی جاتی ہے ؟

(۳)۔ اس خلافت کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی یا نہیں ؟

(۴)۔ اگر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ملوکیت نہیں آئی تو کیا بعد کی حکومتوں میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی خصوصیات موجود تھیں ؟

(۵)۔ اگر آپ مانتے ہیں کہ ملوکیت آگئی تو وہ کن اسباب سے کس طرح آئی ؟

(٦)۔ کس مرحلے پر آپ کہینگے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی؟

(۷) خلافت راشدہ اور اس ملوکیت میں وجوہ امتیاز کیا ہیں اور ایک کی جگہ دوسری کے آنے سے فی الواقع فرق کیا واقع ہوا؟

(۸) کیا اسلام میں خلافت و ملوکیت دونوں یکساں ہیں ؟ یا ان میں سے ایک نظام اس کی نگاہ میں مطلوب ہے اور دوسرا نظام صرف ایسی حالت میں قابل برداشت ہے۔ جبکہ اس کو تبدیل کرنے کی کوشش زیادہ بڑے فتنے کی موجب نظر آتی ہو ؟" ص ۳۴۸

یہ سوالات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

"یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور وفکر کرنے سے آپ ان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے دماغ بند نہیں کر سکتے جو آج تاریخ اسلام اور علم سیاست کے اسلامی شعبے کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کا جواب اگر میں نے غلط دیا ہے تو آپ صحیح دے دیں یہ فیصلہ عام اہل علم خود کرلیں گے کہ دونوں جوابوں میں سے کونسا جواب معقول اور مدلل ہے ۔" ص ۳۴۹

تبصرہ :۔ ان سوالات کے جوابات دینے سے پہلے ہم خود ان سوالات پر کچھ تبصرہ کرنا چاہتے ہیں ۔

سوالات میں ان کی نفسیاتی ترتیب کو بالکل نظر انداز کر دیا

گیا جس کی وجہ سے ان کے درمیان مغالطہ انگیز خلا پیدا ہو گیا ہے۔
پہلا سوال اسلام کے اصول حکمرانی کے متعلق ہے جس کا ایک عنوان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نظام خلافت کسے کہتے ہیں؟ اس کے بعد **دوسرا سوال**۔ خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ کی خصوصیات کے متعلق کرتے ہیں اور ان دونوں کے سوالات کے درمیان خلا پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ سوال اوّل کے بعد دوسرا سوال خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ کی خصوصیات کے متعلق نہیں پیدا ہوتا بلکہ مطلق نظام خلافت کی خصوصیات کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔

سیاست کا طالب علم اسلام کے اصول حکمرانی معلوم کر کے نظام خلافت کا ایک تصور اپنے ذہن میں قائم کرے گا اس کے بعد فطری طور پر اس کے ذہن میں اس کے ان امتیازات و خصوصیات کی جستجو پیدا ہو گی جو اسے دنیا کے دوسرے نظامات و نظریات سیاسیہ مثلاً تھیاکریسی۔ جمہوریت شاہی وغیرہ سے ممتاز کرتے ہیں۔ بالکل نفسی بات ہے کہ کسی شئے کی معرفت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک وہ دوسری سب اشیاء سے ممتاز نہ ہو جائے اس سے امتیاز جوئی ایک نفسی اور فطری اصول ہے۔ اس خلا کے ساتھ خلافت راشدہ کی خصوصیات کا سوال بالکل بے محل ہے۔

یہ خصوصیات تو اسے عام خلافت سے امتیاز دیتے ہیں۔ اگر نفس خلافت اور خلافت راشدہ میں کوئی فرق ہی نہیں اور خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ خلافت کے اعلیٰ درجہ کے نام نہیں بلکہ مطلق خلافت کا نام ہے تو پھر اس کی خصوصیات کے کیا معنی ہیں؟ خلافت راشدہ تو مطلق خلافت کے ایک اعلیٰ اور مثالی (IDEAL) درجہ کا

نام ہے نہ کہ مطلق خلافت کا انہوں نے یہ جھول اور خلا جو چھوڑا ہے
چوتھے سوال میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے سوال تو
یہ ہونا چاہیئے تھا کہ بعد کی حکومتوں میں مطلق خلافت کی خصوصیات
موجود تھیں یا نہیں ؟

مگر اس کے بجائے وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے وجود وعدم
کو پوچھتے ہیں سیاست کا طالب علم تو پہلے یہ جاننے کی کوشش کرے
گا کہ خلافت راشدہ کے بعد نظام خلافت کب تک باقی رہا ؟ یہ
سوال تو بعد کا ہے کہ اس خلافت کا درجہ کیا تھا اعلیٰ درجہ تھا یا
اوسط یا ادنیٰ ؟ یا خلافت ختم ہو کر ملوکیت قائم ہو گئی تھی ؟

اس طرز استفسار اور اسلوب گفتار سے موصوف کا مقصد
نفسیاتی طور پر قاری کو ایک مخصوص زاویہ نظر دینا ہے تاکہ وہ خلافت
راشدہ کے بعد کی جملہ اسلامی خلافتوں کو ملوکیت سمجھے اور اسی
نقطۂ نظر سے ان کے احوال پر غور کرے یہ بھی مغالطہ ہی دینے کی ایک
شکل ہے ۔ پانچواں سوال بھی بے محل ہے یہ تو اس وقت ہو سکتا تھا
جب خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد سوا ملوکیت کے اور کوئی
احتمال باقی نہ رہتا حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔

نفس نظام خلافت باقی رہنے کا احتمال باقی ہے پھر یہ کہنا
کیوں لازم ہو گیا کہ ملوکیت آ گئی اس خلا کو باقی رکھنے سے بھی
مودودی صاحب کا مقصد یہی ہے کہ قاری کا ذہن پھسل کر سبائی
راستے پر پڑ جائے ۔

پانچویں سوال کے بعد چھٹا سوال لایعنی اور بے سود ہے ملوکیت
کی آمد کی کیفیت اور اس کے اسباب معلوم ہونے سے اس کا وہ

مرحلہ خود بخود معلوم ہو جائے گا اس کے لئے علیحدہ جستجو کی کیا ضرورت ہے ؟

ساتواں سوال بھی سوالات کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے ہے ورنہ بالکل غیر ضروری اور عبث ہے ۔ سوال اوّل سوال دوم کے جوابات سے یہ امتیازات خود بخود واضح ہو جائیں گے ۔ خصوصیات و امتیازات کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے پھر مکرر اس سوال کی کیا ضرورت ہے ؟ ملوکیت کی حقیقت معلوم کئے بغیر مسلمانوں میں اس کا آنا یا نہ آنا کیسے معلوم ہو سکتا ہے اور خلافت راشدہ سے اسے ممتاز کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ دونوں کے آثار خود بخود سامنے آئیں گے اس کے لئے مستقل سوال کی کیا ضرورت تھی ؟

آٹھویں سوال کی نوعیت گذشتہ سوالات سے مختلف ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ایک شہر کا راستہ پوچھتے پوچھتے یکایک کسی دوسرے شہر کا راستہ پوچھنے لگے اس سوال سے موضوع ہی بدل جاتا ہے اس سے پہلے ہر سوال میں خلافتِ راشدہ کے متعلق گفتگو کی گئی تھی جو خلافت کا ایک مخصوص درجہ یا اس کی ایک خاص قسم ہے یہاں پہنچکر مطلق خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا گیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالات کے درمیان مذکورہ بالا خلا قصداً پیدا کیا گیا تھا ورنہ مطلق خلافت کا مسئلہ یہاں کیوں یاد آیا ؟

جوابات

سوالات کی ساخت اور ان کی ترتیب کے متعلق مندرجہ بالا تبصرہ کرنے کے بعد ہم ان کے جوابات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

جواب سوال ۱

اس سوال کا مختصر اور جامع جواب اس آیت میں موجود ہے۔

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ"
(سورۃ الحج - ۲۲:۴۱)

"یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں کو منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے"

اور یہ مجمل جواب یہاں بالکل کافی رہتا ہے آیت میں جو مضمون بیان فرمایا گیا ہے اس کے علم کے بعد ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آتی جو اس کے بعد مذکور ہیں۔

جواب سوال ۲

خصوصیات خلافت راشدہ

خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین کے لقب کا ماخذ یہ حدیث شریف ہے

فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الرّاشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ ۔ (ابوداؤد و ترمذی)	تم میرے طریقے پر اور میرے خلفاء کے طریقے پر جو ہدایت یافتہ اور راہ یافتہ ہونگے چلنا لازم سمجھو اور مضبوطی کے ساتھ اسے دانتوں سے پکڑے رہو (یعنی) اسکے پابند رہو۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خلفاء کو "راشد" اور "مہدی" فرمایا ہے اور اپنی سنت یعنی طریقے کی اتباع کے ساتھ ان کی سنت یعنی ان کے طرز عمل کی اتباع کا بھی حکم دیا ہے۔ اس حکم میں حکمت یہ ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول و نبی ہیں اور ان کا لایا ہوا دین تا قیامت آنے والے ہر شخص کے لئے ہے خواہ وہ کسی ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہو امت کی علمی و عملی ہدایت کے لئے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم دو چیزیں امت کو دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور دوسری خود اپنی سنت جو کتاب اللہ کی شرح اور اس کا بیان ہے۔

حدیث شریف ہے۔

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ رسولہ (صلی اللہ علیہ وسلم)"۔ (موطا امام مالکؒ)	"میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہوگے اس وقت تک ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے ان میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے دوسری اس کے رسول کی سنت"۔

مگر اس مرحلے پر دو سوال پیدا ہوتے تھے اوّل یہ کہ کتاب وسنت قیامت تک آنیوالی امت تک کس طرح منتقل ہو؟ دوم یہ کہ دین اسلام صرف علم کا نام نہیں بلکہ علم و عمل کا مجموعہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مدت دراز گذرنے کے بعد جو لوگ پیدا ہوں گے وہ کتاب وسنت کو کیسے سمجھیں گے اور اس پر کس طرح عمل کرینگے؟ ان دونوں سوالات کا جواب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح دیا کہ کتاب وسنت کے ایک لاکھ سے زائد عملی نمونے چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے خیر امۃ یعنی خیر الامم۔ خیر البریہ۔ اُولٰئِکَ هُمُ الرَّاشِدُوْن اولٰئک علیٰ ھدیً من ربّھم وَ اولٰئک ھم المفلِحُوْن کی سندیں عطا فرمائیں اور رضی اللّٰہُ عَنْھُم وَرضوا عنہ ارشاد فرما کر ان کے مقبول عند اللہ ہونے کی بشارت دیدی۔ اس سے دونوں مسئلے حل ہو گئے کتاب وسنت کے اولین ناقل اعلیٰ درجہ کے مومن کامل متقی اپنی اشاعت وحفاظت دین کے حریص اسلام کے فدائی بلند کردار رفیع الاخلاق تھے اس لئے قیامت تک اس کے محفوظ رہنے کا انتظام ہو گیا دوسرا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ یہ امت یعنی جماعت صحابہ رضؓ کتاب وسنت کا عملی نمونہ تھی اس لئے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا وہ اس نمونے کو دیکھ کر دین کا علم و عمل حاصل کریں گے یہ انتظام پورے دین یعنی کتاب وسنت کے بقائے دوام اور اس کے علم و عمل کو آسان بنانے کے لئے فرمایا گیا تھا۔ اور جماعت صحابہ رضؓ پوری کتاب وسنت کا کامل نمونہ تھی لیکن اس مقام پر سوال صرف سیاسی نظام کے متعلق ہے اس لئے ہم بحث کو اسی پہلو تک محدود رکھتے ہیں۔

اس محدود زاویۂ نظر سے حدیث مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم میرے خلفاء کی اتباع کرنا کیونکہ وہ پیش آمدہ مسائل کے حل اور اپنے طرز عمل میں راشد و مہدی ہونگے اس خصوصیت کی تفصیل درج ذیل ہے۔

خلافت راشدہ کی پہلی خصوصیت

پہلی خصوصیت

جسکی وجہ سے اس کے لئے اس لقب کو مخصوص کیا گیا ہے یہ ہے کہ اسکے بانی اور اسے عملاً چلانے میں اہم کردار ادا کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جنہیں قرآن مجید نے بلا استثناء اولٰئک ھم الراشدون۔ اور اولٰئک حزب اللہ اور الا ان حزب اللہ ھم المفلحون اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اور اولٰئک علٰی ھدًی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون ۔کی سند عطا فرمائی تھی جس نظام خلافت کے اہم کارپرداز سب کے سب راشد مہدی اور مفلح (فلاح یافتہ) حزب اللہ (اللہ کا گروہ) ہوں اور جنہیں رضوان الٰہی حاصل ہو اس کے لئے خلافت راشدہ اور خلافت علٰی منہاج النبوۃ کا لقب یقیناً بہت مناسب و موزون ہے بلکہ یہ القاب اسی کے لئے موزون اور مناسب ہیں بعد کا کوئی دوسرا نظام خلافت ان کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ہم نے صحابہ کرام کو بانی نظام خلافت اس لئے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کیئے ہوئے خلیفہ معصوم اور صاحب وحی و کتاب تھے۔ آنحضور کا مبارک و مسعود دور نظام نبوت کا دور مسعود تھا۔ بعد کا کوئی نظام خلافت اس کے برابر اور اس لقب کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

اُمت کو نظام خلافت کی تعلیم دی گئی اور صحابہ کرام کی تربیت فرما کر انہیں اس کام کے لئے تیار کیا گیا کہ وہ ہدایات و تعلیمات نبوت کی روشنی میں نظام خلافت قائم کریں جو بعد کی آنے والی پوری اُمت کے لئے نمونہ ہو۔ اس لئے نظام خلافت کو عملی شکل دینے والے افراد نے ایسا وجود دینے والے جس کی پیروی کی جا سکے صحابہ کرام ہی تھے عملاً نظام خلافت کی ابتدا خلافت راشدہ ہی سے ہوتی ہے۔ نظام خلافت کا صحابہ کرام رضہ کے ہاتھوں میں ہونا اور سربراہ مملکت کا صحابی ہونا اُسے خلافت راشدہ کے لقب کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ خواہ کوئی دوسری خصوصیت پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اس لئے حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا شمار بھی خلفاءِ راشدین میں ہے اگرچہ ان کا مرتبہ حضرات خلفاءِ اربعہ سے کمتر اور فروتر ہے مگر خلیفہ راشد ہونے کا مدار فضیلت اور درجے پر نہیں بلکہ صرف رتبہ صحابیت پر ہے۔

دوسری خصوصیّت

بعض اعمال نبوت ایسے تھے جنہیں انجام دینے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا مگر ان کی تعمیل بعض خاص حوادث کے ظہور سے مربوط و مشروط تھی اور وہ حوادث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہیں پیش آئے۔ اس وجہ سے ان احکام الٰہیہ کی تعمیل آنحضرت پر واجب نہیں ہوئی اور آپ انہیں انجام نہیں دے سکے۔

سید المرسلین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے وہ کام اپنے خلفاء کے سپرد کر دیئے اور ان کے لئے چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ انہیں انجام دینے کا طریقہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں مذکور

ہے۔

قتالِ مرتدین اور قتالِ رُوم جس کی طرف آیات دعوت اعراب میں اشارہ ہے اس کی نمایاں مثالیں ہیں ان کاموں کو حضرات خلفاءِ راشدین نے بالکل اسی طرح انجام دیا جس طرح نبی کریم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ان کی انجام دہی چاہتے تھے گویا اگر آنحضور علیہ الصلاۃ والسلام بنفس نفیس یہ کام کرتے تو اسی طرح کرتے جس طرح آپ کے اصحاب اور خلفاء نے انہیں انجام دیا بتعبیر مختلف وہ منہاج نبوت کو اختیار کرنے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور پسند سے مطابقت پیدا کرنے میں "راشد ومھدی" تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی ہدایت دی تھی اس لئے وہ خلفاءِ راشدین تھے اور ان کی خلافت کو خلافت راشدہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مثالی حکومت

خلفاءِ راشدین کی حکومت ایک مثالی حکومت تھی ان کا عدل وانصاف رعایا کے ساتھ ان کا اخلاص اور عوام کی خیر خواہانہ خدمت کا بے پناہ جذبہ اپنی ذمہ داری کا شدید اور مستقل احساس، اپنی اونچی حیثیت کی وجہ سے جائز دنیاوی نفع اٹھانے سے بھی گریز اعلیٰ درجہ کی فرض شناسی یہ سب امور واوصاف ایسے تھے کہ جنہوں نے خلافت راشدہ کو اس قدر بلند مرتبہ دیا ہے کہ غیر مسلم بھی اس کے علو مرتبت اور کمال خوبی کا اعتراف کرتے ہیں بلاشبہ خلافت راشدہ ان اوصاف سے موصوف اور ان مدارج کمال پر فائز تھی مگر یہ اس کے کمالات اور اوصاف عالیہ تھے خصوصیات نہ تھے وہ نمونہ کی خلافت تھی یہ نمونہ اسی لئے تھا کہ اس کی پیروی کی جائے انہیں خصوصیات کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی نظیر کا کوئی وجود ہی نہیں

ہو سکتا۔

اگر ایسا ہوتا تو سنّت خلفاءِ راشدین مہدیین کی اتباع کا حکم ہی کیوں دیا جاتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی امر محال کا تو حکم نہیں دیتے تھے رہا یہ امر کہ بعد کی خلافتوں میں ان کی اتباع کی گئی یا نہیں ؟ تو حق یہ ہے کہ جس حد تک اتباع ضروری اور ممکن تھی اس حد تک کی بھی گئی آئندہ صفحات میں مناسب موقع پر انشاء اللہ ہم اس کی توضیح کر کے مودودی صاحب کے مغالطے کا پردہ چاک کریں گے۔

جواب سوال ۳ مختلف سیاسی نظامات اپنے دستور مملکت اور اس دستور کی بنیاد پر نافذ ہونے والے قوانین کے اعتبار سے باہم ممتاز ہوتے ہیں حکومت اور عمال کے طرز عمل کو اس امتیاز میں کوئی دخل نہیں ہوتا خلافت اسلامیہ کا بھی ایک دستور ہے جو اصولی ہے جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حدود مملکت میں قوانین شرعیہ نافذ ہوں جس مملکت (STATE) میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اس کا دستور (CONSTITUTION) دستور خلافت ہو اور اس میں قوانین شرعیہ نافذ ہوں اس مملکت کو خلافت ہی کہا جائیگا اس کے علاوہ کسی دوسرے نام مثلاً ملوکیت وغیرہ کے نام سے اسے موسوم کرنا گمراہ کن غلطی ہے ایسے نظام خلافت میں اگر حکومت یا عمال حکومت ظلم کرتے ہوں اور قوانین وضوابط شرعیہ کو توڑتے ہوں یا اپنی مرضی کے مطابق کہیں انہیں نافذ کرتے ہوں اور کہیں بہانے اور تاویلیں کر کے انہیں معطل کر دیتے ہوں تو بھی شرعًا اور عقلاً ہر طرح وہ نظام نظام خلافت ہی رہے گا۔

ہی رہے گا۔ ملوکیت یا کوئی دوسرا سیاسی نظام نہ ہو جائے گا کیونکہ یہ افعال

واعمال ارباب حکومت یا عمال حکومت کے ذاتی اعمال و افعال ہیں
ان کا کوئی اثر مملکت (STATE) کی نوعیت پر نہیں پڑتا نظام خلافت
افراد اشخاص حکام یا عوام کا نام نہیں بلکہ دستور شرعی و قوانین شرعیہ کا
نام ہے۔ وہ جبتک موجود ہے اسوقت تک خلافت بھی موجود ہے
اس کی ایک واضح علامت و دلیل یہ ہے کہ سربراہان مملکت اور حکام
و عمال بدلتے رہتے ہیں مگر ان کے بدلنے سے نظام خلافت نہیں بدلتا
وہ یکساں رہتا ہے۔ جیسے نظام جمہوریت ایک ایسے نظام مملکت
کا نام ہے جس کا ایک خاص دستور ہوتا ہے جس کی روح عوام کی اکثریت
کی رائے اور جمہوری ادارہ ہے جو عام طور پر مشہور و معروف ہے اس
میں جو قوانین نافذ ہوتے ہیں وہ اسی دستور پر مبنی اور جمہور کی رائے
اور ارادے کے مطابق ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات جمہوری حکومتوں میں
برسر اقتدار افراد ملک کی اکثریت کے رائے کے خلاف عمل کرتے ہیں
اور بسا اوقات حکومت کے ذی اثر افراد ملکی قوانین کی خلاف ورزی
کرتے ہیں۔ الیکشن میں دھاندلیاں بھی ہوتی ہیں ظلم و جبر بھی ہوتا ہے،
مختصر یہ کہ حکومت اور حکام کی طرف سے اصول جمہوریت کی خلاف
ورزی بکثرت دیکھنے میں آتی ہے۔

لیکن باوجود اس کے علم سیاست سے واقفیت رکھنے والا یہ
نہیں کہتا اور نہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکومتیں جمہوری نہیں ہیں یا ان میں جمہوریت
ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بادشاہت یا ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی ہے۔ علیٰ ہذا
اگر بادشاہت میں بادشاہ عوام کے نمائندوں اور قائدین سے مشورہ
کا التزام کرے اور ہر امر کا فیصلہ ان کی رائے سے کرے تو بھی وہ نظام
بادشاہی نظام ہی رہتا ہے جمہوری نہیں ہو جاتا جمہوری اسوقت ہو گا جب

اس کا دستور .... بدل کر جمہوری بنا دیا جائے۔
حضرت بلقیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قصہ قرآن مجید مذکور ہے وہ ارکان مملکت سے مشورہ فرماتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امور سلطنت میں مشورہ کرنا ان کی عادت تھی ان کے فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی لیکن باوجود اس کے قرآن مجید میں ان کا پورا واقعہ پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوریٰ اور جمہور کی رائے کا احترام ان کا ذاتی فعل تھا۔ دستور حکومت کا جزو نہ تھا اس سے بھی زیادہ واضح مثال فرعون کی ہے جو خدائی کا دعویدار تھا اور بالکل مطلق العنان تھا مگر امور مملکت میں مشورہ بھی کرتا تھا تو کیا اس کی حکومت جمہوری کہی جا سکتی ہے؟ اس توضیح کے بعد مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ جس طرح حضرات خلفائے راشدین کی مملکت خلافت تھی اسی طرح ان کے بعد کی اموی اور عباسی خلافت بھی خلافت ہی تھی اگرچہ خلافت راشدہ کے درجہ کی نہ تھی مگر تھی خلافت ہی اسے ملوکیت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خلافتیں ابتدا سے لے کر اپنی انتہا تک خلافتیں ہی رہیں۔
علماء و مؤرخین اسلام نے انہیں خلافت ہی کے نام سے موسوم کیا ہے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ خلافت نہ رہیں تھیں بلکہ کوئی دوسرا نظام بن گئیں تھیں۔
علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ نے اس پورے زمانہ کی تاریخ لکھی اس کا نام تاریخ الخلفاء رکھا۔ اور جملہ اموی و عباسی حکمرانوں کو خلیفہ ہی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ علامہ ملا علی قاری ابن کثیر، ابن خلدون وغیرہ جملہ علماء و مؤرخین یہی لکھتے چلے آتے ہیں۔ اس اصولی بات کے سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا آسان ہو جاتا ہے کہ مودودی صاحب نے اموی و عباسی خلافتوں کی مذمت

میں جو اپنی زیر نظر کتاب کے صفحات سیاہ کیے ہیں اور ان میں جو الزام ان
خلفاء پر لگائے ہیں۔ وہ واقعہ کے لحاظ سے تو بالکل غلط ہیں لیکن اگر ان
بہتانات کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ خلافتیں خلافتیں ہی رہتی ہیں
ان کی نوعیت نہیں بدلتی قصور افراد کا ثابت ہوتا ہے نہ کہ نظام حکومت
کا نظام خلافت اور دستور اسلامی خلافت ہی کا دستور رہا ہے۔ اس پورے
دور میں ممالک محروسہ میں قوانین شرعیہ نافذ رہے اس کے بعد یہ کہنا کہ
خلافت نہ رہی تھی روز روشن میں طلوع آفتاب سے انکار کرنا ہے۔ اللہ
تعالیٰ کی قدرت کہ خود مودودی صاحب متوفی کو ایک موقع پر مجبور ہو کر
اس حقیقت کا اعتراف و اقرار کرنا پڑا اور بادل نخواستہ اس پورے
دور اموی و عباسی کو دور خلافت اور اس دور کے حکمرانوں کو خلفاء کہنا
پڑا موصوف کا وہ اقرار و اعتراف درج ذیل ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ کسی نے
موصوف سے سوال کیا کہ جب دور خلافت صرف تیس سال باقی رہا اس
کے بعد اب تک واپس نہ آسکا تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ عملاً ممکن نہیں پھر ایسے
نظام کے لئے کوشش و محنت فضول ہے جو عملی نہ ہو بلکہ محض مثالی۔
(IDEAL) ہو اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

"لیکن یہ تاریخ کے نہایت ناقص مطالعے کا نتیجہ
ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحیح اسلامی نظام صرف
تیس سال ہی قائم رہا سیاسی بصیرت کی کمی کی
وجہ سے اشخاص کی تبدیلی اور نظام کی تبدیلی میں
لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ دونوں باتوں میں
زمین آسمان کا فرق ہے۔ خلافت راشدہ کے
خاتمہ کے بعد جو تبدیلی واقع ہوئی وہ کانسٹی

ٹیوشن کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اشخاص و افراد کی
تبدیلی تھی ملک کا قانون وہی رہا حکومت کا
دستور وہی رہا تعزیرات خدا کی قائم کی ہوئی
تھیں حدود اللہ مقرر کیے ہوئے تھے جائیدادیں
قرآن کے بنائے ہوتے قاعدے کے مطابق تقسیم
ہوتی تھیں صرف اس نظام کے چلانے والے
افراد میں یہ تبدیلی ضرور ہوگئی تھی کہ وہ صدیق اکبرؓ
اور فاروق اعظمؓ کی طرح متقی اور خدا ترس نہ
تھے تاہم ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہ
تھا کہ وہ خدا کے قانون کی جگہ اپنا قانون چلا دے
ان میں سے اگر کوئی شخص خدا کے کسی حکم کی ذمہ
داریوں سے بچنا چاہتا تھا تو اسکو طرح طرح کے
مذہبی حیلوں سے کام لینا پڑتا تھا خدا سے علانیہ
بغاوت ان میں سے بدتر سے بدتر آدمی بھی کرنیکی
جرأت نہ کرتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعد کے
زمانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب مسند خلافت
پر کوئی خدا ترس اور متقی انسان آگیا تو دفعتہً
شب وروز کے اندر دنیا میں وہ بہار آگئی جو فاروق
اعظم کے زمانہ میں آئی تھی اور ایسا معلوم ہونے
لگا کہ گویا نظام حکومت میں سرے سے کوئی خرابی
پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعہ بھی ہے کہ
دراصل نظام کے اندر کوئی بنیادی خرابی جس

کی اصلاح درکار ہو پیدا ابھی نہیں ہوئی تھی صرف اوپری خرابیاں پیدا ہوتی تھیں جو معمولی تبدیلی سے درست ہوجاتی تھیں اس طرح کی اصلاح کے دور اسلامی خلافت پر بار بار آئے اور جبتک اس کی بنیاد میں خرابی نہیں پیدا ہوئی یعنی خدا کی حکومت کی جگہ طاغوت کی حکومت نہیں قائم ہوگئی اس وقت تک دنیا میں خلافت راشدہ کی برکتوں کا دور بار بار آتا رہا اور اب بھی اس کے لئے جد و جہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں ہماری مدد کیوں نہ فرمائیگا ،،

روداد جماعت اسلامی حصہ سوم ۴۵-۱۹۴۴ء ص ۲۴۲

مرتبہ شعبہ تنظیم جماعت ۔ شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان

(اچھرہ لاہور۔ پنجاب)

مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت میں بھی قدرے اختصار کے ساتھ یہی اقرار کیا ہے اموی و عباسی ادوار خلافت کے متعلق لکھتے ہیں،

" اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے ۔،،

(ص ۲۰۲ زیر عنوان سیاسی قیادت)

مودودی صاحب کے اس بیان پر کسی تبصرے کی احتیاج نہیں انہوں نے صراحت کے ساتھ اموی و عباسی خلافتوں کے نظام کو نظام خلافت تسلیم کیا ہے اور وہی کہا ہے جو ہم نے لکھا ہے۔ پھر معلوم نہیں کن وجوہ سے ان کی رائے بدل گئی اپنے زیر بحث سوال کا جواب خود انہوں نے دیدیا ہے اور وہ وہی ہے جو ہم نے دیا ہے یہاں ہمیں اتنی بات ضرور کہنا ہے کہ انہوں نے اوپری خرابیوں کا جو تذکرہ کیا ہے وہ خلاف واقعہ ہے۔

حضرت معاویہ رضہ کے مبارک دور تک تو خلافت راشدہ کا دور تھا جو بہت مبارک اور مثالی دور تھا۔ ان کے بعد اموی و عباسی خلافتوں میں وہ بات نہیں رہی ان میں دور خلافت راشدہ کی برکتیں اور خوبیاں نہیں تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں دونوں میں بہت فرق تھا مگر یہ فرق خوبیوں اور برکتوں کی کمی بیشی کا تھا اس بنا پر نہیں تھا کہ ان میں کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان میں خوبیوں کی کمی ہو گئی تھی خرابیاں نہیں پیدا ہوتی تھیں نہ اوپری اور نہ گہری۔ خوبیوں کی کمی سے خرابیاں پیدا ہونا لازم نہیں آتا مٹی کے پیالے میں وہ خوبیاں نہیں ہوتیں جو چینی کے پیالے میں ہوتی ہیں مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ مٹی کے پیالے میں خرابیاں ہوتی ہیں کوئی خرابی اس میں بھی نہیں البتہ کاسۂ چینی کی خوبی سے وہ محروم ہے

جواب سوال ۱۴

خلافت راشدہ یا خلافت علی منہاج النبوت کی اصل خصوصیات اوپر مذکور ہو چکیں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ خصوصیتیں ایسی تھیں جن کا بعد کی کسی دوسری خلافت میں پایا جانا ممکن ہی نہیں لیکن ان خصوصیات کے فقدان سے خلافت کی ماہیت نہیں بدل جاتی نہ کوئی خلافت ملوکیت بنجاتی ہے۔ یہ خصوصیتیں

نفس نظام خلافت کے شرائط یا اوصاف لازمہ نہیں ہیں یہ تو وہ فضائل و کمالات ہیں جنہوں نے اس خلافت کو خلافت راشدہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے تمغہ افتخار کا مستحق ٹھہرایا بعد کی خلافتیں بھی خلافتیں ہی تھیں البتہ ان کا درجہ خلافت راشدہ کے برابر نہ تھا بلکہ اس سے بہت فروتر تھا۔

لیکن نفس خلافت کی جو خصوصیتیں ہیں وہ ان سب خلافتوں میں موجود تھیں اس لئے انہیں ملوکیت کہنا ان پر بہتان وافتراء ہے۔ سوال کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم کی گئی ہے کہ جس نظام حکومت میں خلافت راشدہ کی خصوصیات نہ پائی جائیں وہ ملوکیت ہے یہ مفروضہ خود سراسر غلط اور بے بنیاد ہے ہم اس بحث کی ابتداء ہی میں سوالات پر تبصرے کے دوران واضح کر چکے ہیں کہ کسی نظام حکومت کے خلافت راشدہ نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نفس خلافت کے حدود سے نکل جائے خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رض کا دور ختم ہونے کے بعد خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ نہیں باقی رہی۔ مگر نفس خلافت علیٰ منہاج الشریعۃ بدستور باقی رہی اور صدیوں تک باقی رہی ان خلافتوں کو ملوکیت شیعوں اور یہود کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا۔

جواب سوال ۵

تیسرے سوال کا جو جواب دیا جا چکا ہے اس کے بعد اس سوال کے جواب کی کوئی احتیاج باقی نہیں رہتی بلکہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ ان کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد متصلاً جو خلافتیں قائم ہوئیں یعنی اموی و عباسی خلافتیں وہ درحقیقت خلافت تھیں یا ملوکیت اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ وہ خلافتیں تھیں اور وہ کسی مرحلے پر بھی

ملوکیت نہیں بنیں۔ اس لئے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ ملوکیت نہیں آئی اس کے بعد یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ملوکیت کیسے اور کن اسباب سے آئی۔

جواب سوال ۶ تیسرے سوال کے جواب کے بعد اس سوال کے جواب کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بس اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرحلے پر بھی نہیں آئی جو مدعی ہو وہ ثبوت کے ساتھ بتائے کہ خلافت فلاں مرحلے پر ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

جواب سوال ۷ سوال سوم کے مذکورہ بالا جواب کے بعد یہ سوال بھی خود بخود ختم ہو جاتا ہے زیر بحث حکومتیں خلافت تھیں ملوکیت نہیں تھیں انہیں ملوکیت فرض کر کے ان کے اور خلافت راشدہ کے درمیان فرق تلاش کرنا یا دونوں کے درمیان کسی فرق کی وجہ سے انہیں ملوکیت کہنا مغالطہ انگیز بلکہ گمراہ کن غلطی ہے۔ اس فرق سے صرف اتنا لازم آتا ہے کہ ان خلافتوں میں سے کسی کو خلافت راشدہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ انہیں خلافت بھی نہ کہا جائے بلاشبہ یہ سب خلافتیں تھیں اور نفس نظام خلافت کی برکتوں سے مالا مال تھیں ملوکیتیں نہیں تھیں۔

جواب سوال ۸ سوال مبہم اور ابہام کی وجہ سے مغالطہ انگیز ہے اس جگہ ملوکیت سے انکی مراد کیا ہے؟ انہیں اسکی وضاحت کرنا چاہیئے تھی اسلام نے نظام خلافت کی تعلیم دی ہے اور وہ اسے مطلوب بھی ہے لیکن نظام خلافت کی شکلیں بھی مختلف ہیں اس اختلاف و اتحاد کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات

میں مناسب موقع پر کی جائے گی مودودی صاحب نے ملوکیت کی جو توضیح و تشریح کی ہے اس کی رد سے تو خلافت کی بعض شکلیں بھی ملوکیت میں داخل ہو جاتی ہیں حالانکہ فی الواقع وہ ملوکیت نہیں ہیں بلکہ خلافت ہی ہیں اور شرعاً مطلوب بھی ہیں ان کے بارے میں سوال مذکور سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا اس لئے ضرورت اس کی تھی کہ وہ ملوکیت کی تفصیل و توضیح کر کے اس کی متعین صورتوں اور شکلوں کے متعلق سوال کرتے۔ سوال کے اس ابہام سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ نظام جو متعارف نظام خلافت سے مختلف ہو ملوکیت اور غیر مطلوب ہے۔ حالانکہ یہ کلیہ قطعاً غلط ہے اور کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں تاہم ان کے مجمل اور مبہم سوال کا ہم اجمالی مگر کلی اور قطعی جواب دیتے ہیں۔

بلاشبہ اسلام نے نظام خلافت کی تعلیم دی ہے اور وہ اسے مطلوب بھی ہے۔ اور مودودی صاحب کا اصطلاحی نظام ملوکیت اسلام کو مطلوب نہیں ہے مگر غیر مطلوب کے معنیٰ ممنوع حرام اور مبغوض نہیں ہیں اگر ملوکیت قائم ہو جائے مگر شریعت مقدسہ نے نظام خلافت کے قیام کے جو مقاصد مقرر فرمائے ہیں وہ حاصل ہو رہے ہوں احکام شرعیہ نافذ ہوں اور عام مسلمانوں کی اکثریت اس ملوکیت کو گوارا کرنے پر تیار ہو تو اسے تبدیل اور اس میں انقلاب لانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسلام کے نزدیک حکومت کی شکل کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ اگر وہ خلافت کی شکل سے مختلف ہو تو اسے بدلنا لازم و واجب ہو۔ یا صرف اس اختلاف شکل کی وجہ سے اسلام کے نزدیک وہ نظام حکومت ناپسندیدہ ہو جائے لیکن اگر صورت مذکورہ سے مقاصد حکومت اسلامیہ نہ حاصل ہو رہے ہوں تو شرعاً جمہور اہل اسلام پر اسکی اصلاح کرنا واجب ہے آئینی طریقوں سے اسے بدلنے کی کوشش

بھی جائز ہے[1] لیکن تشدد کا استعمال اور خروج بالسیف قطعاً ناجائز اور حرام ہے خواہ اس سے کسی دوسرے فتنہ کا اندیشہ ہو یا نہ ہو تشدد اور مسلح جنگ کر کے اسے بدلنے اور اس میں انقلاب لانے کی کوشش کرنا فسادٌ فی الارض اور حرام ہے قابل برداشت ہونے کو خوف فتنہ سے مقید کرنا غلط ہے تشدد کے ذریعہ انقلاب کی کوشش ہر حالت میں حرام ہے عظیم تر فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو ،

تذییل

مودودی صاحب نے امام ابو حنیفہ قدس سرہٗ اور مذہب احناف کے متعلق جو غلط فہمی پھیلائی تھی اس کا ازالہ کیا چکا اور اس ضمن میں ایسی اصولی باتیں آگئیں جنہیں ملحوظ رکھنے کے بعد حضرت امام اعظم کے متعلق کوئی معمولی فہم کا آدمی بھی اس قسم کی کسی غلط فہمی کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ مودودی صاحب کے سوالات کا جو انکی کتاب کی جان ہیں کافی وشافی جواب بھی ہو چکا ہے اس کے آگے

[1] جلسوں اور جلوس کے ذریعہ احتجاج آئینی ذرائع میں داخل ہے بشرطیکہ پرامن اور تشدد سے پاک ہو احتجاج کا جو طریقہ آج کل رائج ہو گیا ہے یعنی توڑ پھوڑ، آتش زنی، پتھراؤ وغیرہ تشدد اور ہنگامہ آرائی یہ شرعاً زیر بحث مسئلہ میں بالکل ناجائز اور حرام ہے مودودی صاحب کی نام نہاد جماعت اسلامی اس پرتشدد احتجاج نا روا میں دوسری سیاسی پارٹیوں سے پیچھے نہیں بلکہ چند قدم آگے رہتی ہے

کچھ لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ خلافت وملوکیت کے زہر کو مارنے کے لئے جسقدر تریاق کی ضرورت تھی وہ پیش کیا جا چکا تھا۔ حضرت معاویہ رضؓ کے عہد خلافت تک مباحث اظہار حقیقت جلد اوّل وثانی میں آچکے ہیں اور جن اعتراضات ومطاعن کا تعلق اس زمانے سے ہے ان کا اطمینان بخش اور مسکت جواب بھی دیا جا چکا ہے اس کے بعد کے دور سے تعلق رکھنے والے اعتراضات کے جوابات دوسرے حضرات لکھ چکے ہیں اس لئے خاتم الخلفاء الراشدین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے بعد کے اموی دور خلافت اور عباسی دور خلافت پر جو اعتراضات ومطاعن مودودی صاحب نے کئے ہیں انکا مستقل جواب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی لیکن یکایک بعض ایسے خیالات وافکار ذہن میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان ادوار کے متعلق لکھنے کی تحریک پیدا کی وہ خیالات محرکہ درج ذیل ہیں۔

۱:۔ اموی وعباسی خلفاء اور ان کے اعوان وانصار مظلوم ہیں سبائیوں اور حاسدوں نے ان پر غلط اعتراضات کئے جھوٹے الزام لگائے بہتان وافتراء کیا انکے دینی خدمات اور ملی کارناموں کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی یہ ظلم ان پر صدیوں سے ہو رہا ہے، مظلوم کا حق ہے کہ اس کی نصرت کی جائے اس لئے ان کی طرف سے دفاع کر کے اصل حقیقت ظاہر کرنا بھی واجب علی الکفایہ اور عمل خیر ہے جس پر ثواب آخرت کی امید کی جا سکتی ہے۔

۲:۔ جس طرح صحابہ کرام رضؓ اپنے بعد کی پوری امت کے محسن ہیں اسی طرح اموی وعباسی خلفاء اور ان کے اعوان اور اس دور کے قائدین امت بھی اپنے بعد آنے والی پوری امت کے محسن ہیں

کیونکہ انہوں نے دین اسلام اور ملت اہلسنت والجماعت
کی حفاظت اور اشاعت کی دعوتِ اسلام اکناف عالم میں پھیلائی
اور دین اسلام کے لیے خدمات انجام دیئے جن کے بغیر دین حق
ہم تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ان کے مخلصانہ خدمات اور احسانات
ناقابل فراموش ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اپنے محسنوں کی طرف
سے دفاع کیا جائے اور ان پر جو بہتان و افتراء کیا گیا ہے اسکی حقیقت
ظاہر کی جائے یہ بھی خیال ہوا کہ جزئی طور پر ان غیر واقعی اعتراضات
اور الزاموں کے جوابات اگرچہ دیئے جا چکے ہیں اور یہ خدمت دوسرے
حضرات باحسن وجوہ انجام دے چکے ہیں مگر اس پوری فہرست
مطاعن و اعتراضات پر اگر ایک اجمالی تبصرہ کر دیا جائے اور ایسی اصولی
باتیں قاری کے سامنے لائی جائیں جنہیں پیش نظر رکھنے کے بعد
وہ خود اس قسم کے جملہ اعتراضات و مطاعن کی حقیقت اور
ان کی کمزوری سے واقف ہو سکے تو انشاء اللہ بہت مفید ہو گا۔
ایک اثر انفرادی اور جزئی حیثیت سے فرداً فرداً ہر طعن کا ہوتا
ہے جو فرداً فرداً ہر اعتراض کے جواب سے زائل ہو جاتا ہے
مگر جب متعدد امور کو خواہ وہ مطاعن ہوں یا مدائح مجتمع کر کے پیش
کیا جاتا ہے تو مجموعے کا ایک مستقل اثر ہوتا ہے اور بعض کمزور
ذہن کے افراد اس سے اتنا متأثر ہوتے ہیں کہ جزئی جوابات
کی طرف پوری توجہ نہیں کرتے اور انہیں پڑھنے سے اگرچہ وہ
لاجواب ہو جاتے ہیں مطاعن کو غلط بھی سمجھنے لگتے ہیں مگر باوجود
اس کے تاریخ اسلام کی وہ قدر و عظمت جسکی وہ مستحق ہے ان
کے دل میں نہیں پیدا ہوتی اور اس کے محاسن، خصائص اور

امتیازات کا ادراک ان کے لئے دشوار ہوتا ہے ان امور کے پیش نظر مودودی صاحب نے پورے دور اموی و عباسی پر جو مطاعن وارد کیئے ہیں ان پر انشاء اللہ ایک اجمالی تبصرہ پیش کیا جائے گا۔
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مبحثوں کے عنوانات و موضوعات کی ایک مجمل فہرست بحث شروع ہونے سے پہلے پیش کر دیجائے تاکہ ذہن موضوع سے مالوس ہونے کی وجہ سے تفصیلی بحثوں میں بھی اجنبیت کے بجائے انس محسوس کر کے انہیں آسانی کے ساتھ سمجھ لے۔
حصہ اول کے مباحث مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت پیش کیئے جائینگے۔

عا ۱:۔ یہود اور سبائیوں کی طرف سے تاریخ کو تاریک بنانے کی کوشش اور اس کے لئے ان کا مخصوص طریق کار
ع۲ :۔ تاریخ سے استخراج نتائج کا سبائی طرز
ع۳ :۔ سبائیوں کے مجموعہ اعتراضات مبینہ اور ان کے مبینہ نتائج کے غلط ہونے کا قطعی ثبوت شرعی و تاریخی دلائل سے۔
ع۴ :۔ ہماری تاریخ ہر طرح قابل ستائش و تحسین و تابندہ اور بے نظیر ہے دنیا کی کوئی قوم ایسی بلند پایہ اور قابل تحسین تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔

مباحث حصہ دوم کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

ع۱ :۔ اسلامی نظام کی حقیقت، اقامت مملکت کا کیا کوئی خاص طریقہ اسلام نے مقرر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ کیا ہے؟
ع۲ اگر اسلام کے مقرر کردہ طریقے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے کوئی حکومت قائم ہو جائے تو کیا وہ ناجائز حکومت ہوگی؟

اور کیا اس میں انقلاب پیدا کر کے صحیح طریقے سے حکومت قائم کرنا واجب ہے؟ اگر ہے تو کس پر؟

۳ :۔ اگر انقلاب کرنا واجب ہے تو کیا اس کے لئے بشرط ضرورت تشدد اور تلوار سے کام لینا واجب ہے یا جائز ہے؟ یا اس کے لئے صرف آئینی ذرائع کا استعمال جائز ہے؟

۴ :۔ مسلمانوں میں بادشاہی کی ابتداء کب سے اور کیسے ہوئی۔؟

اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے متعلق سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں نے بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، اور ان الفاظ کے ساتھ بہت سے غلط تصورات وابستہ ہو گئے ہیں انہیں صاف کر کے ان کی حقیقت اور ان کے شرعی معنیٰ کی وضاحت بھی انشاء اللہ اس تذییل میں کیجائیگی۔ کیونکہ اول تو ان مسائل کا علم دوسرے مسائل شرعیہ کیطرح خود بھی مطلوب ہے دوسرے یہ کہ ان مسائل واحکام کا عقائد کے ساتھ قوی ربط ہے اور اس کتاب لکھنے کا اصل مقصد اصلاح عقائد ہی ہے اس کے علاوہ جو تاریخی واقعات و مسائل ہمارے ابحاث کا موضوع ہیں ان سے بھی ان موضوعات کو قوی تعلق

۱؎ جماعت اسلامی تو اس قسم کے غلط تصورات کو پھیلانے میں مصروف تھی ہی چند سال سے پاکستان میں اسلامی نظام کا پرانا نعرہ لگا کر اک نئی جماعت پیدا ہوئی ہے وہ بھی اسلامی نظام کی غلط تشریح کرنے میں مودودی صاحب کے نقش قدم پر چل رہی ہے اور جماعت اسلامی کی مخالف ہونے کے باوجود ان غلط تشریحات میں اس کی ہم آہنگ ہے ان غلط تشریحات کی اشاعت کر کے اور انقلاب کی دعوت دے کر مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلاء کر رہی ہے۔

در لبط ہے۔ ان سب امور کے پیش نظر ان مسائل کی بھی ضروری توضیح پیش کرنا مناسب بلکہ ایک حد تک ضروری معلوم ہوتا ہے اس تفصیل کے پیش نظر تذییل کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اوّل میں اسلامی تاریخ پر تبصرہ ہے۔

حصہ دوم اسلامی نظام کے متعلق بحث ہے۔ جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی إن أُرِيدُ إِلَّا الإِصلاحَ مَا استَطَعتُ وَمَا تَوفِيقِي إِلَّا بِاللهِ عَلَيهِ تَوَكَّلتُ وَإِلَيهِ أُنِيبُ۔
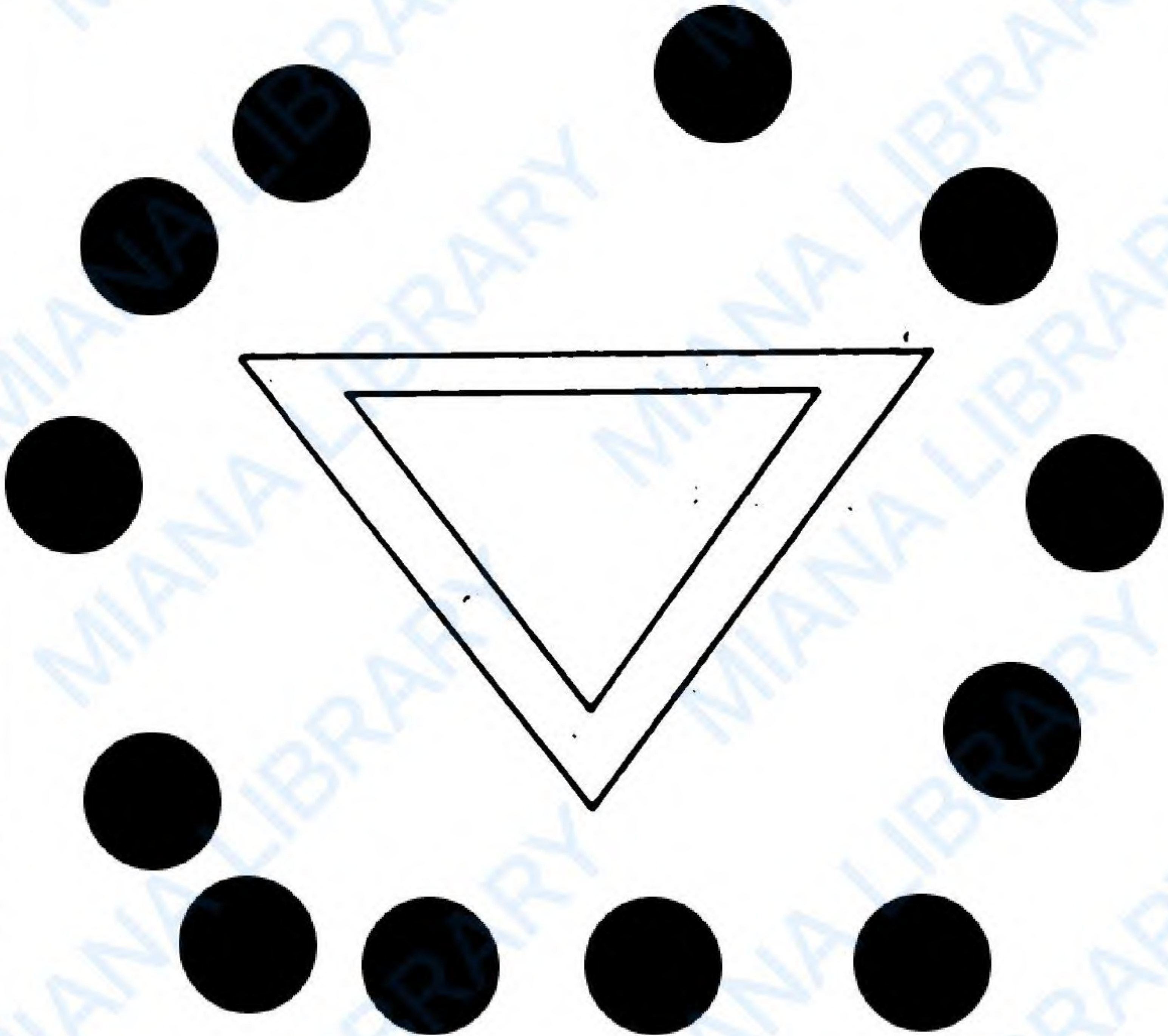
حصہ اوّل

اسلامی تاریخ پر ایک اجمالی نظر و تبصرہ

مبحثِ اوّل

یہود اور سبائیوں کی طرف سے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے کی کوشش — اور — اُن کا طریق کار

کسی قوم کے عروج کو زوال سے بدلنا ہو تو اسکا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ کو تاریک بنا دیا جائے۔ ماضی کے ذخیرے سے جو قوت اُسے حاصل ہو رہی ہے اس کی رسد بند ہو جائے گی ذہنی قوتوں کی شادابی جاتی رہے گی اور اخلاقی قوت کو جذبۂ خود حقارتی پامال کر دے گا۔ اس کی ایک زندہ اور نمایاں مثال ہندوستان کی اچھوت قومیں ہیں۔ جو آرین ہندوؤں کے آنے سے پہلے متمدن اور صاحب اقتدار تھیں۔ ہندوؤں نے ان پر غالب آکر ان کی تاریخ بدل دی اپنے اسلاف کو دیوتا اور ان کے اسلاف کو راکشش یعنی شیطان مشہور کیا اور بہت سے معائب و خبائث ان کی طرف منسوب کر دیئے۔ اس یکطرفہ پروپیگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ اچھوت خود بھی اپنے آپ کو ذلیل و حقیر اور مستحق تحقیر و تذلیل سمجھنے لگے اور انتہائی

پستی میں پہنچ گئے۔

یہود کو جو دشمنی اور عداوت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہے وہ محتاج بیان نہیں شیعیت یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کی بنیاد ہی اسلام یعنی مذہب اہلسنّت اور سنیوں کی عداوت پر رکھی گئی ہے ان دونوں نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور اسے تاریک بنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے یہ بالکل طبعی بات ہے جس قوم کے قومی مزاج میں کسی دوسری قوم کی عداوت و دشمنی داخل ہوجائے تو یقیناً وہ اس کی تاریخ کو بگاڑنے کی کوشش کرے گی۔ اگر ہم انکے تصانیف و تالیفات اور روایات پر اعتماد کریں تو یہ ہمارا تصور ہے یہود اور شیعوں نے ہماری تاریخ پر کس طرح کولتار پھیرا ہے اس کا مفصل بیان تو بہت طوالت چاہتا ہے۔

اس وقت تو ہم صرف اتنی بات دکھانا چاہتے ہیں کہ سبائیوں نے اسلامی تاریخ کو بیان کرنے میں طرز بیان بھی اپنے مقصد مذکور کو سامنے رکھ کر اختیار کیا ہے اس مخصوص طرز بیان کا ایک کامل نمونہ مودودی صاحب کا طرز نگارش ہے جو انہوں نے اپنی زیر نظر کتاب "خلافت و ملوکیت" میں اختیار کیا ہے یہ طرز بیان موصوف کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ شیعوں اور متشیعین کا جنہیں ایک بزرگ نے گلابی شیعہ کا لقب دیا تھا عموماً یہی طرز و طریقہ ہے

تاریخ نگاری میں سبائی طرز کے خصوصیات

اول:

مودودی صاحب نے باب پنجم میں "خلافت و ملوکیت کا فرق" کے عنوان سے وہ مطاعن و اعتراضات جمع کئے ہیں جو شیعہ عموماً اموی و عباسی دورِ خلافت پر کیا کرتے ہیں۔ اسلوب بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ انداز مؤرخانہ

نہیں بلکہ خطیبانہ اختیار کیا گیا ہے پورا زور بیان و بلاغت ان ادوار کو بھیانک بنا کر پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے بطور نمونہ یہ عنوانات ہی ملاحظہ ہوں "آزادی اظہار رائے کا خاتمہ" "عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ" ان دونوں عنوانوں پر غور کیجئے انہیں دیکھ کر اسلامی خلافت کے بجائے کسی کیمونسٹ اسٹیٹ کا تصور قائم ہوتا ہے جہاں ظلم و ستم کا دور دورہ ہو اور عوام قیدیوں اور غلاموں کی طرح رہتے ہوں۔ یہ سب بقول مودودی صاحب ملوکیت کے اثرات تھے اور خلافت ختم ہو چکی تھی مگر یہ بات تعجب خیز ہے کہ موصوف نے پوری کتاب میں ملوکیت کی کوئی جامع تعریف نہیں فرمائی ہے۔ نہ کہیں یہ واضح کیا ہے کہ ملوکیت سے ان کی مراد کیا ہے؟ صرف آثار سے تو کسی چیز کی حقیقت و ماہیت تک پہنچ جانا ضروری نہیں یہ ابہام شاید اسی لئے رکھا گیا ہو کہ ہر کام جو اموی و عباسی دور میں ہوا ہو اسے ملوکیت کا اثر کہہ کر اس کی مذمت کی جا سکے ہمارے اس خیال کی تائید زیر نظر کتاب میں بعض مبینہ واقعات سے ہوتی ہے مثلاً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں جناب مصنف نے ص۲۶۳ پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ امیر المومنین منصور رح نے موصل کے اہل ذمہ سے جو بار بار عہد شکنی کر کے فساد اور بغاوت کرتے رہتے تھے توثیق عہد کے لئے یہ عہد لیا تھا کہ اگر ہم آئندہ بغاوت کریں تو ہمارا خون اور ہمارا مال امیر المومنین کے لئے مباح ہو گا ان لوگوں نے اس کے بعد بھی عہد شکنی اور بغاوت کی امیر المومنین نے امام اعظم رح سے اور بعض دوسرے فقہاء کرام سے مشورہ کیا کہ کیا حسب معاہدہ ان لوگوں کو قتل کر دینا اور ان کا مال ضبط کر لینا حکومت کے لئے جائز ہے؟

فقہاء سے مشورہ کرنا بہت اچھی بات ہے جناب مصنف نے اُسے ان کے معائب میں شمار کیا ہے اور اسے مبہم ملوکیت کے ساتھ وابستہ

کر کے اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ گویا وہ علماء پر دباؤ ڈال کر مذکورہ بالا باغی کفار کے قتل اور ان کے مال کی ضبطی کے جواز کے لئے ان کی تائید حاصل کرنا چاہتے تھے سچ ہے :۔

ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبیست

یہ بھی پیش نظر رہے کہ امیر المؤمنین منصور رحمنے امام ابوحنیفہ رح کی رائے پر عمل کیا اور ان سب باغیوں کو معاف کر دیا نہ کسی کو قتل کیا اور نہ کسی کا مال ضبط کیا۔

مودودی صاحب نے خلافت عباسیہ کو ملوکیت کہدیا ہے اور ملوکیت میں خیر کجا؟ اس لئے ان کے لئے یہ بہت آسان ہو گیا کہ ان خلفا کے ہر عمل کو خواہ وہ کتنا ہی اچھا ہو برائی اور عیب بنا کر پیش کر دیں۔

دوم | اسی کے مشابہ عیب آفرینی کے ایک دوسرے آرٹ کا تذکرہ بھی خالی از فائدہ نہیں بعض صورتوں میں کوئی بات فی نفسہ معیوب ہو یا نہ ہو اس کا کوئی ایسا محرک اور سبب اپنی طرف سے گھڑ کر ظاہر کیا جاتا ہے جو مذموم اور قابلِ اعتراض ہو اموی اور عباسی ادوار پر طعن و طنز کرنے میں سبائیوں نے اس یہودی آرٹ سے کام لیا مثلاً مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔ "حجاج بن یوسف نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب کے سوا کوئی شخص نماز میں امام نہ بنایا جائے"۔

ص ۱۷۰

اس حکم کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اور واقعتاً یہی تھی کہ عجمیوں میں اس وقت تک صحیح مخارج و صفات کے ساتھ قرآن مجید کی قرأت کرنے والے اقل قلیل بمنزلۂ معدوم تھے حجاج بن یوسف کو قرآن مبین کے ساتھ جو شغف تھا اور انہیں جس قدر اس کی اشاعت و حفاظت کی فکر تھی وہ مشہور

ومعروف ہے جس کا انکار ان کے دشمن بھی نہیں کرسکتے کیا یہ ممکن نہیں کہ اس حفاظت اور صحت قرأت کی ترغیب کے لئے انہوں نے یہ حکم جاری کیا ہو؟ اور واقعہ یہی ہے کہ اس حکم کی یہی وجہ تھی جو یقیناً قابل تعریف ہے مگر مودودی صاحب اور ان کے ہم مذہب اس کی توجیہہ نسلی و قومی عصبیت سے کرتے ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے مذموم و معیوب ہے خلافت و ملوکیت کے زیر بحث صفحات میں جناب مصنف نے بقول تو اموبوں و عباسیوں اور ان کے عمال کے ایسے واقعات و احوال تبعداد کثیر جمع کردیئے ہیں جو شرعًا و اخلاقًا ہر طرح مذموم اور قابل نفرت ہیں ہمیں سردست ان کی صحت و غلطی سے کوئی بحث نہیں۔ا

اسوقت تو ہمارا موضوع بحث یہ ہے کہ جناب مصنف نے اس مجموعۂ مطاعن میں ان کی تعداد و تاثیر میں اضافہ کرنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کیئے ہیں اور کن فن کاریوں سے کام لیاہے اس قسم کے دو آرٹ کا تعارف تو اوپر گذر چکاہے تیسرے کا چہرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سوم ہر مطالعہ کرنے والے کو جو غور و فکر سے کام لیتا ہو اس قسم کی داستانوں میں عیب و ہنر کے ناپنے کے دو پیمانے نظر آئینگے جس سے مخالفت اور عناد ہے اس کے کسی عمل کی مذمت کیجاتی ہے۔ مگر جب وہی عمل اپنے کسی ممدوح سے سرزد ہو تو اس کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں۔ نمونے کے لئے اس واقعے کا تذکرہ کافی ہے کہ مودودی صاحب نے بار بار اس مسئلے پر زور دیا ہے کہ تلوار کے زور سے حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی کوشش نہایت درجہ مذموم اور شرعًا ممنوع ہے۔

اس طرح جو حکومت حاصل کی جائے وہ ملوکیت اور ناجائز حکومت ہے

پھر اسی اصول کے پیش نظر حضرت معاویہؓ پر بزور شمشیر خلافت حاصل کرنے کا الزام لگا کر ان کی مذمت کی ہے اور ان کی خلافت کو ناجائز ملوکیت کہا ہے اگرچہ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضؓ پر یہ الزام بالکل غلط اور سراسر بہتان ہے انہوں نے بزور شمشیر حاصل کرنے کی کوشش تو کیا سرے سے حصول خلافت کی کوئی کوشش بلکہ اس کی خواہش بھی کبھی نہیں کی۔

اظہار حقیقت جلد ثانی میں اس کی مفصل وضاحت کی جا چکی ہے لیکن اس حقیقت واقعہ سے قطع نظر، مودودی صاحب اور ان کے ہم مشربوں کا طرز عمل یہ ہے کہ جب اس فعل کی نسبت حضرت معاویہؓ کی طرف کی جاتی ہے تو وہ لائق صد مذمت عیب ہوتا ہے۔ مگر جب یہی فعل محمد بن الارقط، ابراہیم اور زید بن علی سے سرزد ہوتا ہے تو عیب کے بجائے ہنر اور گناہ کے بجائے ثواب بن جاتا ہے ان دونوں صاحبان نے خلیفہ وقت سے بغاوت کی اور بزور شمشیر تاج خلافت چھین کر اپنے سر پر رکھنا چاہتے تھے کیا جمہور مسلمین نے انہیں منتخب کیا تھا؟ کیا کوفہ کے مٹھی بھر سبائی جنھیں جمہور اہل اسلام گمراہ بدمذہب بدکردار اور قابل نفرت جانتے تھے۔ امت مسلمہ کے نمائندے تھے؟ پھر ان کے انتخاب سے یہ جائز خلیفہ کیسے ہو گئے؟ ان کے لئے یہ کیسے جائز ہو گیا کہ حصول خلافت کے لئے جنگ اور مسلمانوں کی خونریزی کریں؟ کیا یہ حصول حکومت واقتدار اور منصب خلافت بزور شمشیر حاصل کرنے کی کوشش نہیں تھی؟۔

اس بدیہی واقعہ کے باوجود مودودی صاحب نے ان صاحبان کے اقدامات کو نہ صرف جائز کہا بلکہ جہاد سے تعبیر کر کے انہیں موجب اجر عظیم ظاہر کیا ہے۔ خلافت بزور شمشیر حاصل کرنے کی کوشش اگر عیب اور معصیت ہے تو سب کے لئے ہے ایک کے لئے اسے معصیت کبیرہ اور جرم عظیم قرار دینا

اور دوسرے کے لئے اُسے مجموعۂ محاسن اور موجب اجر عظیم بتانا بالکل خلاف صداقت و انصاف ہے اگر کوئی شخص جواب میں کہے کہ ان صاحبان نے تو جابر حکام کے خلاف عادلانہ حکومت قائم کرنے کے لئے خروج کیا تھا بخلاف اس کے حضرت معاویہ رضہ نے خلیفۂ برحق کے خلاف خروج کیا تھا اس لئے دونوں کی حیثیتوں میں فرق ہے تو مجیب کی غلط بیانی سے قطع نظر کر کے اور اس کے بیان فرق کو صحیح فرض کر کے۔ ہمارا جواب الجواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضہ کے متعلق ایسی ہی تاویل کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے فتنۂ سبائیت ورفض کو مٹانے اور خلافت سے سبائیوں کا اثر و غلبہ دور کرنے کے لئے خروج کیا تھا یہ بھی ایک جائز اور اعلیٰ مقصد تھا پھر دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے؟ واضح رہے کہ یہ جواب مجیب کی تقریر جواب کو صحیح فرض کر کے دیا گیا ہے۔ ورنہ درحقیقت ان کے سب مقدمات غلط اور خلاف حقیقت ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضہ نے خروج ہی نہیں کیا اور وہ کبھی خلافت کے طالب نہیں ہوئے۔ آں محترم پر خروج و بغاوت اور طلب خلافت کا الزام سراسر جھوٹ بہتان و افتراء ہے۔ ان صاحبان یعنی ابن الاشعث وغیرہ نے شرعاً جرم بغاوت کا ارتکاب کیا اور عاصی ہوئے ان صاحبان کا خروج محض جاہ و اقتدار کی ہوس کی وجہ سے تھا عادلانہ نظام قائم کرنے کے لئے بھی کسی مسلم حکومت کے خلاف خروج بالسیف باتفاق اہلسنت ناجائز اور حرام ہے۔ ان کے خروج کو تو مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب خیر اور عمل صالح موجب اجر کہتے ہیں اور حضرت معاویہ رضہ کے انکار اطاعت کو خروج اور معصیت بتاتے ہیں۔ یہ کتنی شدید افسوسناک اور شرمناک ناانصافی ہے۔

ان مخالفین خلافت و خلفاء کے طرز بیان میں یہ وصف نمایاں ہوتا

چہارم ہے کہ وہ عموماً ان واقعات کو جنہیں وہ بزعم خود بطور عیب اور قابل مذمت عمل کے بیان کرتے ہیں اسے اس کے سیاق و سباق پس منظر و ظروف (CONTEXT) سے الگ کرکے ذکر کرتے ہیں یہ طریقہ یقیناً دیانت داری اور صداقت کے خلاف ہے۔ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ظروف اور پس منظر کو واقعات کی صحیح قیمت متعین کرنے میں بہت دخل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک سرجن ایک شخص کی گردن کا آپریشن کر رہا ہے۔ دیکھنے والا صرف یہ بیان کرے کہ فلاں شخص فلاں شخص کی گردن کاٹ رہا تھا تو سننے والا سرجن کو قاتل اور ظالم سمجھے گا لیکن اگر وہ اس طرح بیان کرے کہ ایک سرجن اسپتال میں گردن کے پھوڑے کا اپریشن کر رہا تھا تو سننے والا اسے مریض کی خیر خواہی اور ایک قابل تحسین فعل سمجھے گا متعلقہ واقعات کے بارے میں سکوت اور ان کے تذکرے کی وجہ سے خبر کی تاثیر اور اس کی نوعیت میں کتنا فرق ہو گیا۔ مودودی صاحب نے زیر نظر کتاب میں جگہ جگہ یہی طرز عمل اختیار کیا ہے اور جن واقعات کو بطور طعن ذکر کیا ہے انہیں انکے سیاق و سباق اور پس منظر سے الگ کرکے بیان کیا ہے مثال ملاحظہ ہو مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے وہ بہر حال خلیفہ ہونا چاہتے تھے انہوں نے لڑکر خلافت حاصل کی مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا"

وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ
خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا
چارہ کار نہ تھا اس وقت اگر ان سے بیعت
نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے منصب
سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنیٰ خونریزی و
بدنظمی کے تھے۔ جسے امن و نظم پر ترجیح نہیں
دی جا سکتی تھی۔ اسی لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی
دست برداری (ربیع الاول ۴۱ھ) کے بعد تمام
صحابہ و تابعین اور صلحائے اُمت نے ان
کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو عام الجماعت
اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم
ہوئی۔" (ص ۱۵۸)

حضرت معاویہ رضؓ پر مندرجہ بالا بے بنیاد الزام لگانے کے لئے
مودودی صاحب نے وہی کارروائی کی ہے جس کی نشاندہی ہم نے اس بحث کے
آغاز میں کی ہے حضرت حسن رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کے درمیان صلح اور خلافت
سے حضرت حسنؓ کی دست برداری کے واقعہ کو اس کے گرد و پیش کے
احوال (CONTEXT) سے الگ کرکے بیان کیا ہے اس واقعہ
کے وقوع کے وقت ان دونوں حضرات کی سیاسی پوزیشن کیا تھی؟ اس
کا دکھانا لازم تھا اسے پیش نظر رکھے بغیر واقعات کی صحیح نوعیت نہیں سمجھ
میں آسکتی۔ حضرت معاویہ رضؓ اس واقعہ سے بہت پہلے منصب خلافت
پر فائز ہو چکے تھے اجتماعِ اذرح میں جمہور مسلمین کے نمائندوں یعنی اکابر
صحابہ رضؓ و تابعین نے خلافت تقسیم کرکے ایک حصہ ملک کا حضرت علی رضی اللہ عنہ

کو اور ایک حصہ کا خلیفہ انہیں بنا دیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی خلافت تسلیم کرلی تھی آں محترم نے ان سے خوارج کے معاملے میں تعاون حاصل کیا اور ان کے زیرنگیں ممالک میں مداخلت سے احتراز فرمایا اس مسئلے کو ہم اظہار حقیقت جلد ثانی میں کما حقہٗ واضح کرچکے ہیں اعادے کی حاجت نہیں۔ اس امر سے تو تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ شام و اردن وغیرہ ممالک اسلامیہ کے ایک حصے پر حکمران تھے اس صورت میں زیر بحث واقعہ کے حوالے سے یہ کہنا بداہتہً غلط ہے کہ انہوں نے بزور شمشیر خلافت حاصل کی یا اس کی کوشش کی خلافت تو انہیں پہلے ہی حاصل تھی پھر اس کے لئے کوشش کے کیا معنی ؟ اور تحصیل حاصل کا کیا مطلب ؟ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کی کبھی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی نہ بزور شمشیر اور نہ بصورت تدبیر بلکہ حصول خلافت کے لئے ان کی خواہش کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔

انکے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے منصب خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی اور بزور شمشیر یہ منصب حاصل کیا ان پر بہتان و افتراء ہے۔ اظہار حقیقت جلد ثانی میں ہم اس حقیقت کو الم نشرح کرکے سبائی پروپیگنڈے کی قلعی کھول چکے ہیں۔ [۱]

(حاشیہ) [۱] بعض حضرات کو اس میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ ایک وقت میں دو خلافتیں اور دو خلفاء کا ہونا شرعاً جائز نہیں اس لئے جب حضرت علی خلیفہ تھے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسی دور میں حضرت معاویہ رضؓ بھی خلیفہ تھے۔ اسی طرح حضرت حسن رضؓ کی دست برداری سے پہلے

اس غلط بیانی سے قطع نظر جو معترض نے بیان واقعہ میں کی ہے انہوں نے اس کے بیان میں یہ کاروائی کی ہے کہ اسے اپنے گرد و پیش کے واقعات (CONTEXT) سے الگ کر کے پیش کیا ہے اسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) موصوف کو خلیفہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا ان کی حیثیت ملک کی تھی نہ کہ خلیفہ کی چنانچہ بکثرت علماءِ اہلسنت کا مسلک یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری سے پہلے زمانہ میں حضرت معاویہؓ ایک ملک تھے تفویض مذکور کے بعد خلیفہ بن گئے اس سے پہلے وہ خلیفہ نہیں تھے اس شبہ کے جواب میں پہلے تو ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بیک وقت دو یا زیادہ خلافتوں کے انعقاد و لقا کو شرعاً ناجائز اور ممنوع کہنا ہی غلط ہے اسلام نے اس امر کو ناپسند کیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان ایک ہی خلافت سے منسلک رہیں لیکن یہ پسندیدگی ترغیب ہی کی حد تک محدود ہے حکم اور امر کے درجہ تک نہیں پہنچتی دو خلفاء کا بیک وقت نصب و تقرر صرف اس وقت ممنوع اور ناجائز ہے جب دونوں کا ملک ایک ہی ہو اور دونوں کو ایک ہی علاقہ اور رقبہ اراضی کا حکمران منتخب کیا جائے یہ صورت شرعاً و عقلاً ہر طرح ممنوع اور مکروہ ہے حدیث میں ایک خلیفہ کے تقرر کے بعد دوسرے کو خلیفہ مقرر کرنے کی شدید مخالفت وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے فَاقْتُلُوا الْآخَرَ اس کا محمل یہی ہے۔ مگر جب دونوں کے علاقے الگ الگ ہوں اور دونوں کی خلافتوں میں کسی تعارض و تصادم کا اندیشہ نہ ہو تو دو یا زیادہ خلافتوں کا قیام ممنوع نہیں ہے خصوصاً جب صرف ایک خلافت کے قیام سے کوئی مانع درپیش ہو۔

کاروائی کی رونمائی ان سطور کی تحریر کا اصل مقصد ہے اس سال و مصالحت مذکورہ کیوجہ سے عام الجماعۃ کہنے کی غلط توجیہ کرکے مودودی صاحب نے حضرات صحابہ کرام وتابعین کے اس جذبے کو جو اس کا ترشح ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شیخ عبدالقاہر بغدادیؒ (المتوفی ۴۲۹ھ) اپنی مشہور کتاب الفرق بین الفرق ص۱۳۱ (مطبوعہ مصر ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء) میں اسکی ایک صورت تحریر فرماتے ہیں۔

"وقالوا لا تصح الامامة إلا لواحد في جميع ارض الاسلام الا ان يكون بين الصقعين حاجز من بحر او عدو لا يطاق ولم يقدر اهل الصقع الاخر حينئذ يجوز لاهل الصقع عقد الامامة لواحد يصلح لها منهم"

"علماء دین کہتے ہیں کہ پوری ارض الاسلام میں صرف ایک ہی امام کی امامت جائز ہے مگر اس صورت میں (دو یا زائد کی امامت بھی جائز ہے) کہ دونوں علاقوں کے درمیان کوئی رکاوٹ ہو مثلاً سمندر یا کوئی ایسا دشمن حائل ہو کہ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے والوں کی مدد نہ کرسکیں اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی طاقت نہ ہو تو ہر علاقے کے مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے علاقہ کے کسی آدمی کو اپنا امام بنالیں جس کی تدبیر سے ان کے مصالح حاصل ہوسکیں"

تھا اور اس فکر اور رائے کو جو اس جذبہ کی رہنمائی تھی چھپانے کی کوشش کی ہے ان کی توجیہہ سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت حسن رضؓ کا یہ اقدام صلح درحقیقت ایک غلط اقدام تھا جسے ان حضراتِ صحابہ رضؓ و تابعین رحؒ نے بادل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) " متعین " کے درمیان جسطرح " بحر " کا حائل ہونا دوسری خلافت کے قیام کے لئے وجہ جواز بن سکتا ہے اسی طرح دوسرے موانع بھی وجہ جواز بن سکتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ عالمی حکومت کا قیام اگرچہ عقلاً ممکن ہے اور شرعاً بالشرط وجود مستحسن ہے لیکن عادتاً غیر ممکن ہے اسلام کا کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جس پر عمل کرنا محال عادی ہو وہ عالمی حکومت (UNIVERSAL STATE) قائم کرنے کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟ البتہ چونکہ یہ صورت عقلاً ممکن ہے اس لئے اسے مستحسن قرار دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ دو یا زائد خلافتوں کا قیام شرعاً جائز ہے اور جن صورتوں میں ناگزیر ہو ان میں مستحسن ہے علامہ ابن خلدون بھی اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں۔ خلافت واندلس و اسپین اور خلافت بغداد متوازی قائم رہیں اور دنیائے اسلام کے جمہور علماء نے اسے جائز رکھا کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ دونوں کو خلافت ہی کہتے رہے۔

اگر موجودہ حالات میں بالفرض خلافت قائم کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا جائے تو کیا کسی ایسی خلافت کا تصور کیا جا سکتا ہے جسکا دائرہ پوری دنیائے اسلام پر محیط ہو؟ ذرائع مواصلات کی سہولتوں کے باوجود نسلی، وطنی، لسانی ہر قسم کی جاہلی عصبیتیں امت میں ابھری پڑی ہیں محض تخیل کی تو بات دوسری ہے لیکن کیا عملاً کوئی ایسی خلافت قائم ہو سکتی ہے یا اگر قائم ہو جائے تو چند سال بھی

ناخواستہ صرف اسوجہ سے منظور کرلیا کہ باہمی خانہ جنگی تو ختم ہو نئی اپنی اس توجیہ سے انہوں نے حضرت حسن رضؓ کے اخلاص ان کی للّٰہیت اور قوم کے ساتھ ان کی مخلصانہ خیر خواہی و خیر سگالی کے پاکیزہ جذبات نیز ان کے تدبر کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی ہے جو بہت افسوسناک طرز عمل ہے۔ حضرت معاویہ رضؓ پر اعتراض کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لئے انہوں نے پس منظر میں تبدیلی کرکے اصل پس منظر کو اوجھل کر دیا۔

واضح بات ہے کہ حضرت حسن رضؓ جو خلافت سے حضرت معاویہ رضؓ کے حق میں دست بردار ہو گئے ان کا یہ فیصلہ تنہا ان کا فیصلہ نہ تھا کسی خلیفہ کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ذاتی رائے اور مرضی سے خلافت و ملک کسی دوسرے کو تفویض کردے۔ خلافت اور وہ سرزمین جس پر خلافت قائم ہے اس کی ذاتی املاک تو نہیں ہوتیں جنہیں کسی کو ہبہ کر دینے کا اسے اختیار ہو یہ حق تو جمہور مسلمین کا ہے اس لئے حضرت حسن رضؓ نے جو فیصلہ کیا وہ یقیناً جمہور مسلمین کے نمائندوں یعنی ارباب حل و عقد اور ارکان شوریٰ کے مشورے اور ان کی اجازت و تائید سے کیا ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قائم رہ سکتی ہے؟ اس وقت اگر بالفرض نظام خلافت قائم کرنا ممکن ہو تو متعدد خلافتیں قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اور اسے جائز سمجھنا ناگزیر ہے شریعت نے کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیا جس پر عمل عادتاً غیر ممکن ہو یا جو کسی فتنہ و فساد پر منتہی ہوا اگر اس دور میں اس وحدت اقتدار پر زور دیا جائے تو اس کا نتیجہ صلاح و فلاح کے بجائے فتنہ و فساد کی صورت میں نکلنے کا قوی اندیشہ قریب بہ یقین ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں ہر فہیم شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ حسب ضرورت دو یا زیادہ خلافتوں کا بیک وقت قیام شرعاً بالکل جائز ہے اسکے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بطور شرط صلح، کنفیڈریشن کی صورت بھی پیش کرسکتے تھے اور اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یقیناً منظور کرلیتے ۔ کیونکہ اس سے ان کے اقتدار میں کوئی کمی نہ آتی ۔ جن ممالک پر وہ حکمراں تھے ان پر بدستور حکمراں رہتے ۔ صرف خلیفۃ المسلین کے لقب سے محروم ہوجاتے ۔ تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی ۔ جس پر وہ اصرار کرتے ۔ وہ تو صلح کے اس قدر خواہش مند اور اتحاد بین المسلمین کے اس قدر حریص تھے کہ انہوں نے سادہ چیک پر اپنے دستخط کرکے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا تھا ۔ تو کیا وہ صرف لقب کے لئے جنگ کرتے ؟ اس کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا ۔ مگر پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے یہ صورت نہیں پیش فرمائی ؟

اس کے بعد اپنے اس الزام کے ثبوت میں مودودی صاحب نے مبینہ طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک تقریر نقل کی ہے، لکھتے ہیں :۔

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود بھی اپنی پوزیشن کو سمجھتے تھے ۔ اپنے زمانہ خلافت کے آغاز میں انہوں نے مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے خود فرمایا :

> " بخدا میں تمہاری حکومت کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے اقتدار سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے اس معاملے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے مغلوب کرکے اسے لیا ہے ——— اب تم اگر یہ دیکھو کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کررہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو ۔" ۱۰۹

○ تبصرہ :۔ مودودی صاحب نے نقل عبارت میں بھی وہی کاروائی کی ۔ ابتدائی چند سطریں نقل کرنے کے بعد انہوں نے مبینہ خطبے کی کئی سطریں چھوڑ دیں، اس کے بعد کی ڈیڑھ سطر کی عبارت نقل کردی ۔ (اس عبارت کے نیچے ہم نے خط کھینچ دیا ہے) اس کے بعد کی عبارت بالکل حذف کردی ۔ اس طرح اقتباس مذکور کو سیاق و سباق (CONTEXT) سے بالکل الگ کردیا ۔ جو شخص پورا خطبہ پڑھے وہ اس خطبے کو مودودی صاحب کے دعوے کا ثبوت کبھی تسلیم نہیں کرسکتا ۔ کیونکہ اگر واقعی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ خطبہ دیا تو یقیناً اس میں مخاطب صرف وہ سبائی گروہ ہے جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور سب مسلمانوں کے لئے درد سر بنا ہوا تھا اور خلافت اسلامیہ کا دشمن تھا ۔ اس میں بہت سے

لوگ تو اس صلح سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے ' لیکن ایک گروہ اشرار ہنوز موجود تھا ۔ یقیناً مخاطب وہی اور صرف وہی ہیں اس لئے کہ مسلمانوں پر اقتدار تو انہیں بزور صلح و اخلاص حاصل ہوا تھا نہ کہ بزور شمشیر ' اسے خلاف واقعہ بزور شمشیر کہہ کر وہ دوستوں کو مخالف کیوں بناتے ان روافض پر یقیناً انہوں نے اقتدار بزور شمشیر حاصل کیا تھا مگر صرف اپنی شمشیر سے نہیں بلکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شمشیر کی معیت و رفاقت سے ۔ انہوں نے صلح کی پیشکش کر کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو وہ قوت بہم پہنچائی جس سے کام لے کر وہ ان سبائی مفسدوں کو اپنے گرد و پیش سے دفع کر سکے ۔ جب مخاطب صرف مفسدین فی الارض سبائی تھے تو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں باقی رہتی ۔ اور مودودی صاحب کا دعویٰ اس خطبے سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا ۔

مبینہ خطبہ کی جو عبارت موصوف نے نقل کی ہے اس کی آخری سطر: " اب تم " سے " راضی رہو " تک ... ہے ۔ پہلے مبینہ خطبہ میں یہ بھی ہے کہ میں نے حضرت ابو بکر ' عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر عمل کرنا چاہا مگر اس سے خود کو عاجز پایا ۔ اس کے آخر میں ہے ۔

" اب ان جیسے لوگ کہاں ؟ اور اپنا کردار ان جیسا بنانے کی طاقت کس میں ہے ؟ یہ بہت ہی بعید ہے کہ ان کے بعد کوئی ان کے شرف و فضل کو پاسکے ۔ رحمتہ اللہ و رضوانہ علیہم "

اس کے بعد ہے کہ :

تم اگر مجھے اپنے اندر سب سے بہتر نہ پاؤ گے کم از کم اپنے حق میں بہتر ضرور پاؤ گے ۔ "

پھر بعض واقعات کو فراموش اور ان کی غلطیوں کو درگزر کرنے کے اعلان اور بحالی امن و امان کی خوشخبری دینے کے بعد آخر میں یہ ہدایت ہے :۔

" فتنہ آرائیوں سے اپنے کو دور رکھو ' اس سے زندگی فاسد ' نعمتوں کی ناقدری ' اور تباہی اور بربادی ہی حصے میں آتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مغفرت سے نوازے ۔ "

ان فقروں سے عیاں ہے کہ اگر روایت صحیح ہے تو اس خطبہ میں یقیناً مخاطب وہی سبائی تھے جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لشکر میں گھسے ہوئے تھے ' اور آں محترم کے لئے دردِ سر بنے ہوئے تھے ۔ اور یہ خطبہ بھی خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور دوسرے

صحابہ کرام کے ایماء اور مشورے سے دیا گیا ہوگا تاکہ یہ دشمنان اسلام جو شیعہ کہلاتے تھے اپنی فتنہ پردازیوں سے باز آجائیں۔

مندرجہ بالا وضاحت تو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ خطبہ مذکور کی نسبت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف صحیح اور یہ روایت ثابت ہے۔ لیکن درحقیقت یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ یہ روایت ثابت ہی نہیں۔ ابن کثیر نے بے سند ایک شاعر سے نقل کردی۔ جو نہ خود ثقہ ہے نہ کسی ثقہ سے روایت کرتا ہے۔ اپنے علم کا کوئی قابل وثوق ذریعہ بھی نہیں بیان کرتا۔ ممکن ہے کہ سبائی کذابوں سے افواہاً سنی ہو۔ خود ابن کثیر تاریخ بیان کرنے میں محتاط نہیں ہیں۔ زبان اور ادب کی رنگینی دیکھ کر انہوں نے بطور زینت کتاب نقل کردی۔ مختصر یہ کہ روایت ثابت نہیں کسی سبائی کی گڑھی ہوئی ہے۔

حضرت حسنؓ خلافت سے دست بردار کیوں ہوئے؟

سادانا حسن و معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مصالحت اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری کی تفصیل زیر تحریر باب کا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو اس باب میں صرف سبائی ارجافی (پروپیگنڈے) کی اس تکنیک (TECHNIQE) کو بے نقاب کرنا ہے جس سے وہ ہماری تاریخ کو تاریک بنانے کے لئے کام لیتے ہیں۔ اس مسئلہ میں بھی ہم نے اس کی واضح نشاندہی کی ہے ضمناً بقدر ضرورت واقعہ کی روئیداد بھی آگئی۔ اور یہ حقیقت خوب روشن ہوگئی کہ شیعی قلم نے واقعات و اخبار کو ان کے سیاق و سباق (CONTEXT) سے نکال کر ان کے معانی و اثرات میں کتنی تبدیلی کردی۔ اوراپنی ارجافی و تشہیری فن کاری سے کس طرح خوبیوں کے چہرے پر سیاہی پھیر کر انہیں عیوب بنادیا ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے کیوں دست بردار ہوگئے۔ ہمارے موضوع کے دائرے سے خارج ہے لیکن بوجوہ ذیل اس پر روشنی ڈالنا مناسب بلکہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

اول: اس بحث میں مودودی صاحب کا یہ فقرہ اوراس کو "عام الجماعت" اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی" اگرچہ مختصر سا جملہ ہے مگر فساد انگیز غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ جس کی نشاندہی ہم نے اس بحث کی ابتداء میں کی ہے۔

دوم: اس صلح اور دست برداری کے حقیقی سبب اور اصل محرک سے عموماً لوگ

ناواقف ہیں ۔ میری نظر سے کسی کتاب میں آج تک اس کا کوئی تذکرہ بلکہ اس کی طرف اشارہ تک نہیں گذرا حالانکہ حالات پر ذرا غائر نظر ڈالنے سے اس کا ادراک بہ سہولت ہوجاتا ہے ۔ اس سے واقفیت بہت مفید اور ناواقفیت موجب نقصان ہے ۔ اس لئے اس کی وضاحت لازم ہے ۔

سوم : حضرت حسن رضی اللہ عنہ ' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان دونوں حضرات کے مخلص معاونین و اہل شوریٰ کے اس عظیم حکیمانہ کارنامے کو اس طرح روشنی میں لانا کہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکے ضروری اور بہت مفید معلوم ہوتا ہے ۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر اس بحث کو سامنے لانے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ بحث کا نقطہ آغاز یہ سوال ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح کی پیش کش کیوں کی ؟ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دست بردار کیوں ہوگئے تھے ؟ پہلے سوال کا جواب تو ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حملہ آور نہیں تھے ۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ شام پر حملہ کرنے کے لئے لشکر جمع کررہے ہیں تو وہ صرف اپنے دفاع کے لئے لشکر جمع کرکے سامنے آکر کھڑے ہوگئے ۔ ان کا ارادہ حملہ کرنے یا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے زیر نگیں کسی ملک پر قبضہ کرنے کا نہیں تھا ۔ تاریخ اس کی شاہد ہے ۔ نیز ان کا صلح کی پیشکش کرنا بھی اس کی واضح دلیل ہے ۔ کیونکہ حملہ آور اور فتح کا خواہشمند صلح کی پیشکش کرنے میں پہل نہیں کرتا ۔ یہ پیشکش تو اس کی طرف سے ہوتی ہے جس پر حملہ کیا جائے ۔ اور وہ مدافعانہ جنگ بھی نہ کرنا چاہتا ہو ۔ اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ حملہ نہ کرتے تو کوئی جنگ نہ ہوتی ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ بھی نہ ہوتا ۔ اس کیفیت پر نظر کرنے سے دوسرا سوال اشکال اور معمے کی شکل اختیار کرلیتا ہے ۔ کیونکہ خانہ جنگی سے بچنے کے لئے خلافت سے دست برداری کی کوئی احتیاج قطعاً نہیں محسوس ہوتی ۔ بقاء خلافت کے ساتھ بھی مناسب شرائط پر صلح ہوسکتی تھی ۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ۔ اس کی ایک توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایک گروہ شیعہ منافقین کا تھا ' جو غدار تھے ۔ اور عین وقت پر موصوف کو دھوکہ دے دیتے ۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اپنی فساد انگیزیوں سے آں محترم کے لئے پریشانی ' نیز نظم و نسق خلافت میں خلل و فساد کا سبب بنے ہوئے تھے ۔ اس کمزوری کی وجہ سے وہ دست برداری پر مجبور ہوئے ۔ اکثر مولفین یہی وجہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مودودی صاحب نے بھی اپنے منقولہ بالا فقرے اور اسلوب بیان سے

اشارتاً یہی توجیہ پیش کی ہے۔ لیکن یہ توجیہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اس غلط توجیہہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس عظیم کارنامے' اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مخلصانہ نصرت اسلام پر پردہ پڑجاتا ہے۔ ان سبائی منافقوں کو الگ کرکے بھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس چالیس ہزار مخلص جانباز موجود تھے۔ اگر جنگ کرنا چاہتے تو کرسکتے تھے۔ جس میں ان کے غلبے کے امکانات بھی تھے وہ حضرت معاویہؓ کے مقابلے میں کمزور نہیں تھے مقابلہ برابر کا تھا۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انہوں نے شکست کے خوف یا عسکری کمزوری کی وجہ سے صلح کرلی۔

صحیح اور مطابق واقعہ توجیہہ معلوم کرنے کے لئے اس واقعہ پر اس کے ماحول اور پس منظر (PERSPECTIVE) کو سامنے رکھ کر نظر کرنا چاہئے۔ مندرجہ ذیل حوادث جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس مبارک اقدام کے دوران پیش آئے' بہت اہم ہیں۔ اور مصالحت کے حقیقی سبب و محرک کو سمجھنے کے لئے انہیں سامنے رکھنا ضروری ہے۔

جمہور و مسلمین کے نمائندوں سے' جن میں بعض حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ اور بعض حضرات اکابر تابعین' مشورہ کرکے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح اور خلافت سے دست برداری کا عزم مصمم تو کرلیا۔ لیکن ان کے لشکر میں شیعان علی و حسن رضی اللہ عنہما کے نام سے سبائی مفسدین و منافقین کی جو جماعت موجود تھی' ان کی فتنہ انگیزی کے خطرے کی وجہ سے' ان سے اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ ان کا عندیہ معلوم کرنے کے لئے ان کے سامنے یہ مسئلہ اس طرح پیش کیا کہ :۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جنگ سے پہلوتہی کررہے ہو۔ تو میں تمہیں اس کے لئے مجبور نہیں کرتا۔" 1

آپ کا اتنا کہنا تھا کہ سبائی جو شیعان حسن رضی اللہ عنہ کہلاتے تھے۔ مشتعل ہوگئے۔ اور حد سے گزر گئے چنانچہ مشہور شیعہ مجتہد و مورخ ملا باقر مجلسی اپنی مشہور کتاب **جلاء العیون** باب ۴ فصل ۵ میں لکھتے ہیں :

> "جب منافقین نے یہ کلام حضرت سے سنا ایک دوسرے پر نظر کی اور کہا کہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو معاویہ سے صلح منظور ہے اور چاہتے ہیں کہ منصب خلافت معاویہ کو دے دیں

(1) الاخبار الطوال

پس سب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ شخص اپنے باپ کی طرح
کافر ہوگیا ہے۔" (العیاذ باللہ)

یہی نہیں بلکہ عملاً ان لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ضرر پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ **جلاء العیون** کے علاوہ **الاخبار الطوال** میں بھی اسی سلسلہ میں مذکور ہے کہ:

" یہ کہہ کر بلوہ کیا اور آپ کا سب اسباب لوٹ لیا یہاں تک جائے نماز حضرت کے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لی اور چادر دوش مبارک سے اتارلی۔ پس امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا طلب کیا اور سوار ہوئے اور اہل بیت آنحضرت نے تھوڑے سے شیعوں کے ہمراہ حضرت کو درمیان میں لے لیا اور ساباط سے مدائن پہنچے، جراح بن سنان اسدی شقی نے آپ کے گھوڑے کی لگام پکڑلی اور ایک خنجر ران مبارک پر مارا کہ ہڈی تک شگاف ہوگیا اور بر ایت دیگر پہلو پر خنجر مارا اور کہا کہ " تم بھی اپنے باپ کے کافر ہوگئے۔"

حافظ ابن کثیرؒ نے بھی البدایہ و النہایہ میں لکھا ہے کہ اس صلح کرنے سے شیعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے سخت ناراض ہوگئے اور آں محترم کی جان کے دشمن ہوگئے۔ موصوف کو " مذل المومنین " (مسلمانوں کو ذلیل کرنے والا) اور " مسود وجوہ المومنین " (مومنین کا چہرہ سیاہ کرنے والا) کے القاب سے خطاب کیا۔ بلوہ اور فساد کیا۔ اور آں محترم کی جان کے درپے ہوگئے مگر باوجود اس کے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے اقدام یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست برداری، پر خوش اور مطمئن رہے۔ (۱)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سبائی صلح کے مخالف تھے تو اس کی مخالفت کرتے حضرت حسن رضی اللہ پر جنگ کے لئے دباؤ ڈالتے۔ لیکن آں محترم کو معاذاللہ کافر کیوں کہا اور مسود وجوہ المومنین کا لقب کیوں دیا؟ اس کا جواب ان کے عقائد پر نظر کرنے سے ملتا ہے۔ یہ سبائی بانی مذہب شیعہ عبداللہ ابن سبا کے شاگرد تھے۔

مذہب شیعہ کے بنیادی عقیدے یعنی امامت، ولایت، اور وصایت کے عقیدے، جن کی تعلیم ابن سبا نے انہیں دی تھی ان کے ذہنوں میں راسخ تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا

(۱) ملاحظہ ہو البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۱۸، ۱۹ =

کہ " امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے لئے مخصوص ہے اور آں محترم کی طرح ' حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی امام اور مولائے مومنین ہیں ۔ یہ مناصب انہیں مثل نبوت ' من جانب اللہ حاصل ہیں ۔ " ان سے دست بردار ہونا ' اور کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرنا ان کی رائے میں ایسا ہی تھا جیسے کوئی " نبی " اپنی " نبوت " سے دستبردار اور مستعفی ہوکر کسی ایسے شخص کا تابع اور پیرو بن جائے جو " نبی " نہیں ہے ۔ بلکہ بقول ان کے کافر ہو ۔ کیونکہ یہ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے تھے ۔

مزید یہ کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ امام نے اپنے بعد والے امام کے لئے نص کرتا ہے ۔ اور خلافت نص سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ نصب و انتخاب سے اس لئے ان کی رائے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لئے " نص " کی تھی ۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ صلح کرکے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکذیب و تغلیط کر رہے ہیں ۔ یہ سب امور ان بدبختوں کے نزدیک کفر تھے اس لئے ان بد باطن منافقوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ کافر کہہ دیا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی انہوں نے جو گندہ ذہنی کا اظہار کیا ہے ۔ اس کی بنیاد بھی ان کے یہی عقائد باطلہ ہیں ۔ لیکن ان لوگوں کے نزدیک انہوں نے توبہ کرلی تھی اس لئے انہیں مومن اور امام کہتے تھے ۔

شیعان حسن رضی اللہ عنہ کے ان عقائد فاسدہ باطلہ کی تشریح کے بعد حضرت حسن رضی اللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں تاج و تخت خلافت سے دستبرداری اور اس اقدام میں انہیں جمہور مسلمین کی تائید حاصل ہونے کا اصل محرک اور سبب عیاں ہوجاتا ہے ۔ نیز اس کے مقاصد حسنہ اور منافع سامنے آجاتے ہیں ۔ تفصیل درج ذیل ہے :
سبائیوں نے منصب خلافت کے متعلق جو باطل افکار پھیلائے تھے کہ " منصب خلافت یا امامت یعنی حکومت اسلامیہ کی سربراہی موروثی منصب اور نبی کریم صلی اللہ وسلم کی میراث ہے ' جس کے مستحق حضرت علی رضی اللہ تھے ' کیونکہ وہ وصی رسول ؐ تھے اور ان کی اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے بطن سے ہو اس کا استحقاق رکھتی ہے ۔ اور ان میں بھی سب نہیں بلکہ جن کا تقرر اس منصب پر منجانب اللہ ہو وہی اس کے مستحق ہیں ۔ نیز یہ کہ یہ استحقاق حق عطائے الٰہی (DEVINE RIGHT) ہے ۔ اس لئے جمہور مسلمین کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو خلیفہ منتخب کریں ۔ اگر وہ ان حضرات کے سوا کسی دوسرے کو امام اور خلیفہ بنائیں تو اس کی امامت و خلافت باطل ہے اور اس کی بیعت و اطاعت حرام بلکہ

کفر ہے۔"

مختصر یہ کہ امامت ولایت اور وصایت کے باطل عقیدے سبائیوں کی طرف سے پھیلائے جارہے تھے۔ ان سب عقائد باطلہ اور نظریات فاسدہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے باطل کردیا اور ان پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ یہ پاش پاش ہوکر خاک میں مل گئے۔ اور ان کا خلاف اسلام و باطل ہونا پوری طرح دنیائے اسلام پر واضح ہوگیا۔ اللہ تعالی آں محترم کے درجات بلند فرمائے کہ انہوں نے مندرجہ بالا عقائد سبائیہ کے بطلان اور اس کی لغویت پر ایسی برہان قاطع اپنے اس عمل خیر سے قائم فرمادی جو قیامت تک باقی رہے گی اور پوری امت سبائیہ مل کر بھی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ آں محترم نے عملاً ثابت کردیا کہ خلافت و امامت نہ کوئی موروثی چیز ہے اور نہ خلیفہ و امام کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے' بلکہ امام کا نصب و عزل کلیتہً جمہور اہل اسلام کا حق اور انہیں کے اختیار میں ہے۔ کسی کو خلیفہ اور امام بننے کا حق عطائے الٰہی (DEVINE RIGHT) نہیں حاصل ہوتا۔ کوئی منجانب اللہ اس منصب پرُ نہیں مقرر ہوتا۔ وصایت و ولایت کے عقائد فاسدہ کا بطلان خودبخود واضح ہوجاتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس عظیم کارنامے کے اجر میں وہ سب حضرات بھی شریک ہیں' جو اس وقت اصحاب شوریٰ تھے اور جمہور مسلمین کی نمائندگی کررہے تھے اور جنہوں نے موصوف کے اس مخلصانہ اور جرات مندانہ اقدام میں ان کی تائید کی۔ ان میں صحابہ کرام بھی تھے اور اجلہ تابعین بھی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات قرب بلند فرمائے اور اس عمل خیر کا انہیں اجر جزیل عطا فرمائے۔ (۱)

---

(۱) اس موقع پر ایک روایت یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس صلح سے شدید اختلاف تھا یہاں تک کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انہیں دھمکی دی کہ اگر "تم اختلاف سے باز نہ آئے تو میں تمہیں خانہ قید کردوں گا"۔ ہمارے نزدیک یہ روایت قطعاً غلط اور موضوع ہے۔ کسی سبائی نے اپنی من گھڑت داستان کربلا کی تمہید کے طور پر گڑھی ہے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس سے اختلاف ہوتا تو سبائیوں کو اس سے تقویت حاصل ہوتی اور وہ موصوف کو سامنے لاکر کوئی جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ اس طرح کی کاروائی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پھر یہ کہ اگر گھر میں ہی اختلاف باقی رہتا تو مخلصین اس صلح سے اس قدر خوش نہ ہوتے کہ اس سال کا نام عام الجماعۃ رکھ دیتے۔

اس مبارک واقعہ کی مندرجہ بالا تفصیل کو دیکھ کر مودودی صاحب کے مغالطے کو سمجھ لینا آسان ہوجاتا ہے ۔ انہوں نے ان واقعات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے قابل صد تحسین اقدام کو اس کے گرد و پیش اور احوال و ظروف سے بالکل الگ کرکے ایسے انداز میں پیش کیا ہے ' جس سے دین سے اور تاریخ سے ناواقف ' کمزور ذہن قاری کے دل میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جذبہ پیدا ہو ۔ یہ سبائیوں کی طرف سے ہماری تاریخ کو مسخ کرنے کی پرفریب کوشش کا ایک نمونہ ہے ۔ ایسے نمونے شیعوں اور شیعیت زدہ سنی علماء و مورخین کے یہاں بکثرت ملتے ہیں ۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم
لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما
(النساء)

" قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرادیں پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں"۔

مسلمانوں کو آیت حکم دے رہی ہے کہ ان کے درمیان کسی معاملے میں نزاع اور جھگڑا پیدا ہو تو اسے شریعت اسلامیہ کے سامنے پیش کریں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت مقدسہ سے اس کا فیصلہ کرائیں ۔ اس کے ساتھ شریعت کا جو فیصلہ ہو اسے دونوں فریق خوش دلی کے ساتھ پورے طور پر قبول اور تسلیم کرلیں ۔ اور اس کو حق سمجھیں ۔ خواہ طبعی طور پر وہ ان پر گراں گزرے ۔ آیت مقدسہ بتاتی ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے ۔ اور آپس کے نزاع کے وقت اس پر عمل سے گریز کرنا یعنی شریعت اسلامیہ ہی کا معاملہ کسی دوسرے کے سامنے پیش کرنا ضعف و نقص ایمان کی علامت ہے ۔

مزید یہ کہ بخاری شریف کی روایت میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ۔ اگر یہ واقعہ ثابت ہوتا تو وہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے ۔ ان وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت بالکل من گھڑت اور جھوٹی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس صلح سے متفق اور خوش تھے ۔ انہیں یا کسی مخلص کو بھی اس سے اختلاف نہیں تھا ۔ اختلاف صرف دشمنان اسلام روافض کو تھا ۔

بناء بریں کسی قول یا فعل کو خواہ وہ کسی سے صادر ہوا ہو ، اچھا یا برا ، معیوب یا مستحسن اور صحیح یا غلط کہنے کا اصل معیار یہ ہے کہ اسے شریعت اسلامیہ کے سامنے پیش کیا جائے ۔ اگر شریعت اسے عیب قرار دے تو وہ عیب ہے اور اگر شرع شریف اسے مستحسن کہے تو وہ مستحسن ہے ۔ شریعت اگر سکوت اختیار کرے تو وہ نہ معیوب ہے نہ مستحسن ۔ اسے ہم مباح کہہ سکتے ہیں ۔ امتِ مسلمہ کو افراد اور جماعتوں کے کردار ، جانچنے اور اپنے درمیان اختلاف و نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لئے اسی معیار کی تعلیم دی گئی اور اسی طرز عمل کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہی معیار و طرز عمل صحیح ہے ۔ لیکن ہماری تاریخ کو تاریک بنانے کی کوشش کرنے والے معترضین اور صحابہ و متبعین صحابہ کے مخالفین نے اس معیار اور اصول کو نظر انداز کردیا ۔ انہوں نے اپنے طبع زاد اور خود ساختہ معیار اصول مقرر کرکے اعتراضات کئے اور الزام لگائے اور اس امر سے بالکل صرف نظر کی کہ یہ قول یا فعل شرعاً قابل اعتراض ہے یا نہیں ؟ اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں ۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

> " دوسری نمایاں تبدیلی تھی کہ دور ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا طرز زندگی اختیار کرلیا اور اس طریقہ کو چھوڑدیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے ۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کردیا ۔ شاہی " حرس " (باڈی گارڈ) ان کے محل کی حفاظت کرنے اور ان کے جلو میں چلنے لگے ۔ "

(ص ۱۶۰)

○ تبصرہ : ان اعتراضات کی شرعی بنیاد کیا ہے ؟ کیا خلیفہ کی حفاظت کے لئے " حرس " کا مقرر کرنا اور ان کا اس کے ساتھ چلنا سربراہ مملکت کا محل میں رہنا شرعاً ممنوع ہے ؟ اگر ہے تو وہ کس آیت یا حدیث کی رو سے ؟ اگر یہ سب باتیں جائز ہیں تو اعتراض کے کیا معنی ؟ خلفاء راشدین نے اگر کوئی کام نہیں کیا تو صرف اتنی بات اس کے عدم جواز کی دلیل نہیں بن سکتی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حرس نہیں رکھتے تھے ۔ اور نہ کسی محل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکونت اختیار فرمائی لیکن اس سے منع بھی نہیں فرمایا جب تک ممانعت نہ ثابت ہو اس وقت تک ان کا عدم جواز نہیں ثابت ہوسکتا ۔ یہ سب امور شرعاً جائز تھے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی اس وقت ضرورت تھی ۔ عام مسلمانوں کا معیار

زندگی بلند ہو چکا تھا۔ شان و شوکت رکھنے والی کافر قوتوں سے مقابلہ تھا۔ جو ظاہری شان و شوکت سے متاثر ہوتے تھے۔ تجربات باڈی گارڈ رکھنے کی ضرورت واضح کر رہے تھے۔ خلفاء راشدین میں سے تین حضرات دشمنان اسلام کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے۔ ان حالات میں باڈی گارڈ ساتھ رکھنے پر اعتراض کرنا عناد پر مبنی ہے۔ اور اس بات کی علامت ہے کہ معترض کے نزدیک عیب و ہنر کی کسوٹی شریعت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ خود اس کا ذہن ہے۔ محل میں رہنا خلاف استحباب کہا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی جائز مصلحت اس کی مقتضی نہ ہو۔ بصورت مصلحت خلاف استحباب بھی نہیں اگر ہو بھی تو خلاف مستحب عمل پر اعتراض اور طعن کرنا صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سیاسی مصالح کا تقاضا یہی تھا کہ خلفاء اور بڑے درجہ کے حکام و ولاۃ قصر اور محل میں قیام کریں۔ خود قوم کی خواہش تھی کہ یہ لوگ شان و شوکت کے ساتھ رہیں۔ اس وقت کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جمہور مسلمین اسے گوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ان کی مملکت کے سربراہ یعنی خلفاء نیز ان کے ماتحت اور اونچے درجے کے امراء و حکام معمولی مکانوں میں رہیں یا ان کا معیار زندگی پست ہو۔ ان کی شان و شوکت کو وہ قوم کی شان و شوکت کا ایک مظہر اور غیر مسلم اقوام کو مرعوب کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ جب خود اس وقت امت مسلمہ ان کے اعلیٰ معیار زندگی کو پسند کرتی تھی، تو صدیوں بعد کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟

دور خلافت امیرالمومنین ہشام بن الملک رحمہ اللہ کے ایک امیر عقال بن شبہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے امیرالمومنین ہشام کو ایک سبز رنگ کی پوستین پہنے ہوئے دیکھا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا دیکھتے ہو میں نے کہا کہ خلیفہ ہونے سے پہلے بھی میں نے آپ کو ایک سبز پوستین قبا پہنے دیکھا تھا۔ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ آیا یہ وہی ہے یا کوئی دوسری۔" ہشامؒ نے کہا کہ "اس ذات کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں میرے پاس سوا اس قبا کے کوئی دوسری قبا نہیں اور جو کچھ تم دیکھتے ہو کہ میں روپیہ جمع کرتا ہوں اور اس کی حفاظت کرتا ہوں یہ سب تمہاری خاطر ہے۔ (۱)

اس واقعہ سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیرالمومنین ہشام اپنی ذات کے بارے میں کتنے کفایت شعار تھے اور قوم کے لئے دولت کی حفاظت کی کتنی کوشش کرتے تھے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معیار زندگی کو اتنا نیچا رکھنا اس وقت کے

(۱) تاریخ طبری واقعات ص ۵ تذکرہ خصائل امیرالمومنین ہشام رحمہ اللہ

مسلمانوں کو عام طور پر پسند نہ تھا۔ عقال نے جو کہا اس کا مقصد ان پر اعتراض کرنا تھا۔
عہد اموی و عہد عباسی دونوں میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
اس وقت قوم اپنے سربراہان مملکت اور حکام و امراء کا معیار زندگی بلند دیکھنا چاہتی تھی۔
اس صورت میں شرعاً اس کا جواز اور بھی واضح ہوجاتا ہے بلکہ اسے مستحسن کہنا بھی بے جا
نہیں ہے اس پر اعتراض کرنا سخت غلطی ہے۔

چند سطروں کے بعد اسی سلسلہ میں مودودی صاحب "بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی"
کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں۔

> " تیسری اہم تبدیلی بیت المال کے متعلق خلفاء کے طرز عمل
> میں رونما ہوئی۔ بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس
> کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے، جس میں کسی کو
> من مانے طریقے پر تصرف کرنے کا حق نہیں ہے ———— اور
> اپنی ذات کے لئے وہ اتنی تنخواہ لینے کا حق دار ہے جتنی ایک اوسط
> درجے کی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہو۔"

(ص ۱۶۱)

اول تو مودودی صاحب نے خلفاء کے لئے جو "اوسط درجے کی زندگی بسر کرنے" کا
قانون ذکر فرمایا، وہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں۔ دوسرے اگر بالفرض ثابت بھی ہو تو
اوسط درجہ سوسائٹی کے عام معیار زندگی کے تناسب سے اونچا نیچا ہوتا رہتا ہے۔ ہر
معاشرے کے بعد ہر زمانے میں اوسط درجہ کا ایک ہی ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس میں تغیر
بکثرت ہوتا رہتا ہے۔ آج سے پچاس برس قبل پاکستان میں جو اعلیٰ معیار زندگی سمجھا جاتا
تھا۔ وہ آج اوسط درجہ سمجھا جاتا ہے۔ اندازاً ساٹھ پینسٹھ سال پہلے ایران سے ہزاروں
آدمی تقریباً ہر سال فقر و فاقہ سے پریشان ہو کر بھیک مانگنے کے لئے ہندوستان کا رخ کرتے
تھے۔ اس زمانہ میں ایران کا جو اوسط معیار زندگی تھا کیا آج بھی وہی ہے؟ عرب میں تیل
کے چشمے نکلنے سے قبل جو اعلیٰ اور اوسط معیار زندگی تھا اسے وہاں کے موجودہ معیار سے کیا
نسبت ہے؟ آج بفضلہ تعالیٰ وہاں ادنیٰ معیار زندگی تو بالکل مفقود ہوچکا ہے۔ کسی دور
میں جو اعلیٰ درجہ تھا وہ اب ادنیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اوسط درجہ تو سابق اعلیٰ درجہ سے
بدرجہا اعلیٰ ہے۔

خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے ادوار میں مسلمانوں کے پاس دولت کی فراوانی تھی ترقی

ان کے قدم چوم رہی تھی اور دولت ان کی طرف دوڑ دوڑ کر آرہی تھی ۔ بروایتے جناب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں تو نوبت حقیقی افراط زر تک پہنچ گئی تھی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ زکوٰۃ نکالتے تھے اور جستجوئے بسیار سے بھی انہیں ایسے لوگ نہیں ملتے تھے جو اسے قبول کرنے پر تیار ہوں ۔ معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب یہ حالات ہوں تو قوم کا معیار زندگی کتنا اونچا ہوگا ۔ اوسط درجہ کا تعین بھی اسی اعلیٰ درجہ کی نسبت سے ہوگا ۔ یہ ثابت کرنا معترضین کی ذمہ داری ہے کہ ادوار مذکورہ میں خلفاء اور ان کے عمال کا معیار زندگی اوسط درجہ سے بلند تھا ۔ انہوں نے اس کا کوئی ثبوت نہیں کیا اور درحقیقت پیش بھی نہیں کرسکتے تھے ۔ امعان نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو تو یہ نظر آئے گا کہ ان خلفاء رحمہم اللہ کا ذاتی معیار زندگی اس کے اوسط درجے سے اونچا نہیں تھا ۔ غلاموں کی کثرت ' یا انعامات کی تقسیم ' اور ان کے مثل اخراجات کا شمار ذاتی خرچ نہیں ہے ان سب سے کسی نہ کسی طرح ان کے پیش نظر قومی مفاد ہوتا تھا ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ فوائد حاصل بھی ہوتے تھے ۔ پھر یہ کہ یہ خلفاء ذاتی حیثیت سے خلافت سے پہلے بھی متمول تھے ' ان کی ذاتی دولت بھی اچھی خاصی تھی ۔ یہ لوگ اپنی ذاتی دولت ' اپنی ذات کے علاوہ اللہ کی راہ میں اور علم و ادب کی ترقی کے لئے بھی خرچ کرتے تھے ۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ ان کے سب اخراجات کا بار بیت المال پر پڑتا تھا ۔

ان کے انفاق فی سبیل اللہ اور رفاہ عام کے لئے بے دریغ خرچ کرنے کی ایک مثال نہر زبیدہ کی صورت میں آج تک موجود ہے جو حضرت زبیدہ رحمہا اللہ اور ان کے شوہر محترم کی ذاتی دولت سے جاری ہوئی ۔ بیت المال کا ایک پیسہ بھی اس پر صرف نہیں ہوا ۔

بالفرض ان کا معیار زندگی اعلیٰ بھی تھا ۔ مگر آمد و خرچ میں کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی ' اور وہ اس کے لئے اپنی ذاتی دولت خرچ کرتے تھے ' یا بیت المال ہی سے خرچ کرتے تھے ' مگر اس سے کوئی قومی یا ملی ' مصلحت پیش نظر ہوتی تھی ' تو معیار زندگی کی یہ بلندی شرعاً یا اخلاقاً کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ۔ ان خلفاء کے مقرر کردہ عمال و حکام کا بھی عموماً یہی حال تھا ۔ یہ براہ راست بیت المال میں سے تو کچھ نہ لے سکتے تھے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنخواہیں زیادہ لیتے تھے لیکن یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں اس وقت عام معیار زندگی بلند تھا ' اس لئے تنخواہوں کا معیار بھی اونچا ہوگیا تھا ۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیث شریف بھی رہنما اور قابل ذکر ہے ۔ :

عن انس بن مالک رضی قال حدثنی ام حرام ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال یوما لی بیتها فاستیقظ وھو یضحک قالت یا رسول اللہ مایضحکک قال عجبت من قوم من امتی یرکبون البحر کالملوک علی الاسرۃ فقلت یا رسول اللہ ادع اللہ ان یجعلنی منھم قال انت منھم ثم نام فاستیقظ وھو یضحک فقال مثل ذلک مرتین او ثلاثا فقلت یا رسول اللہ ادع اللہ ان یجعلنی منھم فیقول انت من الاولین فتزوج بھا عبادۃ بن الصامت فخرج بھا الی الغزو فلما رجعت قربت دابہ لترکبھا فوقعت فاندقت عنقھا " (۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دوپہر کو میرے مکان پر آرام فرمایا ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے ہنستے ہوئے بیدار ہوئے ۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو کس بات پر ہنسی آئی ۔ آنحضور صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت میں سے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ سمندر میں اس شان سے سوار ہیں جیسے بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتے ہیں ۔ (حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ) میں نے عرض کیا کیا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالٰی سے دعا کیجئے کہ مجھے بھی ان میں سے بنادے ۔ آنحضور ؐ نے فرمایا کہ تم ان میں سے ہو (یعنی ان کے ساتھ شریک جہاد ہوگی) اس کے بعد دوبارہ آپ سوگئے پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے ۔ اور پھر وہی بات فرمائی جو پہلے فرمائی تھی دو بار یا تین بار میں نے پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالٰی سے دعا کیجئے کہ مجھے بھی ان میں شامل فرمادے ۔ (اس کے بعد اس مرتبہ) آپ نے فرمایا کہ تم پہلی جماعت میں شامل ہوگی ۔ "

" پھر واقعہ یہ ہوا کہ ان سے حضرت عبادہؓ بن الصامتؓ نے نکاح کیا اور انہیں ساتھ لے کر جہاد کے لئے گئے واپسی میں سوار ہونے کے لئے سواری کے قریب آئیں تو اس سے گرپڑیں اور ان

(۱) بخاری شریف ج ا کتاب الجہاد باب رکوب البحر ص ۴۰۵

کی گردن کچل گئی۔

یہ نبی کریم صلی اللہ کی پیشین گوئی ہے۔ اس کا ظہور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ہوا۔ وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے بحری جہاد فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور ان کے رفقاء جہاد کے متعلق فرمارہے ہیں کہ ان کی شان و شوکت تخت و تاج رکھنے والے ملوک یعنی بادشاہوں کے مثل ہوگی۔ اور ان کی اس شان و شوکت اور ان کے اس اعلیٰ معیار زندگی پر خوشی کا اظہار فرمارہے ہیں۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں ایمان ہے سمجھ سکتا ہے کہ اپنے امتیوں کی جس شان و شوکت اور ان کے جس اعلیٰ معیار زندگی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کا اظہار فرمائیں۔ اس پر معترض ہونا کس قدر افسوسناک اور خطرناک جسارت ہے۔

یہ گفتگو تھی حدیث کے صرف اعجازی پہلو کے پیش نظر۔ یعنی صرف اس حیثیت سے کہ یہ ایک پیشین گوئی ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء جہاد کے اقدام سے پوری ہوئی۔

حدیث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک اصول شرعی کی تعلیم بھی ہے۔ یعنی فقہ حدیث یہ ہے کہ خلفاء امراء اور حکام کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے اعلیٰ معیار زندگی اختیار کرنا فی نفسہ جائز ہے اور کسی کو اس پر معترض ہونے کا حق نہیں خصوصاً جب کوئی مصلحت ملی بھی اس کی متقاضی ہو۔ (۱)

(۱) لطیفہ یہ ہے کہ معیار زندگی کی بلندی کا اعتراض مودودی صاحب کی جماعت کے ایک سابق رکن اور ان کے رفیق خاص قمرالدین صاحب نے (جو بعد میں جماعت سے الگ ہوگئے) خود ان پر کیا تھا۔ اس کا جواب موصوف نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام ایک خط میں یہ دیا ہے:

" اب اگر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر وہ شخص جو جماعت کے کام کے سلسلہ میں میرے ساتھ آکر رہے اس کے لئے یا تو میں سوا سو روپے مہینے کی آمدنی کا انتظام کردوں ورنہ پھر اس (STANDARD) پر رہوں جس پر کم از کم آمدنی (مثلاً پندرہ روپے مہینہ) رکھنے والا رہتا ہے ورنہ ان کے دل ٹوٹیں گے' اور ان میں احساس کمتری پیدا ہوگا تو میری طرف سے اس کا یہ جواب ہے کہ یہ اسلام کا مطالبہ نہیں اور نہ اسلام اس طرز کی سوسائٹی بنانا چاہتا ہے۔ جس میں مصنوعی طور پر یوں مساوات پیدا کی جائے۔ جسے اللہ اپنے فضل سے

خلیفہ راشد سادس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو اعتراضات سبائیوں نے کئے ہیں ان میں قوت بیان کا زیادہ اسراف اس طعن پر کیا ہے کہ آں محترم نے امیر یزیدؒ کو اپنا ولی عہد کیوں بنایا ؟ مودودی صاحب نے بھی اس طعن کو بیان کرنے میں سبائی آرٹ اور انشاء پردازی کی قوت سے پورا پورا کام لیا ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس پر تو پانچ حضرات صحابہ کرام نے بھی اعتراض کیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ان کا اعتراض ثابت ہی نہیں ۔ جس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہ رضی اللہ عنہم پانچ حضرات نے اس پر اعتراض کیا تھا ' وہ بالکل موضوع ' جعلی اور جھوٹی روایت ہے ۔ حق یہ ہے کہ کسی کا اعتراض کرنا ثابت نہیں ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض حضرات کو اس بارے میں کچھ شبہ تھا ' جس کا ازالہ انہوں نے کرنا چاہا تھا ۔ بعد استفسار وہ زائل ہوگیا ۔ اور یہ حضرات مطمئن ہوگئے ۔ انہوں نے اعتراض نہیں کیا تھا ' بلکہ استفسار کیا تھا جسے سبائی اور سبائیت نواز مورخوں نے اعتراض کے غلط عنوان سے بیان کیا ہے ۔ اگر بطور مفروضہ ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ان حضرات نے اعتراض کیا تھا تو بھی بعد کے لوگوں کے لئے شرعاً اس اعتراض کو دہرانے کی گنجائش نہیں پیدا ہوتی ۔ ان حضرات صحابہ نے اگر اعتراض کیا تھا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس کام کو خلاف شریعت سمجھ کر نہیں کیا تھا ۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ کا اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانا خلاف شریعت ہے ۔ بلکہ وجہ اعتراض یہ تھی کہ وہ حالات زمانہ کے لحاظ سے ولی عہد بنانے کو خلاف مصلحت سمجھتے تھے ۔ مگر جب ان پر واضح ہوگیا کہ یہ خلاف مصلحت نہیں ہے ۔ تو انہوں نے اپنا اعتراض کبھی نہیں دہرایا ۔ اور جب وقت آیا تو

سو (۱۰۰) روپے مہینے کی حلال آمدنی دے وہ لازماً اس معیار پر زندگی بسر کرے جو دس یا پندرہ روپے آمدنی رکھنے والے کا ہو ۔ نہ صحابہ کرام میں یہ قاعدہ جاری کیا گیا تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ و ' عمار رضی اللہ عنہ و بلال رضی اللہ عنہ کا معیار معاشرت ایک ہونا چاہئے ۔ اگر لوگوں کے دل اس طرح کی مساوات نہ ہونے پر ٹوٹتے ہیں اور ان میں رشک و حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ ان کی غیر اسلامی ذہنیت کا نتیجہ ہے ۔ "

○ تبصرہ :۔ مودودی صاحب نے خود ہی فیصلہ کردیا کہ اموی و عباسی خلفاء پر ان کا اعتراض غلط اور معترضین کی غیر اسلامی ذہنیت اور ان کے حسد کا اثر ہے ۔

(ہفت روزہ " آئین " لاہور مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء جلد ۲۶ ص ۲۸۵ زیر عنوان تنظیم و تخریب

امیر یزید مغفور کی خلافت بھی تسلیم کی اور ان کی اطاعت کرتے رہے۔

اس صورتحال کو پیش نظر رکھ کر اب کسی کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ پر اعتراض مذکور کی شرعاً کیا گنجائش باقی رہتی ہے اور اس طعن و تشنیع کو شرعاً و اخلاقاً جائز کس طرح سمجھا جاسکتا ہے؟ یقیناً یہ اعتراض و طعن بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

جو شیعہ اپنی شیعیت کا اظہار و اقرار کرتے ہیں' ان پر تو تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ان کا دین اور ان کی شریعت الگ ہے۔ انہیں اسلام اور شریعت محمدیہ صلی صاحبہا الف الف تحیتہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ لیکن تعجب ان شیعیت نواز مدعیان سنیت پر ہے' جو اس مسئلے میں شریعت کو قصداً پس پشت ڈال کر اپنے خود ساختہ قاعدے کے پیش نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر مذکورہ بالا طعن کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا نفس ولی عہد بنانا شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے؟ اور اگر اس سے بحث نہیں تو کیا بیٹے کو ولی عہد بنانا شرعا ممنوع اور ناجائز ہے؟ اگر ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اگر کوئی دلیل شرعی ہو تو اسے پیش کریں۔ بغیر دلیل شرعی کے اسے ممنوع اور معصیت کہنا بدعت اور شریعت مقدسہ پر افتراء ہے۔

مخالفین صحابہ یہ اعتراض صدیوں سے دہرارہے ہیں مگر سوال مذکور کا جواب آج تک نہ دے سکے اور نفس ولی عہدی یا بیٹے کی ولی عہدی کے ممنوع ہونے کی کوئی دلیل شرعی آج تک نہیں پیش کر سکے اور نہ قیامت تک پیش کر سکیں گے۔ قیامت برحق ہے اس روز احکم الحاکمین کے سامنے اس سوال کا جواب دینا ہوگا۔ ایک ایک لفظ ایک ایک حرف' ایک ایک نقطہ کا حساب ہوگا اس دن یہ لوگ کیا جواب دیں گے اور لاجواب ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ان معترضین کو ان باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

لیکن یہ لوگ اس سے بے فکر ہیں۔ کیونکہ جب ان کے دل سے صحابہ کرام کی عظمت و محبت رخصت ہوئی تو وہ مرتبہ رسالت کی عظمت و محبت کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی۔ ایمان بالرسالتہ میں ضعف آنے کی وجہ سے اللہ تعالی کا خوف بھی ان کے دلوں سے رخصت ہوگیا۔ اور آخرت کی طرف سے یہ بے فکر ہوگئے۔ اس طعن و اعتراض کو باطل سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی کوئی دلیل و بنیاد ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شرعاً خلیفہ کے لئے ولی عہد بنانا بالکل جائز ہے۔ ولی عہدی کے لئے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ غیر کی طرح وہ اپنے بیٹے' بھتیجے یا بھائی وغیرہ کسی قریب کے یا بعید رشتہ دار کو بھی ولی عہد بنا سکتا ہے۔ شرعاً اس میں ذرہ برابر بھی قباحت نہیں۔

اعتراض مذکور کے غلط اور لغو ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی غلطی پر دلیل شرعی قائم ہے ۔ ذرا ان واقعات پر نظر ڈالئے جو کتب حدیث و سیر میں تبکرار مذکور ہیں اور صرف ان میں مذکور نہیں بلکہ مستفیض ہیں ۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنا ولی عہد بنایا نفس ولی عہدی کا جواز تو اس سے ثابت ہوگیا ۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنانا تو بیٹے کو ولی عہد بنانے کی واضح مثال ہے ۔ اگر اس مثال کی پیروی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی تو اس پر اعتراض کے کیا معنی ؟ اگر بیٹے کو ولی عہد بنانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے جائز تھا ۔

تو حضرت معاویہ کے لئے بھی جائز تھا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے اس کی تحریک نہیں پیش کی تھی بلکہ دوسرے حضرات نے تحریک کی تو جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی خود کوئی تحریک نہیں کی تھی ۔ بلکہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے تحریک پیش کی تھی ۔ دونوں صورتیں یکساں ہیں ۔ بلکہ واقعات میں غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولی عہدی کی ابتدائی تحریک حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی طرف سے ہوئی تھی ۔ یہ تحریک قولی نہ تھی بلکہ عملی تھی ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کو امامت صلوۃ کے لئے اپنا قائم مقام بنایا ۔ اسے صحابہ کرام نے عموماً استخلاف کی ایک علامت قرار دیا اور بکثرت صحابہ نے خلافت صدیقی کی حقانیت کی علامت اور دلیل بنایا تھا اس بارے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے کہ : **رضی اللہ عنہ النبی لی دیننا لرضینا عنہ لی دنیانا** " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو) ہمارا دینی مقتداء بنانا پسند فرمایا (مراد امامت صلوٰۃ) تو ہم نے انہیں دنیا میں اپنا مقتداء بنانا پسند کرلیا "۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض وفات میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امامت صلوٰۃ میں اپنا قائم قام بنایا تھا ۔ مندرجہ بالا عرف اور ماحول (ENVIORONMENT) میں یہ صاف اشارہ اس امر کی طرف سمجھ میں آتا ہے کہ آں محترم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا تھا یعنی ولی عہد بنایا تھا ۔ اور ان کی خواہش یہی تھی کہ ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے جانشین اور **خلیفۃ المسلین** بنیں ۔

یہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ دونوں حضرات کے

لئے حکم شرعی ایک ہی ہوگا۔ اس مرحلے سے آگے بڑھئے تو اس معاملے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پوزیشن زیادہ مستحکم معلوم ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لئے کوئی استصواب عام (ریفرنڈم) نہیں کرایا۔ کیونکہ اس کے لئے آں محترم کو موقع ہی نہ ملا۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کے لئے وقت ملا اور انہوں نے کامل استصواب رائے عامہ کیا۔ ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو بالکل عیاں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر بیٹے کو ولی عہد بنانا جائز نہ سمجھتے تو کبھی اس کی اجازت نہ دیتے۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے سے منع کرتے۔ آں محترم نے اجازت دی اور منع نہیں فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے جائز سمجھتے تھے۔

جب ان مخالفین صحابہ رضی اللہ عنہم کو ازروئے شریعت اسلامیہ مقدسہ اعتراض مذکور کی کوئی گنجائش نہیں نظر آئی تو جھوٹ، افتراء وغیرہ سبائی طریقوں سے کام لے کر اور اعتراض کو سبائی سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

مودودی صاحب کا صبغتہ السبائیہ سے رنگین مندرجہ ذیل قول اسی سانچے کی تصویر ہے:

> "اب خلافت علی منہاج النبوۃ کے بحال ہونے کی آخری صورت صرف یہ باقی رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیتے، یا اگر قطع نزاع کے لئے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کرجانا ضروری سمجھتے، تو مسلمانوں کے اہل علم و اہل خیر کو جمع کرکے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لئے امت میں موزوں تر آدمی کون ہے۔"

(ص ۱۴۸)

○ تبصرہ: مودودی صاحب نے مسئلہ ولی عہدی میں صحیح اور غلط کو پرکھنے کے لئے شریعت مقدسہ سے صرف نظر کرکے سبائیہ کا یہ خود ساختہ معیار پیش کیا ہے اور مسئلہ کو اس خانہ ساز سانچے میں ڈھال کر اعتراض کی شکل تیار کی ہے۔ معترضین کے اس گروہ نے شریعت مطہرہ سے ایسی بے اعتنائی برتی کہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور قسم کھانے کو بھی اس طرف التفات نہ کیا کہ جس بات کو یہ لوگ واجب کہہ رہے ہیں اس کے وجوب

کی کوئی دلیل شرعی بھی ہے ؟ اگر ہے تو اسے پیش کرنا چاہئے تھا اور اگر نہیں ہے تو کیا معاذ اللہ انہیں ایجاب و تحریم کا اختیار بھی حاصل ہے ؟ مودودی صاحب نے کسی خلیفہ کے لئے جانشینی کے مسئلے میں صرف دو طریقے جائز رکھے ہیں ۔ اول یہ کسی کو ولی عہد نہ بنائے اور مسئلہ مسلمانوں کے کے باہمی مشورے پر چھوڑدے جو اس کے مرنے کے بعد باہم مشورہ کرکے خود حل کرلیں گے ۔

دوم یہ کہ اہل علم و اہل خرد کو جمع کرکے انہیں آزادی کے ساتھ ولی عہدی کے لئے " موزوں ترین " آدمی معین کرنے دے ۔

ان دو کے علاوہ کوئی تیسری صورت ان کے نزدیک جائز نہیں ۔ اور سبائی ذہنیت رکھنے والوں کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں شکلوں میں سے کوئی شکل نہیں اختیار کی " اس لئے ان کا یزید کو ولی عہد بنانا جائز نہیں تھا ۔ " یہ استدلال و اعتراض کس قدر لغو ہے اس پر ہم چند سطروں بعد روشنی ڈالیں گے ۔ پہلے تو ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ولی عہدی کے لئے مذکورہ بالا دونوں صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت کا ممنوع اور ناجائز ہونا کس دلیل شرعی سے ثابت ہے ؟ کیا قرآن مجید میں یا کسی حدیث شریف میں اس کی مخالفت فرمائی گئی ہے ؟ اگر فرمائی گئی ہو تو پیش کیجئے ۔ ان کے علاوہ ایک تیسری شکل یہ بھی نکلتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین ارباب حل و عقد سے مشورہ کرکے ان کی متفقہ یا ان کی اکثریت کی رائے سے کسی شخص کو ولی عہد بنادے ' اس کی بھی دو صورتیں ہیں :

اول : کسی کو خود ولی عہد بنانا تجویز کرے اور اس کے متعلق مشورہ لے ۔

دوم : یہ کہ اہل شوریٰ میں سے کوئی تجویز پیش کرے اور اس پر شوریٰ کیا جائے ۔

کسی خلیفہ کے لئے اس تیسری شکل کو (اس کی صورت اول یا دوم) اختیار کرکے کسی کو ولی عہد بنانا جائز ہے یا نہیں ؟ اگر جائز ہے تو سبائی اعتراض کی جڑ کٹ گئی ' اور ناجائز ہونے کا دعویٰ ہے تو اس کی دلیل شرعی کیا ہے ؟ اگر کوئی دلیل شرعی نہیں پیش کرسکتے تو کیا اپنی طرف سے بغیر کسی دلیل شرعی کے کسی کام کو شرعاً ناجائز اور ممنوع کہنا تحریف شریعت اور افتراء علی اللہ نہیں ہے اور اس کے کرنے پر اعتراض کرنا کیا ظلم نہیں ؟ جب اس کا عدم جواز ثابت نہیں تو اسے بنیاد بنا کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا کس طرح جائز ہوگا ۔

اعتراض کی غلطی تو واضح ہوچکی ۔ اس کے لئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ۔ مگر معترضین کی بدنیتی کی نقاب کشائی کے لئے اس واقعہ کا اظہار بھی مفید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنانے کے لئے مودودی صاحب

کے تجویز کردہ دونوں طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی نہیں اختیار فرمایا بلکہ تیسرا طریقہ اختیار فرمایا تھا ۔ یعنی اس وقت پر موجودہ چند ارباب حل و عقد کے کہنے پر موصوف کو اپنا ولی عہد مقرر کردیا ۔ کسی سے کوئی مشورہ بھی نہیں لیا ۔ نہ ان ارباب حل و عقد سے یہ فرمایا کہ اس مسئلے پر دوبارہ غور کرلیں ۔ کیا یہ صورت جائز نہ تھی ؟ اور کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ولی عہدی جائز نہیں تھی ؟ اگر وہ جائز تھی اور یقیناً جائز تھی تو حضرت معاویہ کا امیر یزید کو ولی عہد بنانا کیوں ممنوع تھا ؟ دونوں کے فعل میں اگر کوئی فرق ہو تو واضح کیا جائے ۔

اس اصولی اطمینان بخش اور مسکت جواب کی ضرورت تو اس مفروضہ کی بناء پر ہے کہ امیر یزید کا ولی عہدی کے لئے انتخاب سلیکشن SELECT ION کے ذریعہ ہوا نہ کہ الیکشن ELECTION کے ذریعہ ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا اور انہیں ولی عہد بنانے کے لئے یہی شکل اختیار کی جاتی تو بھی کوئی اعتراض کی بات نہ تھی ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سلیکشن نہیں بلکہ الیکشن کی بنیاد پر امیر یزید کو ولی عہد خلافت بنایا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں موصوف نے ولی عہد نہیں منتخب کیا تھا بلکہ جمہور مسلمین نے جن میں صحابہ کرام بھی تھے امہات المومنین تھیں ' اکابر تابعین اور لاکھوں صالح اہل ایمان تھے ' امیر یزید کو حضرت معاویہ کا جانشین منتخب کیا تھا ۔ ایک جلیل القدر صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کی ولی عہدی کی تجویز پیش کی اور جمہور مسلمین صحابہ ' امہات المومنین اجلہ تابعین ' اور عام صالح مومنین نے اس کی تائید کی اس طرح امیر یزید ولی عہد مقرر ہوئے ۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی تحریک سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ تو کیا تصور بھی نہیں تھا ۔ جس کا ثبوت البدایہ و النہایہ کی مندرجہ ذیل روایت ہے جو انہوں نے حضرت سعد بن العاص کے ترجمہ میں ذکر کی ہے

وقال عبدالملک بن عمیر عن قبیصة بن جابر قال بعثنی زیاد فی شغل الی معاویة فلما فرغت من اموری قلت یا امیر المومنین لمن یکون الامر من بعد ک ؟ فسکت ساعة ثم قال : یکون بین جماعة ' اما کریم قریش سعید بن العاص واما فتیٰ قریش ' حیاء ودھا ء وسخا ء ' عبداللہ بن عامر ' واما الحسن بن علی ' فرجل سید کریم ' اما القاری لکتاب اللہ الفقیہ فی دین اللہ الشدید فی حدود

اللہ مروانؓ بن الحکمؓ واما رجل لقیہ عبداللہؓ بن عمرؓ واما رجل یتردد الشریعۃ مع دواھی السباع ' ویروغ روغان الثعلب ' فعبد اللہ بن الزبیر " (۱)

عبدا لملک ابن عمیر' قبیصہ بن جابر سے نقل کرتے ہیں کہ زیاد نے مجھے ایک کام سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا ' جب میں اپنے کاموں کو انجام دے چکا تو عرض کیا کہ امیرالمومنین آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا ؟ وہ کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد فرمایا کہ خلافت میرے بعد ایک جماعت کے درمیان ہوگی (یعنی چند نام میں بتاتا ہوں ان میں سے کوئی خلیفہ ہوگا) قریش کے سخی سعید بن العاص ' یاحیا ' تدبر اور سخاوت کے اعتبار سے قریش کے جوان (فتی) عبداللہؓ بن عامرؓ یا حسن بن علیؓ کہ وہ سردار اور کریم شخص ہیں ۔ یا عالم کتاب اللہ ' اللہ کے دین کے فقیہ حدود الٰہی میں متشدد مروانؓ بن الحکمؓ یا مرد فقیہ عبداللہؓ بن عمرؓ یا وہ صاحب جو منبع شریعت ہونے کے ساتھ درندوں کی ایسی شجاعت اور لومڑی کی ایسی ہوشیاری کے ساتھ کام کرتے ہیں یعنی عبداللہؓ بن زبیرؓ "

حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد خلافت کے لئے اتنے حضرات کا تذکرہ کیا اور سب کی تعریف کی ۔ گویا ان کی تجویز تھی کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے ۔ یہ سب صاحبان اس منصب کے لئے موزوں اور مناسب ہیں ۔ مگر یزید کا اشارتاً بھی تذکرہ نہیں کیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں حضرت مغیرہؓ کی تحریک سے پہلے امیر یزیدؒ کو ولی عہد بنانے کا کوئی تصور ہی نہ تھا ۔

امیر یزید کو ولی عہد مقرر کرنے کی تحریک تنہا حضرت مغیرہؓ کی تحریک نہ تھی ' بلکہ کوفہ کے رائے عامہ کی تجویز تھی ۔ آں محترم نے یہ تجویز پیش کرکے صرف اپنے رائے کا اظہار نہیں کیا تھا 'بلکہ صوبہ کوفہ کی جمہور مسلمین کی ترجمانی فرمائی تھی ۔ معاملے کے اس پہلو کو واضح کرنے کے لئے کہ یہ جمہور اہل سنت کا مشورہ ہے ' انہوں نے دس آدمیوں کا ایک

(۱) البدایہ و النہایۃ ابن کثیر ج ۸ ص ۸۵ بضمن ترجمہ حضرت سعید بن العاص مطبوعہ بیروت

عوامی وفد دمشق بھیجنے کا انتظام کیا۔ ارکان وفد کوفہ کے مسلمانوں کے قائد اور ان کے معزز نمائندے تھے، جن پر کوفہ کے اہل سنت اعتماد کرتے تھے اس وفد نے دمشق پہنچ کر حضرت مغیرہؓ کی طرف سے امیر یزید ؒ کی ولی عہدی کی تجویز حضرت معاویہؓ کے سامنے پیش کی۔ ابن الاثیر لکھتے ہیں۔

فقال او قد رضیتموہ ؟ قالوا نعم قال و ذلک رایکم ؟ قالوا نعم ورأی من وراء نا" (۱)

" (حضرت معاویہؓ نے) فرمایا کہ کیا تم اسے (یزید کو بحیثیت ولی عہد) پسند کرتے ہو ؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں ۔ پھر (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے) پوچھا کہ کیا یہ تمہاری رائے ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں (ہماری رائے بھی ہے) اور جن لوگوں کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں (عام اہل کوفہ) ان سب کی بھی یہی رائے ہے ۔"

اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ صوبہ کوفہ کی رائے عامہ یہی تھی کہ حضرت معاویہؓ کے بعد امیر یزید ؒ خلیفہ ہوں ۔ کوفہ میں سبائی مفسدین بھی موجود تھے ۔ وہ یقیناً اس کے مخالف ہوں گے لیکن انہیں اس کی ہمت نہ ہوسکی کہ حضرت مغیرہؓ یا اس وفد کی رائے کی کھلم کھلا مخالفت کرسکیں ۔ حالانکہ یہ مخالف الداالخصام اور دشمن نظام اسلام تھے ۔ اس موقع پر انہیں مخالفت کرنا چاہئے تھی ۔ پھر یہ لوگ سرمہ در گلو روائے میں اپنا مکروہ چہرہ چھپائے کیوں بیٹھے رہے ؟ وجہ ظاہر ہے مومنین شہر و صوبہ کی غالب اکثریت امیر یزید ؒ کو ولی عہد اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفۃ المسلمین بنانا چاہتی تھی ۔ اس اکثریت کے مقابلے میں مٹھی بھر سبائی منافقین زبان کھولنے کی جسارت کیسے کرسکتے تھے ۔ چند افراد اہل ایمان بھی اگر امیر یزید ؒ کی ولی عہدی و خلافت کو ناپسند کرتے تو یہ منافقین سبائیہ یقیناً اس کے خلاف شور و شر برپا کرتے ان کا سکوت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حضرت مغیرہؓ اور وفد مذکور دونوں کی رائے صوبے کے سب اہل سنت والجماعت یعنی مومنین مخلصین کی متفقہ رائے تھی ۔ (۲)

(۱) کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۸

(۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ' ایسے جلیل القدر صحابی کے متعلق یہ کہنا کہ " انہوں نے دوبارہ گورنری پر فائز ہونے کے لالچ میں بطور خوشامد تجویز پیش کی تھی " معترضین کی پست فطرتی اور دناءت طبیعت کی علامت ہے ۔ حضرت مغیرہؓ گورنری کے

حضرت معاویہؓ اگر حضرت مغیرہؓ یا صوبہ کوفہ کے وفد کی تجویز کے بغیر خود اپنی رائے سے امیر یزید" یا کسی اور کو ولی عہد بنادیتے تو بھی شرعاً جائز تھا۔ جو شخص اسے ناجائز کہتا ہو وہ اپنے قول کو دلیل شرعی سے ثابت کرے۔ چہ جائیکہ خود انہوں نے اپنی رائے سے یہ نامزدگی تجویز نہیں فرمائی بلکہ ایک جلیل القدر صحابی رسول کی رائے اور ایک اہم صوبے اور مرکزی شہر کی رائے عامہ سے ولی عہد بنانا تجویز فرمایا۔ یہ آخر کس دلیل شرعی کی بناء پر ممنوع ہے ؟ اور جب ناجائز نہیں تو اس پر اعتراض کیوں ہے ؟ کیا اس کے معنی یہ نہیں کہ معترضین نے شریعت اسلامیہ کے متوازی ایک دوسری شریعت گڑھی ہے ، شریعت اسلامیہ جس کام کو جائز کہتی ہے ان کی خود ساختہ شریعت اسے ناجائز کہہ رہی ہے۔ اور اگر اسے ناجائز نہیں سمجھتے تو اس پر معترض کیوں ہیں ؟

بغض صحابہؓ نے انہیں اس وادی ضلال تک پہنچادیا کہ یہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کا مقابلہ و معارضہ کررہے ہیں۔

سبائیوں اور سبائیت زدہ سنی نما شیعوں کی شریعت مطہرۃ اسلامیہ سے بے اعتنائی بلکہ رو گردانی ، اور من مانی معیار سازی عیاں ہوجاتی ہے۔ اب ہم اسی سلسلے میں ان کی دروغ آمیزی یعنی سچی بات میں جھوٹ کی آمیزش کرکے واقعہ کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں کوفہ کے وفد کا تذکرہ بحوالہ ابن اثیر ہوچکا ہے۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ سبائی اس کا انکار نہیں کرسکے مگر اس کی حقیقت کو مسخ کرنے کے لئے انہوں نے ایک کہانی گڑھی۔ مودودی صاحب نے بحوالہ ابن اثیر یہ جھوٹی کہانی اس طرح بیان کی ہے کہ " حضرت مغیرہؓ نے کوفہ کے دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی منصب سے بوجہ کبر سنی خود مستعفی ہوچکے تھے۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اس منصب کے جویاں اور حریص تھے بہت پست قسم کی بہتان طرازی اور دنی قسم کی بدگمانی ہے۔ بالفرض انہیں دوبارہ گورنری کی خواہش بھی ہوتی تو وہ اپنا استعفاء واپس لے سکتے تھے خوشامد کی انہیں کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ حضرت معاویہؓ تو خود انہیں گورنری پر برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ اگر حضرت مغیرہؓ اشارتاً بھی اپنے منصب پر برقرار رہنے کی خواہش کا اظہار کردیتے تو فوراً ان کا استعفیٰ واپس اور نامنظور کردیا جاتا۔ اس سے عیاں ہے کہ آں محترم پر الزام مذکور بہتان عظیم ، سوء ظن قبیح ، اور الزام لگانے والوں کی پست فطرتی و دناءت طبیعت اور دروغ بافی کی دلیل ہے۔

کیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کے پاس جاکر یزید کی ولی عہدی کی تحریک کریں ۔ " اس سبائی کہانی میں یہ بھی ہے کہ " حضرت معاویہؓ بھی سمجھ گئے کہ یہ کرائے کے آدمی ہیں انہوں نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے موسیٰ سے تخلیہ میں پوچھا کہ " تمہارے باپ نے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ تیس ہزار درہم میں ۔ حضرت معاویہؓ نے کہا کہ تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے ۔ "

مودودی صاحب نے یہ سراپا کذب و دروغ ' بازاری گپ ابن اثیر کے حوالے سے نقل کی ہے ۔ بغض معاویہؓ کی وجہ سے مورخانہ ذمہ داری کا احساس ان میں بالکل فنا ہوگیا ۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ابن اثیر نے یہ روایت بغیر کسی سند کے نقل کردی ہے ۔ اس کی حیثیت بازاری افواہ سے زیادہ نہیں ۔ جو سبائیوں نے گڑھ کر پھیلائی ہوگی ۔ تاریخ میں اس کی حیثیت مزبلہ کے کوڑے کرکٹ کے برابر بھی نہیں ۔ پھر اس جھوٹی کہانی کو نقل کرنے سے کیا فائدہ ؟ ابن اثیر تو نقل حدیث میں بھی بہت غیر محتاط ہیں ۔ چہ جائیکہ تاریخ میں جس ماحول اور فضا میں پرورش پائی اس نے ان کے ذہن میں جراثیم رفض کی خاصی تعداد کی پرورش کی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ بازاری افواہ اپنی کتاب میں ٹانک لی ۔ اس کا بھی خیال نہ کیا کہ اس سے ان کی کتاب کی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچے گا ۔

جلیل القدر صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر رشوت دینے ' کوفہ کے دس سربر آوردہ صالح معززین پر رشوت لینے اور دوسرے جلیل القدر صحابی رسول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس رشوت کے لین دین کو جائز قرار دینے کا جھوٹا الزام لگانے میں نہ ابن اثیر کو کوئی جھجک محسوس ہوئی نہ مودودی صاحب کو ۔ معمولی درجہ کے عام مسلمان پر بھی اس قسم کا بہتان باندھنا اور افتراء کرنا شرعاً فعل حرام اور معصیت کبیرہ ہے ۔ چہ جائیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی رضی اللہ عنہ پر ! سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں نہ ہو تو آدمی سب کچھ کرسکتا ہے ۔

تاریخ کا مسلمہ اور روشن واقعہ یہ ہے ' جس سے سبائی بھی انکار نہیں کرسکے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چھ بار مختلف اہم مقامات پر اس مسئلے پر استصواب عام اور مشورہ کیا ۔ ہر طرف سے وفود بلوائے جنہوں نے رائے عامہ کی ترجمانی کی اس طرح سب ممالک اسلامیہ کے جمہور مسلمین کے رائے ان کے نمائندوں اور زعماء کے ذریعہ معلوم کرلی ۔ جیسا شوریٰ اور استصواب رائے امیر یزید" کی ولی عہدی کے لئے خلیفہ راشد حضرت معاویہؓ نے کیا ایسا استصواب اور شوریٰ اس وقت تک کسی خلیفہ کے لئے نہیں ہوا تھا یہ

بھی تسلیم شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت کے پورے عالم اسلامی نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور سب امیر یزید" کی ولی عہدی پر راضی تھے ۔ بلکہ سب نے حضرت معاویہ ؓ کے اس اقدام اور یزید" کی ولی عہدی کو پسند کیا ۔ پورے عالم اسلامی میں صرف پانچ یا زیادہ سے زیادہ سات حضرات نے اختلاف کیا ۔ لیکن اتنی غالب اکثریت کی رائے کے مقابلے میں پانچ یا سات حضرات کی رائے کا شرعاً یا عقلاً کوئی وزن باقی نہیں رہتا ' بلکہ اگر حضرت معاویہ ؓ صرف ان حضرات کے اختلاف کی بناء پر اپنے مفید اقدام کو ترک یا ملتوی کردیتے تو اس میں کلام ہوتا کہ غالب اکثریت کی رائے اور مرضی کو جس میں صحابہ ؓ کرام اور اجلہ تابعین کی بھی بڑی تعداد تھی نظر انداز کرکے ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کی رائے پر عمل کرکے ملی مصلحت کو نظر انداز کرنا ' ان کے لئے جائز ہے یا نہیں ؟ جب انہوں نے استصواب اور شوریٰ کے لئے مسئلہ ولی عہدی جمہور اہل اسلام کے سامنے پیش کیا تھا ' اس وقت وہ ان کی بات اور رائے تھی ۔ لیکن جب جمہور اہل اسلام نے ان سے اتفاق کرلیا اور امیر یزید" کی ولی عہدی منظور کرلی تو بات ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ اب یہ ان کی رائے نہ تھی بلکہ جمہور اہل ایمان اور اہل اسلام کی غالب اکثریت کی رائے ہوگئی تھی جو مطالبے کی حیثیت رکھتی تھی ۔ انہیں اپنی رائے واپس لینے کا اختیار نہیں باقی رہا تھا ۔ اس لئے اس شوریٰ و استصواب کے بعد امیر یزید کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ بہت صحیح فیصلہ تھا ۔ یہ نہ صرف جائز تھا بلکہ انہیں یہی کرنا چاہئے تھا ۔ استصواب و شوریٰ کے بارے میں طبری لکھتا ہے :۔

" لما مات زیاد دعا معاویۃ بکتاب فقراہ علی الناس باستخلاف یزید ' ان حدث بہ حدث الموت فیزید ولی عہد فاستوثق لہ الناس علی بیعۃ یزید غیر خمسہ نفر "

" جب زیاد کا انتقال ہوگیا تو حضرت معاویہ ؓ نے ایک مکتوب منگایا اور لوگوں کے سامنے پڑھا کہ اگر میری وفات ہوجائے تو یزید میرے ولی عہد ہوں گے اس سے پانچ آدمیوں کے سوا سب لوگوں نے اتفاق کیا اور یزید کی بیعت کا عہد کیا ۔ (۱)

اگر صرف ۵۱ فیصد مسلمان بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہوئے تو بھی ۴۹ فیصد کے اختلاف کو بے وزن قرار دیا جاتا ۔ اور حضرت معاویہ ؓ کے لئے بالکل جائز ہوتا کہ

(۱) (تاریخ طبری ج ۷ حوادث ۵۶ ھ)

وہ اکثریت کی تائید کی بناء پر امیر یزید ؒ کو ولی مقرر کرتے اور یہ ولی عہدی شرعاً بالکل جائز ہوتی چہ جائیکہ انہیں اس وقت پورے عالم اور امت کی تائید حاصل ہوئی ۔ پانچ چھ حضرات کا اختلاف قطعاً قابل لحاظ نہیں تھا ازروئے شریعت اسلامیہ ولی عہدی اور خلافت کے بارے میں اکثریت ہی کی رائے کا اظہار ہے۔ معترضین میں بہت سے حضرات جمہوریت کے دلدادہ ہیں ۔ مگر اس مسئلے میں اصول جمہوریت کو کیوں بھول جاتے ہیں ؟ اس کی رو سے بھی سربراہ کے انتخاب یا ولی عہد مقرر کرنے میں اکثریت ہی کی رائے کا اعتبار کرنا چاہئے ۔ بدگمانی اور بہتان طرازی سبائی مشن کا جزو اعظم ہے ۔ اس کی مثالیں اس بحث میں بھی ملتی ہیں ۔ استصواب رائے عامہ اور جمہور اہل سنت کی رائے معلوم کرنے کے لئے حضرت معاویہ ؓ کا بے مثال اہتمام تاریخ کا ایسا روشن واقعہ ہے کہ اس کا انکار سبائی بھی نہیں کرسکے ۔ اور سبائی ذہنیت رکھنے والے مورخین بھی اسے بیان کرنے پر مجبور ہوگئے ۔ لیکن بغض معاویہ ؓ سے مغلوب ہوکر بدگمانی اور دروغ بانی کے حربے سے کام لے کر واقعات کی صورت بگاڑنے کی ناپاک کوشش کی ۔ اس کا ایک نمونہ چند سطریں پہلے آپ دیکھ چکے ہیں ۔ اس سے زیادہ مکروہ نمونہ ملاحظہ ہو ۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں :

" اسی زمانہ میں حضرت معاویہ ؓ نے مختلف علاقوں سے وفود بھی طلب کئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا ۔ " (ص ۱۰۱)

○ تبصرہ : اس ناقابل انکار واقعہ کے اقرار سے اپنا پورا طلسم ٹوٹتے دیکھ کر موصوف نے اسی بدگمانی اور غلط بیانی کے کے سبائی حصار میں پناہ لی ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

> " جواب میں لوگ خوشامدانہ تقریریں کرتے رہے مگر حضرت احنف ؓ بن قیس خاموش رہے ۔ حضرت معاویہ ؓ نے کہا " ابوالبحر تم کیا کہتے ہو ؟ " انہوں نے کہا کہ : " سچ کہیں تو آپ کا ڈر ہے ' جھوٹ بولیں تو خدا کا ڈر ۔ امیرالمومنین آپ یزید ؒ کے شب و روز جلوت و خلوت آمد و رفت ہر چیز کو خوب جانتے ہیں اگر اس کو اللہ کے نزدیک اور اس امت کے لئے واقعی پسندیدہ جانتے ہیں تو اس کے بارے میں کسی سے مشورہ نہ کیجئے اور اگر آپ کے علم میں وہ اس سے مختلف ہے تو آخرت کو جاتے ہوئے دنیا اس کے حوالے کرکے نہ

جائیے - رہے ہم تو ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ جو حکم ملے
اس پر سمعنا واطعنا کہہ دیں - " (ص ۱۵۲)

○ تبصرہ: خوشامدانہ تقریر والے فقرے کے متعلق تو اتنا کہنا کافی ہے کہ **سبحانک هذا بهتان عظیم** - " بغیر کسی دلیل کے ان صالح بزرگوں پر جو جمہور مسلمین کے نمائندے بن کر آئے تھے " خوشامدی " اور خائن ہونے کا الزام لگانا بڑی شرمناک جسارت ہے یہ حضرات جو ایک بہت بڑے علاقے کے مسلمانوں کے قائد اور نمائندے تھے جن پر وہاں کے مسلمان اعتماد کرتے تھے ' ان میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے ' انہیں بغیر دلیل و ثبوت " خوشامدی " کہہ کر ان پر حق پوشی و باطل پروری کا غلط الزام لگانا ' افتراء پردازی کا بہت مکروہ نمونہ ہے - (۱)

حضرت احنف رض بن قیس کی طرف جو تقریر منسوب کی گئی ہے وہ بھی کسی سبائی مفتری کی گڑھی ہوئی ہے - اور موصوف پر بہتان و افترا ہے - اس تقریر کے اول و آخر میں جو تناقض ہے وہ بتا رہا ہے کہ یہ کسی فہیم اور دیندار شخص کا کلام نہیں ہو سکتا - یہ حضرت احنف رض بن قیس کا قول نہیں بلکہ کسی سبائی کا گڑھا ہوا مقولہ ہے جسے بغض صحابہ رض کی شدت نے سرسام میں مبتلا کر کے اول فول بکنے پر مجبور کر دیا تھا - ملاحظہ ہو اول کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رض کو امیر یزید کی ولی عہدی کا مشورہ دینے کو حکم الٰہی کے خلاف سمجھتے ہیں - اور اس کے ارتکاب سے انہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خوف ہے اسے معصیت سمجھتے ہیں - مگر آخر میں بلا تکلف یہی مشورہ دیتے ہیں - یعنی یہ کہتے ہیں کہ آپ بغیر کسی سے مشورہ لئے ہوئے بلا تکلف یزید کو ولی عہد مقرر کر دیجئے - سوال یہ ہے کہ جب یہ چیز معصیت تھی تو پھر اس کا مشورہ دینے اور اس کے بارے میں حضرت

(۱) ایک کتابچہ جس کا نام شہید کربلا ہے کراچی کے ایک بڑے عالم دین نے لکھا تھا - یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اس میں بھی یہ فقرہ ان متقی بزرگوں کے متعلق لکھا گیا ہے - کتابچہ مذکور میں استخلاف یزید کے مسئلے پر بالکل مودودی صاحب کے زاویہ نظر سے گفتگو کی گئی ہے - دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ اگر اسے خلافت و ملوکیت کے اس حصے کا ثنیٰ یا معنوی فوٹو اسٹیٹ کہا جائے تو بے جا نہیں - گمراہ کن ہونے میں کتابچہ مذکور " خلافت و ملوکیت " سے کسی طرح کم نہیں - اس کتابچے کے مصنف کا نام اگر پوشیدہ کر دیا جائے تو قاری اسے کسی ہوشیار شیعہ کی تصنیف سمجھے گا -

معاویہؓ کی اطاعت کا وعدہ کرنے کے کیا معنی ؟ مسلمہ اصول ہے کہ امیر کی اطاعت صرف جائز امور میں جائز ہے نہ کہ معصیت میں **لاطاعتہ للمخلوق فی معصیۃ الخالق -**" پر سمعنا واطعنا" کے کیا معنی ؟ اس سے عیاں ہے کہ حضرت احنفؒ بن قیس کی طرف قول مذکور کی نسبت بالکل غلط ہے - یہ کسی سبائی نے اپنی طرف سے وضع کرکے ان کی طرف منسوب کردیا ہے - لیکن بالفرض ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ یہ انہیں کا قول ہے تو بھی حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا - بس اختلاف کرنے والے بجائے پانچ کے چھ ہوجاتے ہیں - لاکھوں مسلمانوں کے اتفاق کے سامنے پانچ چھ حضرات کے اختلاف کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی - اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان پانچ حضرات کا اختلاف بھی ثابت نہیں -

بالفرض **کفرض المحال** یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ان سب وفود نے خوشامد کی راہ سے امیر یزید" کی ولی عہدی کی رائے دی - لیکن رائے تو بہرحال ان کی بھی تھی - مسلمانوں کے قائدین اور نمائندوں (جن میں بعض صحابیؓ بھی تھے) کی تائید کے بعد ازروئے شریعت حضرت معاویہؓ کے لئے امیر یزید کو ولی عہد بنانا یقیناً جائز بلکہ مستحب و موکد ہوگیا تھا - ولی عہدی یا خلافت کے لئے انتخاب شرعاً کثرت رائے سے ہوتا ہے - رائے دینے والوں کا جذبہ خواہ کچھ بھی ہو - دل چیر کر دیکھنا اور سینہ کا ایکسرے کرکے جذبہ محرکہ کی جستجو کرنا نہ شرعاً جائز ہے ' نہ عقلاً و اخلاقاً -

جذبہ کے سلسلے میں دو لفظ اور عرض کرنا ہیں - حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ارباب حل و عقد کی تجویز پر ولی عہد بنایا یا یوں کہئے کہ اپنے بعد انہیں اپنا جانشین بنانے کی اجازت دی - ان ارباب حل و عقد میں وہ سبائی منافق بھی تو تھے جو شیعان علیؓ کے نام سے مشہور تھے - اور بعد کو شیعان حسنؓ کے نام سے بھی مشہور ہوئے - اس ولی عہدی کی تائید بلکہ ان کی تحریک میں شرکت کا جذبہ محرکہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ تھا کہ خلافت میں وراثت جاری ہوجائے اور اقتدار صرف اولاد علیؓ کے ساتھ مخصوص رہے - پھر ان کے ساتھ مل کر اور انہیں قابو میں کرکے اپنے باطل مذہب کی اشاعت کی جائے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر تباہ کیا جائے - حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے واقعات ہمارے اس بیان کے شاہد ہیں - اور ان شیعوں کی بدنیتی کا پردہ کررہے ہیں - مودودی صاحب کے کوئی شاگرد رشید ارشاد فرمائیں کہ ان سبائیوں کی اس ناجائز اور مکروہ نیت کی وجہ کیا حضرت علیؓ پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ انہوں نے حضرت حسنؓ کو ولی عہد کیوں بنایا ؟ یا یہ کہ موصوف خلیفہ کیسے ہوگئے جبکہ ولی عہدی کا

مشورہ دینے والوں کی نیت درست نہ تھی؟ یا ایسے لوگوں کے کہنے سے حضرت علیؓ عنہ نے انہیں اپنا جانشین کیوں بنادیا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو حضرت معاویہؓ پر بھی اس بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس تفصیل سے یہ واقعہ اظہر من الشمس ہوگیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا شرعاً و اخلاقاً ہر طرح جائز تھا۔ اور اس پر اعتراض و طعن کرنا بالکل غلط بلکہ معصیت ہے۔ معترضین کے پاس اپنے لغو اعتراض کی کوئی وجہ و توجیہ نہیں۔ صرف بغض معاویہؓ نسلی تعصب کا جذبہ جاہلی ان کے اعتراض کا حقیقی محرک ہے۔

یہ بات بھی صاف کردینا مناسب ہے کہ ایک تاریخی روایت میں مندرجہ بالا پانچ حضرات کی طرف یزید" کی ولی عہدی کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کی جو دلیل منسوب کی گئی ہے۔ وہ روایت ثابت نہیں۔ لیکن بطور مفروضہ ثبوت تسلیم کرلینے کے بعد عرض ہے کہ وہ دلیل بالکل کمزور ہے۔ اول تو اس لئے کہ بیٹے کو ولی عہد بنانا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ آں محترم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد خلیفۃ المسلمین بنانے پر رضا مندی کا اظہار فرمایا۔ زخمی ہونے کے زمانہ میں انہیں امامت صلوٰۃ کے لئے اپنا خلیفہ بنایا۔ ہم واضح کرچکے ہیں۔ یہ نظیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے کافی ہے۔

لیکن بالفرض یہ نظیر بھی نہ ہوتی تو بھی دلیل صحیح نہ ہوتی۔ کیونکہ حضرات خلفاء اربعہ کا کسی فعل کو نہ کرنا اس کے عدام جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ان حضرات خلفاء نے حکومت اسلامیہ کا کوئی سکہ نہیں ڈھلوایا۔ تو کیا امیر المومنین عبدالملک" کا سکہ ڈھلوانا کوئی ناجائز کام تھا۔ ان حضرات نے دفاعی ضروریات کے لئے مسلمانوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عشر و خمس کی آمدنی ان اخراجات کے لئے کافی ہوتی تھی۔ تو کیا جہاد کے لئے بوقت ضرورت ٹیکس لگانا ممنوع اور ناجائز ہے؟ ان حضرات کے زمانہ میں فقہ کی کوئی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ تو کیا اس کی تدوین کرنا ناجائز تھا؟ اس لئے بناء اختلاف بالکل کمزور تھی۔ (۱) اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف بالکل صحیح تھا۔ حضرت معاویہ خود مجتہد تھے۔ ان پر کسی کی تقلید واجب نہ تھی۔

(۱) اس موقع پر معترضین مندرجہ ذیل روایت ذکر کرتے ہیں جو اختصار کے ساتھ مودودی صاحب نے بھی ذکر کی ہے:

مسئلہ استخلاف یزید میں جب مخالفین معاویہؓ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں کسی طعن اور اعتراض کے لئے کوئی راہ نہیں پاتے تو نفسی مغالطہ دہی کی راہ اختیار کرتے ہیں ۔

" اس کے بعد حضرت حسینؓ بن علیؓ اور عبداللہؓ زبیرؓ وغیرہ خود جاکر حضرت معاویہؓ سے ملے اور ان سے کہا کہ آپ کے سامنے تین صورتیں رکھتے ہیں جو آپ کے پیش رووں کی سنت ہے ۔

نمبر۱: آپ وہ کام کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو متعین نہیں فرمایا ۔ بلکہ مسلمانوں کی رائے عامہ پر چھوڑدیا ۔ "

نمبر۲: یا وہ کام کریں جو حضرت ابوبکرؓ عنہ نے کیا کہ ایسے شخص کا نام پیش کیا جو نہ ان کے خاندان کا ہے اور نہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے اور اس کی اہلیت پر سب مسلمان متفق ہیں ۔ "

نمبر۳: یا وہ صورت اختیار کریں جو حضرت عمرؓ نے کی کہ اپنے بعد کا معاملہ چھ آدمیوں پر دائر کردیا ۔ "

" اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے ۔ نہ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ مگر معاویہؓ کو اس پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ پر بیعت مکمل ہوچکی ہے اس کی مخالفت آپ لوگوں کو جائز نہیں ہے ۔ "

ہمارے نزدیک یہ روایت بالکل جعلی ' ہے اور کسی سبائی یا سبائیت زدہ کی گڑھی ہوئی ہے ۔ یہ حضرات اس سے بالکل بری ہیں ۔ اسے موضوع سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں استدلال اس قدر ضعیف ہے اور وجہ اختلاف اس قدر کمزور اور بے بنیاد ہے کہ ان بزرگان دین کا اس کی بنیاد پر اختلاف کرنا بالکل بعید از قیاس ہے ۔

۱ ۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نصب خلیفہ کو ان تین صورتوں میں منحصر کردینے کی کیا دلیل تھی ؟ اور کس دلیل شرعی کی بناء پر چوتھی صورت اختیار کرنا ممنوع تھا ؟ جب اس کی کوئی دلیل شرعی کیا عقلی بھی موجود نہیں ہے تو اس مطالبے کے کیا معنی اور اس پر اصرار کو جائز کیسے کہا جاسکتا ہے ؟

۲ ۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ ان حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیوں نہیں کیا ؟ اس کا بھی کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکتا ۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس مطالبے کے کیا معنی ؟

مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

" پھر حضرت معاویہؓ نے مدینے کے گورنر مروان بن الحکم کو لکھا کہ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں کسی کو جانشین مقرر کردوں ۔ لوگوں سے پوچھو کہ جانشین مقرر کرنے کے معاملے میں وہ کیا کہتے ہیں ۔ مروان نے اہل مدینہ کے سامنے یہ بات پیش کی ۔ لوگوں نے کہا کہ ایسا کرنا عین مناسب ہے ۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے مروان کو پھر لکھا کہ میں نے جانشینی کے لئے یزید کو منتخب کیا ہے ۔ مروان نے یہ معاملہ اہل مدینہ کے سامنے رکھ دیا اور مسجد نبوی میں تقریر کرتے ہوئے کہا " امیر المومنین نے تمہارے لئے مناسب آدمی کو تلاش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنایا ہے ۔ یہ بہت اچھی رائے ہے ، جو اللہ نے ان کو سجھائی ۔ اگر وہ اس کو جانشین مقرر کررہے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں ۔ ابوبکرؓ ، عمرؓ نے بھی جانشین مقرر کئے تھے اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اٹھے اور انہوں

۳ ۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ " اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے " خلاف واقعہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو صورت اختیار فرمائی ان حضرات کو اس کا علم تھا ، اور وہ ان تین صورتوں میں داخل نہیں تھی ، اور اس کا علم بھی ان حضرات کو تھا ، ان حضرات کا چوتھی صورت سے لاعلمی کا اظہار کیسے صحیح کہا جاسکتا ہے ؟ اس لئے یہ ان کا قول نہیں ہوسکتا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی دیدہ و دانستہ غلط بیانی نہیں کرسکتے ۔

نمبر ۴ : ان حضرات کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے جو فرمایا کہ " اب تو یزید" کے ہاتھ پر بیعت مکمل ہوچکی ہے ۔ اس کی مخالفت آپ لوگوں کو جائز نہیں " اس معقول اور مدلل بات کا یہ حضرات کوئی جواب نہ دے سکے ۔

اور بغیر اس کا جواب دیئے ہوئے اپنی بات پر اصرار کرنا حق پسندی کے خلاف اور ان حضرات کی شان سے فروتر ہے ۔ ان وجوہ سے بالکل عیاں ہے کہ یہ روایت بالکل موضوع جھوٹی ، اور سبائیوں کی گڑھی ہوئی ہے جن بزرگوں کی طرف یہ اقوال منسوب کئے گے ہیں. وہ ان سے بالکل بری ہیں اور یہ ان پر سبائیوں کا افتراء ہے ۔

نے کہا " جھوٹ بولے تم اے مروان اور جھوٹ کہا معاویہؓ نے۔
تم نے ہرگز امت محمدیہ کی بھلائی نہیں سوچی۔ تم اسے قیصریت بنانا
چاہتے ہو کہ جب ایک قیصر مرا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا آگیا۔ یہ
سنت ابوبکرؓ، و عمرؓ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں سے کسی کو
جانشین نہیں بنایا تھا "۔ (ص ۱۵۰ و ۱۵۱)

پھر چند سطروں بعد لکھتے ہیں:

اس مجلس میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کی طرح حضرت حسینؓ
، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ نے بھی یزید کی ولی
عہدی ماننے سے انکار کردیا "۔ (ص ۱۵۰ و ۱۵۱)

○ تبصرہ: عام طور پر مخالفین حضرت معاویہؓ اس واقعہ کو اسی طرح ذکر کرتے ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا چار حضرات کے اختلاف کا تو تذکرہ کرتے ہیں، مگر اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے کہ ہزاروں اہل مدینہ کے اس مجمع میں ان چار حضرات کے سوا کوئی آواز تجویز مذکور کے خلاف نہیں اٹھی۔ اور پھر غل مچادیتے ہیں کہ دیکھو اہل مدینہ ولی عہدی یزید کے خلاف تھے ۔ بلاشبہ یہ مغالطہ دہی کی ایک شرمناک مثال ہے۔ حضرت مروان نے مسجد نبوی میں یہ تقریر کی تھی۔ اس کا مقصد بھی استفسار تھا۔ مجمع میں صرف یہی حضرات صحابی نہیں تھے بلکہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کرام شریک تھے۔ ان کے علاوہ اجلہ تابعین اور عام تابعین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ اگر انہیں بھی اس سے اختلاف ہوتا تو یقیناً اجتماعی طور پر اس کا اظہار کرتے، سب نہیں تو کم از کم ان کی اکثریت حضرت عبدالرحمٰنؓ کی تائید کرتی۔ لیکن مذکورہ بالا حضرات کے سوا مجمع میں سے کسی نے بھی ان کی تائید نہیں کی۔ اس سے یہ واقعہ اظہر الشمس ہوجاتا ہے کہ سب اہل مدینہ نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے بخوشی خاطر اتفاق کیا تھا۔ اس حقیقت واقعہ کو چھپانے کے لئے مخالفین حضرت معاویہؓ مسجد نبوی شریف کے اس اجتماع کی پوری روئداد نہیں بیان کرتے، اور اس کا صرف اتنا حصہ بیان کرتے ہیں جو ان کے مطلب کے موافق ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے۔

عرض مزید یہ ہے کہ یہ معاملہ تو وفود آنے کے بعد کا ہے۔ ان حضرات نے بقول معترضین اس سے پہلے ہی زیر بحث مسئلہ میں اختلاف کیا تھا اور یہ اختلاف چھپنے والی چیز بھی نہ تھی۔ جب یہ حضرات اتنے با اثر تھے جتنا ظاہر کیا گیا ہے تو عالم اسلامی میں کہیں حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھی؟ عراق و مصر میں تو سبائیوں کی

بھی خاصی تعداد موجود تھی ۔ جو فتنہ و فساد برپا کرنے کے لئے موقع کے منتظر رہتے تھے ۔ انہوں نے بھی کوئی حرکت نہ کی ۔ اس سکون و سکوت سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ عالم اسلامی کی رائے عامہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھی اور ان حضرات کے اختلاف کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا ۔ ان حضرات نے صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا تھا ۔ یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ اہل مدینہ کی رائے ہے ۔ اگر اہل مدینہ کی ایک معتدبہ تعداد ان سے متفق ہوتی تو یہ یقیناً ان سب کی طرف سے بات کرتے ۔ اور اپنی رائے کو سب اہل مدینہ کی رائے صراحۃً کہتے ۔ اس لئے کہ موقع اس کا متقضی تھا ۔ اپنی ذاتی رائے کا اظہار خود اس امر کی علامت ہے کہ مدینہ کے عوام و خواص ان سے متفق نہ تھے ۔ بلکہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی رائے قبول کرلی تھی ۔

پھر یہ مسجد نبوی شریف میں منعقد ہونے والا اجتماع مذکور عام اجتماع تھا ۔ جس میں خاصی تعداد میں صحابہ کرامؓ شریک تھے ۔ اجلہ تابعین بھی بکثرت تھے ۔ اس کے علاوہ عوام تابعین صالحین کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی ۔ آزادانہ رائے معلوم کی گئی ۔ کسی کے اثر کا کوئی سوال نہ تھا اگر کوئی شخص حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ اور ان کے ہم خیال چار حضرات موصوفین سے متفق ہوتا تو ضرور ان کی تائید کرتا ۔ معلوم ہوا کہ ان سے کوئی بھی متفق نہ تھا ۔

مودودی صاحب لکھتے ہیں :

" مدینے کے باہر حضرت حسینؓ ، حضرت ابن زبیرؓ ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ ان سے ملے ۔ حضرت معاویہؓ نے ان سے ایسا درشت برتاؤ کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر کے چلے گئے اس طرح مدینے کا معاملہ آسان ہوگیا ۔ "

(ص ۱۰۲)

یہ روایت بھی اسی بے سند روایت کا ایک ٹکڑا ہے جو انہوں نے ابن اثیر سے نقل کی ہے اس میں بھی سبائیت کی بدبو آرہی ہے ۔ اور منصف مزاج آدمی بہت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کسی شیعہ کا لگایا ہوا پیوند ہے ۔ بے سند ہونے کے عیب سے قطع نظر اس کا

جھوٹا ہونا اس سے ظاہر ہے کہ خود یہ حضرات جو بقول معترض اس " درشت برتاؤ " کی وجہ سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے پھر جاکر حضرت معاویہؓ سے ملے ۔ اگر " درشت برتاؤ " کی حکایت صحیح ہوتی تو یہ حضرات دوبارہ ان سے کیوں ملتے ؟

۔۔۔۔ جھوٹ کی دوسری نشانی یہ ہے کہ ایک طرف تو ان حضرات کو اس قدر با اثر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کے بغیر استخلاف ہی صحیح نہیں ہو سکتا تھا دوسری طرف ان کے ساتھ اس " درشت برتاؤ " کا کوئی بھی اثر نہ ہوا ۔ اور پورے عالم اسلامی تو کیا حرمین میں بھی اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ہوا کوئی سبائی ذہن ہی ان متناقض باتوں کا قائل ہو سکتا ہے ۔

ابن اثیر کی روایت کا دوسرا ٹکڑا بھی اس کی تکذیب کررہا ہے جو درج ذیل ہے ۔

" پھر حضرت معاویہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں یہ بات پہنچی تھی کہ انہوں نے (حضرت معاویہؓ نے) (حضرت) حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کا تذکرہ کیا اور یہ کہا کہ اگر ان لوگوں نے بیعت نہ کی تو میں انہیں قتل کردوں گا ۔ (حضرت معاویہؓ نے) ان سے (ام المومنینؓ) ان حضرات کی شکایت کی تو (ام المومنینؓ نے) انہیں (حضرت معاویہؓ کو) نصیحت فرمائی ۔ اور یہ فرمایا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم انہیں قتل کی دھمکی دیتے ہو ۔ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ اے ام المومنینؓ (ان حضرات کا) مرتبہ اس (قتل کی دھمکی سے) سے بلند و برتر ہے (یعنی یہ خبر آپ کو غلط ملی ہے میں ان حضرات کے قتل کا ارداہ کیسے کرسکتا ہوں یا انہیں یہ دھمکی کیسے دے سکتا ہوں) ۔ لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے یزید کے لئے بیعت لے لی ہے اور (ان حضرات) کے علاوہ دوسروں نے ان سے بیعت کرلی ہے کیا آپ کی رائے میں جو بیعت مکمل ہو چکی اسے میں توڑدوں ؟ ام المومنین نے فرمایا (ان حضرات) سے نرمی کا برتاؤ کرتے رہو انشاء اللہ وہی کریں گے جو پسند کرتے ہو "

اس روایت سے مندرجہ ذیل امور روز روشن کی طرح روشن ہورہے ہیں ۔

(۱) ام المومنینؓ تک قتل کی دھمکی کی خبر پہنچی ۔ لیکن مخبر کون تھا ' اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ۔ اگر " درشت برتاؤ " والا مبینہ واقعہ صحیح ہوتا تو جن پر واقعہ گذرا تھا وہ خود ام المومنینؓ سے اس کا تذکرہ کرتے ۔ خصوصاً حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما جو ان کے بھائی تھے ۔ روایت میں ام المومنینؓ کے الفاظ " بلغنی " (مجھے یہ بات پہنچی ہے) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خبر کا درجہ افواہ کا تھا ۔ تن محترمہ نے احتیاطاً اس کا تذکرہ کرکے

اطمینان فرمالیا - غالبًا یہ افواہ کسی سبائی نے اڑائی ہوگی - آں معظمہ پر ظاہر ہوگیا کہ افواہ غلط اور جھوٹی ہے -

(۲) " درشت برتاؤ " کا زیر بحث واقعہ افواہًا بھی ان تک نہیں پہنچا ' ورنہ خبر کا عنوان یہ نہ ہوتا کہ حضرت معاویہ؄ نے ان حضرات؄ کا تذکرہ کیا " بلکہ یہ ہوتا کہ انہوں نے ان حضرات کو " بالشافہ قتل کی دھمکی دی ہے " معلوم ہوا کہ وہ قصہ بالکل جھوٹا ہے -

(۳) ام المومنین علی زوجہا المصطفٰی و علیہا الصلوۃ والسلام امیر یزید" کی ولی عہدی سے متفق تھیں اور حضرت معاویہ؄ کے اس اقدام پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا -

(۴) جن حضرات نے بیعت سے انکار فرمایا تھا ' ان کا اختلاف شدید نوعیت کا نہ تھا - اس لئے ام المومنین؄ کو توقع تھی کہ وہ بھی بیعت کرلیں گے -

(۵) اگر " اثر " کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جو اثر اہل مدینہ پر ام المومنین؄ کا تھا وہ کسی دوسرے کا نہیں ہوسکتا تھا - وہ جب اس تجویز سے متفق اور اس مسئلے میں حضرت معاویہ؄ کی موید تھیں ' تو اہل مدینہ کا اس سے اختلاف کرنا بعد از قیاس ہے - آں معظمہ سلام اللہ علیہا کی تائید و توثیق اس کی علامت ہے کہ سب اہل مدینہ صحابہ؄ و تابعین ولی عہدی یزید کے بارے میں متفق تھے -

ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ " درشت برتاؤ " والی یہ روایت بالکل غلط ہے اور کسی سبائی کی وضع کی ہوئی من گھڑت کہانی ہے - جس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں -

پھر لکھتے ہیں :-

> " پھر انہوں نے مکے کا رخ کیا اور ان چاروں اصحاب کو خود شہر کے باہر بلا کر ان سے ملے ' اس مرتبہ ان کا برتاؤ اس کے برعکس تھا جو مدینے کے باہر ان سے کیا تھا - ان پر بڑی مہربانیاں کیں انہیں اپنے ساتھ لئے شہر میں داخل ہوئے پھر تخلئے میں بلا کر انہیں یزید کی بیعت پر راضی کرنے کی کوشش کی - حضرت عبداللہ بن زبیر؄ نے جواب میں کہا کہ " تین کاموں سے ایک کام کیجئے - یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی کو جانشین نہ بنائیے لوگ اسی طرح کسی کو اپنا خلیفہ بنالیں گے جس طرح انہوں نے حضرت ابو بکر؄ کو بنایا تھا ' یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت ابو بکر؄ نے کیا کہ اپنی جانشینی کے لئے حضرت عمر؄ جیسے شخص کو مقرر کیا جن سے ان کا دور پرے کا رشتہ بھی نہ تھا یا

پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت عمرؓ نے کیا کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ تجویز کی اور ان میں ان کی اولاد میں سے کوئی شامل نہ تھا۔ " حضرت معاویہؓ نے باقی حضرات سے پوچھا " آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ " انہوں نے کہا کہ ہم بھی وہی کہتے ہیں جو ابن زبیرؓ نے کہا۔ "

(ص ۱۵۲، ۱۵۳)

اس روایت کو صحیح تسلیم کرلینے کے بعد دو باتیں لازماً تسلیم کرنا پڑیں گی جو اس سے نتیجہ صریح کی طرح واضح ہو رہی ہیں۔

اول :۔ ان حضرات کو امیر یزید" کی خلافت یا ان کی اہلیت خلافت پر کوئی اعتراض نہ تھا، نہ اس سے انہیں کوئی اختلاف تھا۔ انہیں اختلاف صرف حضرت معاویہؓ کے طریق کار یعنی استخلاف سے تھا۔

دوم :۔ اگر استخلاف نہ ہوتا اور حضرت معاویہؓ کے بعد ارباب حل و عقد امیر یزید" کا انتخاب کرلیتے تو یہ سب حضرات ان سے بیعت کرلیتے۔ کیونکہ ان حضرات میں سے کسی نے بھی امیر یزید" پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا اس روایت کو صحیح سمجھ کر نقل کرتے ہیں تو انہیں ان دونوں باتوں کو بھی تسلیم کرنا چاہئے۔ اس سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ چند سطریں پیشتر موصوف نے لکھا ہے کہ " حضرت عبدالرحمٰن کے طرح (ان چاروں حضرات نے بھی) یزید کی ولی عہدی ماننے سے انکار کردیا " بالکل غلط، خلاف واقعہ اور ایک مغالطہ ہے۔ یہ مغالطہ موصوف ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عام طور پر شیعیت نواز سنی تاریخ نگار یہ مغالطہ دیا کرتے ہیں۔ کراچی کے ایک ممتاز عالم دین نے بھی اپنے کتابچے میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ان پانچوں حضرات کے متعلق لکھا ہے کہ " بیعت یزید سے انکار پر ثابت قدم رہے " یہ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔ بیعت یزید" کا تو وہاں تذکرہ بھی نہیں آیا، مسئلہ تو انہیں ولی عہد بنانے کا تھا اور وہ حضرت معاویہؓ کا فعل تھا نہ کہ امیر یزید" کا۔ ان حضرات نے بلکہ مجمع میں سے کسی نے بھی امیر یزید پر کوئی تنقید نہیں کی، نہ ان کی خلافت کی مخالفت کی۔ ان پانچ حضرات نے امیر یزید" کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ انہیں اعتراض صرف طریق کار پر تھا نہ کہ امیر یزید" کی ولی عہدی پر۔

ان حضرات کے اعتراض مذکور کو یزید کی بیعت سے انکار یا ان پر جرح قرار دینا کھلی

ہوئی غلط بیانی اور مغالطہ دہی ہے - سیاق روایت سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انہیں ولی عہد نہ بناتے ارباب حل و عقد انہیں منتخب کرلیتے تو یہ پانچوں حضرات ان پر کوئی اعتراض نہ کرتے اور انہیں خوشی سے خلیفۃ المسلمین تسلیم کرتے -

مودودی صاحب لکھتے ہیں :

" اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ نے کہا : " اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں - اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میرے بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی ' تلوار اس کے سر پر پہلے پڑچکی ہوگی " پھر اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کردو اور اسے تاکید کردو کہ ان میں سے جو بھی میری تردید یا تائید میں زبان کھولے اس کا سر قلم کردے " اس کے بعد وہ انہیں لئے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ " یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا ' یزید کی ولی عہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے بیعت کرلی ہے لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کرلو " اب لوگوں کی طرف سے انکار کا کوئی سوال ہی باقی نہ تھا اہل مکہ نے بھی بیعت کرلی - " (ص ۱۰۳)

اس جھوٹے افسانے کی جگہ کامل ابن اثیر کے بجائے مراثی انیس ودبیر میں تھی - ایسا کھلا ہوا جھوٹ بولنا شیعوں ہی کے شایان شان ہے - کیونکہ ان کے مذہب میں جھوٹ بولنا عبادت اور خوبی ہے - اس روایت کا وضع کرنے والا سبائی کذاب ہونے کے ساتھ احمق بھی تھا - اس وجہ سے اس نے متناقض باتیں کہی ہیں اور دروغ بافی کے جوش میں بھول جاتا تھا کہ میں پہلے کیا کہہ چکا ہوں - ذرا روایت کے لطائف ملاحظہ فرمایئے :

(۱) ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ ان پانچ حضرات کا اثر اتنا تھا کہ اسوقت کا پورا عالم اسلامی ایک طرف اور یہ ایک طرف ہوتے تو پلہ انہیں کا بھاری رہتا - بقول معترضین پورے عالم اسلامی کے قائدین نے امیر یزید کی ولی عہدی تسلیم کرلی مگر انہوں نے تسلیم نہیں کی تو ان کی خلافت ہی منعقد نہیں ہوئی - دوسری طرف اس باثری کے ساتھ یہ بے اثری ظاہر کی جاتی ہے کہ حضرت معاویہ مسجد حرام میں ' مسلمانوں کے مجمع کے سامنے انہیں قتل کردینے کی ہمت کرسکتے ہیں - فیا للعجب مضمون روایت کا یہ تناقض پکار پکار کہہ رہا ہے کہ روایت جھوٹی اور من گھڑت ہے -

(۲) اس سے زیادہ مضحکہ خیز افسانہ یہ ہے کہ تردید تو تردید ' تائید میں بھی زبان کھولنے پر سر قلم کرنے کا حکم دیا جارہا ہے ۔ قصہ وضع کرنے والے کذاب کو یہ یاد نہ رہا کہ ان حضرات کی تائید حاصل کرنا تو حضرت معاویہؓ کا عین مقصود تھا ۔ اس کی مخالفت کیوں فرماتے ؟

(۳) بقول معترض حضرت معاویہؓ کا اقدام تو خلاف شریعت تھا ۔ ایسے موقع پر ان حضرات کے ایسے اتقیاء اور با اثر حضرات پر نہی عن المنکر تو فرض تھا اس منکر پر ان کا سکوت تو بہت مذموم اور معصیت کبیرہ تھا ۔ تو کیا ان حضرات کو حق پوشی اور بزدلی کا مرتکب قرار دیا جائے ؟ جو لوگ اپنی شیعیت کو چھپاتے نہیں ہیں وہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات نے تقیہ کیا تھا ۔ مگر مودودی صاحب اور ان کے ہم شرک مدعی سنیت شیعہ کیا کہیں گے ؟ اگر تقیہ کا سہارا لیں گے تو اپنی نقاب تقیہ الٹ جائے گی ۔ کوئی سنی تو ان بزرگوں کے متعلق اس قسم کا وسوسہ بھی نہیں لاسکتا ۔ اس کا تو فیصلہ یہی ہوگا کہ یہ قصہ بالکل غلط اور سراپا کذب و دروغ ہے ۔

(۴) اہل مکہ کے اتنے بڑے مجمع میں جس میں صحابہؓ کرام بھی تھے ' اجلہ تابعین بھی تھے کیا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ حرم شریف کے اندر حضرت معاویہؓ کے باڈی گارڈ تلواریں کھینچے ہوئے کیوں کھڑے ہیں ؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ یہ شمشیر بکف نوجوان ان پانچ حضرات کے پاس کیوں کھڑے ہیں ؟ اور یہ حضرات خاموش کیوں ہیں ؟ حضرت معاویہؓ کے بجائے انہوں نے خود اپنی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا ؟ اگر ان کے اوپر جبر کیا جارہا ہے تو ان کی طرف بیعت ولی عہدی کی تصویب کا انتساب کیسے صحیح ہوسکتا ہے ؟ راوی نے جو اس اجتماع کا منظر بیان کیا ہے اس کے پیش نظر معمولی فہم کے آدمی کے ذہن میں بھی ان سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا ۔ پھر یہ سوالات کیوں نہیں پیدا ہوئے اس سے عیاں ہے کہ روایت ہی غلط اور من گھڑت ہے ۔

(۵) مکہ معظمہ میں متعدد صحابہ کرام موجود تھے ۔ تو کیا وہ سب بے اثر تھے ؟ یا سب انہیں پانچوں حضرات کے مقلد محض تھے ؟ اور سارا مکہ انہیں کے زیر اثر تھا ۔ ؟ کیا کسی اور صحابی سے کسی کو کوئی تعلق نہ تھا ؟ پھر ان صحابہ نے اپنی رائے کیوں نہ ظاہر کی ؟ اگر انہیں اختلاف ہوتا تو ضرور اس کا اظہار کرتے یا جو لوگ ان کے معتقد اور ان کے زیر اثر تھے اگر کوئی اختلاف رکھتے تو ان سے پوچھتے ؟ یا اختلاف کا اظہار کرتے اس کے معنی یہ ہیں کہ پورا مجمع حضرت معاویہؓ کی رائے سے متفق تھا ۔ اور زیر بحث سبائی روایت بالکل غلط

اور سراپا کذب و دروغ ہے ۔'

یہ حضرات تو مکہ مکرمہ حضرت معاویہؓ سے پہلے پہنچ چکے تھے اور بہت دن سے وہاں مقیم تھے ۔ اتنی مدت میں انہوں نے حق کی اشاعت کی یا نہیں ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟ اگر کی ' اور اپنی رائے لوگوں پر ظاہر کی تو جب مجمع عام میں حضرت معاویہؓ نے ان کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ حضرات ان کی رائے سے متفق ہوگئے ہیں تو اس سے اہل مکہ کا مطمئن ہوجانا تعجب خیز اور خلاف عقل و قیاس ہے ۔ کیا وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکتے تھے کہ کل تک تو یہ حضرات اس ولی عہدی کے شدید مخالف تھے ' آج اس کے موید کیسے بن گئے ؟ اس حیرت انگیز تغیر رائے کا سبب پوچھنا ' اور اس کی دلیل بنیاد کی جستجو دل میں پیدا ہونا تو فطری امر تھا ۔ تعجب ہے کہ کسی نے ان حضرات سے یہ نہیں پوچھا کہ کل تک تو آپ حضرات اسے " کسرویت " اور قیصریت " فرماتے تھے آج یہ خلافت کیسے بن گئی ؟ اور یہ خارق عادت تغیر کیسے پیدا ہوگیا ؟

اگر حضرت معاویہؓ کا امیر یزید کو ولی عہد بنانا شرعاً جائز تھا تو اس پر اعتراض کرنا لغو بلکہ شرعاً ناجائز اور معصیت تھا ۔ اور اگر ناجائز تھا تو اس پر سکوت کرنا ان پانچوں حضرات کے لئے قطعاً جائز نہیں تھا ۔ سکوت کرکے یہ حضرات معصیت کبیرہ کے مرتکب ہوئے (معاذاللہ) ۔ اگر یہ کہا جائے کہ خوف جان کی وجہ سے یہ حضرات معذور تھے ' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے احباب اور مخلصین کے اتنے بڑے مجمع میں اور مسجد حرام کے اندر ان کا یہ خوف کہ حضرت معاویہؓ انہیں قتل کردیں گے بہت تعجب خیز ہے ۔ کیا یہ حضرات اتنا بھی نہ سمجھ سکتے تھے کہ حرم شریف کے اندر خونریزی اور وہ بھی ناحق کرنے کی جسارت حضرت معاویہؓ نہیں کرسکتے ۔ اگر وہ ایسی جرات کریں گے تو خود ان کی جان سلامت نہیں رہ سکتی ۔ بلکہ پورا عالم اسلامی ان کے خلاف کھڑا ہوجائے گا ۔ یہ بات تو بالکل واضح مثل بدیہی تھی ۔ اس کے علم کے باوجود ان حضرات کا خوف زدہ ہونا حیرت انگیز بزدلی کہی جائے گی ۔ دوسرا جواب یہ کہ ان حضرات کے ایسے متقی ' مقتدایان دین کے لئے بخوف جان بھی سکوت جائز نہیں تھا ۔ ان پر تو واجب تھا کہ حق کہتے خواہ اس میں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ۔ کوئی سنی تو ان بزرگان دین کے متعلق اس ناپسندیدہ کردار کا تصور بھی نہیں کرسکتا ۔ وہ تو یہی فیصلہ کرے گا کہ یہ روایت سرتاپا کذب و دروغ کسی سبائی کی وضع کی ہوئی ہے ۔ اور اگر اس میں صداقت کا کوئی شائبہ ہے تو اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حضرت معاویہؓ کی رائے سے متفق ہوگئے تھے ۔ اور ولی عہدی یزید پر راضی

تھے - اسی لئے انہوں نے اختلاف نہیں فرمایا - بلکہ شاید وہ حضرت معاویہؓ سے پہلے مکہ مکرمہ اسی مقصد سے آئے ہوں کہ پہلے سے اہل مکہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کرکے انہیں حضرت معاویہؓ کی موافقت کی ترغیب دیں - (۱)

سبائی کارخانہ دروغ بافی کی اس مصنوعہ موضوعہ روایت کو صحیح تسلیم کرنے سے ان پانچوں بزرگان دین کا جو افسوسناک کردار سامنے آتا ہے - اسے ایک سنی ذہن کسی طرح نہیں باور کرسکتا - اس لئے یہ روایت قطعاً سراپا کذب و دروغ ہے - ان حضرات کا کردار بہت بلند تھا - یہ اولیاء اللہ تھے اور انہوں نے سید المزکین خاتم النبیین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی - ان کے کردار میں پستی غیر ممکن تھی - مزید یہ کہ بالفرض اس جھوٹی روایت کو اگر سر سے پیر تک تسلیم کرلیا جائے ' تو بھی مخالفین حضرت معاویہؓ کا مدعا نہیں حاصل ہوتا -

اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان پانچوں حضرات کو بزور شمشیر قبول بیعت پر مجبور کیا گیا اور اہل مکہ نے ان کے اعتماد پر ان کے سکوت سے دھوکا کھاکر ' یا کسی خوف

---

(۱) یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ کراچی کے ایک بزرگ عالم دین نے اپنے ایک کتابچے میں اس روایت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ :

" حجاز کے عام مسلمانوں کی نظریں اہل بیت اطہار پر لگی ہوئی تھیں خصوصاً حضرت حسین بن علیؓ پر جن کو وہ بجا طور پر حضرت معاویہؓ کے بعد مستحق خلافت سمجھتے تھے - "

یہ بات بالکل غلط اور بالکل بے اصل ہے - تاریخ میں اس کے ثبوت کا نام و نشان بھی نہیں ملتا - یہ موصوف کا طبع زاد افسانہ ہے ' جسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں - اس کا محروم ثبوت ہونا ہی اسے غلط کہنے کے لئے کافی ہے - مگر اس کے علاوہ اس کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اہل مدینہ و اہل مکہ میں سے کسی نے اس پوری مدت استصواب میں حضرت حسینؓ یا بقول قائل موصوف اہل بیت اطہار میں سے کسی کا نام بھی نہیں لیا - بلکہ کسی کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کیا - اگر بقول قائل موصوف ان کی " نظریں " ان حضرات پر لگی ہوتیں تو ضرور ان کا تذکرہ کرتے - اور حضرت حسینؓ یا کسی اور کا نام پیش کرتے - مزید یہ کہ اہل حرمین جن سے استصواب کیا گیا تھا شیعہ نہیں تھے بلکہ سب سنی تھے - وہ قائل موصوف کی طرح خلافت کے لئے ان حضرات کے کسی استحقاق کے قائل نہ تھے - اس غلط نظریئے کو ان کی طرف منسوب کرنا سخت غلطی ہے اور ان حضرات پر بہتان و افتراء ہے -

کی وجہ سے بیعت کرلی ۔ لیکن اس مفروضہ سے نتیجہ کیا نکلتا ہے ؟ شرعی نقطہ نظر سے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ولی عہدی یزید کی بیعت منعقد ہوگئی اور باتفاق اہل مکہ و اہل مدینہ امیر یزید ولی عہد یعنی حضرت معاویہؓ کے بعد خلیفۃ المسلمین منتخب ہوگئے قانون شریعت اور دستور اسلامی کا یہی فیصلہ ہے ۔ حضرت عبادۃ ابن الصامت رضی اللہ عنہا کی مندرجہ ذیل حدیث دیکھئے ۔

قال دعانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبا یعنا فکان فیما اخذ علینا ان با یعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا و مکر ھنا و عسرنا ویسر نا و علی اثرۃ علینا ۔

حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا ور ہم نے آپ سے بیعت کی (یعنی عہد کیا) ' پس جن باتوں پر ہم سے بیعت لی (عہد لیا) (ان میں سے ایک یہ تھی کہ) کہ ہم سے عہد لیا کہ ہم اپنے امیر کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں خواہ وہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند اور خواہ ہمیں اس پر عمل کرنے میں دشواری ہو یا سہولت اور خواہ ہمارے اوپر کسی کو بے وجہ ترجیح دی جائے ۔

(مسلم شریف ج ۲ مع نووی کتاب الامارۃ)

اس حدیث سے روشن ہے کہ اگر حضرات اہل مدینہ اور اہل مکہ نے نیز پانچ حضرات نے ناگواری کے ساتھ بھی ولی عہدی یزید کے میں حضرت معاویہؓ کی اطاعت کرلی ' یعنی ان کی بات مان لی ' خواہ اقرار سے یا سکوت سے ' تو وہ اطاعت امیر ہوگئی جس کے معنی یہ ہیں کہ بیعت یزید ہوگئی اور ان کی ولی عہدی یا دوسرے الفاظ میں خلافت منعقد ہوگئی ۔ جب مسئلہ ان کے سامنے آیا تھا تو ان میں سے ہر شخص کو اختلاف کا حق تھا ۔ لیکن انہوں نے اختلاف نہیں کیا اور اقرار یا سکوت سے اسے منعقد کرلیا ' خواہ بادل نا خواستہ ہی منظور کیا ہو تو اب کسی کو اختلاف کا حق باقی نہیں رہا ۔ اور قطعی طور پر ازروئے قانون کی دستور اسلامی (ISLAMIC CONSTITUTIONAL LAW) امیر یزید کی خلافت منعقد ہوگئی ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت خلافت سے حضرت سعد بن عبادہؓ نے اختلاف کیا تھا ۔ اس اختلاف کا کیا اثر ہوا ؟ جب جمہور مہاجرین و انصار نے آں محترم سے بیعت کرلی تو

"ان کی خلافت منعقد ہوگئی۔ اگرچہ حضرت سعدؓ ان کی خلافت پر راضی اور خوش نہ تھے، لیکن ان کی خلافت تسلیم کرلی۔ اور ان کے خلیفہ و امام ہونے سے انکار نہیں کیا۔

اسی طرح حضرت علیؓ کا جب انتخاب ہوا تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بادل ناخواستہ ان سے بیعت کی تھی اور خود مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ

> "حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جن حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے دو ہزار شورشی دارالخلافہ پر مسلط تھے۔ خلیفہ وقت کو قتل تک کر گزرے تھے۔ خود دارالخلافہ میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہم خیال موجود تھی نئے خلیفہ کے انتخاب میں وہ لوگ یقیناً شریک ہوئے اور ایسی روایات بھی بلاشبہ موجود ہیں کہ جب حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو ان لوگوں نے بعض حضرات کو زبردستی بیعت پر مجبور کیا تھا۔" (ص ۳۳۰)

صرف مودودی صاحب ہی کے نزدیک نہیں بلکہ اہل سنت کے نزدیک بھی حضرت علیؓ کی بیعت منعقد ہوگئی ہے۔ اس نظیر سے منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زیر بحث صورتحال میں اگر یہ خلاف واقعہ بات بھی فرض کرلیں کہ حضرات اہل مکہ اور اہل مدینہ نے ولی عہدی یزیدؒ پر کراہت و ناگواری کے ساتھ بیعت کی تھی تو بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ امیر یزید کی ولی عہدی یا یوں کہئے کہ بیعت خلافت منعقد ہوگئی، اور وہ جائز ولی عہد اور جائز خلیفہ تھے۔ رہا شخصیتوں کے تفاوت و درجات کا معاملہ تو اس کا کوئی اثر اس مسئلہ پر نہیں پڑسکتا۔ اس لئے کہ شریعت اسلامیہ کا قانون چھوٹے بڑے سب کے لئے یکساں ہے۔ اس میں تفاوت مراتب کا کوئی اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ مودودی صاحب خود لکھتے ہیں :-

> "خدا کی شریعت بے لاگ ہے۔ اس میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ کسی کے مرتبہ کا لحاظ کرکے ہم غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کریں۔" ص ۳۴۲

جس طرح "غلط" کو "صحیح" بنانے کی کوشش کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ اسی طرح صحیح کو غلط بنانے کی کوشش بھی ممنوع اور ناجائز ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ صحابہؓ اور حضرت معاویہؓ پر اعتراض کرنے والوں نے، صرف ان بزرگوں پر اعتراض اور طعن کرنے کے لئے کس طرح بار بار

شریعت اسلامیہ مقدسہ کو نظرانداز کیا ہے۔ اس موقع پر بھی شریعت تو یہ کہتی ہے کہ امیر یزید" کی ولی عہدی کی بیعت منعقد ہوگئی تھی۔ امت نے انہیں حضرت معاویہؓ کے بعد ان کا جانشین یعنی خلیفۃ المسلمین منتخب کرلیا تھا اور ان کا اس منصب پر فائز ہونا بالکل جائز تھا۔ مگر یہ معترض اور مخالف حضرات شریعت کے اس واضح حکم کو نظرانداز کرکے اپنی طرف سے یہ حکم اور فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کی ولی عہدی ناجائز تھی۔ اور منعقد نہیں ہوئی۔ کیا یہ شریعت کو نظرانداز کرنا نہیں ہے؟ یہ تو صرف نظرانداز کرنا نہیں بلکہ کھلا ہوا شریعت کا مقابلہ اور معارضہ ہے۔ شریعت جس چیز کو جائز کہہ رہی ہے اسے یہ لوگ ناجائز کہہ رہے ہیں۔

حقیقت واقعہ

یہ تاریخی واقعہ تو مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب حضرات اہل مدینہ سے حضرت معاویہؓ کے فرمانے کے بموجب حضرت مروانؓ نے نفس ولی عہدی کے متعلق استفسار کیا تو سب نے اس کی تائید کی مودودی صاحب خود لکھتے ہیں:

> "..... لوگوں سے پوچھو کہ جانشین مقرر کرنے کے معاملے میں وہ کیا کہتے ہیں؟ مروان نے اہل مدینہ کے سامنے یہ بات پیش کی، لوگوں نے کہا کہ ایسا کرنا عین مناسب ہے" (ص ۱۵۰)

گویا نفس ولی عہدی کے مسئلے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا اور سب اہل مدینہ جن میں یہ پانچوں حضرات بھی شامل تھے جن کا اختلاف نقل کیا جاتا ہے، اس مسئلے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ متفق الرائے تھے۔ اس سچے واقعہ کے پیش نظر اس مرحلے پر بالکل فطری بات ہے کہ لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ حضرت معاویہؓ نے ولی عہدی کے لئے کس کا انتخاب کیا ہے؟ یا اگر ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ تو کس شخص کے متعلق یہ فیصلہ کریں گے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ حضرات اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی حضرت مروانؓ سے یہ سوال نہیں کیا؟ وقت کا تقاضا صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ طبعی طور پر شدت کے ساتھ اس کا تقاضا یہ بھی تھا کہ اہل مدینہ، خصوصاً یہ پانچ حضرات، ولی عہدی کے لئے کوئی نام بھی پیش کرتے۔ یہی موقع نام پیش کرنے کا تھا۔ ہزاروں کے اس مجمع سے اس بارے میں کوئی سوال نہ ہونا اور کسی نام کی تجویز پیش نہ ہونا، اس حقیقت کی قوی دلیل ہے کہ یہ سب حضرات کسی نام کے پیش کرنے یا اس کے بارے میں جستجو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

سمجھتے تھے ۔ اور ان کا عام نفسی رجحان اور ارادہ یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ جسے بھی منتخب کردیں گے وہ مناسب ہی ہوگا اور ہم اس کی ولی عہدی و خلافت پر راضی ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پانچ حضرات بھی اس پر راضی تھے ۔ اور ان کی طرف سے اختلاف کی نسبت صحیح نہیں ۔ ان حضرات کو بھی اتفاق تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ضرور اس وقت ولی عہد کے متعلق سوال کرتے نیز اس منصب کے لئے کسی شخص کا نام پیش کرتے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات میں سے نہ کوئی خلافت کا خواہش مند اور امید وار تھا ' اور نہ کسی کے ذہن میں کسی دوسرے کو ولی عہد اور خلیفہ بنانے کی کوئی تجویز تھی ۔ واقعہ کی یہ حقیقت تو اس صورت میں نظر آتی ہے جب صورت واقعہ یہ سمجھی جائے کہ صرف ولی عہدی مقرر کرنے کے استفسار عام اور شوریٰ کے وقت حضرات اہل مدینہ کے ذہن میں احتمال بھی نہ تھا کہ شاید حضرت معاویہؓ ' امیر یزید ؒ کو ولی عہد بنادیں ۔ لیکن یہ صرف ایک عقلی احتمال ہے ۔ مجتمع کی عملی زندگی اور اس دور کے عام حالات کے پیش نظر یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے کہ سب اہل مدینہ و اہل مکہ اس سے کلیتہً بے خبر ہوں کہ حضرت معاویہؓ امیر یزید ؒ کو ولی عہد مقرر کرنے کا ارادہ کررہے ہیں ۔ مدینہ دمشق اور کوفہ یہ سب مرکزی شہر تھے ۔ ان شہروں کے درمیان طلبہ علم ' تجار معلمین ' اہل [illegible] وغیرہ کے قافلوں کی آمد و رفت تسلسل کے ساتھ جاری رہتی تھی ۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں ڈاک کا نظام اتنا عمدہ قائم کردیا تھا کہ مملکت اسلامیہ کے بعید ترین گوشوں کی خبریں بھی زیادہ سے زیادہ دو تین دن کے اندر دارالخلافہ پہنچ جاتی تھیں اور سو دو سو میل کے شہروں کی خبریں تو روز کی روز پہنچتی تھیں ۔ یہ نظام حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی قائم تھا ۔ بلکہ پورے اموی و عباسی دور خلافت میں قائم رہا ۔ واقعات پیش آنے کی صورت یہ تھی کہ امیر یزید ؒ کی ولی عہدی کی تحریک کوفہ سے شروع ہوئی ۔ حضرت مغیرہؓ نے تحریک کی پھر جب حضرت معاویہؓ نے ان کی تجویز نہیں مانی تو کوفہ کے اکابر و زعماء صالحین کا ایک وفد حضرت معاویہؓ پاس یہی تجویز لے کر گیا ۔ ان حالات میں یہ بات عادتاً غیر ممکن ہے کہ اہل مدینہ و اہل مکہ سے جب نفس ولی عہدی کے متعلق استفسار کیا گیا اس وقت وہ کسی ولی عہد کے تعین سے بالکل خالی الذہن ہوں ۔ (۱)

(۱) بقول مودودی صاحب حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کو تو حضرت معاویہؓ کے اس استفسار سے پہلے ہی ایک لاکھ درہم بھی بطور رشوت یزید ؒ کو ووٹ دینے کے لئے بھیج دیئے تھے جو انہوں نے رد کردیئے تھے (العیاذباللہ) پھر وہ اور دوسرے اہل مدینہ اس مسئلہ سے خالی الذہن کیسے ہوسکتے تھے ؟

ان حالات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب اہل مدینہ و مکہ بشمول ان پانچ حضرات کے امیر یزید کی ولی عہدی پر راضی تھے ۔ اور سب نے حضرت معاویہؓ کے بعد ان کا خلیفہ بننا خوشی اور پسندیدگی کے ساتھ منظور کرلیا تھا ۔ اس موقع پر ان حضرات کا کوئی اختلاف منقول نہیں ' اگر اس وقت انہوں نے ذرا سا بھی اختلاف کیا ہوتا تو سبائی راوی اور مورخ اسے سوگنا کرکے دکھاتے ۔ حالانکہ اس وقت ان کے اختلاف کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا ۔

ولی عہدی کے لئے یزیدؒ کا نام لے کر جب استفسار کیا گیا ' اس وقت ان کا اختلاف کرنا بالکل خلاف قیاس ہے ' اور صاف نظر آتا ہے کہ ان کے اختلاف کی جتنی روایتیں ہیں خواہ وہ ابن اثیر میں ہوں یا ابن کثیر میں یا ضمنی طور پر حدیث کی کسی کتاب میں آئی ہوں ' سب سراسر موضوعات ہیں جو سبائیوں ' یا سبائیت زدوں نے بعد کو گڑھی ہیں ۔ ان میں سے ایک بھی سچی نہیں ۔ بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جب مدینہ منورہ میں بنفس نفیس استفسار فرمایا تو ان حضرات میں سے بعض نے کچھ اشکال پیش فرمایا ۔ لیکن جب حضرت معاویہؓ نے اس کا جواب دے دیا تو یہ حضرات مطمئن ہوگئے ' اور انہیں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا ۔ مکہ مکرمہ پہلے سے پہنچنے کے بعد ان کا بغیر بلائے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ حضرت معاویہؓ سے آکر ملنا اور ان کا استقبال کرنا ۔ اس کا مزید قرینہ ہے بلکہ اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ حضرات حضرت معاویہؓ سے پہلے مکہ مکرمہ خود ان کے ایماء پر گئے تھے ۔ اور ان کے اس سفر کا مقصد حج کرنے کے علاوہ ولی عہدی امیر یزیدؒ کے لئے حضرات اہل مکہ کو بیعت پر آمادہ کرنا تھا ' تاکہ حضرت معاویہؓ کو وہاں پہنچ کر استفسار میں سہولت ہو ۔ اہل مکہ اپنے دل میں فیصلہ کرچکیں اور موصوف کو کسی تفصیلی تقریر کی ضرورت نہ پیش آئے ۔ اس کا ایک قوی قرینہ یہ بھی ہے کہ ام المومنین سیدۃ النساء حضرت عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا نے حضرت معاویہؓ کی رائے سے اتفاق فرمایا تھا ۔ جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے ۔ اور جو خود مودودی صاحب نے نقل کیا ہے ۔ ام المومنین علیہا السلام کی تائید و توثیق کے بعد ان پانچوں حضرات اور دوسرے حضرات اہل مدینہ میں سے کسی کو اختلاف کی جرات نہیں ہوسکتی تھی ۔ سبائی راویوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور اصل واقعہ میں اپنی طرف سے جھوٹ کی آمیزش کرکے پیش کیا ہے ۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کی طرف اختلاف کی ابتداء کو منسوب کیا گیا ہے ۔ اور وہ بھی شدت کے ساتھ حالانکہ آں محترم کا اس وقت دنیا میں موجود ہونا ہی ثابت نہیں ۔ البدایہ والنہایہ

میں ان کی وفات کے بارے میں کئی قول لکھے ہیں ۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات ۵۳ ھ میں ہوئی ۔ اس کے متعلق حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ " قاله الواقدی و کاتبه محمد بن سعد و ابو عبید وغیر واحد " یعنی یہ واقدی ' ابوعبید اور ان کے علاوہ متعدد مورخین وغیرہ کی تحقیق ہے ۔ ایک قول ۵۴ ھ کا نقل کیا ہے ۔ مگر قائل کا تذکرہ نہیں ہے ۔ ۵۸ ھ کا قول خود حافظ صاحب نے اختیار کیا ہے ' مگر اس کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ " فی قول کثیر من علماء التاریخ " یعنی بہت سے علماء ' تاریخ کے نزدیک ان کی وفات ۵۸ ھ میں ہوئی ۔ مگر ان علماء تاریخ کا نام نہیں بتایا ۔ ممکن ہے کہ یہ مجہول علماء تاریخ شیعہ یا شیعیت نواز ہوں اور انہوں نے صرف ولی عہدی یزید کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰنؓ کا اختلاف دکھانے کے لئے قصداً یہ غلط بیانی کی ہو ۔ اس لئے یہ روایت قابل اعتماد نہیں ۔ اور بوجوہ ذیل قول اول قابل ترجیح ہے :۔

اول : اس میں قائلین کے ناموں کی تصریح ہے ۔ دوم : واقدی اور ابن سعد کا شمار قدیم ترین مورخین میں سے ہے ۔

ان کا زمانہ حضرت عبدالرحمٰن کے زمانہ سے نسبتاً زیادہ قریب ہے وہ آں محترم کی تاریخ وفات سے زیادہ واقف ہوسکتے ہیں ۔

سوم : واقدی خود شیعہ ہے ۔ اس لئے اس پر وہ شبہ نہیں ہوسکتا جو ان مجہول علماء تاریخ پر ہوسکتا ہے ۔ چہارم : ۵۸ ھ کو تاریخ وفات قرار دینے والوں کے نام حافظ صاحب نے کیوں نہیں ذکر کئے ۔ جبکہ ۵۲ ھ و ۵۳ ھ کے قائلین کے نام ذکر فرمائے ہیں ؟ عقلاً اس کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں یا تو انہیں ان کا نام معلوم ہی نہ ہوسکا یا معلوم ہوا مگر ان علماء تاریخ کا درجہ بحیثیت مورخ اس قدر پست تھا کہ ان کا نام ذکر کرنے سے ان کا قول بے وزن ہوجاتا ۔ دونوں میں سے جو سبب بھی ہو ان کا قول واقدی ' ابن سعد اور ابو عبید کے قول کے مقابلے میں ساقط الاعتبار ہوجاتا ہے ۔ اس بحث سے یہ واقعہ منکشف ہوجاتا ہے کہ ولی عہدی یزید سے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے اختلاف کی روایت بالکل غلط اور جھوٹی ہے ۔ آں محترم اس شوریٰ اور استفسار سے پہلے وفات پاچکے تھے ۔ اور وہاں موجود ہی نہ تھے تو اختلاف کرنے کے کیا معنی ؟

اب رہے باقی چار حضرات تو اس اجتماع میں ان کے اختلاف کرنے کا کوئی تذکرہ روایت میں نہیں ہے ۔ اس سے عیاں ہے کہ انہیں ولی عہدی یزید سے کوئی اختلاف نہ تھا ۔ اگر ہوتا تو وہ بھی اس کا اظہار مجمع عام میں اسی طرح کرتے جس طرح مبینہ طور پر حضرت

عبدالرحمٰنؓ نے کیا تھا۔ روایت بتاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے پوچھنے پر انہوں نے اختلاف کا اظہار کیا۔ لیکن اس سوال کا کیا جواب ہے کہ اگر واقعی انہیں اختلاف تھا تو انہوں نے اس کے اظہار کے لئے حضرت معاویہؓ کے دریافت کرنے کا کیوں انتظار کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حکایت غلط ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کو اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور سب حضرت معاویہؓ کی رائے سے متفق تھے۔ ورنہ یہ یقیناً حضرت عبدالرحمٰنؓ کے مبینہ اختلاف کے وقت ان کا ساتھ دیتے اور مجمع عام میں اختلاف کا اظہار کرتے۔ حضرت مروانؓ یا حضرت معاویہؓ یا کسی اور کے پوچھنے کا انتظار نہ کرتے۔ خصوصاً جبکہ بقول معترضین اتنا اہم مسئلہ تھا کہ خلافت کا تصور ہی ختم ہورہا تھا' اور دین میں تحریف ہورہی تھی اس کے ساتھ یہ اس قدر صاحب اثر تھے کہ سب اہل مکہ و مدینہ ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے اتفاق و اختلاف پر اس امراہم کا فیصلہ موقوف تھا' اس صورت میں تو ان پر فرض عین تھا کہ اگر انہیں حضرت معاویہؓ کی تجویز سے اختلاف تھا تو بھرے مجمع میں اس کا اظہار و اعلان بار بار کرتے۔ پھر مجمع میں ان کا سکوت کیا گناہ کبیرہ اور اثم عظم نہیں تھا؟

ایک سنی ان اصحاب رسول بزرگان دین کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ انہوں نے اس گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہوگا۔ ہم اہل سنت ایسے بزرگوں کے لئے کسی گھٹیا قسم کے کردار کا تصور کرنا معصیت اور ضعف ایمان کی علامت' اور باعث وبال آخرت سمجھتے ہیں۔ اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان حضرات کو بھی حضرت معاویہؓ کی تجویز سے قطعاً اختلاف نہیں تھا۔ یہ بالکل ان سے متفق تھے۔ اختلاف کی روایت سراپا کذب و دروغ اور کسی سبائی کذاب کی گڑھی ہوئی ہے۔

ان پانچ حضرات کے اختلاف کی روایت کے غلط اور موضوع ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ولی عہدی یزید مرحوم سے اختلاف فرمایا تھا۔ اور وہ مدینہ منورہ چھوڑ کر باقی چار حضرات موصوفین کے ساتھ مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ یعنی جب حضرت معاویہؓ نے امیر یزید کی ولی عہدی کے بارے میں استفسار عام کیا تھا تو آں محترم مدینہ میں نہیں تھے بلکہ مکہ مکرمہ روانہ ہوچکے تھے۔ لیکن بخاری شریف جلد ثانی ص ۵۸۹ کتاب المغازی" باب غزوۃ الخندق وہی الاحزاب" کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے مکہ نہیں گئے تھے۔ اور ام المومنین حضرت حفصہ سلام اللہ علیہا بھی وہیں تھیں' نیز یہ کہ

حضرت ابن عمرؓ نے ولی عہدی یزید سے کوئی اختلاف نہیں کیا - روایت درج ذیل ہے -

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں (حضرت) حفصہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گیا - ان کے بالوں کی لٹوں سے اس وقت پانی ٹپک رہا تھا (غالباً نہا کر یا سر دھو کر نکلی ہوں گی) میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں کی کیفیت دیکھ رہی ہیں کہ انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے - اس معاملے میں میرا کوئی حق ہی نہیں رکھا - (ام المومنین حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا - جاؤ لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں- مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے خاموش بیٹھے رہنے سے کہیں اختلاف نہ پیدا ہو جائے - " اس حدیث میں اس کے آگے یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اجتماع میں شریک ہوئے اور خاموش رہے - اس دوران حضرت معاویہؓ نے ایک تقریر فرمائی جس میں ایک بات یہ کہی کہ :

" جو شخص اس امر کے بارے میں (امر خلافت میں) کوئی بات کہنا چاہے وہ اپنا سر اٹھائے ہم اس سے اور اس کے باپ سے بھی زیادہ خلافت کے حقدار ہیں - "

اس پر حضرت ابن عمرؓ کو ناگواری ہوئی ' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا جواب دینے کا ارادہ کیا ' مگر مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ جواب سے جماعت میں تفریق نہ پیدا ہو جائے اور لوگ میری بات کا کوئی غلط مقصد نہ سمجھ بیٹھیں اور لوگوں کا خون بہنا نہ شروع ہو جائے ' (یعنی کوئی ہنگامہ اور فتنہ نہ پیدا ہو جائے) - پھر میں نے جنت کی نعمتوں کو یاد کر کے خاموشی اختیار کر لی " (حوالہ مذکور)

بخاری شریف کی اس روایت سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں -

(۱) جب حضرت معاویہؓ نے مدینہ منورہ میں مجمع عام کے سامنے ولی عہدی یزیدؒ کی تحریک فرمائی تھی ' اس وقت حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے - اور اس مجمع میں تھے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو روایت اس موقع پر مودودی صاحب نے نقل کی ہے ' جس میں آں محترم کا اس موقع پر مکہ مکرمہ چلا جانا مذکور ہے بالکل غلط اور موضوع ہے -

(۲) حضرت ابن عمرؓ نے امیر یزید کی ولی عہدی سے اتفاق کیا - اور کوئی اختلاف نہیں کیا - حدیث سے عیاں ہے کہ آں محترم کا خفیف میلان اپنے لئے ہوا تھا - مگر یہ خیال موصوف نے فوراً ذہن سے نکال دیا اور امیر یزیدؒ کی ولی عہدی و خلافت تسلیم کر لی-

(۳) ام المومنین سیدہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ولی عہدی یزید سے متفق تھیں - یہاں تک کہ جب ان کے حقیقی بھائی حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ نے خلافت کے لئے

اپنی خواہش کا اظہار فرمایا تو ام المومنین صلوات اللہ علیہا نے انہیں اجتماع میں شرکت کا حکم دیا اور امت کو اختلاف سے محفوظ رکھنے کی تلقین فرماکر ان کے دل سے اس خیال کو زائل فرمادیا۔ آں محترمہ کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ نے ولی عہدی یزید سے کوئی اختلاف نہیں فرمایا۔ بلکہ اسے منظور فرمالیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث روایت جو مودودی صاحب نے ابن اثیر' البدایہ وغیرہ بہت سے حوالوں کے ساتھ نقل کی ہے' بالکل غلط' موضوع اور جعلی ہے۔ کسی سبائی کی گڑھی ہوئی ہے۔ بخاری شریف کی اس صحیح روایت کے مقابلے میں اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس روایت کو صحیح ماننے کے بعد اسے صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ ثابت یہ ہوا کہ پانچ حضرات موصوفین کو بھی ولی عہدی یزید سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ان کی طرف اختلاف مذکور کی نسبت بالکل غلط ہے۔

مزید یہ کہ ہم حوالے کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ صلوات اللہ علیہا ولی عہدی یزید سے متفق تھیں۔ ان کے اتفاق کے بعد ان کے حقیقی بھانجے حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا اس سے اختلاف کرنا بالکل بعید از قیاس ہے۔ اسی طرح امہات المومنین کے اتفاق کے بعد حضرت حسینؓ کا اختلاف کرنا بھی بعید از قیاس ہے۔ امہات المومنینؓ کی جو عظمت ان دونوں بزرگوں کے دل میں تھی اس کے پیش نظر یہ بات کسی طرح قابل یقین نہیں کہ اس مسئلہ میں ان محترمات کی رائے سے ان بزرگوں نے اختلاف فرمایا ہو۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ تو اس وقت موجود ہی نہ تھے بلکہ راہی جنت ہوچکے تھے۔ اس لئے ان کی طرف اختلاف کی نسبت تو سرتاپا کذب و دروغ ہے۔ لیکن اگر ہم بطور مفروضہ اس وقت ان کی موجودگی بھی تسلیم کرلیں تو بھی ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہؓ کی مبارک رائے سے ان کا اختلاف کرنا بالکل بعید از قیاس ہے۔ اس لئے ان کی طرف اختلاف کی نسبت کسی حالت میں صحیح نہیں۔ ماحصل یہ کہ امیر یزید" کی ولی عہدی نیز حضرت معاویہؓ کے بعد آن کی خلافت پر اہل مکہ و مدینہ زادھما اللہ شرفا کا اجماع ہوگیا تھا۔ اس وقت کا پورا عام اسلامی ان کی ولی عہدی اور خلافت پر متفق تھا۔ گویا اجماع امت سے ان کی ولی عہدی' اور خلافت منعقد ہوگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح خلفاء راشدین کے انتخاب میں اتفاق اور اجماع حضرت عثمانؓ کی خلافت پر ہوا ایسا کسی کے انتخاب پر نہیں ہوا۔ اسی طرح اس دور مبارک کے بعد غیر صحابی خلفاء میں جیسا اتفاق و اجماع امیر یزید کے انتخاب و خلافت پر ہوا ایسا کسی اموی یا عباسی خلیفہ کے انتخاب پر نہیں ہوا۔ ان حقائق کو نظر انداز کرکے یہ کہنا کہ امام یزید کی امامت و خلافت منعقد ہی نہیں

ہوئی اور وہ جائز خلیفہ نہیں تھے ۔ بہت ہی افسوسناک جسارت اور کذب و دروغ کا بہت مکروہ نمونہ ہے ۔

اس روایت کا کوئی جواب سبائی ذہن رکھنے والوں کے پاس نہیں ۔ اس کے جواب سے عاجز ہو کر بعض شارحین حدیث نے جن کا ذہن شیعیت کے جراثیم سے آلودہ تھا اس کی تحریف معنوی کی کوشش کی ہے ۔ اور لکھا ہے کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا نہیں ہے بلکہ اجتماع اذرح کا ہے ۔ ان کا یہ بیان بوجوہ ذیل بالکل غلط ہے :۔

(۱) ام المومنین سیدتنا حفصہ رضی اللہ عنہا کا اذرح جانا کہیں سے بھی ثابت نہیں ۔ بلکہ بعید از قیاس ہے ۔ ام المومنینؓ آخر وہاں کیوں تشریف لے جاتیں ؟

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مقام اذرح صرف حکمین کا فیصلہ سننے تشریف لے گئے تھے ۔ انہیں وہاں کوئی رائے نہیں دینا تھی ۔ پھر ان کی عدم موجودگی سے اختلاف پیدا ہونے کا احتمال کیوں پیدا ہوتا ؟

(۳) یہ تو ایک تسلیم شدہ واقعہ ہے جس کا اقرار مخالفین کو بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ مقام اذرح نہیں تشریف لے گئے تھے ۔ پھر یہ واقعہ وہاں کیسے پیش آسکتا ہے ۔ ؟

مزید یہ کہ : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہؓ کا انتقال ۵۳ ھ کے بعد ہوا ہے ۔ ان کی وفات ۴۵ ھ میں کہنا غلط ہے ۔ یہ غلط بیانی صرف اس لئے کی گئی ہے تاکہ کسی طرح زیر بحث واقعہ کو مدینہ کے بجائے اذرح کا ظاہر کیا جاسکے ۔ مگر ان مخالفین کا مقصد اس غلط بیانی سے بھی حاصل نہ ہوا کیونکہ حضرت معاویہؓ کا وہاں ہونا تو کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا ۔ بلکہ اذرح میں ان کی عدم موجودگی بلاشبہ ثابت اور فریق مخالف کو بھی تسلیم ہے ۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

پنجم الزام سازی

زیر بحث روایت کا موضوع اور جعلی ہونا تو ثابت ہوگیا اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ ولی عہدی یزید" سے مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ میں کسی نے اختلاف نہیں کیا ۔ نیز یہ کہ پانچ حضرات موصوفین کی طرف بھی اختلاف کی نسبت بالکل غلط ہے ۔ ان حضرات نے بھی اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قاری کو اس روایت اور اس جیسی دوسری رواتیوں میں سبائی آرٹ کا مکروہ چہرہ بھی دکھادیا جائے ' جس سے سبائیوں نے اس روایت کے وضع کرنے میں کام لیا ہے ۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے

بعد اس روایت اور اس قسم کی دوسرے روایات اور بیانات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کو توڑ مروڑ کر' ان کی غلط توجیہات کرکے اور ان میں جھوٹ کی پیوند کاری کرکے الزام سازی کی گئی ہے۔ جس کا مقصد وحید حضرت معاویہؓ اور دوسرے صحابہؓ کرام کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ ہندوستان کے برطانوی دور میں جس طرح بعض بد دیانت پولیس والے' کسی آزادی خواہ لیڈر کے خلاف جھوٹا مقدمہ بنایا کرتے تھے۔

اسی طرح یہ روایت گڑھی گئی ہے۔ سبائی آرٹ ملاحظہ ہو:

"حضرت معاویہؓ مدینہ منورہ آتے ہیں۔ وہاں سب ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ اس کے بعد غالبًا مستقبل قریب میں یہ حضرات حج کے لئے گئے ہوں گے ممکن ہے اس کے ساتھ یہ مقصد بھی ہو کہ حضرت معاویہؓ کے پہنچنے سے پہلے' ولی عہدی یزید کے لئے استفسار کرلیں اور لوگوں کو اس کے قبول کے لئے تیار کرلیں۔ مگر سبائی راوی نے ان حضرات کے اس مبارک سفر کی خبر کا رخ اپنے غلط اور مفسدانہ مقصد کی طرف موڑنے کے لئے " درشت برتاؤ " کی کہانی وضع کی۔ پھر جب یہ حضرات مکہ مکرمہ میں حضرت معاویہؓ سے ملے تو اس دروغ گو کو یاد نہ رہا کہ پہلے کیا کہہ چکا ہے اور صحیح واقعہ بیان کردیا کہ ان حضرات نے حضرت معاویہؓ کا استقبال کیا اور آں محترم نے ان سب حضرات کا اکرام کیا اور ان سے محبت و خوش اخلاقی کے ساتھ ملے' جب اس سبائی راوی کو اپنی پہلی بات یاد آئی' تو گھبرایا کہ یہ تو تناقض بیان ہوگیا۔ اس لئے جھٹ یہ کہانی وضع کی کہ " ان حضرات کو شبہ ہوا کہ شاید حضرت معاویہؓ اپنی غلطی پر نادم ہوئے ہوں۔ مگر یہ بات اس کاذب کی سمجھ میں نہ آئی کہ ان حضرات کے دل میں حضرت معاویہؓ کی ندامت کا خیال آنے کی وجہ کیا ہوسکتی تھی؟ یا تو ان حضرات کو مبینہ " درشت برتاؤ " سے اتنی ناگواری ہوئی کہ گھر چھوڑ کر چلے آئے یا اتنی جلدی اتنے نرم پڑگئے کہ بغیر کسی سبب کے انہوں نے اپنے ذہن سے بغیر کسی دلیل عقلی یا نقلی کے " ندامت " کا اختراع کرلیا۔ یا للعجب! ۔ ان حضرات کو معلوم تھا کہ حضرت معاویہؓ مکہ مکرمہ ولی عہدی یزیدؒ کے بارے میں رائے عامہ معلوم کرنے ہی کے لئے آرہے ہیں۔ مبینہ " درشت برتاؤ " مبینہ طور پر اس سے اختلاف کی بناء پر تھا۔ یہ بناء قائم تھی پھر ان حضرات کو ان کی " ندامت " کا احتمال کیسے پیدا ہوگیا؟ اس سے ظاہر ہے کہ جھوٹ کی یہ کھپچی سابق جھوٹ کی استخوان شکستہ میں اسے سہارا دینے کے لئے لگائی گئی تھی۔ اس کے بعد جب ان حضرات نے مسجد حرام کے استفسار و شورائے عام میں ولی عہدی یزیدؒ سے کوئی اختلاف نہ کیا' بلکہ قولًا یا کم از کم سکوت کرکے

حضرت معاویہؓ کی تائید کی تو فوراً راوی کذاب نے یہ کہانی وضع کی کہ ان کے اوپر شمشیر بکف باڈی گارڈ کے جوان مسلط کردیئے گئے تھے۔ مختصر یہ کہ زیر بحث واقعات کو توڑنے مروڑنے اور انہیں غلط رخ دینے کے لئے اس قدر جھوٹ بولا گیا ہے اور اصل واقعات میں اس قدر کذب و دروغ کی آمیزش کی گئی ہے کہ حالات کی صورت ہی بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر امعان نظر سے دیکھئے اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیجئے تو ان فریب کاروں اور کذابوں کا دام فریب پارہ پارہ ہوجاتا ہے اور اصل حقیقت کا روشن چہرہ نظر آجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے تو خلافت یزیدؒ کے زمانے میں ان کے خلاف خروج کیا اور ان سے جنگ کی ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یزیدؒ کو ولی عہد بنانے کے خلاف تھے اور ان کی خلافت انہوں نے تسلیم نہیں کی تھی۔ اس کا پہلا اور اصولی جواب یہ ہے کہ ایک مدت کے بعد امیر یزیدؒ کے خلاف خروج کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دونوں حضرات اس وقت بھی ولی عہدی (خلافت) یزیدؒ کے خلاف ہوں۔ جب حضرت معاویہؓ نے استفسار عام (REFERENDUM) کیا تھا اس وقت انہیں امیر یزیدؒ کی خلافت پر کوئی اعتراض نہ تھا' اور اس کے مخالف نہ تھے۔ اگر تنزل کرکے ان کے اختلاف کی روایتیں تسلیم بھی کرلی جائیں تو بھی ان سے معترض کا مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان سے اتنا ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ ان دونوں حضرات کو اختلاف انہیں ولی عہد بنانے سے تھا۔ نہ کہ ان کی خلافت سے یہ اختلاف حضرت معاویہؓ اور ان کے ایک مخصوص طرز عمل سے تھا امیر یزیدؒ کی ذات یا ان کی خلافت سے انہیں اختلاف نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے' حالانکہ پانچوں حضرات میں سے کسی نے اس کا اشارتاً بھی تذکرہ نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ بعد کو کوئی بات ایسی پیش آئی ہو جس کی وجہ سے ان دونوں حضرات کو امیر یزیدؒ سے اختلاف پیدا ہوگیا ہو اور انہوں نے ان کے خلاف خروج کیا ہو۔ ایک مدت بعد کا یہ خروج و اختلاف اس کی دلیل نہیں بن سکتا کہ انہیں پہلے سے اختلاف تھا۔ اس لئے شبہ مذکور غلط اور باطل ہے۔ مزید یہ کہ ان پانچوں حضرات میں سے چار (۱) جن کے متعلق امیر یزیدؒ کی ولی عہدی سے اختلاف کرنے کا افسانہ گڑھا گیا ہے۔ مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ پر حملہ کی مہم میں' امیر یزیدؒ کی ماتحتی میں شریک جہاد تھے ان سب نے ان کی امارت خوشی کے ساتھ منظور کی تھی۔ بجا طور پر کہا جاسکتا کہ اس امارت کو منظور کرنا اس

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوگیا تھا۔

امر کی علامت و دلیل ہے کہ ان حضرات نے ولی عہدی یزید کے مسئلے میں یقیناً حضرت معاویہؓ سے اتفاق کیا ہوگا۔ اختلاف کی روایتیں بالکل غلط ہیں۔ بعد کے اختلاف کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنے والے کہ اختلاف پہلے سے موجود تھا اس اتفاق و تعاون و قبول امارت سے یہ نتیجہ کیوں نہیں نکالتے کہ انہوں نے ولی عہدی کے مسئلے میں استفسار کے وقت امیر یزیدؒ کو ووٹ دیا ہوگا اور حضرت معاویہؓ کی رائے سے اتفاق کیا ہوگا۔ اس استدلال کو ترجیح ہے کیونکہ یہ استدلال استصحاب حال سے ہے جو ایک اصولی اور شرعی دلیل ہے۔ بخلاف اس کے بعد کی حالت پر قبل کی حالت کو قیاس کرنا نہ شرعی استدلال ہے اور نہ منطقی۔

اس شبہ کا دوسرا جواب جو حقیقت واقعات پر مبنی ہے ' یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو کوئی خواہش خلافت کی نہیں تھی۔ ان اللہ والے حضرات کا قلب جاہ و اقتدار کی طلب سے پاک تھا۔ چنانچہ ایک زمانہ تک امیر یزید مرحوم کی خلافت کے قائل رہے اور ان کی اطاعت کرتے رہے۔ لیکن سبائیوں نے خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے ' مسلمانوں کا خون بہانے اور امت کے اجتماع میں پراگندگی پیدا کرکے خود اقتدار حاصل کرنے کے لئے حضرت موصوف کو ورغلایا ' انہیں امیر یزیدؒ اور دوسرے ارباب حکومت کے متعلق بہت غلط خبریں پہنچائیں۔ دوسری طرف امیر یزیدؒ اور ان کے حامیوں کو غلط خبریں دے کر حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کے خلاف بھڑکاتے رہے۔۔ یہاں تک کہ ایسے حالات پیدا کردیئے کہ دونوں طرف کی فوجیں مقابل ہوگئیں اور بالآخر جنگ چھڑگئی۔ ورنہ پہلے سے فریقین میں سے کسی کا ارادہ باہم جنگ و جدل کا نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح سبائی فتنہ پردازوں اور مفسدوں نے جنگ جمل برپا کرادی تھی۔ حالانکہ فریقین میں سے کسی کا بھی ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ اسی طرح یہ جنگ بھی انہوں نے برپا کروائی۔ اس سے قطعاً نہیں معلوم ہوتا کہ شروع ہی سے آں محترم کو امیر یزیدؒ کی خلافت سے اختلاف تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں امیر یزیدؒ کی ولی عہدی اور خلافت دونوں باتوں سے پورا اتفاق تھا اور یہ اتفاق ان کے دور خلافت میں بھی مدت تک باقی رہا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے بھی زیادہ صاف ہے ' وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوئے تھے۔ اللہ والے تھے ' جاہ اقتدار کی طلب سے ان کا قلب بھی پاک تھا۔ وہ خلافت کے طلب گار نہیں تھے۔ امیر یزیدؒ کے خلاف انہوں نے قطعاً خروج نہیں کیا اور ان کی خلافت پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ داستان کربلا ابو مخنف اور اس کے معاون یہود کی گڑھی ہوئی جھوٹی داستان ہے ' جو اس نے اپنے ہم

مذہب سبائیوں کے جرائم پر پردہ ڈالنے اور ' بنو ہاشم کو خلافت عباسیہ کے خلاف خروج اور بغاوتوں پر آمادہ کرنے ' امامت کے باطل نظریئے کو پھیلانے امت مسلمہ کے اجتماع میں پراگندگی پھیلانے ' اسلام کی ترقی کو روکنے ' اس میں تحریف کرنے اور امت مسلمہ کو گمراہ کرنے اور اسے زوال و انحطاط کے راستے پر ڈالنے ' کے لئے وضع کی تھی ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ سبائیوں نے امت مسلمہ اور خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کے لئے حضرت حسین ؓ کے قتل کا منصوبہ بنایا کہ انہیں کوفہ آنے اور قیام کرنے کی دعوت دی ' اور مقصد یہ ظاہر کیا کہ ہم آپ سے ہدایت یعنی کتاب و سنت کا علم حاصل کرنا اور آپ کی تعلیم و تربیت سے اپنے نفوس کا تزکیہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی تعلیم و تربیت عام کے لئے حضرت حسین ؓ نے وہاں کا سفر فرمایا ۔ اور وہاں بلا کر ان نابکاروں نے اسے خروج کے نام سے مشہور کیا ۔ اور آں محترم کو ان کے بہت سے اعزاء و اقارب کے ساتھ شہید کردیا پھر الزام حکومت وقت پر لگادیا۔ یہ ایک واضح اور مسلمہ حقیقت ہے کہ قاتلان حسین کوفہ و بصرے کے سبائی تھے ۔(۱)

ان میں کوئی سنی نہیں تھا اور کوئی شامی نہیں تھا ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک ثابت شدہ اور تاریخی حقیقت ہے کہ قاتلان حسین ؓ سب ایرانی تھے ۔ ان میں کوئی عراقی نہیں تھا ۔ کوفہ و بصرے میں عربوں کے موالی بکثرت رہتے تھے ۔ یہ وہ ایرانی غلام تھے جنہیں ان کے عرب آقاؤں نے آزاد کردیا تھا ۔ اور آزادی کے بعد وہ کوفہ اور بصرے میں مقیم ہوگئے تھے ۔ حادثہ کربلا کے متعلق تفصیلی گفتگو ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہے ۔ اصل بات سمجھانے کے لئے اتنا تذکرہ ضروری تھا ۔

ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلافت کے طالب نہیں تھے ۔ اور آں محترم کو امیر یزید ؒ کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں تھا ۔ نیز انہوں نے ان کی خلافت کے خلاف خروج نہیں کیا ۔ جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے " یزید ؒ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے سفر کیا تھا ' یا تخت خلافت حاصل کرنے کے لئے گئے تھے " ' انہیں اپنے دعوے کی دلیل پیش کرنا چاہئے ۔ بار ثبوت ان پر ہے ہم پر نہیں ۔ اس سوال کا جواب بھی کہ " پھر انہوں نے کوفہ کا عزم کیوں کیا ؟ " ہمارے ذمہ نہیں ۔ سبب کوئی بھی

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے " قاتلان حسین کی خانہ تلاشی " از امام اہلسنّت حضرت علامہ عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ نیز " قاتلان حسین " از مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزا پوری رحمہ اللہ

ہو، مگر حصول خلافت یا خلافت اسلامیہ کے خلاف خروج بالسیف اس کا سبب نہیں تھا۔ تاہم ہم نے اس سوال کا بھی اطمینان بخش جواب چند سطریں پہلے دے دیا ہے۔ جو اس شخص کے لئے بالکل کافی و شافی ہے جو حق کا جویاں ہو۔ اور انصاف سے کام لے۔ معاند کے لئے کوئی چیز بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اس دعوے میں میں تنہا نہیں ہوں۔ محققین اہل سنت کی یہی رائے ہے۔ بطور مثال علامہ سید نواب صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ کی رائے پیش کرتا ہوں۔ موصوف اپنی مشہور کتاب حجج الکرامتہ فی آثار القیامتہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

گویم نسبت حرص خلافت بسوئے حسین علیہ السلام صحیح نیست زیراکہ باتفاق اہل روایت و درایت معلوم است کہ خروج وے برینائے دعوئی خلافت راشدہ کہ بمرور ۳۰ سی سال منقضی گشت نبود بلکہ بربنائے تخلیص رعایا از دست ظالم بود و اعانت مظلوم بر ظالم منجملہ واجبات است"

پھر چند سطروں بعد لکھتے ہیں:

" ساحت عزت و جاہ وی رضی اللہ عنہ ازاں پاکتر است کہ غبار حرص خلافت و طمع بردامن جلالش نشیند حاشا و کلا و اوچہ حرص بر خلافت کند بعد ازاں کہ برادر کلانش حسن رضی اللہ عنہ آنرا گذاشتہ باشد و حدیث " انی ھذا سید یُصلح اللہ بہ بین الفئتین از والد ماجد خودش شنیدہ" ۔ (ص ۳۵۷)

(ص ۳۵۷)

" میں کہتا ہوں کہ حسین علیہ السلام کی حرص خلافت کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ باتفاق روایت و درایت یہ معلوم ہے کہ ان کا خروج خلافت راشدہ کے دعوئی کے بناء پر نہیں تھا۔ جو کہ تیس سال کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ بلکہ رعایا کو ظالم کے ہاتھ سے چھڑانے کے لئے تھا۔ اور مظلوم کی اعانت ظالم کے خلاف منجملہ واجبات کے ایک واجب ہے۔"

ان کا (حضرت حسینؓ کا) میدان عزت و جاہ اس سے پاک ہے کہ حرص خلافت اور طمع سلطنت کے غبار سے انکا دامن جلال

آلودہ ہو جاتا ہو۔ وہ خلافت کی حرص کیسے کرتے، جبکہ ان کے برادر حسن رضی اللہ عنہ حاصل شدہ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اور وہ حدیث شریف "میرا یہ بیٹا سردار ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ دو گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا" اپنے والد ماجد سے سن چکے تھے۔"

مذکورہ بالا عبارت میں نواب صاحب نے صاف صاف کہا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا جو عزم فرمایا تھا وہ حصول خلافت کے لئے نہیں تھا۔ (۱) بلکہ یہ بھی وضاحت کے ساتھ فرما دیا کہ حصول خلافت کی خواہش آں محترم کے شایان شان بھی نہیں تھی اور آں محترم کا قلب سلطنت و اقتدار کی طرف میلان سے بالکل پاک تھا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت حسینؓ کو ولی عہدی یزید کے معاملے میں حضرت معاویہؓ سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اختلاف کی روایت غلط ہے۔ اگر یزیدؒ کی ولی عہدی سے انہیں ان کی شخصیت کی بناء پر اختلاف ہوتا تو جس طرح انہوں نے مبینہ طور پر امیر یزیدؒ کی مخالفت اور اصلاح حکومت کے لئے فوری کوفہ جانے کا عزم فرمالیا تھا اسی طرح وہ حضرت معاویہؓ کی تجویز پر اسی وقت صراحت کے ساتھ اختلاف کرتے، یعنی یہ کہتے کہ "یزیدؒ اس

(۱) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عزم کوفہ کی جو توجیہہ علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ رعایا پر ظلم و جور کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا۔ کوفہ کے گورنر اس وقت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ تھے۔ کسی صحابیؓ سے عوام پر ظلم و جور کا صدور بہت بعید از قیاس ہے۔ حضرت نعمانؓ موصوف تو اپنی رحمدلی، نرم خوئی، اور اپنے عدل کے لئے مشہور تھے۔ علاوہ بریں اس وقت سو سے زیادہ صحابہ کرامؓ اور بکثرت اجلہ تابعین موجود تھے۔ اگر کسی خطہ مملکت میں ظلم ہوتا تو یہ حضرات ضرور نکیر کرتے۔ لیکن اس نکیر کا کہیں بھی نام و نشان نہیں ملتا۔ بالفرض کفرض المحال یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ "خلافت یزیدؒ میں ظلم ہو رہا تھا اور حضرت حسینؓ عوام کو اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے امیر یزیدؒ کو خلافت سے معزول کرنے کے لئے گئے۔ تو بھی ہمارے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس سے کسی طرح بھی یہ لازم نہیں آتا کہ تجویز ولی عہدی کے وقت بھی وہ امیر یزیدؒ کے مخالف ہوں، یا ان کی خلافت کو ناپسند کرتے ہوں یہ ناپسندیدگی اگر پیدا ہوئی تو بعد کو ان کے زمانہ خلافت میں ہوئی ہوگی۔ اس سے ان کی ولی عہدی کے وقت ناپسندیدگی نہیں ثابت ہوتی۔"

قابل نہیں ہیں کہ انہیں خلیفہ بنایا جائے ۔ مگر انہوں نے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں کہا ۔ بلکہ ان کی شخصی حیثیت و کیفیت کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ۔

نتائج بحث

ہماری اس تفصیلی بحث سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں ۔

(۱) حضرت معاویہ نے امیر یزید کو خود اپنی رائے سے ولی عہد نہیں بنایا تھا ' بلکہ اس کی تجویز حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے خالصتاً لوجہ اللہ محض امت مسلمہ کی مصلحت کے لئے پیش کی تھی ' نیز یہ تجویز ان کے علاوہ جمہور اہل کوفہ کے نمائندوں اور قائدین نے سب اہل کوفہ کی طرف سے پیش کی تھی ۔

(۲) حضرت معاویہ نے نفس ولی عہدی کے مسئلے پر بھی استصواب رائے عامہ کیا ' اور ولی عہدی یزید کے مسئلے پر بھی استصواب رائے عامہ کیا ۔

(۳) جمہور اہل مکہ و جمہور اہل مدینہ نے ان کے علاوہ اس وقت کی پوری دنیائے اسلام اور زیر نگیں خلافت اسلامیہ بلاد و امصار کے جمہور اہل اسلام نے حضرت معاویہ کی دونوں تجویزوں سے پورا پورا اتفاق کیا ۔

(۴) مکہ معظمہ ' و مدینہ منورہ جو دنیائے اسلام کے اہم دینی مرکز تھے ' نیز ان کے علاوہ دمشق ' کوفہ ' بصرہ اور دوسرے دینی مراکز کے جمہور اہل ایمان ' اور مرکزی شخصیتوں نے حضرت معاویہ کی تجویز یعنی استخلاف یزید " سے پورا پورا اتفاق کیا ۔ صرف پانچ حضرات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اختلاف کیا ۔ ازروئے اصول دستور اسلامی اور ازروئے شریعت مقدسہ اسلامیہ جمہور اہل اسلام کے اتفاق کے بعد خصوصاً جبکہ ان جمہور میں کثیر تعداد صحابہ کرام کی تھی اور امہات المومنین سلام اللہ علیہن بھی شامل تھیں ' ان پانچ حضرات کا اختلاف بالکل بے وزن اور کالعدم ہو جاتا ہے ۔ اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ' شرعاً ' عقلاً اور اخلاقاً ہر طرح بالکل جائز اور مناسب تھا ۔ نیز یہ کہ امیر یزید کی خلافت شرعاً ' عقلاً ' اخلاقاً ہر طرح بالکل جائز اور صحیح تھی ۔ اور وہ صحیح خلیفۃ المسلمین تھے ۔ ان کی خلافت کو تسلیم نہ کرنے سے اس وقت کے جمہور صحابہ مہاجرین و انصار و غیرھم اور جمہور تابعین کا تخطیئہ کرنا لازم آتا ہے ۔

(۵) حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا شرعاً " بالکل جائز تھا جیسے حضرت حسن کو

ولی عہد بنانا حضرت علیؓ کے لئے جائز تھا اس پر اعتراض کرنا شریعت مقدسہ پر اعتراض اور اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ (العیاذباللہ)

(۶) جن حضرات صحابہ کرامؓ کے متعلق معترضین بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ولی عہدی یزید سے اختلاف کیا تھا۔ ان کا اختلاف بھی در حقیقت ثابت نہیں۔ روایت پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور یہ سب حضرات بھی حضرت معاویہؓ کی تجویز سے متفق تھے۔ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امیر یزیدؒ کا انتخاب خلافت جمہور اہل اسلام کی متفقہ رائے سے ہوا۔ اور موصوف اس وقت کے مسلمانوں کے متفق علیہ خلیفہ اور امام تھے۔

(۷) امیر یزیدؒ یا ان کی خلافت سے اختلاف کسی دلیل سے بھی ثابت نہیں۔ اگر بالفرض ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ان پانچ حضرات کو حضرت معاویہؓ سے امیر یزیدؒ کو ولی عہد بنانے کے مسئلہ پر اختلاف تھا تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان حضرات کو امیر یزیدؒ کی خلافت سے اختلاف تھا۔ یہ اختلاف تو حضرت معاویہؓ کے فعل استخلاف سے ہوا۔ امیر یزیدؒ کی خلافت سے نہیں ہوا۔ در حقیقت یہ حضرات بھی امیر المومنین یزیدؒ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔

منصب خلافت کے لئے یزیدؒ کی موزونیت

مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> "دوسرے یہ کہ یزیدؒ بجائے خود اس مرتبے کا آدمی نہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہؓ کے بعد امت کی سربراہی کے لئے وہ موزوں ترین آدمی تھا۔"

(ص ۱۵۰)

○ تبصرہ:۔ استخلاف یزیدؒ کے بارے میں مودودی صاحب کی جو عبارتیں ہم نے ان کی اس عبارت سے پہلے نقل کی ہیں وہ ان کی کتاب میں بلحاظ ترتیب اس عبارت کے بعد ہیں اور یہ سطریں ان سے پہلے ہیں۔ لیکن میں نے اس ترتیب کے خلاف ان کی یہ عبارت ان کی عبارات مذکورہ کے بعد اس لئے نقل کی ہے کہ ان عبارات میں متعدد امور زیر بحث لاتا تھے۔ بخلاف اس کے اس عبارت میں صرف ایک مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔ جس پر مختصر گفتگو

کافی ہوگی ۔ طویل بحث کی احتیاج نہیں ۔ مجھے موصوف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ امیر یزید" اس معاشرے میں منصب کے خلافت کے لئے " موزوں ترین " شخص نہیں تھے ۔ کیونکہ ملت اسلامیہ میں اس وقت قحط الرجال نہیں تھا صحابہؓ و تابعین میں بکثرت ایسے افراد موجود تھے جو منصب خلافت کی اہلیت رکھتے تھے اور اس کے لئے موزوں تھے ۔ لیکن کیا جمہور اہل ایمان پر منصب خلافت پر فائز کرنے کے لئے صرف " موزوں ترین " کو منتخب کرنا واجب ہے ؟ مودودی صاحب کے کوئی پیرو ارشاد فرمائیں کہ کس آیت یا حدیث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ امت کی سربراہی کے لئے جسے منتخب کیا جائے اسے اس کام کے لئے " موزوں ترین " ہونا چاہئے ' یا دوسرے الفاظ میں صرف " موزوں ترین " " آدمی " کو اس منصب پر مقرر کرنا جائز ہے ۔ اور جو " موزوں ترین " نہ ہو اس کا تقرر ناجائز اور معصیت ہے ؟

شریعت صرف اتنا بتاتی ہے کہ اسے اس کام کے لئے " موزوں " ہونا چاہئے " موزوں ترین " قطعاً ضروری نہیں ۔ موصوف نے ص ۱۴ پر یہ آیت نقل کی ہے :

" ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا " (النساء ۔ ۵۸)

" اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو "

اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امانت ان لوگوں کے حوالے کرنا چاہئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں (۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی منصب کسی کے سپرد کرنا ہو تو یہ دیکھنا لازم ہے کہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے لئے موزوں ہے یا نہیں ؟ " اہل ترین اور موزوں ترین " کے حوالے کرنے کے وجوب کی طرف تو آیت میں اشارہ تک نہیں معلوم ہوتا ۔ جس شخص کو ولی عہد بنایا جائے وہ اس کام کا اہل اور اس کے لئے موزوں ہونا چاہئے " اہل ترین " اور " موزوں ترین " ہونا قطعاً ضروری نہیں ۔ اگر موزوں تر یا " موزوں ترین " کے ہوتے ہوئے بھی کسی موزوں

---

(۱) در حقیقت مودودی صاحب جس سیاق میں اس آیت کو لائے ہیں اس میں اس کا لانا بر محل نہیں ہے ۔ آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ " امانتیں ان لوگوں کو ادا کرو جو اس کا حق رکھتے ہیں ۔ " یعنی جس کا حق شرعاً ہو وہ اسے دے دو ۔ کسی کا حق نہ مارو ۔ حکومت کا حق کسی کو بھی نہیں حاصل ہوتا ۔ اس لئے اس سے اس مسئلہ پر استدلال غلط ہے ۔ زیادہ سے زیادہ استیناس ہو سکتا ہے ۔ لیکن چونکہ موصوف نے یہ آیت نقل کی ہے اس لئے ہم نے انہیں کی تفسیر کی بناء پر انہیں جواب دے دیا ۔

اور " اہل " کو ولی عہد بنادیا جائے یا خلیفہ منتخب کرلیا جائے ' تو ازروئے شریعت یقیناً جائز اور صحیح ہے ۔ اس پر اعتراض کرنا جائز نہیں ۔ ایسے معترض کے طعن کی زد خود شریعت پر پڑتی ہے ۔

مودودی صاحب نے " موزوں ترین " کی خود ساختہ قید لگا کر قاری کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے ۔ جو جدال کا ایک ناپسندیدہ اور نامناسب طریقہ ہے ۔

شریعت اسلامیہ نے خلیفہ کے لئے " موزوں ترین " ہونے کی قید قطعاً نہیں لگائی ۔ اسے حکم شرعی کہنا شریعت مقدسہ پر افتراء ہے ۔ جسے اصطلاحاً بدعت کہتے ہیں ۔ عقلاً بھی سربراہ مملکت کے انتخاب کے لئے یہ شرط لگانا فتنہ انگیز غلطی ہے اس لئے کہ موزوں ترین سربراہ مملکت کا انتخاب اور تعین بہت مشکل بلکہ عادتاً غیر ممکن ہے ۔ پھر اس میں اختلاف آراء کا قوی امکان ہے ۔ کیونکہ مختلف اہل الرائے کے معیار میں بعض اوقات اختلاف ہوتا ہے ۔ یہ کثیر الوقوع واقعہ ہے ۔ کوئی نادر بات نہیں کہ اس قسم کے اختلاف کا نتیجہ بسا اوقات فتنہ و فساد کی صورت میں نکلتا ہے ۔ اس لئے " موزوں ترین " کی شرط لگانا غلطی ہے ۔

رہا یہ مسئلہ کہ امیر یزید اس منصب کے اہل تھے یا نہیں ؟ تو خلافت کے لئے ان کی موزونیت ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ان کے مخالفین بھی نہیں کرسکتے ۔ اگر انکار کریں تو یہ محض مکابرہ اور مجادلہ ہوگا ۔ ولی عہدی سے پہلے بھی امیر یزید منصب خلافت کے لئے اپنی موزونیت و اہلیت عملاً ثابت کرچکے تھے ۔ اور اپنے مختصر دور خلافت میں بھی انہوں نے اس کا ثبوت دیا ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کے دور خلافت میں دین اسلام کو ہر طرح ترقی ہوئی ۔ دعوت اسلام دنیا کے دور دراز حصوں تک پہنچی ۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا ' افریقہ کا خاصا حصہ فتح ہوا اور لاکھوں بربر مشرف بہ اسلام ہوئے ۔ مسلمانوں نے علوم دینیہ اور علوم عقلیہ دونوں میں ترقی کی ۔ اور انہیں معاشی مرفہ الحالی حاصل ہوئی ۔ یہ بات ماننا پڑے گی کہ وہ ایک اچھے جرنیل ' اور ایک اچھے سٹیٹسمین تھے ۔ اور منصب خلافت کے اہل تھے ۔ ان دونوں باتوں کو انہوں نے اپنے کردار و عمل سے ثابت کردیا ۔ بحث کو مختصر کرنے کے لئے ہم اس مسئلہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی رائے نقل کرتے ہیں ۔

ایک سوال کے جواب میں موصوف فرماتے ہیں کہ :

" یزید کو متعدد معارک جہاد میں بھیجے اور جزائر بحرابیض و بلادہائے ایشیاء کوچک کو فتح کرنے حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بڑی بڑی افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا

جاچکا تھا، تاریخ شاہد ہے کہ معارک عظیمہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے"۔ (۱)

ولی عہد یزید مغفور کے مسئلے پر بحث ختم ہو چکی مگر اس بحث کی ضرورت صرف اس صورت میں ہے جب یہ ثابت ہو کہ خلیفہ راشد سادس امیر المومنین حضرت معاویہؓ نے امیر یزید مغفور کو ولی عہد بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مدنی موصوف کے ایک مکتوب کا مندرجہ ذیل اقتباس قابل دید ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"یا یہ نامزدگی ان کی (۱) طرف سے حقیقتاً یا حکماً کسی طرح نہیں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد اہل شام میں سے اہل حل و عقد نے اس کو جانشین اور ... بنادیا اور بیعت کرلی۔ جیسا کہ بعض دوسرے مورخین کا قول ہے۔" (۲)

اگر "بعض مورخین" کا یہ قول صحیح ہے تو ولی عہدی کی کوئی بحث ہی باقی نہیں رہتی۔ اور اس سلسلہ میں اختلاف کی روایتیں بھی غلط اور موضوع ٹھہرتی ہیں۔ تاریخ کے ان دونوں بیانوں کے درمیان موازنہ کرنے سے ان "بعض مورخین" کے قول کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ ولی عہدی کی روایتوں سے ان کی ولی عہدی پر عالم اسلامی کا جو اتفاق نظر آتا ہے۔ "جمہور مسلمین میں ان کی عام مقبولیت کی علامت ہے۔ اپنے زمانہ خلافت میں بھی وہ جمہور اہل اسلام میں مقبول رہے۔ جس کی واضح علامت یہ ہے کہ سبائیوں نے جو شورشیں ان کے خلاف برپا کیں وہ جمہور عوام و خواص اہل اسلام میں مقبول نہیں ہو سکیں اور سب ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ اس "قول" کی ترجیح کے اور وجوہ بھی ہیں۔ جنہیں ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں نے بغض معاویہؓ کے جذبے سے مغلوب ہو کر شریعت اسلامیہ کو نظرانداز کر دیا اور ان پر ایسے غلط اعتراضات کئے جو شریعت اسلامیہ مطہرہ کی تنقیص و تحریف کو مستلزم ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان پر یہ اعتراض ان تک محدود نہیں رہتا بلکہ حضرات خلفاء سابقین خصوصاً حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ سبائی ذہن بغض صحابہؓ سے مغلوب ہو کر شریعت کو کس طرح نظرانداز کر

(۱) "مکتوبات شیخ الاسلام" حصہ اول مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی مکتوب نمبر ۸۸ ص ۲۵۰ شائع کردہ مولانا سید حامد میاں مرحوم سابق امیر انجمن جامعہ مدنیہ لاہور اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور (۲) یعنی حضرت معاویہؓ کی طرف سے۔

(۳) مکتوبات شیخ الاسلام مکتوب نمبر ۸۹ ص ۲۶۰

دیتا ہے۔ ان کا اعتراض مذکور اس کا ایک مکروہ نمونہ ہے۔

ایک غیر جانبدار شخص اس ساری بحث کو دیکھنے سے پہلے ان لوگوں سے جو امیر یزید کو منصب خلافت کی اہلیت سے محروم ظاہر کرنے کی سعی ناکام کرتے ہیں یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو جن پانچ حضرات نے مدینہ منورہ میں استصواب رائے عامہ کے وقت یزید کی ولی عہدی سے تمہارے حکم کے بموجب اختلاف کیا تھا' انہوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں کیا؟ انہیں ان کی ولی عہدی پر اعتراض کے بجائے یہ کہنا چاہئے تھا کہ آپ جسے ولی عہد بنا رہے ہیں وہ تو خلافت کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ مگر انہوں نے تو یزید کی خلافت سے ذرا بھی اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ اگر اختلاف کی روایت صحیح فرض کی جائے تو انہیں اختلاف حضرت معاویہؓ کے اس طرز عمل سے تھا' اور اسی پر معترض ہوئے۔ امیر یزیدؒ کی خلافت سے انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ نہ ان کی شخصیت پر کوئی اعتراض کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ امیر یزید کی مبینہ نا اہلی اور ان کے مبینہ فسق و فجور کا ان حضرات کو تو پتہ نہ چل سکا۔ مگر برسا برس کے بعد سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ فیاللعجب! اس سے یہ واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان حضرات معترضین کو امیر یزید کی خلافت پر کوئی اعتراض نہ تھا وہ انہیں منصب خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ (۱) انہیں نا اہل کہنا یا حضرت معاویہؓ پر ایک نا اہل کو ولی عہد بنانے کا الزام لگانا خود معترض کی نا اہلی کی دلیل ہے۔

---

(۱) عام طور پر سبائیت زدہ مورخین اور علماء اس ولی عہدی سے ان پانچ حضرات کے اختلاف کو امیر یزید کی خلافت سے اختلاف کی دلیل بنا کر لوگوں کو مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں ہمارے بیان مذکور سے یہ امور بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اگر اختلاف کو ثابت تسلیم کیا جائے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان پانچ بزرگوں کو اختلاف حضرت معاویہؓ سے تھا نہ کہ امیر یزید سے ۲۔ حضرت معاویہؓ سے اختلاف صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ولی عہد کیوں بنا رہے ہیں۔ امیر یزید کی شخصیت یا ان کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ اس کا اظہار سب سے پہلے کرتے ولی عہدی سے اختلاف سے ان کی خلافت سے اختلاف قطعاً لازم نہیں آتا۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کو تنہا کسی مہاجر کے خلیفہ بننے سے اختلاف تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ایک مہاجر امیر ہو

استخلاف یزید کے مسئلے پر معاندانہ بحث کے اختتام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔
"اس طرح خلافت راشدہ کے نظام کا آخری اور قطعی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ خلافت کی جگہ شاہی خانزادوں (DYNASTIES) نے لے لی اور مسلمانوں کو اس کے بعد سے آج تک اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہ ہو سکی۔"

(ص ۱۶۳)

○ تبصرہ۔ بالفرض خلافت کو ایک خاندان کے ساتھ مخصوص کردینے سے اگر حکومت خانوادوں کی حکومت بن بھی جاتی ہو تو بھی وہ حکمراں خانوادے خلافتی خانوادے کہے جاسکتے ہیں نہ کہ "شاہی خانزادے" ان کے لئے شاہی خانوادوں کا لفظ استعمال کرنا بالکل بے محل، سراسر زیادتی اور غلط بیانی ہے۔ جس کا مقصد معاندانہ مغالطہ دہی ہے۔
اس سے قطع نظر طعن کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اس کی بنیاد کسی شرعی اصول اور قانون کے بجائے اپنے من گھڑت اور خود ساختہ قانون پر قائم ہے۔ شریعت اسلامیہ جمہور مسلمین کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ خلافت کو کسی دینی مصلحت کی بناء پر کسی خاندان یا قبیلہ کے ساتھ مخصوص کردیں۔ اس کی کوئی ممانعت قرآن مجید یا حدیث شریف میں نہیں ہے۔ اس تخصیص کا ناجائز اور حرام ہونا تو کجا اس کا مکروہ ہونا بلکہ خلاف اولیٰ ہونا بھی کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں۔ پھر اس پر اعتراض کے کیا معنی؟ اس کے عدم جواز کی دلیل کا معدوم ہونا ہی اس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ اس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جواز بلکہ بعض حالات میں اولیٰ۔ اور ارجح ہونے کی بھی متعدد دلیلیں موجود ہیں۔ "الائمۃ من قریش" معروف حدیث ہے۔ اس میں امامت و خلافت کو خاندان قریش کے ساتھ مخصوص فرمایا گیا ہے۔ مصلحت یہ تھی کہ قریش مجاور خدام کعبہ و حرم ہونے کی وجہ سے جملہ قبائل عرب کے نزدیک محترم تھے، اور مقتداء کی پوزیشن رکھتے تھے۔ عرب قریش کے علاوہ کسی دوسرے کی قیادت کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ اس مصلحت سے اس وقت کے حالات کے پیش نظر ارشاد فرمایا گیا کہ خلفاء قریش ہی میں سے منتخب کئے جائیں۔ یہ حکم دائمی نہیں

اور ایک انصاری۔ دو امیر بیک وقت مقرر ہوں۔ لیکن انہیں حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب تک زندہ رہے ان کے مطیع رہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ ان سبائیت نواز اور شیعیت پرور مورخین و علماء کا استدلال مذکور بالکل غلط، فاسد اور ایک پرفریب مغالطہ ہے۔

تھا حالات بدل گئے تو یہ حکم بھی نہیں باقی رہا۔ لیکن اس وقت کی مصلحت کے پیش نظر تو یہ حکم دیا گیا کہ خلافت و امامت کو ایک قبیلے کے ساتھ مخصوص کردیا جائے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے خلیفہ اور سربراہ مملکت ہوئے۔ وہ اپنے مرتبہ نبوت و رسالت ہی کی وجہ سے ان کے جانشین ہوئے ہوں۔ لیکن بہر کیف اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ کسی مصلحت سے حکومت و خلافت کو ایک خاندان کے ساتھ مخصوص کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ ایک نبی کا عمل ہے۔ اور انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے کسی کام کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔ تورات شریف سے ثابت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے جناب رجبعام رضی اللہ عنہ خلیفہ اور حکمراں ہوئے۔ یہ بھی وہی خاندان کے ساتھ تخصیص تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق تو رائے عامہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ وہ پیغمبر تھے۔ اس لئے ان کی حکومت پر راضی ہونا تو سب اہل ایمان پر فرض ہی تھا۔ اور سب راضی بھی ہوگئے تھے۔ لیکن رجبعام کا نصب و تقرر تو قوم کی مرضی اور رائے ہی سے ہوا۔ جس سے قوم کا یہ اختیار تخصیص ثابت ہوتا ہے۔ بائبل میں مذکور ہے کہ "اور رجبعام سکم کو گیا اس لئے کہ سارے اسرائیل سکم میں اکٹھے ہوئے تھے تاکہ اسے بادشاہ کریں۔"۔ ان امور و دلائل کے پیش نظر اگر ایک مدت تک خلافت بنو امیہ یا بنو عباسؓ کے ساتھ مخصوص رہی۔ جبکہ قوم اس تخصیص پر راضی تھی۔ بلکہ یہ تخصیص جمہور اہل اسلام ہی نے کی تھی تو یہ شرعاً یا عقلاً کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔ اس پر اعتراض کرنا شریعت اسلامیہ مقدسہ پر اعتراض ہے۔ (والعیاذ باللہ) یہ طعن و اعتراض بھی اس حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ مخالفین خصوصاً مخالفین بنو امیہ، ان مقدس ہستیوں کے ساتھ جذبہ حسد و عداوت سے مغلوب ہوکر شریعت مقدسہ اسلامیہ کو کس طرح نظرانداز کردیتے ہیں۔

گزشتہ بحث سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہوچکی ہے کہ خلیفہ راشد حضرت معاویہؓ نے یزید مغفور کو کامل استصواب رائے عامہ کے بعد ولی عہد بنایا تھا۔ اس لئے اگر اس سے خلافت کی تخصیص اموی خاندان کے ساتھ ہوئی تو یہ رائے عامہ سے ہوئی نہ کہ تنہا ان کی رائے سے اور رائے عامہ کو شریعت اس قسم کی تخصیص کا کامل اختیار دیتی ہے۔ اس لئے حضرت معاویہؓ یا یزید پر اس بارے میں اعتراض کرنا یا اس تخصیص کو ان کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ بنی عباسؓ کی خلافت صدیوں تک قائم

(۱) سلاطین : ۱۲ : ۱

رہی نیز اسپین میں اموی خلافت سینکڑوں برس تک خدمت اسلام میں مصروف رہی ۔ پھر خلافت ترکیہ بھی مدت دراز تک حفاظت دین کا فریضہ انجام دیتی رہی ۔ ان ادوار میں بکثرت علماء و فقہاء ہوئے ' اور ان میں بکثرت بہت بیباک حق گو تھے ۔ لیکن کبھی ان علماء اہلسنت نے ان میں سے کسی خلافت پر بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ ایک خاندان کے ساتھ کیوں مخصوص ہیں ؟ حرمت تو بڑی چیز ہے ' اگر یہ تخصیص 'مکروہ تنزیہی بھی ہوتی تو علماء کی کوئی نہ کوئی جماعت ضرور اس پر معترض ہوتی ۔ اور اسے بدلوانے کی کوشش کرتی ۔ لیکن پوری تاریخ اسلام میں اس کی ایک مثال

بھی نہیں ملتی اگر بالفرض کسی عالم دین نے اس پر نکیر کرنے کی جرات نہیں کی تھی تو کم از کم فقہ کی کتابوں میں مسئلہ تو لکھدیا جاتا ۔ مگر آئمہ اربعہ کا پورا فقہ دیکھ جایئے اس مسئلے کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا ۔ بلکہ اس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا ۔ جو شخص اسے ناجائز کہتا ہے ' اور حضرت معاویہؓ یا کسی اور بزرگ پر معترض ہوتا ہے وہ چودہ صدیوں کے ان لاکھوں علماء و فقہاء و ائمہ مجتہدین کو خطاکار کہتا ہے ۔ مزید یہ کہ اگر بیٹے کو ولی عہد بنادینے میں " شاہی خانوادوں " کے لئے جگہ نکل آتی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ کو اپنا ولی عہد بناتا کیوں منظور فرمایا ؟ کیا آں محترم یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے ؟ اگر سمجھ سکتے تھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے جائز سمجھتے تھے ۔ پھر جب وہ اسے جائز سمجھتے تھے تو حضرت معاویہؓ پر بھی اعتراض کی گنجائش نہیں باقی رہتی ۔ اور اگر نہیں سمجھ سکتے تھے تو معترض کا سمجھنا اور اعتراض کرنا سخت غلطی ہے جو اس کے قصور فہم بلکہ فتور فہم کا نتیجہ ہے ۔

خلافت و حکومت کو ایک خاندان کے ساتھ مخصوص کردینے میں ایک مصلحت یہ ہوتی ہے کہ انتخاب خلیفہ میں سہولت ہوتی ہے پوری قوم میں سے کسی ایک مناسب فرد کو اس کام کے لئے تلاش کرنا بہت دشوار ہے ۔ خصوصاً اس دور میں تو یہ دشوار تر بلکہ محال عادی تھا ۔ اس لئے حکماء و زعماء وقت نے یہی طریقہ مناسب سمجھا کہ خلفاء کسی ایک ہی خانوادے سے لئے جائیں ۔ جو یکجا ہوں یا ایک دوسرے سے بہت قریب ہوں کہ بوقت ضرورت آسانی کے ساتھ مجتمع ہو سکیں ۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ امیر یزید مغفور کے بعد خلافت ان کے خانوادے کے ساتھ کہاں مخصوص رہی ؟ بہت قلیل مدت کے بعد خلافت حضرت مروانؓ کی طرف منتقل ہوگئی اور ان کی اولاد میں چلتی رہی یہاں تک کہ بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل گئی ۔

استخلاف یزید کی مصلحتیں

خلیفہ راشد حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ اور معززین واجلّہ تابعین کوفہ کے نمائندہ وفد کی تجویز پر استصواب رائے عامہ کرکے امیر یزید کو ولی عہد اور اپنے بعد خلیفۃ المسلمین مقرر کیا۔ اس وقت کے پورے عالم اسلامی نے ان کی تائید۔ اس وقت تقریباً تین سو صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم موجود تھے، جن میں اکابر صحابہؓ بدری و اصحاب بیعت رضوان بھی تھے۔ ان کے علاوہ اجلّہ تابعین کی کثیر تعداد تھی ان سب نے نیز عام مسلمانوں نے اس استخلاف کو بالاتفاق اور بطیب خاطر منظور کیا۔ صرف پانچ حضرات کا اختلاف بیان کیا جاتا ہے۔ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ در حقیقت انہیں بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ اختلاف کی روایت موضوع، اور جھوٹی ہے۔ ممکن ہے کہ شروع میں کچھ اشکال انہوں نے پیش کیا ہو جو گفت و شنید کے بعد دور ہوگیا اور انہیں بھی تجویز مذکور سے اختلاف نہیں باقی رہا۔ اور اگر بالفرض باقی بھی رہا تو غالب اکثریت کے اتفاق کے مقابلے میں اسے کوئی وزن نہیں دیا جاسکتا، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں باقی رہتی۔ حضرت معاویہؓ کا یہ اقدام بالکل جائز اور صحیح تھا اس لئے ان پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں اور اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کے اس کام کی کوئی مصلحت بتائی جائے۔ لیکن اگر ان مصلحتوں کا بھی تذکرہ کردیا جائے جو ان حکمائے امت یعنی صحابہ کرامؓ کے پیش نظر تھیں تو امید ہے کہ انشاء اللہ قاری کے لئے مزید شرح صدر کی موجب ہوں گی۔ اس لئے مندرجہ ذیل سطور میں ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱۔ مذکور ہوچکا ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ جو خلافت سے دست بردار ہوئے تھے اس کا ایک اہم اور عظیم مقصد شیعوں کے من گھڑت اور باطل عقائد، امامت، وصایت اور ولایت پر کاری ضرب لگانا تھا۔ ان کی دست برداری کے بعد شیعوں کے ان عقائد باطلہ کا باطل ہونا عام طور پر ظاہر ہوگیا تھا۔ لیکن شیعوں نے کچھ مدت کے بعد پھر ان باطل اور خلاف اسلام نظریات شیعہ خصوصاً نظریہ امامت کو پھیلانے کے لئے یہ کہنا شروع کردیا کہ "حضرت حسنؓ نے اپنے شیعوں کی شرارتوں سے پریشان اور مجبور ہوکر، عارضی طور پر خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد کردی تھی۔ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد پھر خلافت انہیں کے گھرانے میں واپس آجائے گی کیونکہ وہ امام ہیں اور خلافت انہیں کا

خدا داد حق ہے۔"(۱)

امیر یزید کو ولی عہد بنا کر حضرت معاویہؓ نے اس باطل توقع اور باطل نظریہ امامت پر دوسری کاری ضرب لگائی۔ جس سے یہ پاش پاش ہوگیا۔ سبائی قائدین نے جو اپنے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے توقع مذکور کا جالا تانا تھا' وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر معدوم ہوگیا۔ اس کے ساتھ شیعی عقیدہ وصایت بھی پاش پاش ہوگیا۔ یہ بہت عظیم اور اہم مصلحت تھی۔ جو امیر یزید کی ولی عہدی و خلافت سے حاصل ہوئی تھی' بہت سے مسلمانوں کا اعتقاد درست ہوگیا اور ایمان سلامت رہا۔ اور بہت سے سوء اعتقاد اور رفض کے ضلال سے محفوظ ہوگئے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور معززین و علماء کوفہ کے پیش نظر بھی غالباً یہی دینی مصلحت تھی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے امیر یزید مغفور کو ولی عہد بنانے کی تحریک کی۔ اس مصلحت کے حصول کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح حضرت حسنؓ کا بغیر کسی مجبوری کے خلافت سے دست بردار ہونا اور جمہور اہل ایمان کی مرضی کے مطابق اس خدمت جلیلہ کو حضرت معاویہؓ کے سپرد کرنا دین اسلام کی ایک عظیم خدمت تھی۔ مگر اس کے اجر و ثواب میں حضرت مغیرہؓ کا حصہ شاید کچھ زیادہ ہو کیونکہ وہ اس کے پہلے محرک تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب محسنین امت کے درجات قرب بلند فرمائے۔ اور انہیں ان کے خدمات جلیلہ کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

۲:۔ حضرت معاویہؓ خلیفہ راشد تھے ازروئے حدیث شریف " علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین " ان کا طریقہ اور عمل بھی حجت شرعی اور لائق اقتداء ہے۔ یوں بھی ہر صحابیؓ کا عمل حجت شرعی ہے۔ بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی حجت شرعی اس سے زیادہ قوی قائم نہ ہو۔

آں محترم نے امیر یزید کو ولی عہد بنا کر اسلامی فقہ دستوری کے دو اہم مسئلے حل کر دیئے اول یہ کہ باپ کے لئے جائز ہے کہ اپنے بیٹے کو ولی عہد بنائے۔

دوسرا یہ کہ ولی عہد بنانے کے لئے استصواب رائے ضروری ہے۔ محض اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد نہیں بنایا جاسکتا۔ اس بارے میں جمہور اہل اسلام کی رضامندی اور ارباب

---

(۱) یہ روایت کہ صلح میں یہ طے پایا تھا کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد پھر حضرت حسنؓ ہی خلیفہ ہوں گے۔ اسی مقصد سے وضع کی گئی تھی۔ ورنہ معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب آں محترم خلافت سے خود دست بردار ہوئے تھے' تو اسے دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش کے کیا معنی ہیں۔ اس روایت کا موضوع ہونا بالکل ظاہر ہے

حل و عقد یعنی ان کے زعماء و قائدین کی رائے اور تائید لازم ہے۔ ان کی اس رائے سے سب صحابہ کرامؓ نے اتفاق کیا اس لئے یہ سمجھنا چاہیے کہ دونوں مسئلوں پر اجماع صحابہؓ ہوگیا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ پانچ حضرات نے اس سے اختلاف کیا تھا تو بھی کہنا پڑے گا کہ اگرچہ اجماع نہیں ہوا لیکن صحابہ کرامؓ اور تابعین کی غالب اکثریت نے اس سے اتفاق کیا۔ یہ بھی بہت قوی حجت ہے۔

۳:۔ اگرچہ حضرت حسنؓ و حضرت معاویہؓ نے دشمن اسلام سبائی پارٹی کو کچل دیا تھا، مگر ناگن بالکل مردہ نہیں ہوگئی تھی اور یہود اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھے۔ اندیشہ تھا کہ "مفسدین فی الارض" پھر شرانگیزی کریں گے۔ اس لئے اس وقت ایسے سربراہ مملکت کی ضرورت تھی جو سبائیوں کی فریب کاریوں اور ان کی شیطانی چالوں کو خوب سمجھتا ہو۔ امیر یزید سبائیوں سے خوب واقف تھے۔ اور ان کا علاج کرنا جانتے تھے۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں اس وقت کی پوری دنیائے اسلام میں سبائیوں کی سراپا فریب ابلیسی تدبیروں کو سمجھنے والے گنے چنے افراد تھے (۱) ان میں سے ایک امیر یزیدؒ بھی تھے۔ اس لئے انہیں ولی عہد بنانا مصلحت کا اہم تقاضا تھا۔

(۱) یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج کا عالم اسلامی تو اس وقت کے عالم اسلامی سے نسبتاً بہت وسیع ہوچکا ہے۔ اہلسنت کی تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ متجاوز ہوچکی ہے۔ لیکن شیعی فریب کاریوں اور سبائی چالبازیوں کو سمجھنے والے اور ان سے واقفیت رکھنے والے تلاش کیجئے تو بلا مبالغہ پوری دنیائے اسلام میں ایک سو آدمی بھی نہ مل سکیں گے۔ حالانکہ موجودہ دور میں شیعوں کی مذہبی کتابیں بھی بکثرت دستیاب ہیں اور امت کو ان کی تخریبی کارروائیوں اور ہلاکت خیز فریب کاریوں، نیز اہلسنت کے ساتھ ان کے بغض و عناد کے ہزاروں تجربات ہوچکے ہیں، باوجود اس کے اہلسنت کی غالب اکثریت ان کی طرف سے بالکل غافل اور بے خبر ہے۔ پھر اس دور میں اگر مسلم زعماء کی غالب اکثریت انہیں سمجھنے سے قاصر رہی تو کیا تعجب ہے؟ جبکہ اس وقت تک شیعہ اپنا مذہب چھپاتے تھے۔ اور ان کے فریب باطل کی کوئی تدوین بھی نہیں ہوئی تھی بلکہ عام مسلمانوں میں یہ گھلے ملے رہتے تھے۔ اور صرف ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے نمایاں ہوتے تھے۔ اپنے فریب باطل کی تبلیغ خفیہ طور پر کرتے تھے نیز اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اگر اکابر امت ان کے طور طریقے سے ناواقف رہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور وہ حضرات اس بارے میں معذور تھے۔

۴ :۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد معدلت مہد میں اسلامی افواج یورپ تک پہنچ گئیں تھیں ۔ حضرت معاویہؓ کے مبارک دور خلافت میں اس محاذ پر مزید پیش قدمی ہوئی ۔ امیر یزید کی قیادت میں لشکر اسلام نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ۔ بکثرت تجربات کی وجہ سے امیر یزید یورپ خصوصاً رومن امپائر کی سیاست کے ماہر ہوگئے تھے ۔ اس کے ساتھ بہت ذہین و ذکی ' شجاع ' باہمت اور مدبر (STATESMAN) تھے مزید یہ کہ سبائی امیر یزید کے قریب آنے ' اور ان کے گرد گھیرا ڈالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے ۔ بخلاف اس کے اس وقت جو نوجوان تابعین یا صحابہؓ میں منصب خلافت کی اہلیت رکھتے تھے ' وہ سبائی فریب کاریوں سے امیر یزید کے برابر واقف نہ تھے ۔ اس لئے ان کے متعلق یہ اندیشہ بجا طور پر کیا جاسکتا تھا کہ سبائی فریب کارانہ خوشامد اور تقیہ سے کام لے کر ان کے مقرب بن جائیں گے اور انہیں اپنے گھیرے میں لے لیں گے ۔ پھر دوستی نما عداوت سے کام لے کر خلافت اور ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں گے ۔ اس تباہ کن مفسدہ سے امت کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی امیر یزید کی ولی عہدی اور خلافت بہت مفید ثابت ہوئی ۔

۵ :۔ ایک مصلحت تو بالکل واضح اور بدیہی ہے امیر یزید کو ولی عہد بنانے کی تجویز خود حضرت معاویہؓ کی نہیں تھی ۔ یہ تجویز حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے پیش کی تھی ۔ جب حضرت معاویہؓ اس پر بھی تیار نہ ہوئے ' تو معززین و قائدین اہل کوفہ کے وفد نے آکر مکرر تجویز پیش کی ۔ پھر حضرت معاویہؓ نے استصواب رائے عامہ کیا ۔ نیز خواص سے مشورہ کیا ۔ اس وقت کے پورے عالم اسلامی نے اس تجویز کی تائید کی ۔ صرف پانچ حضرات کے اختلاف کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ در حقیقت ان کے اختلاف کی روایتیں بھی غلط ہیں ۔ انہیں بھی کوئی اختلاف نہیں تھا ۔ اور اگر تھا بھی تو وہ دور ہوگیا تھا ۔ اور اگر بالفرض باقی بھی رہا تو قابل اعتبار نہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امیر یزید کو عالم اسلام میں قبول عام حاصل تھا اور ظاہر ہے کہ ایسے ہی شخص کو ولی عہد بنانا عین مصلحت ہے جسے قبول عام حاصل ہو ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت تقریباً تین سو کی تعداد میں حضرت صحابہ کرامؓ موجود تھے ۔ ان میں سے کسی نے بھی اس تجویز سے اختلاف نہیں کیا ۔ ان حضرات صحابہؓ میں سے بطور مثال پچاس حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں ۔

(۱) حضرت سعد بن ابی وقاص (۲) حضرت ارقم بن ابی ارقم (۳) حضرت انس بن مالک (۴) حضرت ابوہریرہ (۵) حضرت کعب بن عمرو الانصاری (۶) حضرت ربیعہ بن عباد الائلی (۷) حضرت عبداللہ بن بسر المازنی (۸) حضرت اسامہ بن زید (۹) حضرت جابر بن عبداللہ

الانصاری (۱۰) حضرت جابر بن عتیک (۱۱) حضرت مالک بن ربیعہ (۱۲) حضرت ثابت بن ضحاک بن خلیفہ (۱۳) حضرت نعمان بن عمرو انصاری (۱۴) حضرت ابو واقد اللیثی (۱۵) حضرت عبداللہ بن سعد بن خیثمہ انصاری (۱۶) حضرت فضالہ بن عبید انصاری (۱۷) حضرت ابو قتادہ انصاری (۱۸) حضرت ابوامامہ باہلی (۱۹) حضرت رافع بن خدیج (۲۰) حضرت ربیعہ بن کعب الاسلمی (۲۱) حضرت قیس بن سعد بن عبادہ (۲۲) حضرت عثمان بن حنیف الانصاری (۲۳) حضرت براء بن عازب (۲۴) حضرت ابو سعید خدری (۲۵) حضرت زید بن ارقم (۲۶) حضرت صفوان بن معطل (۲۷) حضرت عمرو بن امیہ ضمیری (۲۸) حضرت سلمہ بن الاکوع (۲۹) حضرت معقل بن یسار مزنی (۳۰) حضرت بریدہ بن الحصیب الاسلمی (۳۱) حضرت ناجیہ الاعجم (۳۲) حضرت عبداللہ بن یزید الاوسی (۳۳) حضرت عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمی (۳۴) حضرت عبداللہ بن ابی اوفی الاسلمی (۳۵) حضرت نوفل بن معاویہ الدیلی (۳۶) حضرت معبد بن خالد (۳۷) حضرت عوف بن مالک (۳۸) حضرت نضلہ بن عبید (۳۹) حضرت حکیم بن حزام (۴۰) حضرت حویطب بن عبدالعزیٰ (۴۱) حضرت عدی بن حاتم (۴۲) حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ الکنانی (۴۳) حضرت معبد بن یربوع (۴۴) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (۴۵) حضرت سمرہ بن جندب (۴۶) حضرت شداد بن اوس (۴۷) حضرت نعمان بن بشیر (۴۸) حضرت ضحاک بن قیس (۴۹) حضرت عبداللہ بن یزید الاوسی (۵۰) حضرت جریر بن خویلد المدنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

ان حضرات صحابہؓ کا تذکرہ استیعاب ' اصابہ ' تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال و تذکرہ اصحاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ حوالہ دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوئی۔ یہ اسماء گرامی بطور نمونہ اور مثال لکھے گئے ہیں۔ ورنہ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ ان پانچ حضرات صحابہؓ کے علاوہ جن کے متعلق یہ غلط خبر مشہور کی گئی ہے کہ انہوں نے زیر بحث مسئلے میں حضرت معاویہؓ سے اختلاف کیا تھا تقریباً تین سو صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم اس وقت مکہ ' مدینہ ' دمشق ' کوفہ ' بصرہ وغیرہ اسلامی مرکزوں میں موجود تھے۔ صحابہ کرامؓ کی اس کثیر تعداد نے امیر یزید کی ولی عہدی سے اتفاق کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کی اس کثیر تعداد کے اتفاق کے مقابلے میں پانچ حضرات کے اختلاف کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہے کہ امیر یزید مغفور کو جمہور صحابہؓ و جمہور اجلہ تابعین اور جمہور امت مسلمہ نے بالاتفاق حضرت معاویہؓ کا ولی عہد تسلیم کیا اور

ان کے بعد خلیفۃ المسلمین منتخب کیا۔ (۱)

اس سے یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ امیر یزید مرحوم ایک صالح اور متقی مسلمان تھے، جو شخص انہیں فاسق و فاجر کہتا ہے وہ ان سیکڑوں صحابہ کرامؓ، ہزاروں اجلّہ تابعین، اور لاکھوں عام صالح مسلمانوں کو خطا کار و گناہ گار کہتا ہے۔ وہ یزید پر نہیں بلکہ جمہور صحابہؓ، جمہور تابعین صالحین، اور اس وقت کی پوری امت مسلمہ صالحہ پر اعتراض و طعن کرتا ہے۔ اور انہیں فاسق نوازی کا مرتکب فاسق کہتا ہے۔ اسی طرح امیر یزید کو منصب خلافت کے لئے نا اہل قرار دینا ان سب حضرات صحابہؓ و تابعین اور اس وقت کے جمہور مسلمین کو نا اہل اور بد فہم قرار دینا ہے۔ (العیاذ باللہ) ایک سنی تو اس کے تصور سے بھی تھرا جاتا ہے۔ صرف شیعہ اور شیعیت کے رنگ میں رنگے ہوئے سنی نما شیعہ ہی اپنے ذہن و دہن کو ایسے افتراء و بہتان سے آلودہ اور گندہ کرسکتے ہیں۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت آنا یقینی ہے اور افتراء و بہتان اور توہین صحابہؓ و تذلیل اہل ایمان کی سزا آخرت میں بہت سخت ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ واقعات جس قرن اور دور کے ہیں وہ ازروئے حدیث شریف خیرالقرون میں داخل ہے۔ امیر یزید پر ان مخالفین بنو امیہ کی یہ تبرابازی حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور دوسرے سیکڑوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، حضرات اجلہ تابعین و ائمہ مجتہدین، اور عام مومنین صالحین کے ساتھ یہ سوء ظن یعنی انہیں حق پوشی مداہنت اور نظام خلافت کو ملوکیت بنانے کی کوشش کا مرتکب قرار دینا، کیا الصادق الامین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی ہوئی تکذیب نہیں ہے؟ بلاشبہ یہ قول رسول کی کھلی ہوئی تکذیب ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قرن کو خیرالقرون فرمارہے ہیں۔ اور یہ لوگ اسے معاذ اللہ شرالقرون قرار دیتے ہیں؟ یہ لوگ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صحابہ، تابعین اور جمہور مومنین کے خلاف ان کے یہ اقوال کس قدر گندے اور زہریلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اس غلط اور قابل نفرت روش سے توبہ کی توفیق عطا

---

(۱) ان پانچ حضرات کا اختلاف تسلیم کرلینے کے باوجود یہ دعوی صحیح اور حق ہے۔ ورنہ ان حضرات کا اختلاف بھی ثابت نہیں۔ ان حضرات نے بھی حضرت معاویہؓ سے اتفاق کرلیا تھا۔ جیسا کہ ہم ثابت کرچکے ہیں۔ اختلاف کی روایت موضوع، من گھڑت اور جھوٹی ہے۔ قطعاً قابل قبول نہیں۔

فرمائے ۔ اور سب مسلمانوں کو اس تبرائی شیعی ذہنیت و بدکلامی سے محفوظ رکھے ۔ آمین

اموی خلافت کے ان مخالفین و اعداء کا زیر گفتگو رویہ جو ذہن میں رفض کے جراثیم موجود ہونے کا اثر ہے روافض اور یہود کے ناپاک مقاصد پورے ہونے کا ذریعہ بن رہا ہے ۔ شیعہ اور یہود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ناکام نبی ظاہر کرنا چاہتے ہیں ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت خاکم بدہن لوگوں کی نگاہ میں گھٹانا چاہتے ہیں ۔ خلفاء بنو امیہ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف وہ جھوٹی روایتیں جو ان کے اعتراضات و مطاعن کی بنیاد ہیں اسی ناپاک مقصد سے گڑھی گئی ہیں ۔ اور ہمارے ان سنی صاحبان نے انہیں قبول کرکے ان دشمنان اسلام کو ان کے ان ناپاک مقاصد کے حصول میں امداد دی ہے ۔ شیعوں اور یہود کا دوسرا ناپاک مقصد ہماری تاریخ کو تاریک بنانا ہے ۔ اس مقصد میں یہ دشمنان یزید و بنی امیہ ' ان کے معاون ہیں ۔ اللہ تعالیٰ انہیں فہم سلیم اور توبہ کرکے صراط مستقیم اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

ان کے ذہن پر تشیع کا ایک اثر یہ ہے کہ یہ لوگ سلامت فہم اور عدل پسندی سے محروم ہوگئے ۔ کسی پر غلط الزام لگادینا ان کے نزدیک کوئی معصیت نہیں ۔ اس سوء مزاج کا ایک اثر یہ ہے کہ جو شخص بنو امیہ خصوصاً حضرت معاویہؓ اور امیر یزیدؒ کی طرف سے دفاع کرتا ہے ۔ اور ان شیعہ اور شیعیت زدہ تاریخ نگاروں نے جو افتراء پردازی اور بہتان طرازی کی ہے اس کی مدلل تردید کرتا ہے تو اس پر خارجیت ' اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عداوت اور ان کی توہین و تنقیص کا الزام عائد کردیتے ہیں ۔

ان کے اس طرز عمل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر یزید مغفور کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مدمقابل سمجھتے ہیں ۔ گویا ان کے نزدیک " اگر امیر یزید مومن صالح ہوں تو حضرت حسینؓ کے رتبہ میں کچھ کمی واقع ہوجائے گی ۔ اور اگر امیر یزید فاسق و فاجر ہوں تو آں محترم کا رتبہ بلند ہوجائے گا ۔

اس طرح یہ لوگ خود حضرت حسینؓ کی تنقیص و توہین کرتے ہیں ۔ مگر فہم سے کام نہیں لیتے اس لئے سمجھتے ہی نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا درجہ فضیلت اپنی جگہ مستقل ہے ۔ امیر یزید یا کسی دوسرے کی اچھائی برائی کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا ۔ امیر یزید ولی اللہ ہوں تو اس سے حضرت حسینؓ کے رتبہ میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی ۔ اور اگر وہ فاسق ہوں تو اس سے آں محترم کے رتبہ میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی ۔ حضرت حسینؓ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے امیر یزید کی مذمت کرنا قطعاً ضروری نہیں ۔

دونوں باتوں میں سرے سے کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ۔ البتہ امیر یزید کو حضرت حسینؓ کے مقابلہ میں لانا جیسا کہ یہ مخالفین یزید کرتے ہیں ، حضرت حسینؓ کی تنقیص و توہین ہے ، جس کا ارتکاب یہ مخالفین یزید خود کرتے ہیں ۔ اور دوسروں پر اس کا غلط الزام لگاتے ہیں ۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ حضرت حسینؓ صحابی ہیں اور امیر یزید تابعی ۔ کوئی غیر صحابی خواہ تابعی ہو یا کوئی دوسرا کسی صحابیؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا ۔ اس لئے ہمارے نزدیک امیر یزید مغفور خواہ کیسے ہی صالح اور متقی ہوں ، حضرت حسینؓ کی خاک پا کی برابری بھی نہیں کرسکتے ۔ جس طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ، اور خواجہ معین الدین چشتی رحمہم اللہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کی خاک پا کی برابری نہیں کرسکتے ۔ حضرت حسینؓ کا رتبہ امیر یزید سے بہت بلند و برتر ہے ۔ انہیں حضرت حسینؓ کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا ۔ رتبہ صحابیت بہت بلند و برتر ہے کسی ایسے شخص کو جسے معیت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ میسر ہوئی ہو کسی صحابیؓ کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا ۔ مرتبہ صحابیت عنداللہ بہت بلند ہے ۔ کسی غیر صحابیؓ کی رسائی اس مرتبہ تک کبھی نہیں ہوسکتی ۔

دو غلط فہمیوں کا ازالہ

پہلی غلط فہمی

الحمدللہ کہ استخلاف یزید کے مسئلے میں حضرت معاویہؓ کا حق و صواب پر ہونا براہین قطعیہ سے قطعی طور پر ثابت اور کالشمس فی نصف النہار روشن ہوگیا ۔ معترضین طاعنین کے اعتراضات و مطاعن کی دھجیاں بکھر گئیں اور وہ ھباءً منثورا ہوگئے ۔ خاتمہ بحث پر ہم دو غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو استخلاف یزید کے مسئلے میں ایسے علماء کرام کو پیدا ہوگئیں جو حضرت معاویہؓ کے مخالف نہیں ہیں ۔ بلکہ ان کی طرف سے دفاع بھی کرتے ہیں ۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ :

> " جمہور امت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا ۔ "

یہ کہنا صحیح نہیں کہ علماء محققین ہمیشہ " کہتے آئے ہیں " ہاں یہ کہتے تو ایک حد تک صحیح ہوتا کہ بعض علماء نے اس قسم کی باتیں لکھی ہیں ۔ لیکن جن علماء کی یہ رائے ہے وہ

کم از کم اس مسئلے کی حد تک تو قطعاً محقق نہیں تھے ۔ انہوں نے اس مسئلے کو سطحی نظر سے دیکھ کر اور جذبات سے مغلوب ہوکر یہ رائے قائم کرلی ۔ ان کی یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے ۔

امیر یزید مغفور کی خلافت کے زمانہ میں جو افسوسناک حوادث پیش آئے ' انہیں ان کی ولی عہدی ' اور خلافت کا نتیجہ قرار دینا حقیقت حوادث اور ان کے صحیح اسباب سے ناواقفیت ' نظر کی سطحیت اور تاریخ کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے ۔ اسلامی ذہن سے یعنی کتاب و سنت کی روشنی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے ' تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان الم انگیز حوادث کا سبب سبائیوں کی فساد انگیز سازشیں ' ان کی فتنہ پردازیاں ' اور ریشہ دوانیاں تھیں جن کی تفصیل بقدر ضرورت و کفایت اس کتاب میں مختلف مقامات پر کی گئی ہے ۔ امیر یزید کو ولی عہد بنانا یا ان کا منصب خلافت پر فائز ہونا قطعاً اس کا سبب نہیں تھا ۔ اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص خلیفہ ہوتا تو بھی یہ یا اسی قسم کے اتنے ہی افسوسناک حوادث پیش آتے ۔ کیونکہ سبائی منافقانہ اور معاندانہ تدبیروں ' اور فتنہ انگیز فریب کاریوں سے باز نہیں آسکتے تھے ۔ وہ صرف حضرت معاویہؓ یا امیر یزیدؒ کے مخالف اور دشمن نہیں تھے ' بلکہ درحقیقت اسلام خلافت اسلامیہ ' اور اجتماع ملت کے دشمن تھے ۔ اگر کسی فرشتے کو بھی تخت خلافت پر بٹھادیا جاتا تو بھی یہ سبائی مفسدین فی الارض اسی قسم کی فساد انگیزیاں اور فتنہ پردازیاں کرتے ' جیسی انہوں نے خلافت یزید کے خلاف کیں ۔ اور اس فرشتہ معصوم کے خلاف بھی لوگوں کو اکساکر ' اس سے لڑوانے اور فساد فی الارض برپا کرنے کی پوری کوشش کرتے ۔ ان ناخوشگوار اور افسوسناک حوادث و واقعات کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ یا امیر یزیدؒ پر ڈالنا سخت نا انصافی ہے ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں سبائی گروہ پیدا ہوکر طاقتور ہوگیا تھا ۔ آں محترم کی شہادت کا حادثہ عظیمہ پیش آیا ' جو دوسرے افسوسناک واقعات جمل و صفین کی خانہ جنگیوں کا سبب بنا ۔ نصیریوں اور خوارج کے فتنے پیدا ہوئے ' تو کیا ان اندوہناک حوادث اور واقعات کی ذمہ داری اس جماعت امناء پر ڈالی جاسکتی ہے ۔ جسے حضرت فاروق اعظمؓ نے انتخاب خلیفہ کے لئے مقرر کیا تھا اور جس نے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا تھا ؟ اور کیا حضرت عثمان ذی النورین کو ان حوادث کا ذمہ دار کہا جاسکتا ہے ؟ اسی طرح حضرت علیؓ کے دور خلافت میں جو افسوسناک حوادث پیش آئے ' یعنی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی نصیریہ کی شورش ' خوارج کا فساد فی الارض یہ سب حوادث سامنے رکھ کر اگر کوئی خارجیت نواز یہ کہے کہ آں محترم کو خلیفہ

منتخب کرنا رائے اور تدبیر کے اعتبار سے ان صحابہ کرامؓ کی جنہوں نے آں محترم کو منتخب کیا تھا غلطی تھی جس سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا کیا یہ " محققین " اس رائے کو صحیح سمجھیں گے ؟ اور کیا اس کے اس تبصرے کو قرین عقل و انصاف قرار دیں گے ؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ان کی رائے بھی قطعاً اور غیر منصفانہ ہے ۔ جس طرح ان حوادث کی ذمہ داری حضرت علیؓ کی خلافت یا حضرت عثمانؓ کی خلافت ' یا انہیں خلیفہ منتخب کرنے والے صحابہ و تابعین پر نہیں عائد کی جاسکتی ۔ اسی طرح امیر یزید کی عہد خلافت میں جو ناخوشگوار واقعات پیش آئے ' ان کی وجہ سے یہ کہنا کہ حضرت معاویہؓ نے امیر یزید کو ولی عہد بنا کر " باعتبار تدبیر غلطی کی ۔ " یا یہ کہنا کہ " یہ حوادث انہیں ولی عہد بنانے ' یا ان کے خلیفہ بننے کی وجہ سے پیش آئے تھے " بالکل غلط باطل اور بے بنیاد بات ہے ۔ حق یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا امیر یزید کو ولی عہد بنانا " رائے اور تدبیر " کے اعتبار سے بالکل صحیح اور مناسب تھا ۔ جو افسوسناک حوادث پیش آئے وہ شیعوں کی مفسدانہ سازشوں اور فتنہ پردازیوں کی وجہ سے پیش آئے ۔ امیر یزید کو ولی عہد بنانے کا نتیجہ نہیں تھے ۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو بھی اس قسم کے افسوسناک حوادث ضرور پیش آتے ۔ افسوس کہ ان " محقق علماء " نے اس واقعہ کو بھی بالکل نظر انداز کردیا کہ حضرت معاویہؓ نے امیر یزید کو تنہا اپنی رائے سے ولی عہد نہیں بنایا تھا ۔ بلکہ تقریباً تین سو صحابہ کرامؓ اور ہزاروں اجلہ تابعین کی رائے سے بنایا تھا ۔ حضرت معاویہؓ کا تخطیئہ کرنے کے معنی تقریباً تین سو صحابہؓ اور ہزاروں اجلہ تابعین کا تخطیئہ کرنا ' اور ان کی " رائے اور تدبیر " کو غلط کہنا ہے ۔ کیا یہ " محقق علماء " ان سب کو خاطی کہنے کی جسارت کرسکتے ہیں ؟ کوئی عاقل سنی تو ایسی مذموم جرات نہیں کرسکتا ۔ ان " محقق علماء " نے مذکورہ بالا غلطی کے علاوہ ایک دوسری غلطی کا ارتکاب بھی کیا ' جو صرف رائے کی غلطی نہیں بلکہ ناانصافی بھی ہے ۔ ان حضرات کی نظر خلافت یزید کے زمانہ میں پیش آنے والے افسوسناک حوادث پر تو فوراً پہنچی مگر اس دور میں جو فوائد و منافع امت مسلمہ کو حاصل ہوئے ' وہ ان کی نظر سے اوجھل ہوگئے ۔ امیر یزید کا دور خلافت بہت چھوٹا ہے مگر باوجود اس کے ' اس زمانہ میں افریقہ میں فتوحات ہوئیں ' علم اسلام اس براعظم میں بڑھتا رہا ۔ اسلام کی اشاعت ہوئی ' اور دعوت اسلام افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی ۔ اور بربریوں کے تقریباً سب قبائل مشرف بہ اسلام ہوگئے ۔ یورپ میں اسلام کی دعوت اگرچہ حضرت معاویہؓ ہی کے زمانہ میں پہنچ چکی تھی ' مگر امیر یزید کے عہد خلافت میں اس کے قدم آگے بڑھے ۔ دشمن اسلام مدعی نبوت مختار ثقفی

کذاب، رافضی اور اس کے ساتھی دشمن اسلام کیسان کذاب رافضی کا فتنہ فرو ہوا۔ جس سے لاکھوں گمراہوں کو ہدایت حاصل ہوئی۔ اور دین اسلام محفوظ رہا۔ کیا امیر یزید کے عہد خلافت کے یہ خوشگوار اور مسرت بخش واقعات قابل توجہ نہیں ؟ کیسی نا انصافی ہے کہ نا خوشگوار واقعات کا تو تذکرہ کیا جائے، اور انہیں شہرت دینے کی کوشش کی جائے مگر، خوشگوار اور پسندیدہ واقعات کو نظرانداز کیا جائے۔

دوسری غلط فہمی

افسوس ہے کہ دوسری غلط فہمی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے ایسے صاحب علم کو پیدا ہوئی۔ "موصوف البدایہ و النہایہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

" وکان معاویۃ لما صالح الحسن عهد الحسن بالامر من بعده (۱) فلما مات الحسن قوی امر یزید عند معاویۃ ورای انه

(۱) اس روایت کے بارے میں حافظ صاحب سبائی فریب کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ روایت قطعاً باطل اور سبائیوں کی وضع کی ہوئی ہے۔ حضرت حسنؓ تو خود خلافت سے دست بردار اور مستعفی ہوئے تھے وہ دوبارہ خلافت اپنے پاس آنے کی خواہش کیوں کرتے؟ اور یہ شرط کیوں پیش کرتے؟ علاوہ بریں اگر یہ شرط ہوتی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ صلح نامہ مکمل ہوتے ہی حضرت حسنؓ کی ولی عہدی کا اعلان کردیتے۔ مگر انہوں نے اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا اور جب اعلان نہیں کیا تھا تو اس پر حضرت حسنؓ نیز دوسرے حضرات صحابہؓ و تابعین شرکاء صلح کو اعتراض اور اعلان کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر تاریخ میں اس اعلان و مطالبے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ واقعہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر معاہدے میں یہ دفعہ ہوتی تو جب بقول شیعہ و شیعیت نواز مورخین و علماء حضرت معاویہؓ نے امیر یزید کی ولی عہدی کے لئے استفسار کیا تھا اور مبینہ طور پر پانچ حضرات نے اس سے اختلاف کیا تھا تو اس وقت یہ حضرات یہ ضرور کہتے کہ آپ نے حضرت حسنؓ سے اپنے بعد انہیں ولی عہد بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اگر وہ نہیں ہیں تو ان کے بھائی حضرت حسینؓ کو ولی عہد بنایئے لیکن اس کی طرف کسی نے اشارہ تک نہیں کیا۔ ان وجوہ سے یہ بات بالکل واضح اور روشن ہوجاتی ہے کہ زیر بحث روایت جس کا تذکرہ حافظ ابن کثیرؒ نے کیا ہے، بالکل غلط جھوٹی اور شیعوں یا شیعیت نوازوں کی گڑھی ہوئی ہے۔ جس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ہے۔ معاہدے میں یہ یا ایسی کوئی دفعہ نہیں تھی۔ یہ سبائیوں کا گڑھا ہوا افسانہ ہے۔

لننلک اهلا و ذلک من شدة محبة الوالد لولده ۔ "

اور حضرت معاویہؓ نے جب حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو
حضرت حسنؓ نے ان سے عہد لے لیا تھا کہ اپنے بعد انہیں
(حضرت حسنؓ کو) ولی عہد مقرر کریں گے ۔ جب حضرت حسنؓ کا
انتقال ہوگیا تو حضرت معاویہؓ کے نزدیک یزید کا معاملہ مضبوط ہوگیا ۔
اور انہوں نے انہیں (یزید کو) اس کام (خلافت) کا اہل سمجھا اور
یہ بات بیٹے کے ساتھ محبت پدری کی شدت کی وجہ سے ہوئی ۔ "

حافظ صاحب کی یہ رائے ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے اور موصوف کی غلط فہمی ہے ۔
افسوس ہے کہ انہوں نے واقعات پر غور نہیں کیا اور اس غلطی میں مبتلا ہوگئے ۔ حالات گواہ
ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے جو امیر یزید کو ولی عہد بنایا اس میں محبت ابوت اور شفقت پدری
کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا بلکہ ان کے اس اقدام کا محرک صرف امت مومنہ کی خیر خواہی ' اور
الملت اسلامیہ کے لئے مصلحت بنی کا جذبہ تھا ۔ اور انہوں نے یہ کام خالصتاً لوجہ اللہ کیا تھا
۔ واضح بات ہے کہ اگر حب اولاد اس کی محرک ہوتی تو وہ حضرت مغیرہؓ کی تحریک سے
بہت پہلے خود ہی اس کی تحریک کرتے ۔ لیکن صفحات گزشتہ میں ہم مدلل طور پر واضح کرچکے
ہیں کہ انہوں نے خود اپنی طرف سے اس کی کوئی تحریک نہیں فرمائی بلکہ ان کے ذہن میں
اس منصب کے لئے دوسرے افراد تھے ۔ امیر یزید کو ولی عہد بنانے کا کوئی خیال بھی ان کے
دل میں نہیں تھا ۔ حضرت مغیرہؓ کی تحریک سے یہ خیال پیدا ہوا ۔ پھر بھی انہوں نے اس کا
ارادہ نہیں کیا ۔ بلکہ جب کوفہ کے معززین اور زعماء کے وفد نے اصرار کے ساتھ یہ
تحریک پیش کی تو انہوں نے اس کا ارادہ کیا ' اور اس کے لئے استصواب عام اور شوریٰ کیا
۔ جس کی تفصیل گزر چکی ہے ۔ اس سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی مذکورہ بالا رائے کی
غلطی بالکل واضح ہوجاتی ہے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی مندرجہ ذیل دعا
کو بھی نظر انداز کیا :۔

اللهم ان کنت عهدت لیزید لما رأیت من فضله فبلغه ما املت واعنه
وان کنت انما حملنی حب الوالد لولده وانه لیس لما صنعت به
اهلا فاقبضه قبل ان یبلغ ذلک ۔" (۱)

---

(۱) تاریخ اسلام و طبقات المشاہیر و الاعلام ج ۲ ص ۲۶۷ مکتبہ القدسی قاہرہ (مصر) ۱۳۶۸
ھ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفاء میں حضرت معاویہؓ کی یہ دعا نقل کی
ہے ۔

" یا اللہ اگر میں نے یزید کو اس کی قابلیت و لیاقت دیکھ کر ولی
عہد بنایا ہو تو اسے اس مقام تک پہنچادے جس کی میں نے اس کے
لئے امید کی ہے اور اس کی مدد فرما ' اور اگر مجھے اس کام پر صرف
اس کی محبت نے آمادہ کیا ہو جو باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے تو
منصب خلافت تک پہنچنے سے پہلے ہی تو اس کی روح قبض کرلے ۔

اس دعا میں حضرت معاویہؓ نے یہ بات صاف صاف فرمائی ہے کہ امیر یزید کو ولی عہد بنانے میں ان کے جذبہ حب الوالد لولدہ یعنی محبت پدری کو کوئی دخل نہیں تھا ۔ انہوں نے انہیں صرف ان کی اہلیت اور مصلحت امت کو پیش نظر رکھ کر خالصتاً لوجہ اللہ ولی عہد بنایا ۔ ان کے اس قول کو تسلیم نہ کرنے کی کیا وجہ ہے ؟ تعجب ہے کہ حافظ صاحب نے ان کی اس دعا کو نظر انداز کیا ۔ اور ان کے متعلق یہ غلط خیال قائم کرلیا کہ انہوں نے یہ کام شفقت پدری کی وجہ سے کیا تھا ۔

اس دعا پر نظر کیجئے جو اخلاص ' للّٰہیت و انابت الی اللہ میں غرق نظر آتی ہے ۔ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کے متعلق یہ دعا کرے گا کہ اگر میں نے اس کی نا اہلی کے باوجود محض بیٹا سمجھ کر اپنی محبت طبعی کی بناء پر اسے ولی عہد بنایا ہو تو یا اللہ اسے وفات دے دے ؟ یہ دعا تو کسی سراپا اخلاص و للہیت اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی یاد سے منور قلب اور اس کی اطاعت و ذکر میں مشغول زبان ہی سے نکل سکتی ہے ۔ بلاشبہ حضرت معاویہؓ اعلیٰ درجہ کے ولی اللہ اور اللہ تعالیٰ کے عبد صالح تھے ۔ بلاشبہ انہوں نے امیر یزید کو اخلاص کے ساتھ ولی عہد بنایا ۔ اس کام میں ماں بیٹے کی محبت اور شفقت و محبت ابوت کو ذرہ برابر بھی دخل نہ تھا ۔ حافظ ابن کثیر کی اس غلطی پر تعجب ہوتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ موصوف نے خود بھی اپنی مشہور کتاب البدایہ والنہایہ میں کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ یہ دعا نقل کی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

" اللھم ان کنت تعلم انی ولیتہ لا نہ لیما اراہ اھلا لذالک فاتمم لہ
ما ولیتہ ۔ وان کنت ولیتہ لانی احبہ فلا تتمم لہ ما ولیتہ ۔ " (۱)
" یا اللہ تو اگر جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس وجہ سے ولی
عہد بنایا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو
اس کے لئے پورا فرمادے ۔ اور اگر میں نے اس اس لئے ولی عہد

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰

بتایا ہو کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔
اس سے بھی وہی مضمون ثابت ہوتا ہے جو اس سے پہلے والی دعا سے ثابت ہوا۔
حضرت معاویہؓ کی اس مخلصانہ دعا کو نقل کرنے کے باوجود حافظ ابن کثیر کی رائے مذکور تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس لغزش کو معاف فرمادے۔ (۱)

ششم

دروغ بافی اور اشاعت فاحشہ کے ذریعہ تاریخ کو تاریک بنانے کی کوشش

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے :-

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاخرۃ ‘ واللہ یعلم و انتم لا تعلمون۔ (النور آیت ۱۹ پ ۱۸)

" جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کی بات کا چرچا ہو ان کے لئے دنیا اور آخرت میں سزائے درد ناک (مقرر) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

یہ منافقین یہود تھے۔ جو فحش جھوٹے قصے گڑھ گڑھ کر مسلمانوں کو سنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور مومنین صالحین اور مومنات صالحات پر بہتان طرازی کرکے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شیعہ مورخین و رواۃ نے بھی اپنے پیشروؤں کا طریقہ اختیار کیا۔ فحش افسانے تصنیف کرکے تاریخ میں داخل کردیئے۔ اور ان کی اس قدر اشاعت کی کہ بہت سے سنی مورخین بلکہ بہت سے علماء دین کو بھی ان کا یقین آگیا۔ یہ من گڑھت قصے تاریخ اسلام میں جابجا ملتے ہیں۔ یہود اور شیعوں نے یہ دروغ بافی اور افتراء پردازی مندرجہ ذیل

(۱) عجب نہیں کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے مضامین البدایہ و النہایہ میں کسی شیعہ یا شیعیت نواز سنی نے ملحق کردیئے ہوں۔ اور حافظ صاحب ان سے بری ہوں۔ ہماری اس قسم کی کتابوں میں شیعوں اور شیعیت پسندوں نے بکثرت اس طرح کی تحریفیں کی ہیں۔

مقاصد سامنے رکھ کر کی ہے :-

(۱) یہ تو ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ؓ نیز تابعین عظام کی وقعت مسلمانوں کے دل سے زائل کرنا ان کا مقصد خاص تھا ' لیکن ان کے مذہب اور ان کے اقوال افعال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل مقصد یہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت ان کا مقصود اعظم قرآن مجید ' اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور وقعت کو (خاکم بدہن) کم کرکے دین اسلام کی ترقی و اشاعت کو روکنا اور اسے مٹانا تھا - (العیاذ باللہ)

اس مسئلہ پر ہم اظہار حقیقت جلد اول میں مفصل روشنی چکے ہیں -

(۲) عداوت اسلام کی وجہ سے انہیں مسلمانوں یعنی اہلسنت سے طبعاً عداوت ہے اس لئے وہ ان کی ترقی کو روکنا اور انہیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں. اس مقصد کے پیش نظر وہ اسلامی تاریخ میں فحش ' بے حیائی اور اخلاقی پستی کے مکروہ ' جعلی نمونے دکھاکر ان کے مورال کو گرانا اور انہیں اخلاقی پستی کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں - اجتماعی نفسیات کا ایک عام اصول ہے کہ کسی قوم یا گروہ کو زوال اور پستی کی طرف لے جانے کے لئے اس کی تاریخ کو مسخ کرکے پست اور ذلیل کردینا ایک موثر حربہ ہے - یہود اور سبائیوں نے اہل اسلام کے خلاف اس حربے سے بہت کام لیا ہے - اور وہ سب اس اصول پر عمل کرکے اہلسنت کو سخت نقصانات پہنچارہے ہیں - درحقیقت شیعیت کا وجود ہی اسلام اور اہل اسلام کو دینی و دنیاوی ہر طرح کا نقصان پہنچانے کے مقصد کارہین منت ہے - اس قسم کے جھوٹے قصے جو شیعوں نے گڑھ کر ہماری تاریخ میں درج کردیئے ہیں ' بکثرت ہیں - یہاں ہم بطور نمونہ ان کا ایک طبع زاد افسانہ پیش کرتے ہیں ' جسے اگر ان کی اس تدبیر اور ان کے اس مخصوص طرز بیان و حکایت کا شاہکار کہا جائے تو بجا ہے - یہ سراپا کذب و دروغ کہانی واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہے - اس کا مختصر عنوان یہ ہے کہ خلیفہ یزید کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے کچھ لوگوں نے خلافت کے خلاف بغاوت کی اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے خلیفۃ المسلمین نے فوج بھیجی اور بغاوت فرو کردی گئی - اس واقعہ کو سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے جس انداز سے بیان کیا ہے ' اس میں " اشاعت فاحشہ " کا سبائی آرٹ خوب نمایاں ہے - کذب و افتراء اور بہتان طرازی کی غلاظت بے حیائی اور بے شرمی کے رنگ میں ڈبو کر کاغذ پر پھیلائی گئی ہے -

" خلافت و ملوکیت " کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ فرمایئے :

" اس کے بعد دوسرا المناک واقعہ جنگ حرہ کا تھا ' جو ۶۳ھ

کے آخر اور خود یزید کی زندگی کے آخر ایام میں پیش آیا - اس واقعہ کی مختصر روداد یہ ہے کہ اہل مدینہ نے یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم قرار دے کر اس کے خلاف بغاوت کردی ' اس کے عامل کو شہر سے نکال دیا اور عبداللہ بن حنظلہؓ کو اپنا سربراہ بنالیا - یزید کو اطلاع پہنچی تو اس نے مسلم بن عقبہ المری کو (جسے سلف صالحین مسرف بن عقبہ کہتے ہیں) ۱۲ ہزار فوج دے کر مدینہ پر چڑھائی کے لئے بھیج دیا اور اس نے حکم دیا کہ تین دن تک اہل شہر کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے رہنا - پھر اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرنا اور جب فتح پالو تو تین دن کے لئے مدینہ کو فوج پر مباح کردینا - اس ہدایت پر یہ فوج گئی - جنگ ہوئی ' مدینہ فتح ہوا اور اس کے بعد یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لئے فوج کو اجازت دے دی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے - ان تین دنوں میں شہر کے اندر ہر طرف لوٹ مار کی گئی - شہر کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا ' جس میں امام زہری کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور دس ہزار کے قریب عوام مارے گئے - اور غضب یہ ہے کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی - حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ " **حتی قیل انه حبلت الف امراة فی تلک الا یام من غیر زوج** " (کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں)

(ص ۱۸۱ و ص ۱۸۲

○ تبصرہ :- چراغ گل کرنے کے لئے اسے پھونک مارتے ہیں اور وہ بھڑک کر گل ہوجاتا ہے - اسی طرح بے غیرت اور بے حیا لوگ دوسروں میں بے غیرتی اور بے حیائی پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات یہ نفسیاتی تدبیر کام میں لاتے ہیں کہ انہیں حیا سوزی اور بے غیرتی کے افسانے سناتے ہیں - انہیں سن کر ان کی آتش غیرت و حیاء بھڑک کر بجھ جاتی ہے - یہ تدبیر کبھی کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ناکام - مگر دشمنان خیر و صلاح اپنی شر انگیزی اور فساد آفرینی سے نہیں چوکتے - جہاں موقع ملا انہوں نے زہر افشانی کی - اور اہلسنت کی غیرت و حیا کو بھڑکا کر ' ان کے دلوں کو مجروح کرکے امت مسلمہ کو بے غیرت و بے حیا بنانے کی

مذموم کوشش کی۔

مودودی صاحب شیعہ تھے انہوں نے بھی اپنے پیش رو شیعوں کی تقلید میں حادثہ حرہ کے متعلق وہ سب کچھ لکھا جو ان کے پیشرو شیعہ یا شیعیت زدہ مورخین نے لکھا ہے ان کے بیان پر غائر نظر ڈالنے سے معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس بیان میں جھوٹ ' بے غیرتی اور بے حیائی کی آمیزش کتنی فراخدلی کے ساتھ کی گئی ہے۔

پہلی صریح غلط بیانی تو یہ ہے کہ " اہل مدینہ نے یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم قرار دے کر اس کے خلاف بغاوت کردی۔ " اس عبارت سے قاری یہ سمجھے گا کہ پورا شہر مدینہ باغی ہوگیا تھا۔ اور معترض یہی سمجھانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ اہل مدینہ کے ایک خاص گروہ نے بغاوت کی جس کے شرکاء کی تعداد مدینہ منورہ کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اگر اس مخصوص نظریئے پر بھی نظر کی جائے جسے انہوں نے جواز بغاوت کی بنیاد بنایا تھا ' تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف ایک اقلیت کی بغاوت تھی۔ جو اپنی تعداد ' اور اپنے مخصوص نظریئے دونوں کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی اقلیت تھی۔ ان میں ایک تعداد تو سبائی منافقین کی تھی ' جو فساد و فتنہ کے اصل بانی تھے۔ اور کچھ صالح لوگ تھے ' جو ان سبائیوں کے دام فریب میں مبتلا ہوگئے تھے۔

ان باغیوں کی فہرست میں کچھ ایسے نام بھی آتے ہیں ' جن کی شرکت مشکوک و مشتبہ ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں نے ان پر بہتان باندھا ہے۔ وہ اس بغاوت میں شامل نہیں تھے۔ شیعہ راویوں اور مورخین نے ان کا نام بھی لکھ دیا۔ اور جھوٹا الزام ان پر لگادیا۔

باغیوں نے سب سے پہلے اموی اہل مدینہ نیز قریش کے دوسرے لوگوں پر جو حکومت وقت کے موید تھے ' حملہ کردیا ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی ' یہ لوگ حضرت مروانؓ کے مکان میں پہنچ گئے ' وہاں باغیوں نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ (۱)

ان کی تعداد نو سو (۹۰۰) فرض کرلیجئے۔ یہ سب باغیوں کے مخالف اور امیر یزید کے حامی تھے۔

اس کے بعد بخاری شریف کی مندرجہ ذیل روایت دیکھئے :۔

" عن نافع قال لما خلع اہل المدینۃ یزید بن معاویۃؓ ' جمع ابن عمرؓ حشمہ و ولدہ فقال :۔ انی سمعت النبی صلی اللہ علیہ

(۱) طبری ج ۵ حوادث ۶۳ ھ

وسلم یقول ینصب لکل غادر لواء یوم القیامۃ ' وانا قد بایعنا ھذا الرجل علی بیع اللہ ورسولہ ' وانی لا اعلم غدرا اعظم من ان یبایع رجل علی بیع اللہ ورسولہ ثم ینصب لہ القتال ' وانی لا اعلم احدا منکم خلعہ ولا تابع فی ھذا الامر ' الا کانت الفیصل بینی و بینہ ۔ "(۱)

" حضرت نافع سے مروی ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید بن معاویہؓ سے بیعت توڑدی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی اولاد ' اور اپنے تعلق رکھنے والوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر غادر (بد عہدی کرنے والے) کے لئے ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا ۔ اور بیشک ہم نے اس شخص (یعنی یزید) سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے واسطے بیعت کی ہے اور میں اس سے بڑھ کر کوئی غدر (بد عہدی) نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے (کسی سے) بیعت کرے ' پھر اس سے جنگ کرے ۔ اور تم میں سے جو شخص بھی ان سے (یزید سے) بیعت توڑے گا یا (بیعت توڑنے میں) کسی دوسرے کی (باغیوں کی) پیروی کرے گا تو میرے اور اس کے درمیان تعلقات ختم ہوجائیں گے ۔ "

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خود باغیوں کے خلاف تھے اور ان کی بغاوت کو حرام و معصیت سمجھتے تھے ۔ وہ ان کی اس حرکت کو غدر اور بد عہدی کہہ رہے ہیں ۔ اس پر عذاب آخرت کی وعید لسان نبوت سے نقل کرتے ہیں ۔ اہل مدینہ کو اس معصیت کبیرہ میں شرکت سے شدت کے ساتھ منع فرمارہے ہیں ۔ خیال فرمایئے کہ حضرت ابن عمرؓ کا جو جلیل القدر صحابی اور اصحاب بیعت رضوان میں سے ہیں ' مدینہ طیبہ میں کس قدر اثر ہوگا ؟ جتنے اہل مدینہ ان سے تعلق رکھتے تھے وہ یقیناً اس بغاوت سے بالکل بے تعلق رہے ہوں گے اور اس سے نفرت کرتے ہوں گے ۔ آں محترم کی شخصیت کی عظمت کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل مدینہ کی کتنی بڑی تعداد بغاوت کے خلاف اور اس سے بے تعلق رہی ہوگی ۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بھی ایک ممتاز صحابی ہیں ۔ وہ بھی اس بغاوت

(۱) صحیح بخاری ج ۲ کتاب الفتن باب اذا قال عند قوم شیئا ثم خرج " فقال بخلافہ " ۱۰۵۳

کے مخالف تھے۔ اور اس سے بالکل الگ رہے۔ یقیناً اہل مدینہ پر ان کا بھی خاصا اثر ہوگا۔ ان کے معتقدین کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔ وہ سب بھی یقیناً اس بغاوت سے الگ رہے ہوں گے۔

تیسرے بزرگ جن کے متعلق اس فتنہ سے بے تعلق رہنے کی نشاندہی اوراق تاریخ کررہے ہیں۔ جناب علی بن حسینؓ ہیں۔ جو زین العابدین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا درجہ کسی صحابی کے برابر تو نہیں مگر اکابر تابعین میں سے ہیں۔ اور یقیناً مدینہ میں کچھ نہ کچھ ذی اثر ہوں گے۔ اہل شہر کی ایک معتدبہ تعداد ضرور ان کی بات مانتی ہوگی۔ ان کا رویہ کیا رہا؟ بغاوت سے بے تعلق رہنے اور اختلاف رکھنے کے ساتھ انہوں نے حامیان خلافت کی مدد بھی کی۔ جب حضرت مروانؓ باغیوں کی قید سے رہا ہوکر جانے لگے تو اپنے اہل و عیال کو انہیں کے سپرد کرگئے۔ طبری لکھتا ہے:۔

و کان مروان شاکرا لعلی بن الحسین مع صداقة کانت بینهما قدیمة.

"حضرت مروانؓ، علی بن حسینؓ شکر گزار ہوئے۔ اور ان دونوں کی دوستی بھی بہت پرانی تھی"۔

فخرج بحرمه و حرم مروان حتی و ضعهم بینبع (۲)

انہوں نے حق دوستی اس طرز ادا کیا کہ:۔

انہوں نے اپنے اور حضرت مروانؓ کے اہل و عیال کو "ینبع" پہنچادیا۔

اس طرح ان کی حفاظت کا انتظام کردیا۔ اور بغاوت سے بالکل بے تعلق رہے۔ علاوہ بریں انصار کی ایک معتدبہ تعداد بغاوت کی سخت مخالف تھی۔ ان کا ایک خاندان بنو حارثہ جس کے افراد کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ خلافت وقت کا موید وحامی تھا' اور اس نے عملاً بھی افواج سلطانی کی نصرت وامداد کی' جیسا کہ چند سطروں کے بعد معلوم ہوگا۔

بغاوت سے بے تعلق رہنے والوں اور اس سے نفرت وکراہت کرنے والوں کا ذرا شمار کیجئے ان سب کی مجموعی تعداد اندازاً کتنی ہوگی؟ اور اس کے بعد دیکھئے کہ باغیوں اور ان کے حامیوں کی تعداد کتنی رہ جاتی ہے۔

یہ بھی سوچ لیجئے کہ اس وقت شہر مدینہ منورہ کی پوری آبادی کتنی ہوگی۔ اس کی

---

(۱) طبری ج ۵ حوادث ۶۳ھ (۱) طبری ج ۵ حوادث ۶۳ھ

کل آبادی چند ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہر منصف مزاج حساب اور اندازہ لگانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ بغاوت اہل مدینہ کے ایک چھوٹے گروہ نے کی تھی۔ اہل مدینہ سب تو کیا ان کی اکثریت بھی باغیوں کی حامی نہ تھی۔ انکی بڑی تعداد بلکہ اکثریت باغیوں کے خلاف تھی۔ اور اسے غدر و معصیت کبیرہ سمجھتی تھی۔ اس واقعی صورت حال کے پیش نظر امام زہری کی روایت جو مودودی صاحب نے نقل کی ہے مبالغہ آرائی کی افسوسناک مثال ہے۔ مدینہ منورہ کی آبادی اگر پچاس ہزار بھی فرض کرلیں تو اس میں سے ساڑھے دس ہزار آدمیوں کا قتل ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پھر جبکہ ان میں سات سو معززین بھی ہوں۔ خصوصاً مدینہ منورہ میں جو ہر مسلمان کے نزدیک مقدس و محترم شہر ہے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو پورے عالم اسلامی میں کہرام مچ جاتا۔ لیکن تاریخ اس کے تذکرے سے خالی ہے۔ اس کے بجائے ہر طرف اطمینان وسکون نظر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زہری صاحب کی روایت کسی سبائی کی گڑھی ہوئی جھوٹی کہانی ہے' زہری خود بھی بنو امیہ کے سخت مخالف تھے۔ ان کی نگاہ میں رتبہ صحابیت کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ ان کے اس تشیع خفی نے انہیں اس زہر چکانی پر آمادہ کردیا۔ ورنہ اس روایت کی تکذیب کے لئے زیادہ چھان بین کی ضرورت نہ تھی۔ فہم عمومی (کامن سنس) ہی اسے رد کردیتا ہے۔ نہایت بے حیائی وبے غیرتی کے ساتھ اشاعت فاحشہ کی ناپاک اور گھناؤنی مثال خواتین کی عصمت دری اور ایک ہزار حمل قرار پانے کی وہ سراپا کذب ودروغ گندی کہانی ہے جو مودودی صاحب نے نہایت طمطراق کے ساتھ ابن کثیر سے نقل کی ہے۔

جھوٹ اور بہتان کا تعفن دوسروں تک منتقل کرنے کا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ "قیل" کہا اور جھوٹ کی گندگی کا انبار لگادیا۔ دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق داغ دی۔ جھوٹ کھل گیا تو "قیل" کی سپر کی آڑ لے لی۔ یہ مورخانہ بددیانتی کا ایک طرز ہے۔ جو مورخ کی بددیانتی کے ساتھ اس کے رفض خفی کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔ قائل اور راوی یقیناً کوئی سیاہ قلب رافضی یا یہودی ہے۔ لیکن مورخ اور ناقل بھی اس معصیت کبیرہ اور الزام کذب وبہتان سے بچ نہیں سکتے۔ اس واقعہ کا یقین وہی کرسکتا ہے جس کی عقل عداوت بنی امیہ سے اندھی ہوچکی ہو۔ ورنہ اس کا جھوٹ اور بہتان ہونا مثل بدیہیات واضح ہے۔

حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ وہ ایسا گندہ حکم دیں اور وہ اس وقت جب کہ وہ بہت بوڑھے' مریض اور اپنی زندگی سے مایوس ہوچکے تھے؟ یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے بلکہ اسے ہم محال عادی کہہ سکتے ہیں۔ پھر ان کے ماتحت جو سپاہی تھے وہ بھی مومن تھے۔ وہ اس قسم کی حرکت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ پھر یہ کہ مدینہ منورہ میں جو لوگ آباد تھے ان میں سے بکثرت امیر یزید اور بنو امیہ کے رشتہ دار تھے۔ ان حالات میں اس قسم کی ناپاک باتوں کا تو وسوسہ بھی فاتحین کے دل میں نہیں آسکتا تھا۔ خصوصاً کسی صحابیؓ کے دل میں۔

یہ امر بھی اہم اور قابل لحاظ ہے کہ اگر سبائیوں کی گڑھی ہوئی اس ناپاک جھوٹی کہانی کو صحیح سمجھا جائے تو لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت دنیا میں جو علوی' حسنی' حسینی' صدیقی' فاروقی' زبیری' قریشی نسل کے افراد موجود ہیں اور اپنے نسب پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ ان سب کا نسب مشکوک و مشتبہ ہے ان میں سے کسی کا دعوی صحت نسب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ یہ نہ ثابت کردے کہ حادثہ حرہ کے زمانے میں اس کی جدہ محترمہ مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھیں۔

تیسری چیز جو اس شیعی ارجاف اور سبائیوں کی من گڑھت سراپا کذب و دروغ کہانی کا سراپا کذب و دروغ ہونا واضح کردیتی ہے ان اثرات کا فقدان ہے' جنہیں لازماً اور یقیناً وجود میں آنا چاہئے تھا۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو ان اثرات کا ظہور یقیناً ہوتا عصمت دری اور بے آبروئی کوئی معمولی بات نہیں۔ معمولی غیرت رکھنے والا مرد بھی اپنی کسی قرابت دار عورت کی آبرو ریزی کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اپنی بیوی' ماں بہن بیٹی وغیرہ قرب ترین رشتہ رکھنے والی عورتوں کی بے آبروئی کو کوئی غیرت دار انسان جان کی قیمت پر بھی اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ پھر کیا مدینہ منورہ کے رہنے والے ہاشمی' علوی' صدیقی فاروقی' قریشی' انصاری وغیرہ سب کے سب انتہائی بے غیرت بزدل' اور دنی الطبع تھے کہ انہوں نے اس ذلت کو گوارا کیا اور اپنی عورتوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے کے بجائے اپنی جان بچائی اور مقابلہ سے گریز کیا؟ اگر بقول راوی کذاب میدان جنگ میں دس ہزار آدمی مقتول ہوئے تھے' تو گلی کوچوں میں کم از کم اتنے ہی مقتول ہوئے ہوتے۔ غیرت کا تقاضا کچھ تو پورا ہوا ہوتا۔

یہ عجوبہ بھی قابل دید ہے کہ بقول مورخین کذابین اتنی ذلت برداشت کرنے کے باوجود حضرت علی بن حسینؓ (المعروف زین العابدین) نیز دیگر بنی ہاشم کی دوستی امیر یزید اور حضرت مروانؓ کے ساتھ بدستور قائم رہی۔ یہ حضرات امیر یزید سے تحفے تحائف بھی وصول کرتے رہے اور ان کے پاس ان کی آمد و رفت بھی جاری رہی۔ مگر حرف شکایت کبھی زبان پر نہ لائے۔ اور اس حادثہ فاجعہ کا کوئی تذکرہ ان سے نہیں کیا۔ کیا یہ انتہائی بے غیرتی نہیں؟

کوئی مسلمان اہل مدینہ یا ان مخصوص حضرات کو بے غیرت سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سارا قصہ جھوٹا' سراپا کذب و افتراء ہے۔

آخر میں "ہزار حمل" کی احمقانہ سبائی کہانی پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے۔ ابن کثیر نے "قیل" کی نقاب میں بے حیا اور کذاب قائل کا روئے نحس چھپادیا' مگر اس کذب و دروغ کو بلا تردید و تبصرہ نقل کرکے گناہ کے مرتکب ہوگئے۔ انہیں تو قائل سے پوچھنا چاہئے تھا کہ کیا اس کی کوئی دادی پر دادی اس وقت وہاں موجود تھی جس نے یہ حمل شماری کی تھی؟ اس دشمن صداقت کو یہ تعداد کیسے معلوم ہوئی؟ اس کا یہ بیان

تو خود اپنے جھوٹ ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ اسے نقل کرنا افسوسناک ہے۔

ہم نے یہ دکھادیا کہ واقعہ حرہ کے بارے میں شیعہ' اور شیعیت زدہ مورخین سے مودودی صاحب نے جو نقل کیا ہے وہ کذب و دروغ' جھوٹ' افتراء اور بہتان ہے۔ نسلی تعصب اور عداوت بنی امیہ کے جذبات سے موصوف اس قدر مغلوب ہوئے کہ صداقت سے روگردانی کے ساتھ غیرت وحیاء کی طرف سے بھی رخ پھر گیا۔ اور ان سراپا کذب و دروغ' سبائیوں کی تصنیف کردہ گندی کہانیوں کو نقل کرکے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے۔ اس کے بعد ہم اس حادثہ "حرہ" کے متعلق صحیح واقعات پر مشتمل روایت نقل کرتے ہیں۔ بطور تمہید روایت ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"وقد کر من امر الحرة ومقتل ابن الغسیل غیرالذی روی عن ابی مخنف"

"واقعہ حرہ اور ابن الغسیل کے قتل کے بارے میں ایک دوسری روایت ابو مخنف کی روایت سے مختلف بیان کی گئی ہے۔"

اس کے بعد احمد بن زہیر کی روایت ذکر کرتا ہے جو انہوں نے اپنے والد سے سنی اور وہ بواسطہ وہب بن جریر' جویریہ ابن اسماء سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ کے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ:۔

حضرت معاویہؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے یزید کو بلا کر فرمایا کہ تمہیں کسی دن اہل مدینہ سے ضرور الجھنا پڑے گا۔ اگر ایسا ہو تو مسلم بن عقبہؓ کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجنا۔ کیونکہ ان کے اخلاص سے میں واقف ہوں۔ جب (حضرت) معاویہؓ کا انتقال ہوگیا۔ تو ان کے (یزید کے) پاس اہل مدینہ کا ایک وفد آیا۔ اور اس وفد میں عبداللہ بن حنظلہؓ بن ابی عامر بھی شریک تھے۔ وہ شریف' صاحب فضیلت' سردار اور عبادت گزار تھے۔ ان کے ساتھ ان کے آٹھ بیٹے بھی تھے۔ انہوں نے (امیر یزید نے) انہیں ایک لاکھ درہم اور ان کے ہر بیٹے کو دس ہزار درہم عطا کئے۔ اس کے علاوہ سواریاں اور کپڑے دیئے۔ جب عبداللہ بن حنظلہ مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے ان سے مل کر وہاں کی کیفیت دریافت کی۔ انہوں نے کہا " میں ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں کہ اگر صرف میرے بیٹوں کے سوا کوئی میرا ساتھ نہ دے تو بھی میں اس سے جہاد کروں گا۔ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے (یزید نے) آپ کو انعام واکرام سے نوازا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں انہوں نی یہ سلوک تو کیا ہے مگر میں نے (ان کا انعام) صرف اس لئے قبول کرلیا کہ اس کے ذریعہ (ان کے مقابلے کی) قوت حاصل کروں۔ اس کے بعد انہوں نے (عبد اللہ نے) لوگوں کو ابھارا اور لوگوں نے ان سے بیعت کرلی۔ یہ بات یزید تک پہنچی توانہوں نے (حضرت) مسلم بن عقبہ کو بھیجا۔ اہل مدینہ نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہاں سے شام تک جہاں جہاں پانی تھا اس میں قطران (مٹی کا تیل یا کولتار)

اور مٹی وغیرہ ڈلواکر اسے ناقابل استعمال بنادیا تھا۔"

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر (لشکر شام پر) ابر باراں بھیج دیا۔ چنانچہ مدینہ تک انہیں ڈول سے کام لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی (۱) جب لشکر مدینہ پہنچا تو وہاں کے لوگ کثیر تعداد میں اور ایسی ہیئت کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلے کہ جس کی نظیر نہ ملتی تھی۔ اہل شام پر انہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوئی اور وہ ان سے جنگ کرنے میں ہچکچائے۔ (۲) اور خود (حضرت) مسلمؓ بن عقبہ شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ (۳) جنگ جاری تھی کہ اہل مدینہ نے وسط شہر میں اپنی پشت کی طرف نعرہ تکبیر سنا۔ اس طرف سے اہل شام کو بنو حارثہ لائے تھے اور وہ بلند سطح زمین پر تھے۔ اس لئے ان لوگوں (اہل مدینہ) کو شکست ہوگئی۔ (اس حملے کی وجہ سے) جو لوگ خندق میں گر کر مرگئے ان کی تعداد مقتولین جنگ سے زائد تھی۔ اہل مدینہ کو شکست ہوگئی اور اہل شام شہر میں داخل ہوگئے۔ اس وقت عبداللہ بن حنظلہؓ کی کیفیت یہ تھی کہ اپنے ایک بیٹے سے ٹیک لگائے ہوئے سو رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے انہیں جگایا۔ آنکھیں کھول کر جب انہوں نے دیکھا کہ لوگوں نے کیا کیا ہے تو سب سے بڑے بیٹے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ آگے بڑھے اور قتل ہوگئے۔ اس کے بعد مسلم بن عقبہ مدینہ میں داخل ہوگئے اور سب لوگوں کو اس بات پر بیعت کرنے کی دعوت دی کہ وہ سب یزید بن معاویہؓ کے تابع فرمان رہیں گے۔ ان کی جان' ان کے مال' ان کے اہل وعیال کے بارے میں انہیں حق ہوگا کہ جو چاہیں فیصلہ کریں۔"(۴)

اس روایت کے سوا جتنی روایتیں طبری میں اس واقعے کے متعلق مذکور ہیں ۔ وہ واقدی' ہشام کلبی' اور ابو مخنف کی ہیں ۔ یہ تینوں شیعہ اور وضاع وکذاب ہیں ۔ اظہار حقیقت جلد اول میں ان کے مکروہ چہرے بے نقاب کئے جاچکے ہیں ۔ احمد بن زہیر کی اس روایت کو جو ہم نے نقل کی ہے ' چھوڑ کر ' مذکورہ بالا کذابوں کی روایتوں پر اعتماد کرنا مورخانہ دیانت بلکہ عام اخلاقی اصول' نیز اصول انصاف کے اخلاف ہے ۔ اس روایت میں نہ تو ہزاروں کے قتل اور مجروح ہونے کا تذکرہ ہے ' اور نہ کسی کی آبروریزی کا ' اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ کے ایک گروہ نے بغاوت کی ' خلیفہ المسلمین کی فوج آئی اور بہت معمولی جھڑپ میں باغیوں کو شکست ہوگئی ۔ تھوڑے سے آدمی قتل ہوئے کچھ بھاگتے ہوئے خندق میں گر کر مرگئے ۔ فرار ہونے والوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے ۔ جنگ اسی وقت بند کردی گئی ۔ پھر کسی کو بھی قتل نہیں کیا گیا ۔ اس معمولی اور غیر اہم واقعہ کو سبائیوں نے جھوٹ اور بہتان وافتراء کی آمیزش کرکے خوب اچھالا اور اسلامی تاریخ کا نہایت بدنما داغ بنادیا ۔ فلعنۃ اللہ علی الکاذبین ۔

بغاوت فرو کرنے کے لئے فوج بھیجنے پر اعتراض بالکل لغو اور خلاف انصاف ہے ۔ بغاوت کو فرو کرنا اور اس کے لئے فوج بھیجنا' امیر یزید پر شرعاً واجب تھا ۔ اگر نہ بھیجتے تو گناہ گار ہوتے ۔ مدینہ منورہ میں جو خونریزی اور اس کے احترام کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی اس کا گناہ باغیوں کے سر ہے ۔ وہی اس کے ذمہ دار تھے ۔ بغاوت کو ختم کرکے امن وامان کا قائم کرنا کارخیر اور کار ثواب تھا۔ انشاء اللہ حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت الٰہی شامی لشکر کے ساتھ تھی۔ (۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باب خلافت سے جو لشکر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اس کے افراد کی تعداد بہت کم تھی۔ کوئی بڑا لشکر نہ تھا۔ (۳) آں محترم بہت معمر اور اس کے ساتھ بیمار بھی تھے۔

(۱) تاریخ طبری ج ۵ حوادث ۶۳ھ

اور ان کی ماتحت فوج کو اس کا اجر جزیل عالم آخرت میں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم واضح ہے۔

" فقاتلوا التی تبغی حتی تفئی الیٰ امر اللہ " (الحجرات)

" اور باغی گروہ سے قتال کرو یہاں تک کے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرنے پر تیار ہوجائے۔ "

آخر میں ایک اور اہم بات عرض کردینا مناسب ہے۔ گزشتہ سطروں سے یہ واقعہ بالکل واضح ہوگیا کہ حادثہ " حرہ " کے بارے میں بکثرت روایتیں سبائی کارخانہ دروغ بافی میں ڈھالی گئی ہیں۔ علاوہ ان دروغ بافیوں اور افتراء پردازیوں کے جن کی نشاندہی گزشتہ سطروں میں کی گئی ہے۔ بہت سے دوسرے مبینہ واقعات بھی سبائیوں کے طبع زاد اور دروغ پارے ہی نظر آتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک بات یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کا اس بغاوت میں شریک اور مقتول ہونا بیان کیا گیا ہے۔

مثلاً ایک روایت میں حضرت فضلؓ بن عباسؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ واقعہ حرہ میں باغیوں کے ساتھ تھے اور اسی جنگ میں قتل کئے گئے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ حضرت فضلؓ پر افتراء اور بہتان ہے۔ درحقیقت انہیں اس بغاوت سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ابو مخنف وغیرہ سبائیوں نے باغیوں کی فہرست میں بعض حضرات صحابہؓ کے نام درج کرکے ان پر بہتان و افتراء کیا ہے۔ ان کذابوں کے بیانات پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ سبائیوں کی اس قسم کی غلط بیانی اور افتراء پردازی کے متعدد نظائر ملتے ہیں۔ اس کی ایک نظیر حضرت عمرو بن **الحمق** پر بہتان طرازی ہے جو میں جلد اول میں پیش کرچکا ہوں۔ شیعہ راویوں اور سبائی مورخوں نے انہیں قاتلان عثمانؓ میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت عمروؓ بن **الحمق** صحابی ہیں اور کسی صحابیؓ رسول صلی اللہ وسلم سے ایسا گناہ عظیم سرزد ہونا بعید از قیاس ہے۔ علاوہ بریں اگر ایسا ہوتا تو محدثین ان کی روایت کیوں قبول کرتے ؟ حالانکہ مسلم شریف میں ان کی روایت موجود ہے۔ امام مسلم کے ایسے محتاط محدث کا ان کی روایت اپنی کتاب میں لانا اس امر کی قوی دلیل ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں قطعاً شریک نہیں تھے۔ قتل عثمانؓ میں ان کی شرکت کا مکروہ افسانہ ابو **مخنف** یا اس کے کسی اور ہم مذہب **والضی** کا گڑھا ہوا بہتان و افتراء ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلانِ سیدنا عثمانؓ میں جو عمرو بن **الحمق** ہے وہ کوئی دوسرا شخص ہے صحابی نہیں ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ابو **مخنف** وغیرہ

شیعی کذابوں نے یہ نام قاتلانِ عثمانؓ کے ناموں کی فہرست میں داخل کردیا اور درحقیقت اس نام کا کوئی شخص بھی ان میں نہیں تھا۔ جس طرح ہمارے اس دور میں بعض پولیس والے اپنی رپورٹ میں ملزم کے ساتھ دو چار غیر متعلق آدمیوں کا نام بھی درج کردیتے ہیں۔ جو ظلم ہے۔ دوسری نظیر حضرت سلیمان بن صرد خزاعی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ انہیں ابومخنف وغیرہ رافضی رواۃ و مورخین نے قاتلان حسینؓ کے گروہ کا ایک سر برآوردہ فرد بتایا ہے۔ ان کی روایت بھی مسلم شریف جلد اول (باب استحباب افاضتہ الماء علی الراس الخ) میں موجود ہے۔ اگر یہ قاتلان حسینؓ کے زمرے میں شامل ہوتے تو محدثین کرام ان سے روایت کیسے کرسکتے تھے اور امام مسلم کے ایسے محتاط محدث ان کی روایت لاکر اپنی کتاب کے وقار و اعتبار کو کیوں مجروح کرتے؟ اس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ سبائی پارٹی نے صحابہ کرامؓ کو بدنام کرنے کے لئے ان پر افتراء کیا ہے اور بہت سے ایسے کام ان کی طرف منسوب کئے ہیں جن سے وہ بالکل بری ہیں۔ نظر برین نظائر حادثہ حرہ کے بارے میں بھی انہوں نے اپنی عادت قبیحہ کے مطابق اگر بعض صحابہ کرامؓ کو بھی خلاف واقعہ بغاوت میں ملوث دکھایا ہو، تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا اس میں شریک ہونا بھی بعید از قیاس ہے۔

واقعہ حرہ کے متعلق دروغ بافی

اور کذب آفرینی سے شیعوں کے مقاصد

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بغاوت اور اس کے فرو کرنے کے ایک معمولی سے واقعہ کو شیعوں اور شیعیت نوازوں نے اس قدر کیوں اچھالا؟ اور بیان واقعات میں کذب و دروغ اور فحش و تشنیع جھوٹ کے انبار کیوں لگائے؟ اس سے ان کا مقصد کیا تھا؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس کا جواب سبائیت کی نفسی پستی اور گندگی کو بے نقاب کردیتا ہے۔ اس ذلیل دروغ بافی اور اس کی تشہیر سے شیعوں کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے جو بالکل عیاں ہیں:

اول:۔ یہود کی مرضی کے مطابق شیعہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ معاذ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بالکل ناکام رہی۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ کی وفات کے چند ہی سال کے بعد ان کے زعم باطل کے بموجب یہ ناپاک واقعات پیش آئے، جبکہ آپؐ کے

صحابہ کرام کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اور واقعات بھی مدینہ منورہ میں پیش آئے جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دس سال مقیم رہے تھے۔ (العیاذ باللہ)

دوسرا مقصد :۔ یہ تھا کہ خلفاء بنی امیہ بلکہ پورے خاندان بنی امیہ نیز ان کے معاونین و مداحین کے خلاف عام مسلمانوں کو برانگیختہ کرکے فساد و فتنہ پیدا کیا جائے ' تاکہ امت مومنہ کا شیرازہ بکھر جائے نظام خلافت پراگندہ ہوجائے۔ اور دین اسلام کی ترقی رک جائے۔ (العیاذ باللہ)

تیسرا مقصد : شیعوں کا تیسرا مقصد سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن میں مستحضر کرلیجئے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ کو دو معجزے ایسے عطا فرمائے گئے ہیں جو قیامت تک قائم رہنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک قرآن مجید ہے اور دوسرا معجزہ جماعت صحابہ رضی اللہ عنھم ہے۔ غور فرمائیں تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جائے گی کہ جس طرح جماعت صحابہ بحیثیت اجتماعی برہان نبوت ہے اسی طرح ہر صحابی اپنی جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور صداقت کی ایک مستقل دلیل ہے۔ شیعہ اور یہود نے اس دلیل کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں مگر ان لوگوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں باقی رکھی۔ واقعہ حرہ کے بارے میں یہ غلط بیانی ' اور فحش نوائی بھی اسی ناپاک کوشش کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ شیعوں کا مقصد ان غلط واقعات کے وضع کرنے سے صحابہ کرامؓ کو بے وقار بنا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی ایک دلیل کو کمزور کرنا تھا۔

چوتھا مقصد :۔ یہ مقصد عام طور پر علماء و مورخین نہیں سمجھ سکتے۔ اسے سمجھنے کے لئے بھی ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں یعنی اہل سنت کے درمیان تفرقہ اور فساد پیدا کرنے کی کوشش شیعوں کا مزاج اور ان کی کٹردی طبیعت کا تقاضا ہے۔ شیعہ برابر اس کے لئے کوشش کرتے رہے جیسا کہ تاریخ اسلام کا ہر طالبعلم جانتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ شیعوں کا ایک گروہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا دشمن تھا بلکہ آں محترم کے زمانہ خلافت میں تو سب ہی شیعہ ان کے دشمن ہوگئے تھے۔ ایک مدت بعد ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوگیا جو اتنی شدت کے ساتھ تو ان کا مخالف نہیں رہا کہ اپنے پیش رووں کی طرح ان کی تکفیر کرتا ' مگر آں محترم کی عداوت سے اس کا دل بھی پاک نہیں تھا اور تابہ امکان پر فریب انداز میں ان کی تنقیص اور ان کی اولاد کو نقصان و تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا

رہا۔ ان لوگوں کے اس مذموم کردار کا ایک مظہر یہ تھا کہ انہوں نے حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کے درمیان اختلاف بلکہ عداوت ڈلوانے کی کوشش کی۔ اس کے لئے ان لوگوں نے کیا کیا جتن کئے ' اس کی تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ اتنا بتانا ضروری ہے کہ بالآخر ان دونوں خاندانوں کو ان لوگوں نے " امامت " کا سبز باغ دکھایا اور ان میں اس کی حرص پیدا کی ' پھر پروپیگنڈا یہ کیا کہ " امامت صرف حضرت حسین ؓ کی اولاد کا حق ہے اور انہیں کو مل سکتی ہے۔ حضرت حسن ؓ چونکہ امامت سے خود ہی دست بردار ہوگئے تھے۔ اس لئے منجانب اللہ بھی وہ معزول کردیئے گئے۔ ان کی اولاد میں کوئی امام نہیں ہوسکتا۔ اور ان میں سے جو اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا اور گمراہ ہے۔ " حضرت حسن ؓ کی اولاد پر اس کا رد عمل ہوا۔ اور ان میں سے بعض نے امامت کا دعویٰ بھی کیا۔ اختلافات بڑھے اور شدید ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ شیعوں نے جن میں بعض حسینی بھی تھے۔ یہ پروپیگنڈہ کیا کہ حضرت حسن ؓ کی نسل ہی منقطع ہوگئی۔ ان کی کوئی اولاد موجود ہی نہیں۔ یہ ہے وہ نکتہ جو میں یہاں دکھانا چاہتا ہوں اور جو واقعہ حرہ کے بارے میں شیعوں اور شیعیت نواز سینوں کی فحش بیانیوں اور گندہ دہنیوں میں بطور ایک اہم مقصد ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ذرا ذہن میں مستحضر کر لیجئے کہ حرہ کا واقعہ کس طرح بیان کیا گیا ہے ؟ حضرت علی بن حسین (المعروف بزین العابدین) کو دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے اور حضرت مروان رضی اللہ عنہ کے اہل و عیال کو لے کر " ینبع " چلے گئے تھے۔ لیکن حسنی خاندان وہیں رہا۔ اس کے بعد ان گندی اور سراپا کذب و دروغ روایتوں پر نظر کیجئے تو آسانی کے ساتھ یہ سیاہ حقیقت نظر آئے گی کہ اس فحش گوئی ' فحش نگاری اور حیا سوز بہتان طرازی کا ایک اہم مقصد مخصوص طور پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو مجہول النسب بلکہ کم نسب مشہور کرنا تھا۔ سبائی اور ان کے دام فریب میں گرفتار بعض حسینی شیعہ اس سے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ " حضرت حسن ؓ کی نسل منقطع ہوگئی۔ اور جو لوگ حسنی ہونے کے دعویدار ہیں وہ درحقیقت ان کی اولاد میں نہیں ہیں۔ معلوم نہیں کس کی اولاد میں ہیں کہ حرہ کے حوادث نے ان سب کی نسل بدل دی۔ اب کوئی ایسا شخص جو خود کو حسنی کہتا ہو ثابت النسب نہیں۔ اس لئے اسے " امام " بنانا جائز نہیں۔ امامت صرف حضرت حسین ؓ کی اولاد کے ساتھ مخصوص ہے۔ " تاریخ کے طالبعلم کو شیعوں کے اس ناپاک مقصد کو سمجھنے

میں کوئی دقت نہیں پیش آتی امامت کے بارے میں حسنی اور حسینی خاندانوں میں جو شدید اختلاف ہوا، اور جس طرح کشمکش ہوئی وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ (۱) جو حسینی شیعہ ہوگئے تھے یا شیعوں کے فریب میں گرفتار ہوگئے تھے، انہوں نے اور ان کے حامی دوسرے شیعوں نے ایک مدت تک اس کی کوشش جاری رکھی کہ حضرت حسنؓ کی نسل کا بالکل بلیک آوٹ کردیں اور دنیائے اسلام کو یہ باور کرادیں کہ آں محترم کی نسل بالکل منقطع ہوچکی ہے۔ اور دنیا میں اب کوئی حسنی موجود نہیں۔ افریقہ میں ادریسی خاندان کو حکمرانی حاصل ہوگئی تھی۔ یہ حسنی تھے۔ حسینی خاندان کی طرف سے ان کی جو مخالفت اور انہیں تباہ کرنے کی جو کوشش ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے۔ شیعوں نے کوشش تو بہت کی مگر وہ حضرت حسنؓ کی نسل کو منقطع اور اس کا بلیک آوٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ ایک مدت کے بعد حضرت حسینؓ کی نسل میں جو سنی تھے انہیں بھی ہوش آیا۔ اور دونوں خاندانوں میں محبت و اخلاص کے تعلقات بحال ہوگئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے ورنہ شیعوں نے تو اپنے ناپاک مقصد کے لئے کوشش میں کوئی کسر نہیں باقی چھوڑی۔ واقعہ حرہ کے بارے میں جو فحش نوائی اور گندہ دہنی شیعہ اور شیعہ نواز مورخین و رواۃ نے کی ہے اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا۔ جس کی تفصیل ہم نے ابھی کی۔

سنی مورخین اور بعض سنی علماء دین نے آنکھیں بند کرکے شیعوں کے ان غلط اور سراپا کذب و دروغ گندے بیانات کو بغیر سمجھے بوجھے اور بغیر غور و فکر نقل کردیا۔ یہ لوگ

---

(۱) آکام المرجان فی غرائب الاخبار و احکام الجان الباب الثامن والسبعون ص ۱۴۸ اصح المطابع

اس سلسلے میں شیعوں کی معتبر ترین کتاب اصول کافی کی دو روایتوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعوں کو حضرت حسنؓ کی اولاد کے ساتھ کس قدر کدّ اور دشمنی تھی۔ اور انہوں نے ان کی اولاد کی تذلیل و تحقیر کی کتنی کوشش کی ہے۔ ان روایات سے ہمارے اس بیان کی پوری تائید ہوتی ہے کہ حادثہ حرہ کے بارے میں جو گندے اور فحش جھوٹے افسانے بیان کئے گئے ہیں۔ انہیں گھڑنے اور مشہور کرنے کا ایک محرک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو ذلیل و مطعون کرنا اور ان کے نسب کو مشکوک و مجہول بتانا تھا۔ روایتیں درج ذیل ہیں :۔

پہلی روایت۔ "عن فضل (بن) سکرۃ قال" دخلت علی ابی عبد اللہ

وہی ہیں جن کے ذہن پر شیعیت کا کچھ نہ کچھ اثر ہے۔ اور بغض بنو امیہ خصوصاً بغض یزید مرحوم کے جوش نے ان کی فہم کو اس حد تک متاثر کردیا کہ یہ ان روایات مکذوبہ موضوعہ کے مضمرات و مقاصد کو نہیں سمجھ سکے۔ جن علماء کا ذہن اس اثر سے پاک تھا انہوں نے ان ہفوات کی تردید کی اور انہیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ مثلاً علامہ قاضی بدرالدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حنفی المتوفی ۷۶۹ھ۔ حادثہ حرہ کی وہی تفصیل بیان کرکے جو شیعوں اور شیعیت نواز مورخوں نے بیان کی ہے، لکھتے ہیں۔

" **قال شیخنا عبداللہ الذہبی ہذا سخف و مجازفۃ** (۱) " ہمارے شیخ عبداللہ الذہبی نے کہا ہے کہ یہ (بیان و حکایت) احمقانہ، اور (بیان کرنے والے کی) بے بصیرتی (کی علامت ہے)۔"

علامہ ذہبی تو حرہ کے بیینہ واقعات کو غلط اور اس کے بیان کرنے والوں کو احمق اور بے بصیرت کہہ رہے ہیں۔ علامہ بدرالدین بھی ان کے ہم خیال تھے۔ اور اپنے استاد کی رائے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر نسلی تعصب اور تشیع کی بیماری میں مبتلا تاریخ نگار اس سراپا کذب و دروغ اور جھوٹ کی پوٹ کو صحیح کہتے ہیں اور حیاء و شرم کو بالائے طاق رکھ کر اسے بیان کرتے رہتے ہیں۔

علیہ السلام " فقال : " یا فضیل اتدری لی ای شئی کنت انظر قبیل ؟ " قال قلت لا قال کنت انظر فی کتاب لفاطمۃ علیہا السلام لیس من ملک یملک (الارض) الا و ہو مکتوب فیہ باسمہ و اسم ابیہ و ما وجدت لو لد الحسن فیہ شیئاً "

(الاصول من الکافی کتاب الحجۃ باب فیہ ذکر الصحیفۃ و الجفر الخ ص ۲۴۲ ج ۱)

" **فضیل بن سکرۃ** سے مروی ہے وہ کہتا ہے کہ میں " ابی عبداللہ علیہ السلام (جعفر صادق) کے پاس پہونچا تو انہوں نے کہا کہ اے فضیل تم جانتے ہو کہ میں ذرا دیر پہلے کیا دیکھ رہا تھا ؟ میں نے کہا کہ نہیں (امام نے) کہا کہ " میں فاطمہ **علیہا السلام** " کی کتاب دیکھ رہا تھا اس میں ان سب بادشاہوں کا تذکرہ، ان کے اور ان کے باپ کے نام کے ساتھ ہے جو ہونے والے ہیں، مگر میں نے اس میں حسنؓ کی اولاد میں کسی کا نام بھی نہیں پایا۔ "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں کے امام جعفر صادقؒ نے حضرت حسنؓ کی اولاد کو امامت اور حکومت دونوں شعبوں سے بالکل خارج کردیا تھا۔ اور یہ بتادیا کہ ان کی مفروضہ الہامی کتاب کے بموجب اولاد حسنؓ میں نہ کوئی " امام " ہوسکتا ہے اور نہ " ملک " اردو

کے ایک عامیانہ محاورے میں حسنی خانوادے کو انہوں نے ٹاٹ باہر کردیا تھا۔

دوسری روایت :۔

یہ روایت ذرا طویل ہے۔ اور اس میں شیعوں کے امام ابوعبداللہ جعفر صادق نے ان کتابوں اور نوشتوں کا تذکرہ کیا ہے جو بقول شیعہ انہیں منجاب اللہ ملی تھیں۔ اسی سلسلہ میں وہ کہتے ہیں :۔

" و عندی الجفر الاحمر قال قلت وای شئی فی الجفر الاحمر ؟ قال : السلاح و ذلک انما یفتح للدم یفتحہ صاحب السیف للقتل ' فقال لہ عبداللہ بن ابی یعفور اصلحک اللہ ایعرف ھذا بنوالحسن ؟ فقال ای واللہ کما یعرفون اللیل انہ لیل و النھار انہ نھار ' لکنھم یحملھم الحسد ' و طلب الدنیا علی الجحود والانکار ' لو طلبوا الحق بالحق لکان خیر الھم " (الاصول الکافی ۔ ۲۴۰ ج ۱)

" اور میرے پاس جفر احمر ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا کہ " جفر احمر " کیا ہے ؟ (امام نے) کہا کہ اسلحہ اور وہ خونریزی کے لئے کھولے جائیں گے اسے " صاحب السیف " (تلواروں والا امام) کھولے گا۔ (اس پر) ان سے (امام سے) عبداللہ بن ابی یعفور نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کی اصلاح فرمائے کیا یہ بات بنوالحسن (حضرت حسنؓ کی اولاد) جانتے ہیں ؟ انہوں نے (امام نے) جواب دیا کہ ہاں ہاں قسم خدا کی یہ (اولاد حسنؓ) اس امر کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح دن کو دن اور رات کو رات جانتے ہیں لیکن حسد اور دنیا طلبی انہیں انکار اور نفی پر آمادہ کرتے ہیں (یعنی حسد اور طلب دنیا کی وجہ سے میری امامت کا انکار کرتے ہیں) اگر وہ حق کو حق کے ذریعہ طلب کرتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا "

اس روایت میں صاف صاف حضرت حسنؓ کی اولاد کو مفروضہ منصب امامت سے محروم اور حاسد و طالب دنیا کہا گیا ہے۔ اصول کافی میں اس قسم کی روایتیں اور بھی ہیں۔ جن کے مضمون میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ لیکن ان کا ماحصل بھی اولاد حسنؓ کی تحقیر و تذلیل اور انہیں اپنے مفروضہ منصب امامت سے محروم رکھنا ہے۔ اس کے ساتھ ان روایات کے وضع کرنے کا ایک مقصد حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کی اولاد کے درمیان

ہفتم مبالغہ آرائی ' سوء تعبیر ' غلط بیانی '

مغالطہ دہی اور اشتعال انگیزی

شیعہ اور شیعیت نواز سنی تاریخ نگاروں نے اسلامی تاریخ لکھنے میں مندرجہ بالا سب طریقوں سے کام لیا ہے۔ اس موضوع پر اس قسم کے کسی شخص کی گفتگو سننے کا آپ کو اتفاق ہو تو اس کی گفتگو میں بھی آپ کو یہ سب اوصاف قبیحہ محسوس ہوں گے۔ ہم نے بغرض اختصار سبائیوں کے ان مکائد کو یکجا کردیا ہے۔ اور بطور نمونہ کچھ ایسے واقعات پیش کردیئے ہیں جس میں یہ طریقے نمایاں ہیں۔ ان سب طریقوں سے دشمنان صحابہؓ اور ان کی کورانہ تقلید کرنے والے بعض سنی یا سنی نما مورخوں نے بھی کام لیا ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ ایسا ہے کہ تاریخ نگاری اور بیان واقعات و حوادث میں اس سے کام لینا دیانت و انصاف کے خلاف ہونے کے ساتھ ' تاریخ کو مسخ کرنے اور صداقت کو چھپانے کے لئے عداوت و دشمنی :انا۔ اور اس کی تشہیر کرنا بھی تھا۔

یہ روایتیں تو بالکل غلط ' جھوٹی اور شیعوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ حضرت جعفر صادق سنی اور صالح و متقی شخص تھے۔ شیعوں کے تصور امامت کا وسوسہ بھی ان کے دل میں کبھی نہ آیا ہوگا۔ یہ سب تو ان پر شیعہ راویوں اور مصنفین کا بہتان و افتراء ہے۔ مگر ہم نے یہ روایتیں صرف اس لئے نقل کی ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں نے اولاد حسنؓ کی تذلیل کرنے اور انہیں اولاد حسینؓ سے لڑانے کی کس قدر کوشش کی ہے۔

یہ روایتیں تو یقیناً سراپا کذب و دروغ ہیں ' جو شیعی عالم علامہ یعقوب کلینی آنجہانی اور ان کے رفقاء نے گھڑی ہیں۔ اور یہ اسوقت گھڑی گئی ہیں جب حضرت جعفر صادق کی وفات پر ایک صدی سے بھی زیادہ زمانہ گذر چکا تھا۔ مگر ان سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ جس زمانہ میں یہ وضع کی گئی ہیں اس میں حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کی اولاد کے درمیان خاصی نافرت و عداوت پھیل چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان لوگوں کو ایسی روایتیں وضع کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ اس دور کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری روایتیں قرائن کی درجہ میں ہمارے اس بیان کی تائید و توثیق کرتی ہیں کہ حادثہ حرہ کے بارے میں جو فحش گوئی اور گندہ دہنی شیعہ موزخین اور راویوں نے کی ہے اس کا ایک مقصد حضرت حسنؓ کی اولاد کو مطعون کرنا بھی تھا۔

کافی ہے ۔ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی جو امہات الکتب اور ابتدائی دور کی کتابیں اس وقت موجود ہیں ان کے مصنفین شیعہ ہیں ۔

اس کی تفصیل ہم جلد اول میں کرچکے ہیں ۔ اہلسنت نے بھی تاریخ اسلام پر اس دور میں بلکہ اس سے پہلے دور میں بھی کتابیں لکھیں مگر یہ کتابیں فتنہ تاتار اور فتنہ اندلس میں تباہ و برباد ہوگئیں ۔ ان شیعہ مورخین اور ان کی جمع کردہ روایتوں کے راویوں نے جس قدر اور جہاں موقع مل سکا مندرجہ بالا مذموم طریقوں اور تدبیروں سے خوب کام لیا ۔ ان کے بعد جن سبائیوں ' اور سبائیت زدہ سنی مصنفین نے انہیں کتابوں کو سامنے رکھ کر ان موضوعات پر لکھا وہ مذکورہ بالا طریقوں پر عمل کرنے میں ان سابقین سے بھی بڑھ گئے ۔ زیر نظر کتاب (خلافت و ملوکیت) میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ۔ مودودی صاحب نے ان تدبیروں سے خوب کام لیا ہے بطور نمونہ حجر بن عدی کی سزائے قتل کا واقعہ پیش کرتا ہوں ۔ اس کا تذکرہ موصوف نے حضرت معاویہؓ کے مطاعن میں کیا ہے ۔ ۔ واقعہ اس دور کا ہے جب مسلمانوں کے باہمی اختلافات دور ہوچکے تھے ۔ اور عالم اسلامی حضرت معاویہؓ کی خلافت و امامت پر متحد و متفق ہوچکا تھا ۔ اور امت مسلمہ امن و سلامتی کے ساتھ دینی و دنیوی عروج و فلاح کی راہ پر گامزن تھی ۔ لیکن سبائی منافقوں کا گروہ جو مسلمانوں اور اسلام کے اس عروج کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہا تھا ۔ ملت اسلامیہ اور امت مومنہ کے خلاف ریشہ دوانیوں اور فتنہ انگیزیوں میں معروف تھا ۔ اس مفسد گروہ کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ خلافت اسلامیہ کا شیرازہ پراگندہ کرکے امت کو ضعف و انتشار میں مبتلا کردے اور آزادی کے ساتھ اپنے باطل افکار و اعمال کی اشاعت کرکے امت مومنہ کو گمراہ کرے ۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر تھے وہ جب جمعہ کو خطبہ دیتے تھے تو دوران خطبہ حجر بن عدی حضرت معاویہؓ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرتا تھا ۔ خطبہ جمعہ کی جو صلوٰۃ کے مثل ایک عبادت واجبہ شعار اسلام ہے ' توہین کرتا تھا ۔ اور اس میں مخل ہوتا تھا ' بار بار سمجھانے کے باجود اس مستلزم کفر حرکت سے باز نہیں آیا ۔ اس کے علاوہ مسجد کے باہر بھی وہ خلافت اسلامیہ کے خلاف سرگرمی کے ساتھ زہر اگلتا رہتا تھا ۔ وہ صرف حکومت (گورنمنٹ) کا دشمن اور مخالف نہ تھا بلکہ مملکت (STATE) کا بھی دشمن اور باغی تھا ۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ منصب خلافت آل ابی طالب کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اسی وجہ سے وہ خلافت اسلامیہ کے خلاف جھوٹا اور فتنہ انگیز پروپیگنڈہ کرتا

رہتا تھا۔ یہ باطل عقیدہ رفض کے شجرہ خبیثہ کی جڑ کا ایک حصہ ہے۔

اس کے ان سب مفسدانہ حرکات کے باوجود حضرت مغیرہؓ نے اس کے خلاف کوئی سخت کاروائی نہیں کی بلکہ محض فہمائش پر اکتفا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض دین دار اور فہیم اہل شہر نے ان کے اس نرم رویہ پر اعتراض بھی کیا اور حجر کی فتنہ انگیز سرگرمیوں سے ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ باوجود اس کے حضرت مغیرہؓ نے اس کے ساتھ سختی نہیں برتی۔ (۱) جب زیاد مرحوم کوفہ کے گورنر ہوئے تو انہوں نے بھی اس کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا۔ جب یہ باز نہ آیا تو سختی کے ساتھ بار بار تنبیہہ کی، مگر اس کے رویہ میں کوئی فرق نہ پڑا۔ اتنی مدت میں اس نے ایک پورا جتھا بغاوت کے لئے تیار کرلیا۔ (۲) زیاد بصرے چلے گئے اور حضرت عمروؓ بن حریث ان کے قائم مقام ہوئے تو اس نے دوران خطبہ جمعہ حضرت معاویہؓ اور خلافت اسلامیہ کے خلاف نعرہ بازی اور یاوہ گوئی کے علاوہ انہیں کنکریاں ماریں۔ ان حالات کی اطلاع انہوں نے زیاد کو دی۔ وہ کوفہ واپس آئے، تو تین ہزار مسلح آدمیوں کا جتھا لے کر مسجد گیا۔ اور دوران خطبہ جمعہ حسب سابق وہی مفسدانہ اور باغیانہ حرکتیں کیں۔ بالآخر زیاد نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے باقاعدہ مقابلہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی ہوئی۔ بالآخر مفسد حجر بن عدی اور اس کی پارٹی کے کچھ لوگ مغلوب ہوکر گرفتار ہوگئے۔ (۳)

زیاد نے لوگوں سے کہا کہ حجر بن عدی اور اس کے جتھے کی سرگرمیوں کے بارے میں اپنا مشاہدہ بیان کریں۔ جن اشخاص نے شہادتیں دیں ان کی تحریری شہادتیں ان کے دستخط کے ساتھ معہ ان ملزمین کے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں بھیج دیں۔ حضرت معاویہؓ نے بھی اسے بہت سمجھایا اور اس کے باطل عقائد و افکار کی تردید کی اور گمراہی و فساد انگیزی سے باز آنے کی صورت میں اس سے معافی کا وعدہ فرمایا۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ بالآخر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ یعنی معہ اپنے چند ساتھیوں کے قتل کیا گیا۔

اس کے بعد اس کے کچھ ساتھیوں کو رہا کردیا گیا۔ غالباً انہوں نے توبہ کرلی ہوگی، یا حجر بن عدی انہیں کسی فریب میں مبتلا کرکے لایا ہوگا اور درحقیقت وہ قصوروار نہ ہوں گے۔

یہ تو واقعہ ہے۔ اس کے بیان میں انہوں نے پورے سبائی آرٹ سے کام لے کر اسے حضرت معاویہؓ پر طعن کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے پہلے تو حجر بن عدی تعریف کی اور اسے صحابی کہا۔ حالانکہ یقیناً وہ صحابی نہیں تھا۔ البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۵۱ میں

---

(۱)، (۲)، (۳) البدایہ والنہایہ جلد ۸ میں بیان احوال ۵۱ھ ص ۵۰ تا ۵۲

مذکور ہے۔

اکثر المحدثین لا یصححون له صحبة

اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں سمجھتے۔

(اصابہ ترجمہ حجر بن عدی) میں مذکور ہے کہ امام بخاری، ابن ابی حاتم، خلیفہ بن خیاط، ابن حبان سب نے اسے تابعین میں شمار کیا ہے۔

ان تصریحات کے باوجود مودودی صاحب انہیں صحابہ میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ محدثین و کبار علماء رجال کے ان اقوال سے قطع نظر بھی خود اس شخص کا کردار بتارہا ہے کہ یہ صحابی نہیں ہوسکتا۔ یہ شخص گمراہ اور اول درجہ کا مفسد و فتنہ انگیز تھا۔ جو افعال شنیعہ اس سے سرزد ہوئے ان کا صدور کسی صحابیؓ سے ممکن نہیں۔ یہ شخص تو سبائی غنڈوں کا سردار ایک گمراہ غنڈہ تھا۔ انہوں نے حجر بن عدی کو صحابی کہنے کے بعد زاہد و عابد اور صلحائے امت میں اونچے درجہ کا شخص بھی کہا ہے۔ اس مدح سرائی کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ وہ مظلوم تھا۔ یہ سبائیوں کی پرانی تکنیک ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ خود کو مظلوم ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا اس قدر پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اچھے اچھے فہیم لوگ بھی ان کے فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ خود ظلم اور فساد فی الارض کا ارتکاب کرتے ہیں اور جب حکومت گرفتار کرتی ہے تو یہ ظالم اپنی مظلومیت کا رونا رونے لگتے ہیں۔ رہا اس کی عبادت اور اس کے زہد و تقویٰ کا معاملہ تو اس کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ابن سبا بھی اپنی ظاہری اور شخصی زندگی میں بہت عابد و زاہد اور متقی تھا، اور خوارج تو شاید ان سب سے زیادہ عابد و زاہد اور متقی تھے۔ جب عقائد فاسد ہوں، تو اعمال صالحہ مفید نہیں ہوسکتے اور کسی کے عقائد سے صرف نظر کرکے صرف اس کے اعمال پر نظر کرکے اسے متقی اور عابد و صالح کہہ دینا سخت غلطی ہے۔ جو لوگ امت مسلمہ میں گمراہی پھیلانا چاہتے ہیں عموماً عبادت اور ظاہری تقویٰ ہی کی چادر سے اپنے باطنی جذام کو چھپاتے رہتے ہیں۔ اس کی مدح سرائی کے بعد مودودی صاحب نے واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے۔ سوء تعبیر کی نمایاں مثال یہ ہے کہ امیر زیاد مرحوم نے اس پر اور اس کی پارٹی پر جو فرد جرم عائد کی تھی وہ مودودی صاحب نے نقل کی ہے وہ خود لکھتے ہیں:

> "آخر کار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کرلیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فرد جرم پر لیں کہ "انہوں نے ایک جتھا بنالیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے

ہیں ' امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں ' ان کا
دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آل ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست
نہیں ہے ۔ انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل
کو نکال باہر کیا ۔ یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں '
ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہار برات کرتے
ہیں ۔ "

(ص ۲۴)

فہرست جرائم تو موصوف نے نقل کردی مگر ایسے طرز سے نقل کی ہے کہ گویا " یہ سب الزام غلط تھے ۔ اور یہ فہرست جرائم زیاد کی خود ساختہ ہیں ۔ پھر اس پر شہادتیں بھی کسی دباؤ کے ماتحت ثبت کی گئیں ۔ درحقیقت گواہ بھی جھوٹے تھے ۔ " یہ سوء تعبیر کی ایک مکروہ مثال ہے اگر ان الزاموں کے غلط ہونے پر کوئی دلیل ان کے پاس تھی اور وہ فی الحقیقۃ انہیں غلط سمجھتے تھے تو صاف صاف کیوں نہ کہا کہ الزام غلط ہیں ؟ یہ مغالطہ انگیز طرز بیان و تعبیر کیوں اختیار کیا ؟

بحیثیت تاریخ نگار انہیں ان کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ملزم اور اس کے حامیوں کے بیان کو صحیح قرار دیں اور اسی تاریخ میں حکومت کے ایک اعلیٰ اور ذمہ دار عہدے دار کا جو بیان منقول ہے اسے بغیر کسی دلیل کے غلط قرار دیں ۔ ان کا یہ عمل انصاف ' دیانت اور صداقت پسندی کے بالکل خلاف ہے ۔ ان کا اتہام صرف زیاد تک محدود نہیں رہا ۔ بلکہ " شہادتیں " لیں کہہ کر اشارتاً واقعات کے گواہوں پر بھی جھوٹی شہادت دینے کا الزام عائد کردیا ۔ حالانکہ ان گواہوں میں بعض (۱) صحابہ کرامؓ ہیں اور بعض اجلہ تابعین اور معززین شہر مودودی صاحب کے نزدیک یہ سب تو معاذاللہ جھوٹے تھے کہ سب نے جھوٹی شہادت دی مگر سبائی مفسد حجر بن عدی سچا تھا جس کا حال یہ تھا کہ خطبہ جمعہ کی توہین کرتا تھا ۔ جو مثل صلوٰۃ ایک عبادت ہے ۔ اور جس کے دوران ساکت و صامت بیٹھ کر اسے سننے کا تاکیدی حکم ہے ۔ خطبہ جمعہ کی توہین اور نماز کی توہین میں کوئی فرق نہیں دونوں گناہ کبیرہ مستلزم کفر ہیں ۔ حجر بن عدی اور اس کا شیعی گروہ اس آیت کا مصداق تھا ۔

---

(۱) حضرت وائل بن حجر ' کثیر بن شہاب ' عامر بن مسعود ' زید بن حارثہ ' عبداللہ بن مسلم الحضرمی رضی اللہ عنہم صحابی ہیں (استیعاب ' اصابہ) = ان سب کی گواہی اس فرد جرم پر ثبت ہے ۔

ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلی (العلق پ ۳۰)

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو اللہ تعالٰی کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔"

مگر بغض صحابہؓ اور شیعیت کے تعصب کی وجہ سے موصوف کو حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں سے پوری ہمدردی ہے۔ اور اس کی ہر بات انہیں اچھی لگتی ہے۔ قاضی شریح رحمہ اللہ کا شمار کبار تابعین میں ہے اور وہ اپنے عدل و انصاف' ورع و تقوی اور حق گوئی' کے لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ شیعہ ان کے سخت دشمن ہیں۔ اس لئے ذرا بھی موقع مل جائے تو ان پر بہتان طرازی سے نہیں چوکتے۔

ان کے متعلق سبائیوں نے یہ افسانہ گڑھا کہ موصوف نے مذکورہ فرد جرم پر بحیثیت شاہد دستخط تو کر دیئے تھے۔ مگر حضرت معاویہؓ کو خفیہ طور پر ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ" حجر بن عدی بہت صالح شخص ہے اور اس پر مبینہ الزام غلط ہیں۔" اور" فرد جرم پر ان کے دستخط جبراً لئے گئے ہیں۔" مودودی صاحب نے یہ افسانہ اور خط اپنی زیر نظر کتاب میں نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت قاضی شریحؒ کی طرف اس خط کی نسبت محض بہتان و افتراء اور سبائی کذابوں کا من گھڑت افسانہ ہے۔ پہلی اور اہم بات تو یہ ہے کہ اس فرد جرم پر قاضی شریح کا دستخط کرنا ہی ثابت نہیں۔ زیاد مرحوم نے ان کے دستخط نہ لئے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے قاضی (چیف جسٹس) تھے۔ یہ عہدہ اس وقت کی اسلامی حکومت میں گورنر کے عہدے سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کی شہادت تو بمنزلہ قضا (فیصلہ) کے ہوگی۔ جب یہ مقدمہ ان کے اجلاس میں پیش نہیں کیا گیا تو انہیں قضا (فیصلہ) کا کیا حق تھا" اس کے علاوہ عامل (گورنر) کے برابر کی پوزیشن رکھنے کی وجہ سے وہ خود صوبائی حکومت کے ایک رکن عظیم تھے۔ اور ان کی حیثیت بھی اس معاملے میں مدعی یا مستغیث کی تھی۔ اگرچہ ان کے لئے بحیثیت ایک عام شہری کے شہادت دینے کی گنجائش تھی۔ مگر اسے انہوں نے اور صوبہ کے حاکم زیاد نے خلاف احتیاط سمجھا ہوگا۔ پھر یہ کہ حجر بن عدی ان جرائم اور معاصی کا ارتکاب علی الاعلان کرتا تھا اس لئے شہادتیں بکثرت مل رہی تھیں۔ قاضی صاحب کی شہادت کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان وجوہ پر نظر کرنے سے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے فرد جرم پر بطور گواہ دستخط نہ کئے ہوں گے۔ اس کے بعد کسی خط کے بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اگر بلا ثبوت بھی یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قاضی

موصوف نے شہادت دی ' اور دستخط فرمائے تو بھی اس کے خلاف خط بھیجنے اور حجر بن عدی کی تعدیل کرنے کا افسانہ تو بالکل غلط اور کذب و دروغ کا ڈھیر ہی رہتا ہے ۔ قاضی شریح کی ایسی عظیم شخصیت سے ایسی رکیک اور ذلیل حرکت اور معصیت کبیرہ کا صدور بالکل بعید از قیاس ہے ۔

مودودی صاحب نے حجر کے خلاف ان الزاموں کو بالکل نظرانداز کر کے اسے مظلوم ثابت کرنے اور ہیرو بنانے کے لئے اس کا مرثیہ پڑھنا شروع کردیا اور اس میں خوب مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے کام لیا یہ ارجاف کا طریقہ تو ہو سکتا ہے ۔ مگر انصاف ' دیانت اور تحقیق سے اسے کوئی تعلق نہیں (۱)

حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کہ ان کے زمانہ میں ان کے عمال و حکام اور خطباء خطبہ جمعہ میں حضرت علیؓ پر لعنت کرتے تھے (العیاذ باللہ) سراسر جھوٹ اور بہتان ہے ۔ جس کا کوئی ثبوت فرقہ مودودیہ اور اس کے ہم نوا سنی نما شیعی نہیں پیش کرسکتے ۔ اس کے غلط اور کذب محض ہونے کی ایک برہان جلی اور دلیل قوی یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد او ران کے قریبی اعزا مثل حضرات حسنینؓ و حضرت ابن عباسؓ ' حضرت جعفرؓ و امثالہم حضرت معاویہؓ کے پاس آتے جاتے تھے اور ان سے ہدایا اور تحفے بھی لیتے تھے ۔

(۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ زیاد نے اس پر کفر کا الزام بھی لگایا تھا ۔ یہ روایت تو غلط ہے اس کا ثبوت نہیں ملتا ۔ معروف روایتوں میں بیان کردہ فہرست الزامات میں کفر کا الزام مذکور نہیں ہے ۔ اس فہرست میں الزام کفر کا اضافہ کسی سبائی کی حرکت ہے ۔ تاکہ پوری فہرست مشکوک ہوجائے ۔ تاہم اگر روایت کو صحیح فرض کیا جائے تو یہ بعید از قیاس نہیں ۔ کچھ عجب نہیں کہ حجر بن عدی کفر کا بھی مرتکب ہوا ہو ۔ خطبہ جمعہ کی توہین خود مستلزم کفر ہے ۔ جس کا یہ مرتکب ہوتا رہتا تھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اسلام اور احکام الہی کی وقعت نہیں باقی رہی تھی یا وہ خطبہ جمعہ کو حکم الہی اور شعار اسلام نہیں جانتا تھا ۔ بعض صاحبان کی رائے ہے کہ " یہ الزام بھی صحیح نہیں کہ اس نے حاکم شہر کو نکال دیا ۔ " ان حضرات کی یہ رائے غلط اور خلاف واقعہ ہے ۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حجر نے زیاد کے قائم مقام عمرو بن حریث کو دوران خطبہ جمعہ کنکریاں ماریں ۔ جب اس نے انہیں منبر اور مسجد سے بے دخل کردیا تو شہر یا دارالامارۃ سے نکال دینے میں تعجب کی کیا بات ہے ؟ اس نے ضرور انہیں نکال دیا ہوگا ۔ مگر یہ نکالنا عارضی ہوگا وہ واپس آگئے ہوں گے ۔ ان وجوہ پر نظر کر کے الزام کو غلط نہیں کہا جاسکتا ۔

ان کی غیرت کس طرح اس مبینہ سب و شتم اور لعنت کو گوارا کرتی تھی ؟ کیا یہ سب لوگ حضرت علیؓ کے مخالف اور دشمن تھے یا غیرت و حمیت سے بالکل تہی دست تھے ؟

پھر کیا عالم اسلامی میں اس وقت صرف خوارج ہی رہتے تھے ؟ یا کسی کو بھی حضرت علیؓ کے ساتھ کوئی عقیدت نہ تھی ؟ حجر کی جسارت دیکھ کر اور غنڈوں کے ایک پورے جتھے کو اس کا رفیق پاکر بھی ان کی عقیدت و غیرت کو حرکت نہ ہوئی ؟ اگر جوش آیا تو صرف سبائی داس الطاغیۃ حجر کو جو متقی نما غنڈہ تھا ؟ اس سے ظاہر ہے کہ لعنت کا یہ افسانہ کسی سبائی کا بہتان و افتراء ہے ۔ فلعنتہ اللہ علی الکاذبین ۔ علاوہ بریں جب حکومت کو یہ بات معلوم تھی کہ ممالک اسلامیہ کے باشندوں میں اغلب اکثریت حضرت علیؓ کے معتقدین کی ہے ۔ تو اسے کیا ضرورت تھی کہ ایسی مکروہ بات کرکے عوام کو اپنا مخالف بنالیتی ؟ اگر بالفرض حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء حضرت علیؓ سے بدگمان بھی ہوتے تو بھی وہ ان سے مخالفت اور ان کے متعلق اپنی بدگمانی کا اظہار ایسے نامعقول طریقے سے نہ کرتے ۔ کیونکہ یہ ان کی سیاست و ملکی مصلحت کے خلاف ہوتا ۔ یقیناً انہوں نے ایسا نہیں کیا ۔ ان کے اوپر یہ الزام بالکل جھوٹا اور بہتان عظیم ہے ۔

سبائی مورخین کی شاطرانہ دروغ بانی کا ایک اور نمونہ بھی اسی واقعہ میں ملتا ہے جس دور کا تذکرہ ہے اس میں سبائی مرجلین ' حضرت معاویہؓ ' اور ان کے رفقاء کے متعلق غلط افواہیں پھیلانے میں مصروف رہتے تھے ۔ اس کے ساتھ اپنے عقائد باطلہ ' مثل ولایت 'وصایت ' امامت اور خلافت میں وراثت وغیرہ کی اشاعت کرتے رہتے تھے ۔ اور اس مغالطہ انگیز استدلال سے کام لے کر حضرت معاویہؓ کی خلافت کو معاذاللہ باطل ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ان کے باطل افکار اور فاسد عقائد کی تردید فرماتے رہتے تھے ۔ اور حضرت معاویہؓ کی خلافت کو جائز و برحق ثابت کرتے تھے ۔ یہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش اور منقبت و فضیلت کے بیان میں خلاف شریعت غلو کرتے تھے ۔ اور اپنے باطل غالیانہ عقیدے مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے ۔ حضرت مغیرہؓ اس غلو کی تردید بھی فرماتے تھے ۔ اسی کو ان روافض اور رافضیت نوازوں نے سب و شتم سے تعبیر کرکے آں محترم اور اموی خلافت کو بدنام کرنے اور حضرت مغیرہؓ نے جو ان کے غالیانہ باطل عقیدوں کی مدلل تردید فرمائی تھی اس کے اثر کو عوام کے ذہن سے زائل کرنے کے لئے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کرتے تھے ۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا طرز عمل بالکل صحیح تھا اور وہ

سبائیوں اور سبائیت نوازوں کے اس الزام سے بالکل بری ہیں۔ (۱)
مگر سبائی اور سبائیت زدہ راویان تاریخ نے دیکھا کہ زہر گھولنے کے لئے یہ موقع مناسب ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کی تعبیر اس طرح کی کہ وہ " حضرت علی " کی مذمت کیا کرتے تھے۔ " دلائل سے کسی کی بات کی تردید کرنا۔ کسی سیاسی معاملے میں اپنے موقف کو صحیح اور دوسرے کے موقف کو غلط کہنا یا اس کی غلطی کو بیان کرنا۔ شرعاً و عرفاً کسی طرح بھی مذمت ' نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ان مورخین نے اسے اس مذموم عنوان سے بیان کیا ہے۔ انہیں تاریخ نگاروں کا بیان دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ بیان و عنوان بالکل غلط ہے۔
یہ بات بالکل [illegible] قیاس و عقل ہے کہ دوران خطبہ حجر بن عدی کا مفسدانہ طرز عمل دیکھنے کے بعد بھی وہ بقول راوی " مذمت " کرکے حضرت معاویہؓ کی شان میں بے ادبی اور ان کی خلافت کے خلاف شورش برپا کرنے کا سبب بنتے رہے ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ کے متعلق یہ روایت کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کرتے تھے ' بالکل غلط اور جھوٹی ہے۔ مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں ایک قدم اور بڑھایا۔ انہوں نے واقعہ ایسے طرز سے بیان کیا ہے کہ ناواقف قاری پوری عبارت پڑھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ بھی خدانخواستہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) لعنت کیا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ

---

(۱) شیعی تشہیر کا یہ اثر ہے کہ آج بھی اگر اس غلو کی تردید کی جائے تو الزام خارجیت لگادیا جاتا ہے۔ شیعوں کا تذکرہ نہیں خود سنیوں میں صرف عوام میں نہیں بلکہ بہت سے خواص میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق عقیدت میں شدید غلو پایا جاتا ہے۔ خصوصاً اہل تصوف کے حلقے میں اہل حق میں سے کوئی شخص اگر ان غالیانہ باطل عقیدوں کی تردید کرتا ہے تو اسے یہ لوگ خارجی اور ناصبی کا لقب دیتے ہیں۔ میں نے اظہار حقیقت جلد ثانی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ " حضرت علیؓ معصوم نہیں تھے " ایک اچھے خاصے اہل علم اس پر برافروختہ ہوگئے۔ اور فرمایا کہ ان کا (یہ) مندرجہ بالا فقرہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے (یعنی میرے) دل میں حضرت علیؓ کی طرف سے "کچھ ہے" مطلب یہ ہے کہ آں محترم سے عقیدت نہیں ہے بلکہ مخالفت ہے۔ اس قسم کے کئی واقعات مشاہدے میں آئے۔ ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ پر الزام مذکور کی کیا حقیقت ہے۔؟ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آں محترم کا طرز عمل بہت ہی مستحسن تھا۔ عقائد باطلہ کی تردید اور عقائد صحیحہ کی تعلیم و تلقین واجب تھی وہ اسی واجب کو ادا کررہے تھے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

الزام بالکل جھوٹا اور بے اصل ہے۔

سیدتنا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ علی زوجھا المصطفے و علیھا الصلوۃ والسلام کا حجر بن عدی کے قتل پر ناپسندیدگی کا اظہار اور حضرت معاویہؓ پر اعتراض فرمانا اول تو ثابت نہیں۔ بلکہ بظاہر کسی شیعہ یا متشیع کی تصنیف کردہ روایت ہے۔ لیکن اگر بالفرض صحیح بھی ہو تو اس سے نفس معاملے پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ام المومنین مدینہ منورہ میں تھیں انہیں جو خبریں ملیں ان کی بناء پر انہوں نے حضرت معاویہؓ پر اعتراض فرمایا۔ آں محترمہ معظمہ کو صحیح صورتحال کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ مگر ان کا جواب سن کر مطمئن ہوگئیں۔ ان کے اس فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو خبریں آں محترمہ کو پہنچیں وہ صحیح تھیں۔ یا حضرت معاویہؓ اس معاملے میں غلطی پر تھے۔ حضرت معاویہؓ نے آں محترمہ کے ارشاد کا جواب دے دیا تو وہ مطمئن ہوگئیں۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ حضرت معاویہؓ کا طرز عمل صحیح تھا، حجر واقعی مستحق قتل تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ان مفسدین فی الارض کو جن کا سردار الطاغیۃ السبائیہ حجر بن عدی علیہ ما علیہ تھا قتل کرکے جمہور مسلمین پر احسان عظیم فرمایا۔ ثواب و اجر آخرت کے مستحق ہوئے۔

بغض صحابہؓ کی نحوست ذہن کو دروغ پرور اور کج رفتار بنادیتی ہے۔ اس کا نمونہ، اس واقعہ سے مودودی صاحب کا الٹا استدلال ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد معدلت مہد میں عوام کو آزادی اظہار رائے بدرجہ کمال حاصل تھی۔ حجر کی بکواس، پر برسوں تک حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کوئی گرفت نہیں کی۔ زیاد مرحوم بھی مدت دراز تک طرح دیتے رہے۔ اور افہام و تفہیم کے ذریعہ معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حجر نے شیعوں اور مفسدوں کا ایک بڑا جتھا تیار کرلیا اور بغاوت اور فساد فی الارض کا عملاً آغاز کردیا۔ ایسی دریدہ دہنی پر اتنی مدت تک کوئی کاروائی نہ کرنا آزادی اظہار رائے کی کتنی نمایاں مثال ہے۔ مگر سبائی کج فہمی سے آزادی اظہار رائے کے خاتمہ کی دلیل بناتی ہے۔

اسی طرح کی ایک مثال حجاج بن یوسف کا معاملہ ہے۔ سبائیوں نے ان پر ظلم و ستم کا الزام لگایا اور اس کی اس قدر تشہیر کی کہ سنی بھی انہیں ظالم کہنے لگے۔ اور ان کا نام ظلم و ستم کی علامت بنادیا گیا۔ اس تشہیر بہتان کو شیعوں اور شیعیت نوازوں نے خلافت بنو امیہ کے خلاف عوام و خواص کو مشتعل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ نے اپنی اولاد کو جو وصیت حجاج مرحوم کی قدر شناسی اور ان سے حسن

سلوک کے متعلق کی تھی اس کا تذکرہ کر کے مودودی صاحب لکھتے ہیں :۔

" یہ وصیت اس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے ۔ "

(ص ۱۸۶)

مگر یہ عمارت ظلم کے اسی غلط پروپیگنڈے ' اور جھوٹ کی ریت پر قائم کی گئی ہے ' جس کا ڈھیر سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے لگایا ہے ۔ اس لئے حقیقت ظاہر ہونے کے بعد یہ پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے ۔ غلط بیانی اور اس میں مبالغہ آرائی کا ایک نمونہ مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل قول ہے :

" اس کے زمانہ میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کئے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے جب وہ مرا ہے تو اس کے قید خانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑ رہے تھے ۔ "

(ص ۱۸۶)

○ تبصرہ :۔ اس غلط بیانی کے لئے " الاستیعاب ج ۱ " کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ الاستیعاب کے متعلق جلد اول میں دکھا چکا ہوں کہ قابل اعتماد کتاب نہیں ۔ اکابر علماء قدیم نے بھی اسے قابل اعتماد نہیں سمجھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصنف حافظ ابن عبدالبرؒ کے ذہن پر شیعیت کا خاصا اثر تھا ۔ اور وہ بنو امیہ سے دلی پرخاش رکھتے تھے ' اس لئے ان کے خلاف روافض کی روایتیں بلا تکلف قبول کر کے نقل کر دیتے تھے ۔ اس معاملے میں نہ تو وہ خود قابل اعتماد ہیں اور نہ ان کی کتاب ۔ مجہول کے صیغوں " قیل " " یقال " " اور بتائی جاتی ہے " کہہ کر ہر جھوٹ نقل کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اہل بصیرت ایسی کہانیوں اور افواہوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتے ۔ خصوصاً جو بعید از قیاس ہوں ' ان کی صحت کا شبہ اور احتمال بھی کسی فہیم انسان کو نہیں پیدا ہوتا ۔ زیر بحث روایت تو اگر ثقات کی سند متصل کے ساتھ بھی ذکر کی جاتی تو بھی قابل قبول نہ ہوتی ' بلکہ فہم سلیم کے نزدیک مردود اور جھوٹی قرار پاتی ۔

اس سوال کا جواب کیا ہے کہ یہ مقتول شماری کس نے کی ؟ اس زمانہ میں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں تھی ' نہ اخبارات تھے ' ڈاک ' تار ' فون وغیرہ ذرائع خبر رسانی بھی مفقود تھے ۔ سفر بھی آج کی طرح آسان نہیں تھا ۔ پھر اس سبائی روایت کے راوی کذاب نے مقتولین کی تعداد کیسے معلوم کر لی ؟ اور یہ کیسے معلوم کر لیا کہ یہ سب مقتولین ناحق ' بغیر کسی

عدالتی فیصلے کے قتل کئے گئے تھے ؟ موجودہ زمانہ میں جبکہ رسل و رسائل اور حمل و نقل کے ذرائع بکثرت ہیں ' مشرق کی خبر مغرب تک منٹوں میں پہنچ سکتی ہے اور بعض اوقات پہنچتی ہے ۔ اگر کسی چھوٹے سے ملک میں ' بلکہ کسی بڑے شہر میں بھی سو دو سو آدمی قتل کئے جائیں تو خود اس شہر میں رہنے والوں کے لئے ان کی صحیح تعداد کا معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ پھر اگر بالفرض یہ مقتولین پہلے سے قید ہوں تو یہ معلوم کرنا کہ انہیں عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیا گیا ہے یا اس کے فیصلے کے بعد اور بھی مشکل ہوتا ہے ۔ آج کل مختلف ممالک کے بڑے شہروں میں مختلف قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ۔ بعض صورتوں میں حکومت گولی چلاتی ہے ۔ مقتولین و مجروحین کی صحیح تعداد مدت دراز تک نہیں معلوم ہوتی ۔ بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ صحیح تعداد کبھی نہیں معلوم ہوتی ۔ پھر حجاج مرحوم کے دور میں ایک وسیع و عریض صوبے میں ان مفروضہ مقتولین کی یہ تعداد ' اور ان کا بغیر عدالتی فیصلے کے قتل ہونا کیسے معلوم ہوگیا ؟ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب یہ دشمنان خلافت نہیں دے سکتے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی ' موضوع اور جعلی ہے کسی رافضی دشمن خلافت کی گھڑی ہوئی ہے ' جس نے جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو کو ممزوج کر کے حجاج مرحوم پر بہتان و افتراء کیا ہے ۔ ۸۰ ہزار قیدیوں کی روایت کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے ۔ یہ بھی جھوٹ کی پوٹ ہے ۔ یہ قیدی شماری کس نے کی ؟ اور کس کے بس کی بات تھی ؟ اگر حجاج ظالم تھے تو انہوں نے اس مقتول شماری اور قیدی شماری کرنے والے کی گردن کیوں نہ مار دی اور انہیں جیتا کیسے چھوڑ دیا ؟ یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اموی خلافت کے زمانہ میں جیل خانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اتنی وسیع و عریض جیل جیسی موجودہ زمانہ میں ہوتی ہے ۔ شاید ایک بھی نہ تھی ۔ سزائے قید کا رواج بہت کم تھا ۔ اگر یہ سزا دی جاتی تھی تو زیادہ تر مجرم کو خانہ قید کردیا جاتا تھا ۔ جسے ہمارے زمانہ میں نظربندی کہتے ہیں ۔ یعنی ملزم اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ رہتا ۔ صرف گھر سے باہر جانے پر پابندی ہوتی تھی ۔ پھر یہ ۸۰ ہزار قیدی آخر قید کہاں تھے ؟ اور ان کی گنجائش کہاں نکالی گئی تھی ؟

ان دروغ بافی راویوں اور دروغ نواز مورخوں کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار مقتولین اور اسی (۸۰) ہزار قیدیوں کا تذکرہ سن کر اس دور کی تاریخ اور عام انتظامی و سیاسی حالات سے معمولی واقفیت رکھنے والے کے دل میں بھی مندرجہ بالا سوالات پیدا ہوں گے ۔ ان کا جواب تو ہونا چاہئے ۔ لیکن عداوت بنی امیہ اور حب شیعیت کے زہر کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن بھی ماؤف ہوگیا اور سوالات تک نہ پہنچ سکا ۔

ورنہ کوئی اور روایت گڑھ دیتے اور جھوٹ کی تعداد میں اضافہ کردیتے۔

سبائیوں اور سبائیت نواز تاریخ نگاروں اور راویوں نے جھوٹ کیوں بولا ؟ اور مبالغہ آمیز کذب و دروغ کا اتنا بڑا ڈھیر کتب تاریخ میں کیوں لگادیا۔ اس کا علم بھی مفید ہے۔ جو لوگ تحریک شیعیت ' اس کے مقاصد ' اور اس کے طریق کار سے واقف ہیں ان کے لئے اسے سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابن سبا کی تعلیم یہ تھی کہ اگر شیعوں کی مفسدہ پردازی پر حکومت کوئی گرفت کرنے تو اپنی مظلومیت کا رونا اونچی سے اونچی آواز میں رویا جائے اور معمولی سی بات کو سینکڑوں گنا کرکے دکھانے کے ساتھ اپنی معصومیت و بے گناہی کی جھوٹی تشہیر خوب کی جائے۔ یہ یہود کا بہت اصولی عمل ہے۔ وہی انہوں نے شیعوں کو سکھایا ' شیعہ ہمیشہ اسی پر کاربند رہے اور اب بھی اسی پر کاربند ہیں۔

اموی خلافت کے مبارک دور میں خلافت اسلامیہ کے خلاف سبائیوں کی خفیہ سازشیں جاری تھیں۔ یہ مفسدین فی الارض " تقیہ " کا لبادہ اوڑھ کر اور " سنی " بن کر اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف طرح طرح کے دینی و دنیاوی فتنے برپا کرنے میں معروف تھے۔ ایسے فتنہ پرداز منافق دشمنان اسلام ' جب گرفت میں آجاتے تھے تو حجاج مرحوم انہیں سزا دیتے تھے۔ اور یہ سزا شرعاً ' و اخلاقاً ' ہر طرح بالکل بجا اور درست ہوتی تھی۔ ایسے واقعات چند ہی ہیں۔ انہیں شیعوں اور شیعیت نوازوں نے جھوٹ اور مبالغے کی آمیزش کرکے روئی کا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان مفسدوں کو جب سزا دی گئی تو قانون شرعی کے مطابق دی گئی۔ حجاج مرحوم کی گورنری کے پورے زمانہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس میں انہوں نے کسی شخص کو اس کے جرم کے ثبوت شرعی کے بغیر سزا دی ہو۔ واضح رہے کہ کسی کے بارے میں ایسے سنگین الزام کے لئے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔ خون ناحق کا الزام معمولی الزام نہیں ہے۔ حجاج ہوں یا اور کوئی ' کسی کو بھی اس جرم کا مرتکب ثابت کرنے کے لئے شرعی ثبوت کی احتیاج ہے۔ روایت کو سند اور درایت دونوں حیثیتوں سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مورخ کے عقیدہ و کردار کو بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ مورخ بھی ایک راوی ہے۔ جب رواۃ پر نقد کیا جائے گا تو اسے نقد سے مستثنیٰ کیوں سمجھا جائے ؟ مختصر یہ کہ حجاج مرحوم پر ظلم و جور کا الزام لگانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس الزام کا ثبوت دیں۔ اور میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ حجاج مرحوم کے دور ولایت کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کرسکتے جس کے بارے میں وہ شرعی دلیل سے یہ ثابت کرسکیں کہ اس میں انہوں نے کسی

کا خون ناحق بہایا تھا ۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں مورخ اعظم نے یہ لکھا ہے ' یا فلاں شیخ الشائخ ' فلاں امام اہل سنت ' فلاں عمدۃ الاولیاء اور فلاں علامہ نے یہ لکھا ہے ' ثبوت کے لئے کافی نہیں ۔ تاریخ اقوال و آراء کا نام نہیں ۔ بلکہ نقل و روایت کا نام ہے ۔ کسی تاریخی واقعہ کے ثبوت کے لئے نقل صحیح و قوی درکار ہے ۔ نقل اقوال بالکل بیکار ہے ۔

ممکن ہے کہ کسی معاملے میں ان سے نادانستہ غلطی بھی ہوئی ہو اور کسی غیر مجرم کو مجرم سمجھ کر انہوں نے سزا دی ہو ۔ لیکن شیعوں اور شیعیت نوازوں خصوصا علوی فاطمی راویوں اور مورخوں نے اس قسم کے ایک واقعہ کو دس واقعات کرکے دکھایا ہے اور مجرموں کو بے گناہ ظاہر کرکے ان کی مظلومیت کا رونا رویا ہے ۔ ان کذاب سبائیوں کے جھوٹے آنسوؤں سے متاثر ہو کر بعض سنی مورخین نے بھی ان کی مشہور کی ہوئی غلط افواہوں پر یقین کرلیا ۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں اس کا علم تھا کہ حجاج ان الزاموں سے بری ہیں لیکن حکومت یا علویہ کو خوش کرنے کے لئے یہ علماء و مورخین ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ۔ جیسے آج پاکستان اور بھارت کے متعدد صحافی اور سیاسی لیڈر ایران کی تعریف کرتے رہتے ہیں ۔ بلکہ بعض علماء بھی اس کی ستائش کرنے میں دریغ نہیں کرتے ۔ حالانکہ ایران نے انقلاب خمینی کے دور میں اور اس کے بعد سنیوں پر ایسے مظالم ڈھائے اور ڈھارہا ہے کہ جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔ وہ اب تک لاکھوں سنیوں کا خون بہا چکے ہیں اور بغیر کسی تحقیق و ثبوت جرم ہزاروں کو پھانسی پر لٹکا چکے ہیں یا گولی مار چکے ہیں ۔ اور اب تک سنیوں پر جھوٹے الزام لگا کر انہیں سزائے موت دینے کا سلسلہ جاری ہے ۔ یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے کہ خمینی اور ان کے ہم مذہب اسلام کے دشمن ہیں ۔ مگر مودودی صاحب کے ہم مشربوں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں سے کسی کی زبان سے بھی آج تک کوئی لفظ ایران کی چنگیزی و فرعونی حکومت کی مذمت میں نہیں نکلا ' بلکہ یہ لوگ ایران کی مدح و ستائش کرتے رہتے ہیں اور اس کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں ۔ اور بعض اس کے شیعی نظام کو اسلامی نظام کے نام سے موسوم کرکے اسلام کی توہین و تنقیص کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ بعض مشاہیر علماء اہل سنت نے بھی اپنے شیعیت خفیہ کی وجہ سے یا ایران اور شیعوں کو خوش کرنے اور نفع دنیا حاصل کرنے کے لئے خمینی آنجہانی مذکور کو اپنا مقتداء اور پیشوا تک کہہ دیا تھا ۔ بعض نے ایران کے "جشن انقلاب" میں شرکت کی اور خمینی آنجہانی کو تحفے تحائف دیئے ۔ حالانکہ یہ جشن درحقیقت سنیوں کی تباہی کا جشن تھا ۔

شیعہ مورخوں اور راویوں نے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے، خلفاء اسلام، ان کی حکومتوں اور ان کے عمال کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹ بولنے کے ساتھ مغالطہ دہی سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس مغالطہ دہی کی ایک مثال عبدالرحمان بن محمد بن اشعث کی بغاوت کا بیان بھی ہے، جس کا مختصر تذکرہ چند صفحات پیشتر ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر کچھ مزید روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مخالفین بنی امیہ کی بیمار ذہنیت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث حجاج کے زمانہ میں ایک فوجی آفیسر تھا آدمی تیز اور ذہین تھا عراق کا باشندہ تھا جہاں ایرانی سبائی خاصی بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ عراق کے دو اہم شہر کوفہ اور بصرہ ان کے اہم مرکز تھے۔ یہ "تقیہ" کے غول میں پوشیدہ رہتے تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خفیہ تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ نفاق ان کا شعار اور خفیہ ساز باز ان کا اصول کار تھا۔ ابن الاشعث کے آخری کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی در حقیقت اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر مدت دراز تک 'تقیہ' کی نقاب میں اپنا اصل چہرہ چھپائے رہا۔ مودودی صاحب نے اس کی بغاوت کے واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا اس نے کوئی جہاد فی سبیل اللہ کیا ہو۔ حالانکہ علماء و مورخین اسلام نے عموماً اس کی اس بغاوت کو "فتنہ ابن الاشعث" کے عنوان سے (بذیل حوادث ۸۰ھ و ۸۲ھ) ذکر کیا ہے اور اس کی بغاوت کے واقعہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس کی خلاصہ یہ ہے:

> "عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث ایک فوجی افسر تھا۔ یہ عراق کا رہنے والا تھا۔ تیز جری اور ذہین آدمی تھا۔ حجاج نے اسے سجستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قریب کے کافر ملک پر حملے شروع کر دیئے۔ ان بلاد و امصار کا والی ایک مشرک رتبیل نامی تھا۔ یہ حملے صرف سرحد تک محدود تھے۔ اور سرحدی چھیڑ چھاڑ کی حد سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ کچھ مدت کے بعد حجاج نے اسے لکھا کہ "رتبیل" کے ملک پر باقاعدہ حملہ کرے اور اندرون ملک تک فوجیں لے جا کر اس کی سرزمین کو فتح کرے۔ چونکہ حجاج سے اس کی مخالفت تھی (۱) اس لئے اس نے یہ کہا کہ اس

---

(۱) عبد الرحمٰن بن محمد بن اشعث سے حجاجؒ مرحوم کے ناراض ہونے کی وجہ یہ تھی کہ

نے اسے اس جنگ کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اسے اور اس کے لشکر
کو تباہ کروادے ۔ اس نے اپنے لشکر والوں سے کہا کہ ہمارے پاس

بعض واقعات کی وجہ سے انہیں اس پر شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ خلافت اسلامیہ کے خلاف سازش کر رہا ہے اور اس کا رجحان غداری کی طرف ہے ۔ ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب حجاجؒ نے اسے شبیب خارجی کے مقابلے میں بھیجا تو اس نے جنگ کرنے میں ڈھیل اور سستی سے کام لیا ۔ ایک موقع پر جب شبیب پسپا ہو چکا تھا اور اس کی مکمل شکست قریب تھی ۔ ابن الاشعث نے مقام جوخی میں قیام کر کے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ التوائے جنگ کا معاہدہ کر لیا اور اسے جنگ کی تیاری کا موقع دے دیا ۔ اس موقع پر عثمان بن قطن نے حجاجؒ کو اطلاع دی کہ "عبد الرحمٰن نے تمام علاقہ جوخی کو کھود کر ایک خندق بنا دیا ہے ۔ شبیب کو تو چھوڑ دیا ہے مگر اس علاقہ کی مالگذاری اپنے خرچ میں لا رہا ہے اور باشندوں کو کھائے جاتا ہے" گویا وہ دیدہ دانستہ دشمن کو قوت حاصل کرنے کی مہلت دے رہا تھا ۔ اس کے ساتھ خیانت و ظلم کا بھی مرتکب ہو رہا تھا ۔ (طبری مترجم احوال ۷۶ھ حصہ ۵ ص ۲۱۰)

مندرجہ ذیل واقعہ بھی اس کے ساتھ حجاجؒ کی بدگمانی کو جائز اور درست ثابت کرتا ہے جس زمانہ میں وہ حجاجؒ کے حکم سے شبیب خارجی سے جنگ میں مصروف تھا اس زمانہ کا ایک واقعہ طبری لکھتا ہے ۔

> "عبد الرحمٰن نے وہ رات دیرالبعار میں بسر کی ۔ دو سوار آئے اور اس کے پاس کوٹھے پر چلے گئے ۔ ایک شخص تو علیحدہ کھڑا ہو گیا اور ایک بہت دیر تک عبدالرحمان سے تنہائی میں باتیں کرتا رہا ۔ پھر وہ اتر آیا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی نیچے اتر آئے ۔ بعد میں لوگوں نے بیان کیا کہ جو شخص عبد الرحمٰن سے باتیں کرتا رہا وہ شبیب تھا اور عبد الرحمٰن میں اور اس میں پہلے سے مراسلت ہوا کرتی تھی۔"
>
> (طبری مترجم حصہ ۵ ص ۲۱۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلافت کے دشمنوں سے مل گیا تھا اور خلافت کے خلاف ان سے ساز باز کر رہا تھا ۔ غداری اسی کا نام ہے ۔

اتنی قوت نہیں ہے کہ ہم رتبیل کے ملک پر حملہ کر سکیں اور اندرون ملک جاکر لڑ سکیں، حجاج نے ہمیں تباہ کرنے کے لئے یہ حکم دیا ہے۔ اس لئے مجھے امیر بنالو اور خلافت پر قبضہ کرو۔ حجاج اور عبدالملک دونو کو ختم کردو۔ فوج اس پر راضی ہوگئی اور اس نے بغاوت کردی۔ اس کے ساتھ بہت سا لشکر ہوگیا اور اس نے بلاد اسلامیہ پر حملے شروع کردیئے۔ حجاج نے عبدالملک کو لکھا۔ اس نے ابن الاشعث کے مقابلے کے لئے شام سے لشکر بھیجا، جس نے اسے ہزیمت دی یہاں تک کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہوگیا اور "بست" کے عامل نے اسے قید کردیا۔ یہ واقعہ رتبیل، کو معلوم ہوا تو وہ اپنا لشکر لے کر "بست" پہنچا اور ابن الاشعث کو قید سے چھڑا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ لے گیا۔" (۱)

علامہ ذہبی کے اس بیان پر نظر کرنے کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ ابن الاشعث نے بغاوت بھی کی اور غداری بھی۔ اس نے خلافت اسلامیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اور نظام خلافت کو ختم اور مسلمانوں کے ملی شیرازے کو پراگندہ کرنے کی ناپاک اور انتہائی مذموم کوشش کی۔ اس نے اس پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ نہایت مکروہ قسم کی غداری بھی کی۔ وہ کافروں سے مل گیا اور انہیں اسلامی ملک پر مسلط کرنا چاہا۔ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنے کافر دوست " رتبیل " کی تحویل میں چلا گیا۔ اس طرح یہ غدار کافروں کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن بن گیا۔ اس کا ناپاک کردار بتارہا ہے کہ یہ یقیناً کوئی سبائی تھا جو اتنی مدت تک اپنی شیعیت کو تقیہ کی نقاب میں چھپائے رہا۔ موقع پاتے ہی اس نے امت مسلمہ پر وار کیا۔ اس کی اس بغاوت، غداری، عداوت خلافت اسلامیہ اور مسلم کشی کو علامہ ذہبی (اور عام طور پر علماء و مورخین) "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مودودی صاحب اس کی اس حرب فی سبیل الطاغوت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیتے ہیں۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ اس سے ان مخالفین بنی امیہ و بنی عباس، کی ذہنیت کی پستی اور دروغ پسندی واضح ہوجاتی ہے۔ یہ حسد اور عداوت خلافت اسلامیہ کے جذبات سے مغلوب ہوکر حق و انصاف اور شریعت مقدسہ اسلامیہ کے احکام

---

(۱) تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر و الاعلام ص ۲۳۰ ج ۳۔ ناشر مکتبہ القوی القاہرہ مصر، مطبعۃ السعادۃ ۱۳۶۸ھ

سب کو نظر انداز کردیتے ہیں۔

علامہ ذہبی کے مندرجہ بالا بیان میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہوگیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

وتفرق أصحاب ابن الأشعث "ابن الاشعث کے ساتھی اس سے جدا ہوگئے۔"

"بست" میں اس کے لشکر نے اسے چھوڑدیا' اسی وجہ سے "بست" کے عامل نے اسے آسانی کے ساتھ گرفتار کرلیا۔

مودودی صاحب کہتے ہیں :۔ "ابن کثیر کا بیان ہے کہ قراء (یعنی علماء و فقہاء) کی ایک پوری رجمنٹ اس کے ساتھ تھی۔"

ان کے اس قول پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "قراء" کی یہ "رجمنٹ" کب سے اس کے ساتھ ہوئی تھی اور کب اس سے الگ ہوگئی ؟ اتنا تو ماننا پڑے گا کہ "بست" کے مقام پر پہنچ کر اس کا سارا لشکر اس کا مخالف ہوکر اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس لئے مخالفین خلافت کو اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ "قراء" کی یہ نام نہاد "رجمنٹ" بھی اس سے الگ ہوگئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قراء جو بقول مودودی صاحب ابن الاشعث کی فساد انگیزی اور بغاوت و غداری کو "جہاد" ہونے کی سند دے رہے تھے اور جہاد ہی سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تھے۔ جہاد سے "فرار" کے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے یا نہیں ؟ ہزاروں علماء کا اس طرح غدر کرکے بقول راوی "جہاد" سے "فرار" کی معصیت عظیمہ کا مرتکب ہونا تو بہت اہم اور عبرت خیز بات ہے' اگر ایسا ہوتا تو اس کا عام طور پر چرچا ہوتا۔ یقیناً تاریخ کے صفحات میں ملامت کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن ہم تاریخ کے صفحات اس سے خالی پاتے ہیں۔ جن علماء و مشائخ کا نام اس سلسلہ میں آتا ہے مثلاً شعبی ' ابن ابی لیلی ' حسن بصری ' و امثالہم ان کا تذکرہ کتب رجال میں دیکھئے تو ان میں بھی ان کی اس مبینہ معصیت کبیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملے گا۔ مزید یہ کہ یہ سب حضرات اپنے وطن واپس آئے تو ان سے حجاج یا عبدالملک کسی نے بھی کوئی باز پرس نہیں کی اور ابن الاشعث کے ساتھ بغاوت میں شرکت پر ان میں سے کسی کو بھی سزا نہیں دی۔ پھر ابن کثیر کے اس قول کو کس طرح صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔ کہ "قراء" کی ایک پوری "رجمنٹ" باغی ہوکر ابن الاشعث کے ساتھ غدر و بغاوت' میں شریک ہوگئی تھی۔ ان کے قول کی صحت کی صرف یہ صورت ہے کہ اس سے مراد ان کی ابتدائی شرکت ہو۔ یعنی جب ابن الاشعث بحکم حجاج جہاد کے لئے روانہ ہوا تھا تو یہ سب

حضرات علماء کفار سے جہاد کرنے کے لئے اس کے ساتھ گئے تھے اور جہاد میں شریک ہوئے تھے ۔ مگر جب اس کی نیت خراب ہوئی اور کفار سے جہاد کے بجائے اس نے خلافت سے بغاوت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا تو یہ حضرات علماء اس سے الگ ہوگئے ۔ اس کے بعد بھی اگر وہ فوری طور پر واپس نہ آسکے تو یہ رکنا مجبوری تھا ۔ ظاہر ہے کہ ابن الاشعث نے قطعاً یہ پسند نہ کیا ہوگا کہ اتنی بڑی جماعت خصوصا علماء کی جماعت ' عین میدان جنگ میں اس کے لشکر سے الگ ہوجائے اور دارالاسلام پہنچ کر اس کی مخالفت کرے ۔ اس لئے اس نے انہیں ڈرا دھمکا کر لشکر میں ٹھہرنے پر مجبور کیا ہوگا ۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ وہاں سے واپس آگئے اور اس فتنہ پرداز سبائی ذہن والے غدار باغی کے فتنہ کو فرو کرنے میں حکومت اسلامیہ کی اعانت کرنے لگے ۔ اگر ابن کثیر کے قول مذکور کا یہ مطلب نہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ انہوں نے غلط بیانی کی اور سبائی مورخین و رواۃ کے کذب و بہتان کو نقل کرکے اپنے مورخانہ وقار کو مجروح کرلیا ۔

ہمارے نزدیک ابن کثیر کے قول کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے ۔ مودودی صاحب نے اس سیاق میں نقل کرکے ناواقف قاری کو مغالطہ دینے کی افسوسناک کوشش کی ہے ۔ جہاد میں ان علماء کی شرکت سے انکار نہیں ' مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بغاوت و غدر میں بھی اس فتنہ پرداز کے شریک تھے ۔ انہیں مفسد و باغی ابن الاشعث کا شریک کار یا موید کہنا ان حضرات پر بہتان و افتراء اور سراسر کذب و دروغ ہے ۔ بلاشبہ ان حضرات نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا ' جب وہ کفار کے مقابلے میں معروف جہاد تھا مگر جب اس نے بغاوت اور غداری کی تو اس وقت یہ اس سے الگ ہوگئے ۔ ابن کثیرؒ کے قول مذکور یا اسی مضمون کے دوسرے اقوال و روایات سے اس مقصد پر استدلال کرنا بہت مذموم غلطی اور مکروہ قسم کی مغالطہ دہی ہے ۔

اس سے یہ بات بھی روشن ہوگئی کہ ابن الاشعث کی تائید میں شعبیؒ ' حسن بصریؒ ' ابن ابی لیلیٰؒ کی جو تقریریں مودودی صاحب نے نقل کی ہیں وہ بھی موضوع ' جعلی اور سبائی رواۃ و مورخین کی گڑھی ہوئی ہیں ۔ جب یہ لوگ اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے اور غدر و بغاوت اور فتنہ میں اس کے شریک ہی نہیں رہے تو یہ تقریریں کب کیں ؟ اور کیوں کیں ؟ نیز یہ کہ پھر جب اپنے وطن واپس آئے تو ان تقریروں کی بناء پر حکومت اسلامیہ نے ان کی گرفت کیوں نہ کی ؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ تقریریں جھوٹے سبائی راویوں کی تصنیف کی ہوئی ہیں اور ان بزرگوں کی طرف ان کی نسبت بالکل غلط اور خالص

جھوٹ ہے۔

تاہم سعید بن جبیر کی طرف منسوب کرکے جو تقریر نقل کی گئی ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی ان کی تقریر تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن الاشعث کی تائید اور بغاوت و غدر پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے جرم عظیم پر ان کی گرفت کی گئی اور حجاج نے انہیں سزائے موت دی۔ ممکن ہے کہ دو ایک اور غیر معروف علماء جو سعید بن جبیر کی طرح سبائی تشہیر و تزویر کا شکار ہوگئے ہوں ان کے ہم خیال ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن الاشعث حق پر تھا اس کا باطل ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے۔ خلافت اسلامیہ سے بغاوت خود معصیت کبیرہ اور جرم عظیم ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کفار سے مل جانا' ان کے ہاتھ سے مسلمانوں کو قتل کروانے اور مملکت اسلامیہ کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا تو نہایت مکروہ اور شنیع غداری ہے جس کا گناہ عظیم اور معصیت کبیرہ ہونا بدیہی اور واضح ہے ایسے مفسد' باغی اور غدار کی تائید کرنا اُس کی غداری' بغاوت اور اس کے فساد فی الارض کو "جہاد" کہنا نہایت قبیح اور جرم عظیم ہے۔ اس تائید کا مطلب خود ان جرائم میں شرکت کرنا ہے۔ سعید بن جبیر اس کے مرتکب ہوئے۔ حجاج مرحوم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گناہ عظیم سے باز آجائیں۔ انہیں نرمی کے ساتھ سمجھایا بجھایا' استمالت کے لئے ہدیئے تحفے دیئے لیکن سبائی زہر ان کے دماغ پر اس قدر قوی اثر کرچکا تھا کہ وہ کسی طرح اس سے باز نہ آئے۔ بغاوت اور غداری کی سزا شرعًا و عقلًا قتل ہے۔ وہ ایک باغی غدار' مفسد کی پر زور تائید کررہے تھے۔ اسے تقویت پہنچانے کے ساتھ' دوسروں کو بغاوت و غداری اور فساد فی الارض کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس طرح وہ خود ان عظیم و قبیح جرائم و معاصی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ شرعًا مستوجب قتل تھے۔ حجاج نے جو انہیں سزائے موت دی تو ان کا یہ فیصلہ شرعًا و عقلًا ہر طرح جائز تھا۔ اسے ظلم کہنا خود ظلم ہے۔ سعید بن جبیر بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے۔ مجتہد تھے' اپنی ذاتی و انفرادی زندگی میں بہت متقی اور عابد و زاہد تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اسلامی قانون سے بالاتر ہوگئے تھے۔ شریعت اسلامیہ' قانون سے کسی کے استثناء کی اجازت نہیں دیتی۔ قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ کسی کو اس کی ذاتی زندگی کی پاکیزگی یا اس کے علم و فضل کی وجہ سے کسی جرم کی سزا سے مستثنٰی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان کی مغفرت کے لئے دعا تو کرتے ہیں مگر انہیں اس جرم سے بری نہیں کہہ سکتے۔ اور ان کی اس معصیت کبیرہ کو طاعت و سعادت نہیں کہہ سکتے۔

بکثرت لوگ اس مغالطہ عامتہ الورود میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ کسی انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی اجتماعی زندگی، دونوں میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی ذاتی اور انفرادی حیات میں متقی، عابد و زاہد ہوتا ہے اس کے متعلق عام طور پر لوگ یہ حسن ظن قائم کرلیتے ہیں کہ سیاسی میدان میں بھی اس کا ہر قدم زہد و تقویٰ کا پابند ہوگا۔ بکثرت ایسا ہوتا بھی ہے یعنی ایسے افراد بھی شاذ و نادر نہیں ہیں جن کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح اپنی ذاتی زندگی میں متقی ہوتے ہیں اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی مثلاً معاشرت، سیاست وغیرہ میں بھی تقویٰ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اور وہ حسبتہ للہ اخلاص کے ساتھ دین و ملت کی خدمت و نصرت کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بکثرت مثالیں اس کے برعکس بھی ملتی ہیں۔ تاریخ دیکھئے اور اپنے زمانہ کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے تو بہت بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ملے گی جن کی انفرادی زندگی دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بہت قابل تحسین و ستائش نظر آتی ہے مگر ان کا اجتماعی کردار قبیح و مذموم دکھائی دیتا ہے۔ (۱)

سعید بن جبیر بھی اسی قسم کے شخص تھے۔ بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے۔ اور ان کی انفرادی زندگی زہد و تقویٰ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر ذہن نے سبائی زہر پی لیا۔ بعض افکار بگڑے تو اجتماعی کردار میں بھی فساد پیدا ہوا اور اس نے تقویٰ و احتیاط کے سب حدود پار کرلئے۔ اسلامی حکومت و نظام حکومت کے خلاف اسلام ہی کا نام لے کر ایک باغی و غدار کی حمایت کرنے لگے یہی نہیں بلکہ اس کی بغاوت و غداری کی تحسین کرکے دوسرے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ ان حالات میں حجاج مرحوم کی حکومت کے بجائے کوئی دوسری حکومت ہوتی تو وہ بھی وہی کرتی جو حجاج نے کیا۔

ان کا یہ فیصلہ شرعاً، عقلاً و عرفاً ہر طرح جائز تھا۔ اس پر اعتراض کرنا اور اسے ظلم کہنا صحیح نہیں۔

خلافت بنی امیہ کے مخالفین و معاندین، اور ان کی عظمت پر حسد کرنے والوں میں جو

---

(۱) موجودہ دور (۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء) میں بھی اس کا مشاہدہ ہورہا ہے۔ ہماری سیاسی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ان میں بکثرت ایسے افراد بھی ہیں جن کی ذاتی اور انفرادی زندگی بہت متقیانہ اور قابل تحسین ہے۔ لیکن یہی افراد جب کسی سیاسی پلیٹ فارم پر آتے ہیں، یا کسی ادارے کے سربراہ یا عہدیدار مقرر ہوجاتے ہیں تو ان میں اور ایک فاسق و فاجر سیاسی لیڈر، یا سربراہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ذہین اور صاحب علم ہیں، وہ اپنی کمزوری سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ دلیل و برہان سے ہم اپنے غلط دعوے کو ثابت نہیں کرسکتے۔ اس لئے وہ تشہیر اور پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں استدلال کے بجائے خطابت سے کام لینے کے لئے اس دور اور بعد کے دور کے متعدد علماء کے اقوال پیش کرنے لگتے ہیں کہ دیکھو فلاں فلاں بزرگ نے حجاج کو ظالم و جابر کہا ہے، جیسے مودودی صاحب نے حضرت حسن بصری وغیرہ کے دو تین اقوال پیش کئے ہیں۔ چند صفحات پہلے میں ان کا تذکرہ کرکے ان کا جواب دے چکا ہوں۔ سعید بن جبیر کے قتل کے بارے میں مخالفین خلافت نے یہی روش اختیار کی ہے۔ یہ لوگ اس حادثے کے متعلق بہت سے علماء مشائخ کے منثور مرثیوں کا انبار لگا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سعید بن جبیر کے قتل کی کیفیت و حالت کے متعلق جو افسانے، سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے گڑھے ہیں انہیں بھی بانداز مرثیہ خوانی بیان کرتے ہیں۔ ان غلط اور سبائیوں کی گھڑی ہوئی کہانیوں کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ قدیم طرز کے مدارس عربیہ کے طلبہ میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ ان مدارس میں تاریخ کا مضمون داخل نصاب نہیں ہے۔ عہد عبدالمالک کے بارے میں جو مضمون لکھا جاتا ہے تو اس میں حجاج کا تذکرہ اور اس قتل کے واقعہ کا ذکر کرنا اور اس کے ساتھ یہ لکھنا کہ "سعید بن جبیر نے قبلہ کی طرف رخ کیا تو حجاج نے ان کا رخ ادھر سے پھروا دیا" ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محض افسانہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شیعہ مورخین اور شیعہ راویوں نے یہ جھوٹے قصے گڑھے ہیں جو بالکل بے اصل ہیں۔

اس مغالطہ انگیز استدلال کا اطمینان بخش رد و جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کا کسی مورخ یا عالم دین نے انکار نہیں کیا کہ سعید بن جبیر ابن الاشعث کی تائید کررہے تھے۔ اور صرف تائید نہیں بلکہ لوگوں کو اس کی بغاوت و غداری میں شریک ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ باوجود الہام و تفہیم اور استمالت وہ اس سے باز نہیں آئے۔ یہی ان کا جرم تھا جب جرم ثابت ہوگیا تو شرعاً و عقلاً ہر طرح ان کا قتل جائز قرار پایا۔ اس کے بعد مورخین اور علماء کا محض اپنے جذبات کی بناء پر اسے مذموم کہنا قطعاً قابل اعتبار نہیں اور ان کے جذباتی اقوال کو پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں دیا جاسکتا۔ جب دلیل شرعی سے ایک چیز کی صحت ثابت ہوگئی تو مورخین و علماء کی ذاتی و جذباتی رائے اور ان کی نوحہ خوانی کی بناء پر عدل کو ظلم اور صحیح کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

اموی دور یا عباسی دور کے بعض علماء نے جو اس واقعہ پر مرثیہ خوانی کی ہے۔ اور

اسے حجاج کا ظلم قرار دیا ہے ۔ اس کے متعدد اسباب ہیں ۔ مناسب ہے کہ یہاں ان کی طرف اشارہ کردیا جائے ۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ صرف سعید بن جبیر کے قتل کے معاملے میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے بہت سے مسائل کے بارے میں قاری سہائی مغالطوں سے محفوظ رہ سکیں گے ۔

ایک عام قانون نفسی اس کا پہلا سبب ہے ۔ وہ یہ ہے کہ بعض خصوصیات میں اشتراک کی وجہ سے جب بہت سے افراد کا ایک گروہ بن جاتا ہے تو ان میں ایک گروہی عصبیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ اور کبھی یہ اس قدر بڑھتی ہے کہ انسان اپنے زمرے کے آدمی کی حمایت میں جا و بے جا کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا ۔ پھر یہ کہ سعید بن جبیر کے شاگرد بھی بکثرت تھے ' ان صورتوں کی وجہ سے جب وہ قتل کئے گئے تو علماء کے دل کو انہیں خطا وار جاننے کے باوجود صدمہ پہنچا اور اس لئے انہوں نے حجاج کی مذمت شروع کردی اور عدل کو ظلم کہنے لگے ۔

عباسی دور کے بعض علماء و مورخین نے شیعوں اور حکومت کو خوش کرنے کے لئے بنو امیہ پر طعن و تشنیع کرنا مناسب اور نفع بخش خیال کرکے موقع بے موقع ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی ۔ اس سلسلہ میں حجاج کے خلاف زہر افشانی ناگزیر تھی ۔ عباسی دور میں شیعوں کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لئے شیعوں کو خوش رکھنا مفید بلکہ ایک حد تک ناگزیر معلوم ہوتا تھا ۔ براہ راست حکومت کو خوش کرنے کے لئے بھی یہ ذریعہ مناسب معلوم ہوتا تھا ۔ ہندوستان کے علماء نے عہد عباسی کے انہیں علماء کی تقلید کی اور بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم و جابر اور اموی خلفاء کو ستم گر کہتے رہے ۔ اور بعض نے ان مطاعن کی حقیقت سے واقفیت کے باوجود شیعوں کی خوشنودی کے لئے ان کی خصلت تبرا بازی ' اختیار کرلی اور اموی خلفاء و عمال و حکام کو برا کہنا اپنا شعار بنالیا ۔ ان علماء و مورخین اہلسنّت کے اس طرز عمل کی نوعیت کا علم ہونے کے بعد حجاج یا خلفاء بنی امیہ کے بارے میں ان کی مذمت کا اعتبار کرنا اور اسے اسلامی تاریخ کو تاریک ثابت کرنے کے لئے دلیل بنانا عقل و دانش سے بے رخی ' عدل و انصاف سے بے مہری اور اسلامی تاریخ پر ظلم ہے ۔

علماء کے ایک طبقہ کی اس غلط روی کے نظائر بکثرت ہیں ۔ ایک واقعہ جو چند سال پہلے پاکستان ہی کی سرزمین پر پیش آیا پیش کرتا ہوں ۔ میں اس وقت تک پاکستان نہیں آیا تھا ۔ بلکہ ہندوستان ہی میں مقیم تھا ۔ اخبارات سے اس واقعہ کا علم ہوا ۔ اور جب ۱۹۷۰ء میں

پاکستان آیا تو اس کی مزید تصدیق ہوئی ۔ صحیح سنہ تو یاد نہیں لیکن اندازا ۲۰ ' ۲۵ سال گزرے ہوں گے عراق میں تین چار شیعہ علماء کو غداری اور حکومت بنی اسرائیل سے عراق کے خلاف ساز باز کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی ۔ ان سب پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ۔ اور انہیں اپنے دفاع کا پورا موقع دیا گیا۔ الزام ثابت ہوگیا تو انہیں قانون کے مطابق سزائے موت دی گئی ۔ مگر حکومت عراق کے سربراہ سنی تھے ۔ اس لئے پاکستان کے شیعہ علماء میں صف ماتم بچھ گئی اور انہوں نے حکومت عراق کے خلاف احتجاج شروع کیا ۔ اس احتجاج کا ایک مکروہ پہلو یہ تھا کہ اس میں بعض علماء اہل سنت بھی با جبہ و دستار شریک تھے اور عراق کی سنی حکومت کے خلاف زہر افشانی میں وہ بھی شیعوں سے پیچھے نہیں رہے ۔

اس واقعہ پر نظر کرنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ عہد عباسی میں علماء کی ایک تعداد کا شیعہ نواز ہونا قطعاً قابل تعجب اور بعید از قیاس نہیں ۔ ایسے علماء کے لئے ہم دعائے مغفرت تو کرسکتے ہیں ۔ ان کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ اور غفرلہ ' بھی لکھ سکتے ہیں ۔ لیکن ان کے غلط اقوال و بیانات کو صحیح نہیں کہہ سکتے ۔ اور ان کے ان اقوال فاسدہ کا اعتبار کرکے اپنی شاندار اور درخشاں تاریخ کو داغ دار نہیں بناسکتے ۔

جس طرح ابن الاشعث کی بغاوت اور غداری ایک فتنہ تھی ۔ اسی طرح صفحات تاریخ میں اس کی حکایت بھی کسی حد تک ایک فتنہ ثابت ہوئی ہے ۔ یوں تو موخین کا بیان واضح ہے ۔ خصوصا علامہ ذہبی نے تو بات بالکل صاف کردی ہے ۔ اور یہ حقیقت خوب عیاں کردی ہے کہ ابن الاشعث مذکور باغی اور غدار واجب القتل تھا ۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ان کے بیان سے بالکل عیاں اور المنشرح ہوگئی کہ علماء و صلحاء اہل سنت قطعاً اس کی بغاوت و غداری میں شریک نہیں ہوئے ۔ ایک دو علماء جن کا ذہن سبائی زہر سے متاثر و مسموم ہوگیا تھا ۔ اس کے موید ہوگئے تھے مگر ایک دو عالموں کی تائید و شرکت کو علماء کی شرکت نہیں کہہ سکتے ۔ ان کی کتاب تاریخ الاسلام سے چند صفحات پہلے یہ سب باتیں نقل کی جاچکی ہیں ' مگر جس عبارت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کے آخر میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جس سے مخالفین خلافت بنی امیہ ناواقفون کو مغالطہ دینے کا کام لے سکتے ہیں ' اس لئے مناسب ہے کہ اس کی وضاحت بھی کردی جائے ۔

علامہ ذہبی عبدالرحمٰن ابن الاشعث کی غداری اور پھر اس کا عسکر خلافت سے شکست کھاکر " بست " کی طرف فرار ' اس کے لشکر کا منتشر ہوجانا اور اس کا ساتھ چھوڑ دینا '

عامل بست کا (جسے خود ابن الاشعث ہی نے مقرر کیا تھا) اسے گرفتار کرلینا ۔ ان سب امور کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں کہ اس موقع پر رتبیل ' اپنا لشکر لے کر آیا اور عامل بست کو جنگ و قتل کی دھمکی دے کر ابن الاشعث کو رہائی دلائی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں ۔

" و کان مع ابن الاشعث عدد کثیر من الاشراف و الکبار ممن لم یثق بامان الحجاج " (۱)

" اور ابن اشعث کے ساتھ بہت سے معززین اور بڑے لوگ تھے ' جنہیں حجاج کے وعدہ امان کا اعتبار نہیں ہوا " (مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ابن الاشعث کے ساتھ رتبیل کے یہاں چلے گئے)

اس عبارت سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید علماء کی ایک کثیر تعداد ابن الاشعث کی ہمنوا ہوگئی تھی ۔ لیکن یہ شبہ بوجوہ ذیل بالکل غلط ہے :۔

(۱) اس میں " اشراف " ' " کبار " کے الفاظ ہیں ۔ یعنی وہ لوگ جو سوسائٹی میں امتیاز رکھتے تھے ' اور انہیں عوام سے نسبتاً اونچا درجہ دیا جاتا تھا ۔ ان لوگوں کا عالم دین ہونا ضروری نہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ بڑے تاجر ' یا کسی بڑی جائیداد کے مالک ہوں ' یا کسی جگہ کے سیاسی یا معاشرتی لیڈر ہوں ۔ " شریف " و " کبیر " ہونے کے لئے کسی زمانہ میں بھی عالم دین ہونا ضروری نہیں تھا ۔ اس سے ان کا زمرہ علماء میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علماء میں سے نہیں تھے ۔ اگر علماء ہوتے تو مورخ ضرور ان کا تذکرہ " علماء " کے لقب کے ساتھ کرتا ۔

(۲) " ممن لم یثق بامان الحجاج " کے الفاظ سے عیاں ہے کہ حجاج نے انہیں امان دے کر واپسی کی اجازت دیدی تھی ۔ مگر امان کا مطلب تو یہی ہے کہ ان لوگوں نے ابن الاشعث کی بغاوت و غداری سے اپنی برات و بے تعلقی ظاہر کی تھی ۔ حجاج نے ان کی بات کا یقین کیا اور انہیں امان دے دی ۔ اس سے روشن ہے کہ یہ لوگ بھی ابن الاشعث کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک وہ کفار کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا ۔ جب اس نے غدر کیا اور باغی ہوکر کافروں سے مل گیا تو ان " اشراف " ' " کبار " نے اس کا ساتھ

(۱) بحوالہ سابق ۔

چھوڑدیا ۔ اس لئے علامہ ذہبی کی اس عبارت سے

ابن الاشعث کی بغاوت و غداری میں علماء و صلحاء کی شرکت ثابت کرنے کی کوشش کرنا افسوسناک مغالطہ دہی اور فریب کاری ہے ۔

حجاج مرحوم نے قرآن مجید کی جو عظیم القدر خدمت انجام دی اس کا اعتراف کرنے پر ان کے دشمن بھی مجبور ہیں ۔ مودودی صاحب نے بھی بادل ناخواستہ لکھ دیا :۔

" قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے ' جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی ۔ " (ص ۱۸۵)

حجاج کی یہی نیکی جسے اس کے دشمن بھی بادل ناخواستہ تسلیم کرتے ہیں ' ان کے ساتھ سبائیوں کی شدید عداوت کا سبب بن گئی ۔ قرآن مجید سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہوچکا تھا ۔ اور اس دور تک تواتر کے ساتھ پہنچا تھا ۔ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ ' اور سینکڑوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے موجود تھے ۔ ان سب کی تعداد روز افزوں تھی ۔ لیکن اس مکتوب قرآن مجید پر اعراب یعنی زیر زبر پیش نہیں لگے ہوئے تھے ۔ قرآن مجید میں کسی تحریف کا تو امکان باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں شیعہ اور یہود عجمی نو مسلموں کو فریب دے کر اعراب کی غلطیوں میں نہ مبتلا کردیں نیز اس سے جو اختلاف پیدا ہو اس کی اشاعت کرکے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے بارے میں دین سے ناواقف نو مسلموں کے دلوں میں شکوک و شبہات نہ پیدا کردیں ۔ اس خطرے کا احساس حجاج مرحوم نے کرلیا اور قرآن پر اعراب لگواکر اس کی حفاظت کے لئے ایک اور مضبوط حصار کا اضافہ کردیا ۔ جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف کا شبہ پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں باقی رہا ۔ حجاجؒ مرحوم کے اس اقدام سے شیعوں اور یہود کے ارمانوں پر اوس پڑگئی ۔ یہ دشمنانِ قرآن تو اسی فکر اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ موقع نظر آئے تو قرآن مجید میں تحریف نہیں تو شبہ تحریف پیدا کرکے سب مسلمانوں کو نہ سہی ' کم از کم نو مسلموں کے ایک گروہ کو تو گمراہ کردیں ۔ حجاجؒ نے ان سب کو مایوس کردیا ۔ اس مایوسی نے ان کے دل میں اس کے خلاف عداوت کا شعلہ بھڑکادیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان دشمنان قرآن امت سبائیہ کاذبہ نے مرحوم کے خلاف پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے ' اور پیالہ بھر کر زہر اگلا ہے ۔ شیعہ اور ان کے معاون خوب سمجھ گئے کہ قرآن مجید میں تحریف غیر ممکن ہے ۔ لیکن انہوں نے

سوچا کہ پورے قرآن مجید کو نہ سہی اس کے کسی چھوٹے سے جز ہی کو مشکوک بنادیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ بعض صحابہ کرامؓ کی طرف اختلاف قرات کے نام سے بعض قراتیں منسوب کردیں جو قرأت متواترہ سے بالکل مختلف تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف جو قرأت، متواترہ قرات کے خلاف منسوب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ شیعوں کے اس کید و فریب کو مٹانے کے لئے اور اہل ایمان کو بچانے کے لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت کا پڑھنا اور لکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ان کا یہ اقدام ہر طرح مستحسن اور لائق تعریف و ستائش ہے مگر سبائی ذہن اس واقعہ کو ان کا عیب کہتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> "حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ اگر ابن مسعود مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔" اس نے اعلان کیا کہ ابن مسعود کی قرات پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو اس کی گردن ماردوں گا۔ اور مصحف میں سے اس کی قرأت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دوں گا۔" (ص ۱۸٦)

> "سور کی ہڈی سے چھیلنا" اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی شان میں بے ادبی کرنا، روافض کا افتراء اور بہتان ہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ پر بھی یہ بہتان باندھا ہے کہ "انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو پٹوایا جس سے انہیں "ہرنیا" (آنت اترنا) کا مرض ہوگیا۔"

یہ سب سبائی کارخانہ دروغ بانی کی ساختہ روایتیں ہیں۔ صحیح بات صرف اتنی ہے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مبینہ قرأت پڑھنے اور اشاعت و تعلیم کی سختی کے ساتھ ممانعت کردی تھی۔ ان کا یہ فعل حد درجہ قابل تحسین ہے۔ اس کا مقصد قرآن مجید کی حفاظت تھا۔ سبائی ذہن رکھنے والوں کا اس پر اعتراض کرنا، اس کی دلیل ہے کہ عداوت بنی امیہ کی شدت نے ان کی عقل و فہم کو ماؤف کردیا ہے کہ خوبی کو برائی کہہ رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف قرأت متواترہ کے خلاف جو قرأت منسوب

کی جاتی ہے وہ ان پر بہتان و افتراء ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے صحابہؓ مثلاً حضرت ابن عمرؓ یا حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی طرف اسی قسم کی جو قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ قطعاً ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہیں۔ یہ حضرات اس سے بری ہیں۔ اس قسم کی سب روایتیں قطعاً باطل کذب و دروغ، اور شیعہ مفسدوں کی وضع کردہ ہیں۔ قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے۔ اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے۔ خبر واحد سے کسی لفظ کا جزو قرآن ہونا قطعاً ثابت نہیں ہوسکتا۔ اسے قرآن یا اس کا جزو سمجھنا گمراہی اور ضلال ہے۔ کوئی عقل سلیم اس امر کو باور نہیں کرسکتی کہ یہ صحابہ کرامؓ جنہوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ ساری عمر کسی آیت کی تلاوت میں غلطی کرتے رہے؟ اور ان الفاظ کو الفاظ قرآن سمجھتے رہے جو درحقیقت قرآن نہیں ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس موقع کے ان الفاظ سے مختلف ہیں جو ہزاروں صحابہؓ پڑھتے تھے۔

یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کتاب مسمی بقرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں دے دی تھی، کہ وہ جیسے چاہیں اسے پڑھتے رہیں۔ بلکہ آنحضور علیہ افضل الصلوات والسلام نے قرآن مجید کی باقاعدہ تعلیم دی تھی۔ پھر کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ پڑھایا تھا۔ جس قرآن کی تعلیم عام آپ نے دی تھی جو ہزاروں نے آپ سے حاصل کی تھی اور جو تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ کیا حضرت ابن مسعودؓ (یا دو تین مزید صحابہؓ کو جن کی طرف اس قسم کی قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں) کو اس کے خلاف تعلیم دی تھی؟ کوئی عقل سلیم اسے باور نہیں کرسکتی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کتاب میں یہ تفریق فرمائی ہو۔

اسی طرح عقل اسے بھی باور نہیں کرسکتی کہ یہ حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عمر بھر غلطی میں مبتلا رہے۔ حالانکہ ان کے ہزاروں ساتھی قرآن مجید پڑھتے اور سنتے رہتے تھے مگر انہوں نے ان کی قرات سن کر بھی اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی۔ اور ان میں سے بھی کسی نے انہیں ان کی غلطی پر نہیں ٹوکا۔ حاصل بحث یہ کہ یہ اختلاف قرأت کی روایتیں جو اخبار آحاد ہیں اور ان میں بھی ضعاف بلکہ درحقیقت موضوع، جعلی، دشمنان قرآن کی وضع کی ہوئی ہیں ان سے قرآن کریم کی جو قرأتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کا لکھنا اور پڑھنا، اور انہیں قرآن مجید کی قرأت سمجھنا، نیز ان نام نہاد قرأتوں کو ان صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرنا قطعاً حرام اور ممنوع ہے۔ اگر ایسی قرأتوں کو لکھنے اور پڑھنے سے حجاج مرحوم نے منع کردیا تھا تو کیا برا کیا۔ اس پر

اعتراض کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ معترض کے دل میں قرآن مجید کی وہ عظمت اور وقعت نہیں ہے جو ایک مومن کے دل میں ہونا چاہئے ۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج مرحوم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے ۔ امیر المومنین عبدالملک نے بھی انہیں حضرت موصوف کی اطاعت کا حکم دیا تھا ۔ حجاج مرحوم ہمیشہ اس پر عامل رہے ۔ اس لئے یہ کہنا کہ انہوں نے آں محترم کو قتل کی دھمکی دی ' کسی طرح قابل یقین نہیں ۔ اسی طرح حضرت انس ' اور سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہما کو گالیاں دینے ' ان کی گردن پر مہریں لگوانے کی کہانی اور اسی قسم کے دوسرے قصے شیعوں اور شیعہ نوازوں کے گڑھے ہوئے قصے ہیں ۔ اور سبائی کارخانہ دروغ بانی کے تیار کئے ہوئے جھوٹے افسانے ہیں ۔ یہ تاریخی خبریں نہیں ہیں بلکہ سبائی پروپیگنڈہ اور تشہیر ہے ۔ جو شیعہ مورخین طبری ' ابن اسحاق وغیرہ نے بہت شوق سے اپنی کتابوں میں اکٹھا کرلیا ۔ پھر کچھ جھوٹ اور دروغ اپنی طرف سے اس میں ملا کر پروپیگنڈے کا ذہنی زہر تیار کیا ۔ اس قسم کی سب روایات میں کوئی نہ کوئی شیعہ راوی ضرور ملے گا ۔ کبھی بغیر تقیہ اور کبھی نقاب تقیہ ڈالے ہوئے ۔ اکثر و بیشتر تو یہ روایتیں مشہور کذاب و مفتری ' ابو مخنف کی پھیلائی ہوئی ہیں ۔ سنی موخین مثل ابن کثیر و ابن اثیر تاریخ لکھنے بیٹھے تو انہوں نے " نقل راچہ عقل " پر عمل کیا ۔

ان کے متعلق میں جلد اول میں عرض کرچکا ہوں کہ تاریخ کے ذوق اور اس کے سلیقے سے محروم تھے ۔ انہیں صرف روایتوں کا انبار لگانا آتا تھا ۔ کثرت روایات کی ہوس بھی بہت تھی ۔ کیونکہ ان کے دور میں محدث اور مورخ کے کمال کا معیار یہی بن گیا تھا کہ اس کے پاس روایات کا ذخیرہ زیادہ ہو اس کے ساتھ ان کا ذہن بھی صاف نہ تھا ۔ یہ سنی تھے مگر ان کا ذہن و دماغ پورے طور پر سنی نہیں تھا ۔ شیعی پروپیگنڈے کے اثرات ان کی تاریخوں بلکہ ان کی دوسری کتابوں میں بھی نمایاں ہیں ۔ بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کے خلاف اس قسم کی غلط روایتیں مشہور کرکے ' اور معاندانہ جھوٹا پروپیگنڈہ کرکے شیعوں نے عوام اہل سنت کو بھی ان سب کے خلاف سخت بدگمان کردیا تھا ۔ عوام کے گمان و اعتقاد کے خلاف زبان کشائی بڑی ہمت کا کام ہے ۔ ایسے علماء تو بہت سے ملتے ہیں ۔ جنہوں نے حکومت کے خلاف جرأت کے ساتھ بات کہی ہو ۔ لیکن ایسے علماء کی تعداد اقل قلیل ہے جنہوں نے عوام کے رجحانات کے خلاف زبان کھولی ہو ۔ ہم نے اچھے اچھے علماء کبار کو دیکھا کہ " خوف فتنہ " کی آڑ لے کر عوام کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں ۔ شیعوں نے پیہم

پروپیگنڈے سے عوام کے ذہن کو مسموم کردیا تھا۔ اس لئے وہ علماء و مورخین جنہوں نے بنو امیہ و بنو عباس کی خلافتوں پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور شیعوں کی طرح ان پر "تبرا" بھیجا ہے' ان میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے' تاکہ عوام ان کے مخالف نہ ہوجائیں۔ ان علماء کے آراء اور اس موضوع پر ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم انہیں درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول یا رد کرسکتے ہیں۔ ان کے لئے قرائن کی شہادت لازم ہے۔ تاریخ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ زیر بحث قسم کی جتنی روایتیں اور کہانیاں تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ اور قرائن کی شہادت ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی ہے۔ جس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ کہانی کسی شیعی کارخانہ دروغ بافی کی مصنوعہ اور کسی شیعہ یا شیعہ نواز کی گڑھی ہوئی ہے۔ اور اس سے کذب آفرینی' افتراء پردازی' بہتان طرازی کا سبائی آرٹ خوب نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس کے متعدد نمونے ہم صفحات سابقہ میں پیش کرچکے ہیں۔ فاضل قارئین ان مثالوں اور نمونوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد سبائیوں اور شیعیت نوازوں کے باقی اعتراضات کی غلطی اور لغویت بھی انہیں مثالوں پر قیاس کرکے معلوم کرسکتے ہیں۔

خادم قرآن کریم' حجاج بن یوسف مرحوم و مغفور کے دو احسانات پوری امت پر ایسے ہیں جن کے بار سے سبکدوش ہونا اس کے لئے ممکن نہیں۔ ان میں ایک قرآن کریم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت' اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سرزمین ہند تک اسلام پہنچانا ہے۔ یہ ان کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں کہ جن کا اعتراف کرنے پر ان کے مخالفین بھی مجبور ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے بھی اپنی زیر نظر کتاب کے ص ۱۸۵ پر بادل نا خواستہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کی یہی خوبی دشمنانِ قرآن اور دشمنانِ اسلام کے نزدیک بہت بڑا عیب تھا۔ اس لئے وہ حجاج مرحوم کے سخت دشمن ہوگئے اور انہیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔

ایک اعتراض جس کی ابتداء تو سنی نما شیعوں ہی کی طرف سے ہوئی۔ شیعوں نے اپنے مطلب کے لئے اسے اچھالا' اور بہت سے سنی بھی اس سے متاثر ہوگئے' ان کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے یہ اعتراض غلط ہے۔ حجاج مرحوم امیر المومنین عبدالملک کی طرف سے گورنر تھے۔ اور انہیں خلیفتہ المسلمین تسلیم کرتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی جانتے تھے۔ قرآن مجید میں صاف صاف باغی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واقع کے اعتبار سے

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ باغی تھے یا نہیں ؟ یہ مسئلہ الگ ہے ۔ لیکن حجاج انہیں باغی ہی سمجھتے تھے ۔ اور انہیں باغی ہی سمجھ کر ان سے جنگ کی ۔ اس لئے شرعاً ان کے اوپر کوئی الزام نہیں ہے ۔ اس اعتراض کے ساتھ جو حاشیہ آرائی کی گئی ہے ۔ مثلاً سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی لاش کی تدفین سے مانع ہونا ۔ اور اس کا بے گور و کفن کئی دن پڑا رہنا ' یا سیدتنا حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی شان میں بد زبانی یا خانہ کعبہ پر پتھر برسانا وغیرہ ۔ یہ شیعوں اور شیعیت نواز مخالف بنی امیہ سنی مورخین اور راویوں کے گڑھے ہوئے طبع زاد جھوٹے افسانے ہیں ' جن کا کوئی قابل اطمینان ثبوت نہیں ۔ بلکہ درایت اور قرائن ان کی تردید کرتے ہیں ۔

مودودی صاحب نے اگر زیر بحث مسئلہ پر علامہ شبلیؒ نعمانی کی کتاب " انتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی " کا مطالعہ کرلیا ہوتا تو شاید وہ شیعوں اور یہود و مستشرقین کے ان اعتراضات کا تذکرہ کرنے کی جسارت نہ کرتے ۔ اگر انہوں نے کتاب مذکور دیکھی ہے تو ان کا ان غلط الزاموں کو دہرانا بہت ہی تعجب خیز اور افسوسناک ہے ۔ یہ الزام غلط ہیں اور ان کا کوئی اطمینان بخش ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جاسکتا ۔ آئندہ سطور میں ان پر تفصیلی بحث اور ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب ملاحظہ ہو:۔

(۱) مودودی صاحب حجاج کے متعلق لکھتے ہیں :۔

> " اس ظالم نے عین حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ پر چڑھائی کی جبکہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین بھی جنگ سے ہاتھ روک لیتے تھے ۔ " (ص ۱۸۵)

○ تبصرہ :۔ مودودی صاحب نے یہ جملے لکھ کر قاری کو مغالطہ دینے کی مذموم کوشش کی ہے ۔ کتب تاریخ متفق ہیں کہ حج کے زمانہ میں حجاج کی طرف سے کوئی جنگ نہیں کی گئی ۔ یکم ذی الحجہ سے محاصرہ کرلیا گیا تھا ۔ جنگ نہیں کی گئی پورے اشہر حرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ جنگ محاصرہ شروع ہونے سے پانچ ماہ بعد جمادی الاولیٰ میں ہوئی ۔ بلکہ بنظر غائر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں ۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :۔

> " قال الواقدی حدثنی مصعب بن ثابت عن نافع مولی اسد وکان عالما بفتنۃ ابن الزبیر قال : حصرا بن الزبیر لیلۃ هلال الحجۃ سنۃ ثنتین و سبعین، فکان حصر الحجاج لہ خمسۃ اشھر و سبع عشرۃ لیلۃ " (۱)

---

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۳۲۹

" واقدی کا بیان ہے کہ مجھ سے مصعب بن ثابت نے بروایت نافع مولیٰ اسد (وہ ابن الزبیرؓ سے خوب واقف تھے) بیان کیا کہ (حضرت) ابن الزبیرؓ کا محاصرہ ذی الحجہ ۷۲ ھ کی چاند رات سے شروع ہوا ' اس کا مطلب یہ ہے کہ حجاج نے یہ محاصرہ پانچ ماہ اور سترہ راتوں تک جاری رکھا ۔ "

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے زمانہ میں محاصرہ جاری رہا ۔ کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ جنگ کرنے کا الزام معترض نے اپنی طرف سے تراشا ہے جو بالکل غلط ہے ۔ حافظ صاحب اس عبارت میں پانچ ماہ کے " محاصرے " کا تذکرہ کرتے ہیں جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے ۔

حضرت حسن بصری کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں :۔

" تیسرا واقعہ وہی ہے جس کا حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے آخر میں ذکر کیا ہے ۔ مدینہ سے فارغ ہونے کے بعد وہی فوج جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں یہ اودھم مچایا تھا حضرت زبیرؓ سے لڑنے کے لئے مکہ پر حملہ آور ہوئی ۔ اور اس نے منجنیق لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری کی جس سے کعبہ کی ایک دیوار شکستہ ہوگئی ۔ اگرچہ روایات یہ بھی ہیں کہ انہوں نے کعبہ پر آگ بھی برسائی تھی ۔ لیکن آگ لگنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی بیان کئے جاتے ہیں ۔ البتہ سنگ باری کا واقعہ متفق علیہ ہے ۔ "

○ تبصرہ :۔ حضرت حسن بصریؒ کی طرف اس سراپا کذب و دروغ بیان کی نسبت بالکل غلط ہے یہ جس طرح حجاج مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان و افتراء ہے ۔ اسی طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر بھی بہتان و افتراء ہے ۔ شیعہ اور شیعہ نواز کذاب راویوں نے یہ جھوٹ گڑھا ۔ واقعیت سے اسے ادنیٰ تعلق بھی نہیں ۔ غلاف کعبہ شریف میں آگ لگنے کے متعلق مقبول اور معروف روایت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے ساتھ والوں میں سے کسی نے موصوف کی اجازت سے کسی ضرورت سے حرم شریف میں آگ جلائی تھی اس کی کوئی چنگاری اڑ کر غلاف کعبہ پر پڑگئی جس سے اس میں آگ لگ گئی جو فوراً بجھادی گئی ۔ اس میں حجاج یا ان کے لشکر کا کیا قصور تھا ؟ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جسکی ذمہ داری کسی شخص پر بھی نہیں ڈالی جاسکتی ۔ شیعہ راویوں اور مورخوں نے اس معمولی سی خبر کو

اپنے قلب کی سیاہی میں رنگ کر پیش کیا یہ گفتگو بھی اس صورت میں ہے جب آگ لگنے کا واقعہ بھی ثابت ہو۔ حق یہ ہے کہ اگر اصول روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نفس آگ لگنا ہی ثابت نہیں اور آگ لگنے کا قصہ ہی سرے سے سبائیوں کا تصنیف کیا ہوا جھوٹا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ "کعبہ پر آگ برسانے" کا الزام تو سراسر بہتان و افتراء اور بے بنیاد جھوٹ ہے۔ سبائی راویوں اور مورخین کے پروپیگنڈے کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر دلائل قائم ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

اولاً:۔ معترضین کہتے ہیں کہ جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کرکے آتش باری کی گئی۔ آپ خود حج یا عمرے کے لئے جاچکے ہوں توبہتر ورنہ کسی پڑھے لکھے سمجھ دار حاجی سے پوچھئے کہ جبل ابی قبیس کا فاصلہ مسجد حرام سے کتنا ہے؟ اور پھر اندازہ کرلیجئے کہ کیا اتنے فاصلہ سے مسجد شریف کے اندر تک کوئی شعلہ آتش پہنچایا جاسکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اتنی دور سے شعلہ نشانہ مذکور تک پھینکنا عادتاً غیر ممکن ہے۔ اس لئے آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب و دروغ ہے۔ جو بغض صحابہ و بغض بنی امیہ سے مغلوب شیعہ اور شیعیت نوازوں نے وضع کی ہے۔

ثانیاً:۔ چند سطور کے بعد ہم اس خلفشار کے دوران مکہ معظمہ کے حالات البدایہ و النہایہ سے ان شاء اللہ نقل کریں گے۔ ان پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کی فوجیں مسجد حرام کے دروازوں کے قریب تک پہنچ چکی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انہیں منتشر کردیتے تھے وہ پھر جمع ہوجاتی تھیں۔ اگر آگ مسجد حرام کے اندر پہنچ سکتی تھی تو ان کے اوپر بھی گر سکتی تھی اور ان کے جسم و لباس میں بھی آگ لگ سکتی تھی۔ تو کیا حجاج اپنی ہی فوج کو جلانا چاہتے تھے؟ اس سے عیاں ہے کہ کعبہ پر آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب و افتراء ہے۔ اس سراپا کذب روایت کو مختلف فیہ کہنا بڑی افسوسناک جسارت ہے۔ اس کے غلط ہونے پر ان سب اہلسنت کا اتفاق ہے جو شیعیت سے متاثر نہیں ہیں۔ اور جن کے دل اہل ایمان کے ساتھ بغض عداوت اور حسد رکھنے کی ظلمت سے پاک ہیں۔ اس روایت کو سامنے رکھنے سے کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکنے کی من گھڑت روایت کا غلط اور مکذوبہ ہونا بھی واضح ہوجاتا ہے۔ حجاج کے لشکر کے آدمی مسجد حرام کے دروازوں کے قریب تک آئے تھے تو کیا ان کی منجنیقیں خود اپنے لشکر والوں پر پتھر پھینکتی تھیں؟ اگر منجنیق سے کعبہ شریف پر پتھر پھینکے جاتے تو کیا اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مسجد شریف سے باہر گریں اور خود حجاج کے لشکر والوں ہی کے لئے جاں لیوا

ثابت ہوں ؟ علاوہ بریں بیت اللہ کا طواف کسی وقت بھی موقوف نہیں ہوتا ۔ کچھ نہ کچھ لوگ ہروقت طواف میں مشغول رہتے ہیں ۔ یہ واقعہ مشہور و معروف اور سینکڑوں کے مشاہدوں سے ثابت اور عام طور پر اہل اسلام میں تسلیم شدہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد سے کسی وقت بھی مطاف خالی نہیں رہتا ۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ طواف میں مشغول رہتے ہیں ۔ اس سے صرف وہ وقت مستثنیٰ ہے جس میں کوئی فرض نماز ادا کی جاتی ہو ۔ اگر کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکے جائیں تو طواف کرنے والوں کے زخمی ہونے یا مرنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے ۔ طواف پر کسی طرف سے بھی کوئی پابندی نہ تھی ۔ طواف کرنے والوں میں حجاج کے لشکر والے بھی ہوتے تھے ۔ اس سال خود حجاج امیر الحجاج تھے ۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

" فلما دخل ذوالحجۃ حج بالناس الحجاج فی ھذہ السنۃ " (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۲۵ احوال ۷۲ھ)

" ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہوا تو حجاج نے اس سال لوگوں کو حج کرایا "

گذرچکا ہے کہ عبدالملک" نے حجاج" کو حکم دیا تھا کہ وہ مناسک حج کے مسائل میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے احکام پر عمل کریں ۔ اگر بقول شیعہ و شیعہ نواز مورخین دروازہ کعبہ شریف پر دوران حج سنگ باری ہوتی رہتی تھی تو حجاج اور ان کے ساتھیوں نے طواف کیسے کیا ؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ شریف پر اور مسجد حرام کے اندر سنگ باری کو حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے کیسے گوارہ کیا ؟ کیا یہ الحاد فی الحرم نہیں ہے ؟ اور کیا تعظیم شعائر اللہ مناسک کے حدود سے بالکل خارج اور ان سے کلیتہً بے تعلق ہے ؟ اگر نہیں تو یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی ۔ اگر نکیر کی ہوتی تو شہرت کے ساتھ منقول ہوتی ۔ لیکن اس قسم کی کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی ۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کعبہ شریف پر سنگ باری کی روایت بالکل جھوٹی ' موضوع ' اور سبائیوں یا سبائیت نوازوں کی گڑھی ہوئی ہے ۔ اور حجاج مرحوم اور ان کے لشکر والوں پر روافض کا افتراء و بہتان ہے ۔

عبدالملک" اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان تصادم کی ابتداء جمادی اولی ۷۲ ھ میں ہوئی تھی اور جمادی الاولی ۷۳ ھ میں حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہوگیا ۔ گویا اس کی ابتداء اور انتہا کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہے ۔ اس

ایک سال کے واقعات متعلقہ کی کیفیت حافظ ابن کثیر نے البدایہ و النہایہ میں لکھی ہے۔ وہ مختصراً درج ذیل ہے۔ ۷۲ھ کے احوال کے بیان میں انہوں نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین عبدالملک ؒ نے حجاج ؒ کو حضرت عبداللہ ؓ بن زبیر ؓ کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔

" لبعثہ فی جیش کثیف من اھل الشام و کتب معہ امانا لا ھل مکۃ ان ھم اطاعوہ "۔ (۳۲۵)

انہیں (حجاج کو) اہل شام کا ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا اور اہل مکہ کے لئے امان نامہ بشرط اطاعت لکھ کر انہیں دے دیا۔ "

پھر لکھتے ہیں کہ حجاج دو ہزار شامیوں کا لشکر لے کر گئے اور طائف کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا :۔

فنزل الطائف و جعل یبعث البعوث الی عرفۃ و یرسل ابن الزبیر الخیل لیلتقیان لیھزم خیل ابن الزبیر و یظفر خیل الحجاج " (ص مذکور)

حجاج نے طائف میں قیام کرکے عرفہ کی طرف لشکر بھیجنا شروع کئے ۔ ادھر سے ابن زبیر ؓ اپنے سواروں کو بھیجتے تھے اور ادھر سے حجاج اپنے سوار بھیجتے تھے ۔ حضرت ابن زبیر ؓ کے سواروں کو شکست ہوجاتی تھی اور حجاج کے سوار غالب رہتے تھے ۔

ان مقابلوں میں سے کسی معرکہ کا حرم شریف کے اندر ہونا کہیں سے بھی نہیں ثابت ہے۔ ذوالحجہ سے پہلے ہی یہ جنگ بند ہوگئی ۔ اور محاصرہ کی ابتداء ہوئی ۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں :۔

ثم کتب الحجاج الی عبدالملک یستاذنہ فی دخول الحرم و محاصرۃ ابن الزبیر " (ص مذکور)

" پھر حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ انہیں حرم میں داخل ہونے اور ابن الزبیر ؓ کا محاصرہ کرنے کی اجازت دی جائے ۔ "

واقدی کی روایت بحوالہ ابن کثیرؒ اوپر نقل ہوچکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ ذی الحجہ کی چاند رات سے شروع ہوا ۔ اس سال حج کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

فلما دخل ذوالحجۃ حج بالناس الحجاج فی ھذہ السنۃ و علیہ و علی اصحابہ السلاح و ھم وقوف بعرفات و کذا فیما بعدھا من المشاعر و ابن الزبیر محصور لم یتمکن من الحج ھذہ السنۃ بل

نحر بدنا یوم النحر و لم یتمکن کثیر ممن معه من الحج " (ص =)

" ذوالحجہ کا مہینہ آیا تو اس سال لوگوں کو حجاج نے حج کرایا اور حجاج اور ان کے ساتھیوں نے جب عرفہ میں وقوف کیا ۔ تو مسلح رہے ۔ اسی طرح عرفات کے بعد والے مشاعر میں بھی یہ سب مسلح رہے ۔ اور ابن زبیرؓ محصور رہے اس سال حج نہ کرسکے مگر یوم النحر میں اونٹوں کی قربانی کی ۔ اور اسی طرح ان کے بہت سے ساتھی حج نہیں کرسکے ۔ "

ملحوظ رہے کہ حضرت ابن زبیرؓ اور ان کے ان ساتھیوں پر جن کا تذکرہ اس روایت میں ہے حج فرض نہ تھا ۔ اپنا حج فرض یہ بہت پہلے ادا کرچکے تھے ' بلکہ اس کے بعد بکثرت نفل حج کرچکے تھے ۔ اس لئے ان لوگوں نے اس سال حج نہیں کیا ۔ حجاج کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی ۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء میں کثیر تعداد نے حج نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض نے حج کیا ۔ اگر حجاج کی طرف سے کوئی مانع ہوتا تو ابن زبیرؓ کے بعض رفقاء کیسے حج کرتے ؟ علاوہ بریں حضرت موصوف قربانی کیسے کرتے ؟ حج کرنے والے حجاج کے لشکر کے لوگ اور دوسرے باہر کے لوگ تھے جو اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار تھے ۔ امیر الحجاج خود حجاج بن یوسف تھے جو لشکر کے سپہ سالار بھی تھے ۔ اور وہ مناسک کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے تابع فرمان تھے ۔ سوال یہ ہے کہ لشکر حجاج کے لوگ تو حج ' طواف ' سعی وغیرہ میں مشغول تھے ' اس موقع پر سنگ باری کون کررہا تھا ؟ مخالفین کہتے ہیں کہ پہاڑ پر منجنیق لگی ہوئی تھی جس سے سنگ باری کی گئی ۔ مگر وہ سنگ باری کس نے کی ؟ کیا اس وقت کوئی آٹو میٹک منجنیق ایجاد کرلی گئی تھی ؟ جسے کمپیوٹر سے کنٹرول کیا جاتا تھا ؟ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطاف ' مسجد حرام مسعی (صفا و مروہ کے درمیان) وغیرہ مقامات حرم کہ میں تو حجاج کا لشکر پھیلا ہوا تھا اور خود حجاج بھی موجود تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی انہیں کے ساتھ تھے پھر یہ سنگ باری کیا یہ لوگ اپنے ہی اوپر کررہے تھے ؟ اور کیا حجاج نے اپنا اور اپنے لشکر والوں نیز غیر جانبدار لوگوں کا سر پھوڑنے کا حکم دیا تھا ؟ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء تو وہاں موجود ہی نہیں تھے ۔ پھر یہ سنگ باری کس پر ہورہی تھی ؟ عداوت بنی امیہ کے جوش میں راوی کذاب کے ہوش گم ہوگئے ۔ اور اسے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے ۔

تیسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے اس الحاد فی الحرم کو کس طرح گوارہ کیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے دیکھتے اور کوئی نکیر نہ کرتے۔

ان واضح امور پر نظر کرنے سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ کعبہ شریف پر آتش باری کی کہانی کی طرح اس پر سنگ باری کرنے کی کہانی بھی بالکل غلط اور سرتاپا جھوٹ ہے۔ جس طرح ان کہانیوں کے تراشنے اور گھڑنے والے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے اسی طرح نقل کرنے والے بھی کاذب و مفتری اور گناہ کبیرہ کے مرتکب ٹھہرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ حرم کعبہ مکرم کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ "مکہ معظمہ پر حجاج نے حملہ کیا" قطعاً غلط ہے۔ ان پر اور ان کے لشکر پر یہ الزام قطعاً بہتان و افتراء ہے۔ طبری نے اپنے رفض کی وجہ سے سبائیوں کی مشہور کی ہوئی یہ جھوٹی افواہ اپنی کتاب میں درج کرلی۔ ابن اثیر شیعہ تو نہیں۔ مگر جلد اول میں عرض کرچکا ہوں کہ وہ خبرو روایت کے بارے میں غیر محتاط ہیں۔ حدیث میں بھی وہ احتیاط نہیں کرتے چہ جائیکہ تاریخ میں انہوں نے بغیر سوچے سمجھے طبری سے من گھڑت کہانیاں نقل کردیں۔ اور دل میں "دروغ برگردن راوی" کہہ کر مطمئن ہوگئے۔ "نقل راچہ عقل" پر عمل ایک مورخ کے لئے بہت بڑا نقص ہے۔ وہ شیعہ تو نہیں ہیں لیکن ان کے تالیفات دیکھ کر "سنی ذہن" رکھنے والا قاری ان کے اس نقص سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ان کے ذہن پر شیعیت کا خفیف سا اثر موجود ہے۔ بنو امیہ کے ساتھ انؔ کا عناد، اور ان کے دل میں صحابہ کرامؓ کی قدر و عظمت کی کمی۔ ایسی چیزیں ہیں جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی یہ کمزوریاں اس درجہ کی تو نہیں ہیں کہ انہیں شیعہ کہا جاسکے۔ اس سے کم درجہ کی ہیں اسی لئے ہم انہیں شیعہ نہیں کہتے مگر یہ زیر بحث قسم کے حوادث و اخبار کے بارے میں ان کی تاریخ پر بے اعتمادی پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔

حصار پر کچھ مدت گزری تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:۔

و مازال اهل مكة يخرجون إلى الحجاج بالامان و يترکون ابن الزبير حتى خرج اليه قريب من عشرة آلاف فامنهم و قل اصحاب ابن الزبير جدا، حتى خرج الى الحجاج حمزة و خبيب ابنا عبدالله بن الزبير فاخذا لانفسهما امانا من الحجاج فامنهما " (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۳۰)

" اہل مکہ برابر حضرت ابن زبیرؓ کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے پاس ان سے امان لے کر پہنچتے رہے ۔ یہاں تک تقریباً دس ہزار آدمی نکل گئے اور ان سب کو (حجاج نے) امان دے دی ۔ اور حضرت ابن زبیرؓ کے ساتھ بہت کم رہ گئے ۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی حجاج کے پاس پہنچ گئے اور ان دونوں نے اپنے لئے امان حاصل کرلی ۔ اور حجاج نے انہیں امان دے دی ۔

محاصرہ تنگ ہوگیا ۔ یہاں تک کہ حضرت ابن زبیرؓ کو مسجد حرام میں محصور کرلیا گیا ۔ اس وقت کی کیفیت لکھتے ہیں :۔

" قالو ! و کان یخرج من باب المسجد الحرام و ھناک خمسمائۃ فارس و راجل فیحمل علیھم فیتفرقون عنہ یمینا و شمالا و لا یثبت لہ احدٌ ....

" و کان ابن الزبیر لا یخرج علی اھل باب الا فرقھم وبدّدشملھم و ھو غیر ملبس "ص۳۳۱ ' ۳۳۰)

" ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ۔ وہ (حضرت ابن زبیرؓ) مسجد حرام کے دروازے سے نکلتے تھے اور دروازے پر پانچ سو سوار اور پیادے جمع ہوتے تھے وہ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ دائیں بائیں منتشر ہوجاتے ۔ ان کے مقابلے میں کوئی نہیں ٹھہرتا تھا ۔ .... حضرت ابن زبیر جس دروازے کے محافظوں کے مقابلے میں بھی نکلتے تھے ؟ ان کے مجمع کو پراگندہ کردیتے تھے ' اور انہیں بھگادیتے تھے ۔ حالانکہ وہ (حضرت ابن زبیرؓ) زرہ بھی نہیں پہنے ہوتے تھے "

اس خبر سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ حجاج کی فوج کے لوگ جو محاصرہ کئے ہوئے تھے حرم میں خون نہیں بہانا چاہتے تھے ۔ اور حضرت ابن زبیرؓ کے قتل کرنے یا انہیں زخمی کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے ۔ ورنہ پانچ سو آدمیوں کا ایک شخص کے سامنے سے ڈر کر بھاگ جانا بالکل بعید از عقل و قیاس ہے ۔ خصوصاً جب ان میں سوار بھی ہوں اگر ان کی نیت قتل و خونریزی کی ہوتی تو وہ انہیں آسانی کے ساتھ قتل کرسکتے تھے خصوصا ایسی صورت میں جبکہ ان کے ساتھی ' یہاں تک کہ ان کے بیٹے بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے

۔ **علی هذا** روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ بھی کسی کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ ورنہ کم از کم ایک دو کو تو وہ قتل یا مجروح کر ہی سکتے تھے ۔ خصوصاً جبکہ بظاہر مخالفین کے یہ سپاہی ان سے مرعوب بھی تھے ۔ اور اسلحہ کے استعمال سے گریز کررہے تھے ۔ حضرت ابن زبیرؓ کا یہ رویہ بھی احترام حرم کی وجہ سے تھا ۔ وہ اپنے دشمنوں کی طرح خود بھی حرم شریف میں کسی کو قتل یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ محض خالی ہاتھ دفاع کرنا چاہتے تھے یعنی مخالفین کو دھکے دے کر دروازہ پر سے ہٹانا چاہتے تھے ۔ مگر حجاج کے لشکر والوں نے اس کی بھی نوبت نہ آنے دی ۔ وہ حضرت ابن زبیرؓ کے قریب ہی نہ آتے تھے بلکہ پہلے ہی بھاگ جاتے تھے ۔ اسی سلسلہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ :۔

" و لقد كان حجر المنجنيق يقع على طرف ثوبه فلا ينزعج بذالك "

" منجنیق کے پتھر آں محترم کے دامن پر لگتے تھے مگر اس سے آں محترم کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں پیدا ہوتی تھی "۔

یہ روایت قوسین کے درمیان لکھ کر حاشیہ پر ناشر نے لکھا ہے کہ یہ " البدایہ و النہایہ " کے مصری نسخہ میں موجود نہیں ہے ۔ تاہم اگر اس روایت کو ثابت تسلیم کرلیا جائے تو یہ بھی اس امر کی ایک دلیل ہے کہ حجاج ؒ کے لشکر والے حضرت ابن زبیرؓ کو قتل یا زخمی نہیں کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ ورنہ تاک کر پتھر پھینکنا کوئی مشکل بات نہ تھی ۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ پتھر ان کے دامن پر لگتا تھا مگر ان کے جسم کو چھوتا بھی نہ تھا ؟ اگر انہیں قتل یا مجروح کرنا مقصود ہوتا تو منجنیق کے بجائے ' ہاتھوں سے پتھر مارے جاسکتے تھے ۔ تیر سے بھی کام لیا جاسکتا تھا ۔ پانچ سو میں سے سو دو سو آدمی بھی سنگ باری کرتے تو آں محترم کا ان سے محفوظ رہنا غیر ممکن تھا ۔ خصوصاً جبکہ موصوف کے جسم پر زرہ بھی نہیں تھی ۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی حرم محترم میں خوں ریزی اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور حرم میں درحقیقت کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ یہ پتھر پھینکنا ایسا ہی تھا جیسے آج کل مجمع کو منتشر کرنے کے لئے ہوائی فائر کئے جاتے ہیں ۔ حجاج کے لشکر والے یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابن زبیرؓ حرم میں محصور رہیں ۔ اور ہم پر حملہ نہ کرسکیں ' نیز کسی دوسری جگہ نہ جاسکیں ۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کی شہادت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ۱۷ جمادی الاول ۷۳ھ کو جام شہادت نوش

فرمایا ۔ پوری رات نمازیں پڑھتے رہے ۔ صبح کے قریب ذرا سی جھپکی لی ۔ بیدار ہو کر اول وقت فجر کی نماز طول قنوت کے ساتھ ادا کی اپنے رفقاء کا جائزہ لیا اس کے بعد محاصرہ کرنے والوں پر اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر حملہ آور ہوئے ' فوج مخالف تتر بتر ہو گئی اور آن محترم ۔ اپنے رفقاء کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے مقام الحجون تک پہنچ گئے ۔ وہاں ایک اینٹ آکر چہرہ مبارک پر لگی ۔ جس سے خون بہنے لگا ۔ اس پر آں محترم نے ایک رجزیہ شعر پڑھا ' اس کے بعد گر گئے (۱) ان واقعات کے تذکرے کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

" ثم سقط إلى الأرض فأسرعوا إليه فقتلوه " (ص ۳۳۱)

" پھر آں محترم زمین پر گر گئے (یہ دیکھ کر) وہ لوگ (لشکر حجاج کے لوگ) جلدی سے دوڑے اور انہیں قتل کردیا ۔ "

پھر ایک صفحہ کے بعد ص ۳۳۲ پر آں محترم کے سر کاٹنے ' اور دمشق بھیجنے ' جسم سولی پر لٹکانے ' کی غلط موضوع ' جعلی روایتیں بھی نقل کی ہیں ۔ شیعوں کی گڑھی ہوئی ان سب روایتوں کا غلط اور بہتان خالص ہونا انشاء اللہ مندرجہ ذیل سطروں سے واضح ہو جائے گا ۔ اس روایت میں اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ چہرے پر اینٹ لگنے سے حضرت موصوف زمیں پر گر پڑے ۔ لیکن یہ بات کہ " لشکر مخالف کے لوگ دوڑ پڑے اور انہیں قتل کردیا ۔ " بوجوہ غلط معلوم ہوتی ہے ۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اسی " اینٹ " کے لگنے سے آں محترم کی وفات ہوئی ۔ چوٹ اور زخم لگنے سے خون زیادہ نکل گیا ۔ جس کی وجہ سے وفات ہو گئی ۔ اور آں محترم مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے ۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ ۔ مخالفین لشکر والوں نے انہیں قتل نہیں کیا ۔ روایت کا یہ حصہ " فأسرعوا إليه فقتلوه " بالکل غلط اور کسی سبائی یا سبائیت نواز راوی یا مورخ کا اضافہ ہے جو اس نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے ۔

مندرجہ ذیل قرائن ہماری رائے کی تصدیق اور روایت زیر بحث کے حصہ مذکور کی تکذیب کر رہے ہیں :-

اول :- اس آخری کشمکش میں بھی فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ دونوں نے حرم کے احترام کی وجہ سے اسلحہ سے کوئی کام نہیں لیا ۔ اس روایت میں اس حادثہ کے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے ۔

(۱) البدایہ و النہایہ ص ۳۳۱ ج

" ثم نھض و حمل و حملوا حتی کشفوھم الی الحجون " (ص ۳۳۱)

پھر (حضرت ابن زبیرؓ) اٹھے اور آں محترم نے نیز ان کے رفقاء نے
حملہ کیا یہاں تک کہ دشمنوں کو " حجون تک پسپا کردیا ۔ "

اس روایت میں نہ تو کسی کے قتل کا تذکرہ ہے نہ زخمی ہونے کا نہ کسی سلاح کے استعمال کا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ نہیں ہوئی فریقین نے حرم شریف کی حرمت و عظمت کا پاس و لحاظ کیا ۔ اور کسی نے ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھایا ۔ حسب سابق (جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے) حضرت ابن زبیرؓ ان کی طرف بڑھتے تھے اور وہ لوگ بھاگ جاتے تھے ۔ حرم مکہ کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔ اس سے عیاں ہے کہ لشکر حجاج انہیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ صرف محصور کرکے ان سے ہتھیار ڈلوانا اور صلح پر آمادہ کرنا چاہتا تھا ۔ جب لشکر کا یہ رجحان تھا تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے آں محترم کو گرتا ہوا دیکھ کر ان کے قتل کا ارادہ کرلیا ہو اور انہیں شہید کردیا ہو ۔ خصوصاً جبکہ انہیں توقع ہو کہ اینٹ کی چوٹ ہی سے ان کی وفات ہوجائے گی ۔ اگر یہ کہا جائے کہ " یہ واقعہ حرم مکہ سے باہر کا ہے ۔ حرم کے اندر تو ان لوگوں نے احترام حرم کی وجہ سے ان کے قتل کا ارادہ نہیں کیا لیکن ممکن ہے کہ جب وہ حرم سے باہر آگئے تھے تو ارادہ قتل کرلیا ہو " ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء کی طرح حجاجؒ اور لشکر حجاجؒ کو بھی احترام حرم کا پورا پورا پاس و لحاظ تھا ۔ اسی وجہ سے حرم شریف میں فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی کسی نے اسلحہ سے کام نہیں لیا ۔ نہ کسی نے کسی کو مجروح کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن حجاجؒ کی فوج کا دوران محاصرہ جو رویہ رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف احترام حرم ہی اس کا سبب نہ تھا بلکہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح کرنا ہی نہ چاہتے تھے ۔ بلکہ اس سے گریز کرتے تھے ۔ اگر وہ اس سے بچنا نہ چاہتے ' یا اس کے خواہاں ہوتے تو پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران کسی موقع پر تو وہ اس کی کوشش کرتے کہ حضرت موصوف کو اپنے پیچھے لگا کر حرم مکہ سے باہر لے آئیں اور وہاں حملہ کرکے انہیں شہید کردیں ۔ مگر اس قسم کی کسی کوشش کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا ۔ بلکہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ملتی ۔ جس سے ان لشکر والوں پر اس کا شبہ بھی کیا جاسکے ۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حجاجؒ اور اس کے لشکر والے سب حضرت ابن زبیرؓ کی عظمت کے قائل تھے اور ان کے قتل یا انہیں مجروح کرنے سے سخت کارہ تھے ۔

۔ قطعاً انہیں جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے ۔ اس لئے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے آں محترم کو شہید کیا ہو ۔

دوم :۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس موقع پر تنہا نہیں تھے ۔ ان کے ساتھ ان کا لشکر تھا ۔ ان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی مگر پھر بھی معتدبہ تھی ۔ جب بقول راوی مخالفین دوڑ کر انہیں قتل کرنے کے لئے آئے تو ان کے رفقاء نے کیا کیا ؟ انہوں نے آں محترم کی حفاظت اور ان کی طرف سے مدافعت کی یا نہیں ؟ اس کا کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں ۔ اگر کوئی مدافعت کی ہوتی تو ضرور اس کا تذکرہ ہوتا ۔ یہ بھی بالکل بعید از عقل و قیاس ہے کہ انہوں نے کوئی مدافعت نہ کی ہو ۔ اور اسے گوارہ کرلیا ہو کہ ان کے منتخب کئے ہوئے خلیفہ اور امیر کو ان کے دشمن ان کے سامنے ذبح کریں ۔ یہ بات توغیرت وحمیت ' خلوص اور وفاداری کے بالکل منافی اور مخالف ہے ۔ بلکہ ایک قسم کا غدر ہے ۔ جو جائز بھی نہیں ۔ بلکہ سخت مذموم اور معصیت کبیرہ ہے ۔ ان واقعات پر نظر کرنے سے یقینی طور پر یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والوں نے آں محترم کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ یا اقدام نہیں کیا ۔ اور قتل والی روایت بالکل جھوٹی ' غلط اور جعلی ہے ۔ صحیح یہ ہے کہ آں محترم کی وفات اسی " اینٹ " کے لگنے سے ہوئی ' اس کی چوٹ کھاکر جب موصوف گر پڑے تو کوئی بھی موصوف کے قتل کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے آں محترم کا انتقال ہوگیا ۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ ۔

سوم :۔ حجاجؒ قریشی نہیں تھے ۔ ان کے لشکر میں بھی قریشی خال خال ہی ہوں گے ۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ عبدالملک کے قریبی رشتہ دار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی بھی تھے ۔ حجاجؒ اور ان کے لشکر کے کسی شخص کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ انہیں خلیفۃ المسلمین کی اجازت کے بغیر قتل کردے ۔ عبدالملک نے ان کے محاصرے کی اجازت دی تھی ۔ قتال و قتل کی اجازت نہیں دی تھی ۔ اس لئے وہ کسی طرح ان کے قتل کی جرأت نہیں کرسکتے تھے ۔ انہیں قتل کرنے کی روایت قطعاً غلط ہے جو کسی سبائی یا سبائیت نواز نے گڑھی ہے ۔

قتل کی روایت سراپا کذب و افتراء اور من گھڑت ہونا تو روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا ۔ اور یہ بات صاف ہوگئی کہ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت اس " اینٹ " کے لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی ۔ لیکن وہ " اینٹ " کہاں سے آئی تھی ۔ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا ۔ لیکن دشمنان بنی امیہ بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ وہ اینٹ لشکر حجاجؒ میں سے کسی نے پھینکی

تھی ۔ بلکہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ ایک اتفاقی حادثہ تھا ۔ کسی نے بھی قصداً ان کی طرف اینٹ نہیں پھینکی تھی ۔ اتفاقی طور پر ان کے لگ گئی ۔ پھر بھی یہ بات راز ہی رہتی ہے کہ وہ " اینٹ " کس نے پھینکی تھی ؟ اور کس طرف سے آئی تھی ؟ حافظ ابن کثیر اس واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں :۔

فجاءته آجرة فاصابته فی وجهه فارتعش بها .... ثم سقط الی الارض " (ص ۳۳۱ ج ۸)

" ایک اینٹ ان کے چہرے پر لگی ۔ انہیں اس سے جھرجھری آئی ...... پھر وہ زمین پر گر پڑے ۔ "

اینٹ کس نے پھینکی ؟ کدھر سے آئی ؟ اس کی طرف اس روایت میں اشارہ تک نہیں ملتا ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ حجاجؒ کے لشکر والوں میں سے کسی نے " اینٹ " نہیں پھینکی تھی ۔ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کے واقعہ شہادت کے بارے میں مختلف و متناقض روایتیں ہیں ۔ صحیح روایت صرف وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے ۔ اور اوپر منقول ہوئی ۔ باقی روایتیں غلط ہیں ۔ اور جمہور مورخین کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہیں ۔

اسی قسم کی ایک روایت البدایہ میں حافظ صاحب نے طبرانی سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ کے اعوان و مددگار لشکر حجاجؒ پر خشت باری کر رہے تھے ۔ انہیں کی پھینکی ہوئی ایک اینٹ اتفاقی طور پر حضرت ابن زبیرؓ کے سر مبارک میں لگی ۔ جس سے سر کھل گیا ۔ اور گہرا زخم آیا ۔ یہ روایت تو غلط ہے ۔ (۱) لیکن اس سے اس

---

(۱) اس لئے کہ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اینٹیں مسجد حرام کی پشت (عقب) کی طرف سے پھینکی جارہی تھیں ۔ اور یہ قطعاً غلط ہے ۔ اس لئے کہ مسجد کے چاروں طرف دروازے ہیں ۔ اور اس کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جسے پشت مسجد کہا جاسکے ۔ دوسرے یہ کہ مسجد کے دروازے پر چاروں طرف حجاجؒ کے سپاہی جمع تھے اور پہرہ دے رہے تھے ۔ پھر کسی طرف سے اینٹیں پھینکنے کا موقع کیسے مل سکتا تھا ؟ تیسرے یہ کہ اگر بقول راوی لشکر حجاجؒ اندرون مسجد گیا تھا جہاں ابن زبیرؓ کے اعوان و انصار بھی تھے تو اس طرح خشت باری سے اپنے ہی معاونین کے زخمی یا مقتول ہونے کا شدید خطرہ تھا ۔ ایسی صورت میں وہ لوگ خشت باری کیسے کرسکتے تھے ؟

بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب یہ روایت گھڑی گئی تھی اس وقت عام طور پر لوگ " خشت باری کو لشکر حجاجؒ کی طرف نہیں منسوب کرتے تھے ۔ نیز یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا ۔ اور کم از کم اس کا احتمال ہے کہ یہ " اینٹ " حضرت موصوف کی جماعت والوں اور طرف داروں ہی نے دشمنوں کی طرف پھینکی ہو ۔ جو اتفاق سے موصوف کے لگ گئی ۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد کم از کم ظن غالب کی حد تک اس راز کی نقاب کشائی ہوجاتی ہے ۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبائی سازش کے کچھ ارکان تقیہ کرکے مکہ معظمہ میں مقیم ہوں گے ۔ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے رفقاء کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہوں گے ۔ حضرابن زبیرؓ کے ساتھ ساتھ الحجون تک گئے اور کہیں چھپ کر موقع پاکر یہ اینٹ انہیں میں سے کسی نے پھینکی ہوگی ۔ جو آن محترم کی وفات و شہادت پر منتج ہوئی ۔ جو لوگ شیعیت کے مزاج سے واقف ہیں وہ ہماری اس بات کو بلا شک و شبہ تسلیم کرلیں گے ۔

قتل کی روایت غلط ثابت ہونے کے بعد لاش کی بے حرمتی کی روایتوں کا غلط ہونا خود بخود واضح ہوجاتا ہے ۔ تاریخ اسلام کے طالب علم کو یہ اصول ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تاریخ اور حدیث کی حیثیت یکساں نہیں ہے ۔ حدیث کی روایت میں راوی جس قدر احتیاط کرتا ہے ۔ تاریخ کا راوی اس کی عشر عشیر احتیاط بھی نہیں کرتا ۔ تاریخی روایت کی صحت و غلطی متعین کرنے میں قرائن داخلی و خارجی کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔ اور در حقیقت فیصلہ قرائن ہی کے اختیار میں ہوتا ہے ۔ رواۃ کا ثقہ ہونا کسی تاریخی روایت کی صحت کے لئے کافی نہیں ۔ جب تک قرائن بھی اس کی تائید نہ کرتے ہوں یا کم از کم اس کی نفی نہ کرتے ہوں اور اس کے خلاف نہ ہوں ۔ کسی تاریخی روایت کے سب راوی ثقہ ہوں ' مگر قرائن قویہ اس روایت کو غلط ثابت کررہے ہوں ۔ تو اسے یقیناً غلط اور مردود سمجھا جائے گا ۔ اور اسے محض ثقات کی روایت ہونے کی بناء پر قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ حدیث اور تاریخ میں یہ فرق پیش نظر رکھنا لازم ہے ۔ حدیث کی صحت و عدم صحت کی جانچ کرنے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے راویوں کے احوال معلوم کریں ۔ قرائن کو اس میں بھی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا درجہ احوال رواۃ کے بعد ہے ۔ بخلاف اس کے تاریخ میں قرائن ہی کو اہمیت حاصل ہے ۔ اس میں راویوں کی جانچ ثانوی چیز ہے ۔ اس کی ایک قوی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایتوں کے بارے میں بڑے بڑے ثقہ اور عادل اشخاص بھی اکثر و بیشتر غیر محتاط ہوتے ہیں ' نسلی عصبیت ' جماعتی و تحریکی تعصب ' سیاسی اختلافات اور اس قسم کے دوسرے حالات و جذبات بعض اوقات غالب ہوکر ماضی کی خبروں کے بارے

میں بڑے بڑے ثقات کو انتہائی بد احتیاطی کرنے یہاں تک کہ کھلا ہوا جھوٹ بولنے اور افتراء کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

یہ واقعہ تنہا میں نے نہیں بلکہ بہتوں نے دیکھا ہے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سیاسی معاملات اور اختلافات کی صورت میں۔ اس بارے میں احتیاط کرنے والے مفقود تو نہیں مگر بہت قلیل ہیں۔ ان امور پر نظر کرنے کے بعد کوئی ایسی تاریخی روایت جو اگرچہ ثقات سے مروی ہو مگر قرائن اس کی تکذیب کر رہے ہوں قطعاً قبول نہیں کی جاسکتی۔ اور اس پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعہ یا تاریخ میں اس اصول کا ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ ورنہ سخت غلطیوں اور غلط فہمیوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ مطالعہ تاریخ کے اس اہم اصول کی وضاحت کے لئے اگرچہ ہم نے زیر بحث روایتوں کے راویوں کو ثقہ فرض کیا تھا۔ لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے۔ کہ ان سب کے راوی عام طور پر مجہول ' شیعہ یا شیعیت نواز ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی روایتیں نقل کرنے میں مشاق تھے۔ بنو امیہ سے بغض و عداوت کی وجہ سے ان کے خلاف زہراگلنے اور ان پر بہتان و افتراء کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کی خبر جو قرائن کے خلاف ہو کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اس اہم اصول کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل قرائن پر غور کیجئے جو زیر بحث روایتوں کی تکذیب کررہے ہیں۔

اول :۔ چند سطریں پہلے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ حجاجؒ کے لشکر کے لوگ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عظمت بھی لشکر والوں کے دلوں میں تھی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے آں محترم کی لاش کی بے حرمتی کی ہو؟ ان کا سر کاٹا ہو اور لاش سولی پر چڑھائی ہو؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ روایتیں بالکل غلط ہیں۔

دوم :۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہاں موجود تھے۔ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ آں محترم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور قریبی رشتہ سے بھتیجے تھے ' دوسرے رشتے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن زبیرؓ کے خالو تھے۔ آں محترم کی شہادت کی خبر بہت تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں پھیل گئی ہوگی ' اور لاش کے قریب لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے ہوں گے۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جائے حادثہ پر اتنی تاخیر کے ساتھ پہنچے ہوں کہ ان کا سر بھی کاٹا جاچکا ہو۔ اور ان کی لاش کو مقام "کدا" پر لے جاکر صلیب پر لٹکایا جاچکا ہو۔ یقیناً حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ فوراً پہنچے ہوں گے۔ پھر انہوں نے حضرت ابن زبیرؓ کی لاش

کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی ؟ اور حجاجؒ یا ان کے لشکر والوں کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کی بے حرمتی کریں ؟ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا یا اس کا کسی نے ارادہ کیا ہوتا تو یقیناً حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اسے سختی کے ساتھ منع کرتے اور نہی عن المنکر کے فریضے سے غفلت نہ برتتے ۔ مگر اس مضمون کی کوئی روایت تاریخ میں موجود نہیں ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کاٹنے ' اسے دمشق بھیجنے ' جسم بے سر کو سولی دینے اور اس قسم کی دوسری روایتیں قطعاً غلط جھوٹی اور شیعوں نیز شیعیت نوازوں کی گڑھی ہوئی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کذابوں کو رسوا کرے ۔

سوم :۔ اوپر مذکورہ ہو چکا ہے کہ مکہ سے تقریباً دس ہزار آدمی امان لے کر لشکر حجاجؒ میں پہنچ چکے تھے ۔ ان میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دو بیٹے حمزہ و خبیب ؒ بھی تھے ۔ ان لوگوں نے ان کی لاش کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی خصوصاً آں محترم کے بیٹوں سے باپ کی لاش کا سر کٹتے اور اسے سولی پر لٹکتے کیسے دیکھا گیا ؟ اگر اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا تو یقیناً ان لوگوں نے حجاجؒ کو اس سے منع کیا ہوتا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہوتا حالانکہ اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے ۔ یہ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ قطعاً نہیں ہوا ۔ بلکہ حجاجؒ نے اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں کیا ۔ سر کاٹنے اسے تشہیر کرنے اور لاش کو سولی دینے کی روایتیں قطعاً غلط سبائی سانچے میں ڈھلی ہوئی سراپا کذب و دروغ کہانیاں ہیں ۔ جن کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ حجاجؒ کے خوف کی وجہ سے خاموش رہے ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انہیں حجاجؒ کا خوف ہو سکتا تھا اسی طرح حجاج بھی ان سے خائف ہو سکتے تھے ۔ اندرون لشکر اگر دس ہزار میں سے ۲ ہزار آدمی بھی تلواریں سونت لیتے تو حجاجؒ کے لئے لینے کے دینے پڑ جاتے ۔ وہ ایک مدبر اور ذہین شخص تھے ۔ ان حالات میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے تھے ۔ جس سے ان امان حاصل کرنے والوں میں اشتعال پیدا ہو ۔ اول تو پر کاہ کے برابر بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حجاجؒ کی نیت حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کی توہین کرنے کی تھی ۔ لیکن بالفرض کفرض المحال ۔ ان کی نیت بھی ہوتی تو بھی وہ اس پر عمل تو کجا اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ کیونکہ اس صورت میں امان لینے والوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا ۔ یہی نہیں بلکہ اس صورت میں خود ان کا لشکر ان کے خلاف ہو جاتا ۔ وہ صرف محاصرے کے لئے آئے تھے ۔ انہیں قتل کرنے نہیں آئے تھے ۔

چہارم :۔ خود حجاجؒ کا لشکر حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا معتقد ان کی عظمت ' اور ان کے

مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا قائل تھا۔ اسی لئے اس نے کسی موقع پر بھی ان سے مقابلے کی جسارت نہیں کی۔ انہیں دیکھ کر سب محاصرے کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ صرف ہاتھ پاؤں' سے غیر مسلح تصادم کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اور محاصرہ کرنے والوں نے ان کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اس لشکر کے ایک سردار طارق نے حضرت ابن زبیرؓ کی لاش کے پاس کھڑے ہوکر حجاجؒ کے سامنے کہا کہ "کسی عورت نے اس سے زیادہ جوانمرد نہیں جنا ہے"۔ (۱) خود حجاجؒ بھی حضرت ابن زبیرؓ کی عظمت اور ان کی ولایت کے قائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے فتح کے بعد جو تقریر کی اس میں حضرت ابن زبیرؓ کو "من خیار الناس" (بہترین لوگوں میں سے ایک) کہا ہے۔ ایسے لوگوں کا آں محترم کی لاش کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنا بالکل بعید از قیاس و عقل ہے۔

مودودی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ حجاجؒ مرحوم کے خلاف بعض بزرگ ہستیوں کے اقوال نقل کئے ہیں کہ:

> "مشہور امام قرات عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ "اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی جس کا ارتکاب اس شخص نے نہ کیا ہو"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ: "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاجؒ کو پیش کر کے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں۔" ص ۱۸۵ و ص ۱۸۶

اسی طرح موصوف نے ذم حجاجؒ میں امام شعبی کا قول بھی نقل کیا ہے۔

○ تبصرہ:۔ شیعوں اور ان کے ساتھ تحریک شیعیت میں شرکت کرنے والے علویوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ارجاف کا اتنا اثر ہوا کہ بنو امیہ کی مذمت کرنا اور ان کے خلفاء و عمال کو ظالم و جابر کہنا فیشن میں داخل ہوگیا۔ خصوصیت کے ساتھ حجاجؒ مرحوم کی مذمت تو ہر وہ شخص واجب و لازم سمجھتا ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق کچھ لکھتا ہے۔ یا تقریر کرتا ہے۔ مودودی صاحب جو نسلی تعصب جاہلی سے مغلوب تھے اس تبرا بازی سے کیسے باز رہ سکتے تھے۔ اس تبرا بازی سے اس قسم کے لوگوں کو یا دوسرے مسلمانوں کو فائدہ تو کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ ہاں غیبت بلکہ بہتان کا گناہ ہوتا ہے۔ اور ناواقف مسلمانوں کو یہ نقصان پہنچتا

---

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸ ص ۳۳۱

ہے ۔ کہ انہیں اپنی تاریخ کے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور ان کے اس قابل تحسین جذبہ فخر کو ٹھیس لگتی ہے جو اپنی درخشاں اور شاندار تاریخ پر ان کے دلوں میں موجزن ہے اور جو ہر طرح صحیح اور بجا ہے ۔

بنو امیہ اور حجاجؒ مرحوم کی مذمت میں جن لوگوں کے اقوال مودودی صاحب نے نقل کئے ہیں ' اگر ان کی طرف ان اقوال و بیانات کی نسبت صحیح ہے تو ایک عام مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ کیا یہ بزرگان سلف بھی " تبرا بازی " کے خوگر تھے ؟ اور کیا یہ حضرات غیبت و بہتان کو " تقویٰ " کے منافی نہیں سمجھتے تھے ۔ ؟

اگر یہ بدگوئی کسی شرعی مصلحت و ضرورت کی بناء پر تھی تو وہ معلوم ہونا چاہئے بظاہر تو کوئی مصلحت نظر نہیں آتی ۔ عاصم بن ابی النجود نے مبینہ طور پر جس زمانہ میں حجاجؒ کی غیبت یا ان پر بہتان باندھنے کا ارتکاب کیا ہے اس وقت خلافت امویہ کو زوال ہو چکا تھا ۔ پھر ان کی مذمت کرنے سے کیا فائدہ تھا ؟

ان کے بعد سب سے زیادہ شدت کے ساتھ خلافت اور حجاجؒ کی مذمت کرنے والے مبینہ طور پر عمر بنؒ عبدالعزیز ہیں ۔ یہ امیر المومنین عبدالملکؒ کے زمانہ میں جوان تھے ۔ حجاجؒ کا دور ان کے سامنے گذرا ۔ خاندان میں ان کا اتنا اثر تھا کہ ہشامؒ نے انہیں اپنا ولی عہد بنایا ۔ یہ اپنے زہد و تقویٰ میں ممتاز و معروف ہیں ۔ ہر مسلمان ان سے پوچھ سکتا ہے کہ حضرت اس دوران آپ کیا کرتے رہے ؟ آپ کا منصب تو یہ تھا کہ آپ اس گریہ و بکا اور مشق تبرا کے بجائے حجاجؒ پر علی الاعلان نکیر کرتے ' امیر المومنین عبدالملک سے ان کی شکایت کرکے انہیں معزول کراتے ' یہ سب آپ کرسکتے تھے مگر انسداد ظلم کے لئے آپ نے یہ کیوں نہ کیا ؟ خلافت امویہ ' اور حجاجؒ کے مخالفین حضرت حسنؒ بصری کا جو طرز عمل ان کے متعلق دکھایا ہے وہ عجیب و غریب ہے ۔ ایک طرف وہ حجاجؒ اور اموی خلافت پر تبرا بھیجتے ہیں اور دوسری طرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے گریز کرنے کے ساتھ خلافت بنی امیہ کی امداد و اعانت بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت کچلنے میں اس کے مددگار بن جاتے ہیں ۔ امام شعبی کا مسئلہ بھی تقریباً اسی نوعیت کا ہے ۔ ان کا انتقال بعمر اسیؒ سال پہلی صدی ہجری گذرنے کے بعد ہوا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حجاجؒ اور عبدالملکؒ کا زمانہ پایا ہے ۔ اور ان ادوار میں وہ عاقل بالغ تھے ۔ پھر انہوں نے حجاجؒ اور عبدالملک پر نکیر کیوں نہیں کی ؟ ان کی پوزیشن اس قدر اونچی تھی کہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے سے پیشتر حجاجؒ اور عبدالملک کو بھی سوچنا پڑتا ۔

اور تا بہ امکان وہ انہیں کوئی نقصان یا تکلیف پہنچانے سے گریز کرتے ۔ تبرا پڑھنے کے بجائے ان دونوں صاحبان کو تو چاہئے تھا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ۔ اور قولاً و عملاً ہر طرح ظلم بند کرنے کی کوشش کرتے ۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کیا ۔ اگر کیا ہوتا تو ثابت ہوتا ۔

مختصر یہ کہ جن بزرگان ملت کی زبان سے مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب علماء و مورخین ' حجاجؒ اور خلفاء بنی امیہ کی مذمت نقل کرتے ہیں ۔ اور انہیں ظالم و جابر کہلواتے ہیں ۔ ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے حجاجؒ یا عبدالملک پر یا کسی دوسرے خلیفہ پر اس کے مبینہ ظلم و جور یا فسق و فجور کے بارے میں نکیر کی ہو ۔ یا انہیں ظلم و معصیت سے باز رہنے کی نصیحت کی ہو ۔ بلکہ عموماً یہ حضرات حجاجؒ و عبدالملکؒ اور دوسرے عمال و خلفاء بنی امیہ سے مالی امداد حاصل کرتے تھے ۔ پھر ایسے حضرات کی بات پر کیسے اعتبار و اعتماد کیا جائے ؟

جس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ حضرات بخوف حجاج حق بات کہنے اور مظلوموں کی حمایت و نصرت کرنے سے باز رہے ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاحبان حجاجؒ اور عبدالملکؒ کے خلاف یہ تبرا بخوف عوام کرتے ہوں ۔ چونکہ شیعوں اور عباسیوں کے ایجنٹوں نے خلافت بنی امیہ کے خلاف غلط باتوں اور بے بنیاد الزاموں کی تشہیر بہت زیادہ کی تھی ' اس لئے عوام کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا تھا ۔ اس طبقہ کے خوف کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے ضمیر اور حقیقت واقعہ کے خلاف یہ تبرا بازی کی ہو ۔ کیا یہ ممکن نہیں ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟ جب یہ ناممکن ہے تو ان کے اقوال مذکورہ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال قطعاً ساقط الاعتبار کیے جائیں گے ۔

یہ گفتگو تو ہم نے یہ فرض کر کے تھی کہ یہ اقوال اور ان کے امثال جو مذکورہ بالا یا ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں انہیں کے اقوال ہیں اور ان سے ثابت ہیں ۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی قطعاً غلط ہے ۔ یہ ان حضرات کے اقوال و آراء قطعاً نہیں ہیں ۔ بلکہ سبائیوں اور تحریک شیعیت کے حامیوں کے وضع کئے ہوئے اور گڑھے ہوئے جملے ہیں ' جو ان کذابوں نے ان بزرگوں اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کردیئے ہیں ۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہے ۔ یہ حضرات ان اقوال و آراء سے بالکل بری ہیں ۔ اگر درحقیقت یہ ان حضرات کے اقوال ہوتے تو یقیناً یہ حضرات حجاجؒ اور عبدالملک ' پر ضرور نکیر کرتے ۔ یہ مداہنت کرنے والے لوگ نہیں تھے ۔ اور اگر

یہ حضرات نکیر کرتے تو یہ بات شہرت کے ساتھ منقول ہوتی ۔ نیز یہ کہ اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے اور اس کا رد عمل یقیناً واضح ہوتا حالانکہ تاریخ ان سب امور کے بارے میں بالکل ساکت ہے ۔ جن ظالموں کو احادیث وضع کرکے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی وہ اگر حسن بصری و امام شعبی و امثالھم پر افتراء کریں اور ان کی طرف اپنے اقوال کاذبہ منسوب کردیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟ اگر بطور فرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ان بزرگوں نے واقعی جناب حجاجؒ رحمہ اللہ کی مذمت کی ہے اور انہیں ظالم کہا ہے تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کے اقوال مذکورہ کو صحیح سمجھ لیں ۔ اجتماعی نفسیات کے اس اصول کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ علماء اور صوفیاء ' علمی ذوق اور علم میں انہماک رکھنے والے لوگ پروپیگنڈے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عوام سے بھی زیادہ اس معاملے میں کمزور ہوتے ہیں ۔ وہ علماء صلحاء اس سے متاثر نہیں ہوتے یا کم متاثر ہوتے ہیں جو علمی مشغلہ کے ساتھ کچھ دنیاوی اور معاملاتی امور سے بھی تعلق رکھتے ہیں اس اصول کے پیش نظر اگر مذکورہ بالا بزرگوں نے سبائیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر اس قسم کی باتیں کہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ لیکن ان کے اقوال کو سند نہیں بنایا جاسکتا بلکہ اسے ان کی نادانستہ غلط بیانی کہا جائے گا ۔ جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا ۔ خواہ دانستہ بولا جائے یا نادانستہ ۔ ان کے ان اقوال کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا ۔ خصوصاً جبکہ دوسرے جلیل القدر علماء حجاجؒ مرحوم کی تعریف کررہے ہوں ۔ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے ۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں بقول مخالفین بنی امیہ یہ مذموم واقعات پیش آئے تھے ' اس میں صحابہ کرامؓ معتدبہ تعداد میں موجود تھے ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ایسے جلیل القدر اور امتیازی شان رکھنے والے صحابیؓ تو حجاجؒ کے ساتھ مکہ معظمہ ہی میں موجود تھے ۔ اور حجاجؒ ایک حیثیت سے ان کے تابع بھی تھے ۔ ان کے علاوہ حضرت ابو ثعلبہؓ بن جرہم خشنی ' متوفی ۷۵ ھ دمشق میں مقیم تھے جو اموی خلافت کا پایہ تخت تھا ۔ یہ بزرگ بیعت رضوان میں شریک تھے ۔ حضرت سوید بن غفلہ متوفی ۸۰ ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے ۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری شریک بیعت عقبہ تھے ۔ مدینہ منورہ میں رہتے تھے ۔ ۷۸ ھ میں وفات پائی ۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ یہ چند اسماء گرامی بطور مثال پیش کردیئے گئے ۔ ورنہ اس زمانہ میں جو صحابہؓ کرام موجود تھے ان کی تعداد اس سے زائد ہے ۔ صحابہ کرامؓ کا ایک وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ " امر بالمعروف و نہی

عن المنکر" کے خوگر ہیں ۔ اگر دشمنان بنی امیہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ حجاجؒ و عبدالملک" بہت ظالم تھے ۔ اور اموی خلافت سے عناد رکھنے والوں نے جو الزام ان پر لگائے ہیں ان میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے تو ان صحابہ کرام" نے ان پر کوئی نکیر کیوں نہ فرمائی ؟ اگر نکیر فرمائی ہوتی تو یقیناً شہرت کے ساتھ منقول ہوتی ۔ حالانکہ تاریخ میں اس قسم کی بات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا ۔ اس سے روز روشن کی طرح روشن ہوجاتا ہے کہ شیعوں اور شیعیت نواز سنی نما لوگوں نے جو اعتراضات حجاجؒ و عبدالملک" پر کئے ہیں ۔ وہ بالکل غلط بے بنیاد ' اور خالص جھوٹ ہیں ۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جو اوصاف حسنہ بیان فرمائے ہیں ' ان کا ان حضرات میں پایا جانا قطعی اور یقینی ہے ۔ اور ان حضرات کا کسی وقت بھی ان میں سے کسی وصف سے خالی اور محروم ہونا قطعاً غیر ممکن اور محال ہے ۔ سنیت کے مدعی مخالفین خلافت بنی امیہ کی ذمہ داری ہے کہ اس سوال کا جواب دیں ۔ لیکن میں پورے وثوق ویقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ قیامت تک اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے ۔

تیسرا سوال بھی ایسا ہی ہے جس کا کوئی جواب بنی امیہ کے ان مخالفین کے پاس نہیں ہے اور وہ اس کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے ۔ سوال یہ ہے کہ الصادق الامین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد " خیر القرون قرنی " الحدیث کے کے بموجب خلیفتہ المسلمین عبدالملک اور حجاجؒ مرحوم کا زمانہ قرن صحابہ" ہونے کی بناء پر " خیر القرون " کے حدود میں داخل تھا ۔ اگر ان معاندین و مخالفین خلافت امویہ کے زیر گفتگو بیانات صحیح اور مطابق واقع ہیں تو اس " قرن " کو " خیر القرون " میں کیسے داخل سمجھا جاسکتا ہے ۔ ایک مومن کا فیصلہ یقیناً یہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سچی اور سراپا صدق ہے ۔ یہ مورخین و معاندین یقیناً جھوٹے ہیں ۔ اور حجاجؒ و عبدالملک" کے اوپر جو الزام انہوں نے لگائے ہیں وہ سب غلط ہیں ۔ اس حدیث شریف نے ان مسائل کا دوٹوک فیصلہ کردیا ۔ کسی مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا جو اس حدیث کے خلاف ہو قطعاً حرام اور تقاضائے ایمان کے خلاف ہے ۔ اموی خلافت کے زوال کے بعد عبدالملک" اور حجاجؒ کے بارے میں اموی و عباسی دور کے علماء ربانیین نے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اور جس طرح ان کی تعریف کی ہے وہ انشاء اللہ چند صفحات کے بعد قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے ۔

بحث کی طوالت ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گذرے ۔ لیکن میرا عذر یہ ہے

کہ شیعوں اور شیعیت نوازوں نے اس دور کے بارے میں جھوٹے قصے کہانیوں ' کو اس قدر شہرت دی ہے کہ حجاجؒ مرحوم کو ظالم کہنا ' فیشن میں داخل ہو گیا ہے ۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مضامین نظر سے گذرے جو حجاجؒ اور عبدالملک کے کارناموں اوؒر ان کے دینی خدمات کے تذکرے کے لئے لکھے گئے تھے ۔ مگر ان میں بھی مضمون نگار نے حجاجؒ کے تذکرہ میں یہ لکھنا ضروری سمجھا " مگر وہ بہت ظالم تھا " ۔ اس طرح اچھے اچھے صلحاء بھی بہتان طرازی کے گناہ میں سبائیوں اور سبائیت نوازوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرتے ہیں ۔ ایسے لوگ اگر حق پسند ہوں تو انشاء اللہ اس بحث کو پڑھنے سے ان کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ اپنی غلطی سے توبہ کریں گے اور بہتان کے گناہ سے محفوظ رہیں گے ۔ اس تطویل کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے یہود اور مسیحی متشرقین اور اب بعض ہنود بھی اس دور کے مبینہ غلط قصوں کو پیش کرکے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ " نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت تقریباً بے اثر رہی ۔ اور اسلام عملاً چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہا" ۔ اس بحث سے اس غلط اور بے بنیاد اعتراض کو بھی دفع کرنا منظور ہے ۔

تیسرے یہ کہ ہماری درخشاں تاریخ پر جو سیاہی ' سبائی منافقین اور یہود نے پھیری ہے اسے دیکھ کر اور حقیقت حال سے بے خبر رہ کر ہماری نئی نسل خصوصاً جو یورپ و امریکہ سے متاثر ہے ' قومی خود حقارتی کے مہلک مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے ۔ اس کا سدباب اور اس مرض کا علاج مقصود ہے ۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم میں ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو دین اسلام اور شریعت اسلامیہ کو بحالات موجودہ ناقابل عمل قرار دیتا ہے اور اس کی دلیل میں سبائیوں کے وضع کئے ہوئے ان جھوٹے قصوں کو پیش کرتا ہے جو خیر القرون کے ایک حصے میں بھی اسے ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قول :۔ " خیر القرون قرنی " الخ کو شیعہ اور ان کے معلم یہود معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ ہماری اس بحث کا ایک اہم مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ بلاشبہ **الصادق الامین سید المرسلین علیہ افضل الصلوات و التسلیم** کا قول بالکل سچا ' بلکہ سراپا صدق اور سچائی ہے ۔ کذابوں کی ہرزہ سرائیوں سے حقائق نہیں بدل سکتے ان اکاذیب و بہتانات کو پیروں سے روند کر پھینک دو پھر دیکھو تو نبی کریم **علیہ افضل الصلوات والتسلیم** کے قول مذکور کی صداقت روز روشن کی طرح روشن نظر آئے گی ۔

مسلمانوں کی ان دو جماعتوں کی اس کشمکش میں جسے علماء نے " فتنہ " کے لفظ سے تعبیر

کیا ہے ' یہ واقعہ قابل توجہ ہے کہ کئی ماہ کی اس کشمکش میں فریقین نے حدود شرعیہ سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ حرم کی حرمت کا دونوں نے پورا پورا لحاظ کیا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے ؟ اس کی کوئی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کرسکتی اگر کعبہ شریف پر سنگ باری یا آتش باری ' یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مسجد حرام کے اندر قتل کرنے کی روایتوں میں سچائی کا شائبہ بھی ہوتا تو محاصرہ اتنے دن نہ جاری رہتا۔ بلکہ جب حضرت موصوف کے تقریباً دس ہزار رفقاء انہیں خیرباد کہہ چکے تھے اسی وقت آں محترم کو قتل کردیا جاتا۔ ان کا قتل کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ اگر تلوار سے نہیں تو تیروں سے کام لے کر انہیں قتل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور اسی وجہ سے نہیں ہوا کہ آں محترم کی طرح ان کے مخالفین بھی حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور احترام حرم کی رعایت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ حضرت ابن زبیرؓ کی جان کے دشمن نہیں تھے۔ ان کی آستیں حضرت ابن زبیرؓ کے خون سے پاک ہے۔ انہوں نے آں محترم کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ کسی شقی سبائی نے ان کے سر پر اینٹ مار کر انہیں شہید کیا تھا۔

اس بحث میں طوالت بیان کا چوتھا سبب زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ چند سال سے پاکستان میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ نفاذ شریعت کی کیا صورت اختیار کی جائے ؟ غالب اکثریت کی رائے ہے کہ فقہ حنفی کو قوانین کا ماخذ بنایا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جملہ مکاتب فقہیہ کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ یہ سطریں ۱۴۱۰ھ ۱۹۹۰ء میں لکھ رہا ہوں۔ نفاذ شریعت کی منزل تو ابھی بہت دور نظر آتی ہے۔ یہ بحث بھی اب ختم ہوچکی ہے یا دب گئی ہے۔ مگر اس بحث کے دوران ہماری قوم یعنی اہل سنت ہی کے ایک معتدبہ گروہ نے برملا کہا اور لکھا کہ فقہ حنفی و مالکی وغیرہ جو مدون ہوئے ان میں ان ادوار کے حکمرانوں (خلفاء و امراء) کی ذاتی و سیاسی مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے اور احکام شرعیہ کو ان کے مصالحے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے علماء اور قانون داں مل کر نئے سرے سے اجتہاد کریں ' اور کتاب و سنت سے قوانین کا استنباط کریں۔ " یہ گروہ جسے اس وقت عرفاً دانش ور کہا جاتا ہے۔ وہ ہے جو انگریزی دان ' اور موجودہ قانون کا ماہر ' اس کے ساتھ عربی دان بھی ہے۔ اور فقہ اسلامی نیز تاریخ اسلام پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے۔ فقہ اسلامی اور فقہاء اسلام کے متعلق ان کی مذکورہ بالا رائے تو بالکل غلط ہے ' لیکن قابل توجہ چیز یہ ہے کہ وہ اس گمراہی میں مبتلا کیوں ہوئے ؟ اور ان کی رائے کا سبب کیا ہے ؟

سبب ظاہر ہے۔ ان کا یہ مرض مطالعہ تاریخ کا اثر ہے۔ سبائیوں نے جو جھوٹ، افتراء اور بہتانوں کے انبار ہماری تاریخ میں لگائے ہیں۔ ان کے سڑنے سے اس مہلک مرض کے جراثیم پیدا ہوئے جن سے ہماری قوم کا ایک اچھا خاصا طبقہ متاثر ہوا اور ہو رہا ہے۔

اس بحث کو طول دینے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہےکہ وہ حضرات جو روافض اور رفض نواز لوگوں کی کورانہ تقلید میں یا اپنی ذاتی سیاسی یا غیر سیاسی غرض کے لئے، یا نسلی تعصب یا حسد کی بنا پر خلفاء بنی امیہ و بنی عباس، اور ان کے عمال و اعوان خصوصاً حجاجؒ مرحوم کو ظالم و جابر کہنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے محاسن کو چھپاتے ہیں۔ ان کی تعریف کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جو شخص جھوٹے الزاموں سے ان کی برات ثابت کرتا ہے اسے خارجی کہنے لگتے ہیں ذرا سوچیں کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں باز پرس کا کس خطرہ ہے۔

خاتمہ بحث پر اس واقعہ کا اظہار کردینا بھی ضروری اور مفید ہے کہ شیعوں اور شیعہ نوازوں نے اس سلسلہ میں بکثرت روایتیں وضع کی تھیں۔ یہاں تک کہ حدیث کے نام سے بھی متعدد کہانیاں وضع کرلیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء پردازی کرتے ہوئے بھی انہیں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہوا۔ ان روایتوں، اور نام نہاد حدیثوں میں سے بعض حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی ستائش اور بنو امیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں ہیں۔ اور بعض خود حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی مذمت میں ہیں۔

اس قسم کے روایات اور نام نہاد احادیث میں سے بعض پر حافظ ابن کثیرؒ نے تنقید کی ہے اور ان کا باطل و موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ بعض کو بلا تبصرہ اس لئے ذکر کردیا ہے کہ ان کا موضوع، جعلی، اور غلط ہونا ان کے مضمون یا اسلوب بیان کی رکاکت کی وجہ سے ایسا ظاہر ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ حاصل یہ کہ اس قسم کی سب روایتیں اور نام نہاد احادیث جو بنو امیہ یا حجاجؒ کی مذمت میں یا خلاف واقعہ حکایات، یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تنقیص پر مشتمل ہیں، قطعاً باطل موضوع اور جعلی ہیں۔ یہ سب شیعوں، اور شیعہ نواز مورخوں اور راویوں یا سبائیوں کے ایجنٹوں کے کارخانہ دروغ بافی میں ڈھالی ہوئی کہانیاں، اور افتراء پردازیاں ہیں جو سبائی فن تشہیر کا نمونہ ہیں۔ ان بے اصل جھوٹی روایتوں اور ان نام نہاد حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔

تنبیہہ :۔ عبدالملکؒ اور حجاجؒ کے ساتھ لڑائی ہونے سے پہلے حضرت عبداللہ بن

زبیرؓ اور امیر یزیدؒ کے درمیان معرکہ آرائی ہو چکی تھی ۔ حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ امیر یزیدؒ کی طرف سے اس فوج کے سپہ سالار تھے جو مکہ معظمہ کی طرف حضرت ابن زبیرؓ کے خلاف بھیجی گئی تھی ۔ شیعہ افواہ بازوں اور مورخوں نیز نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریضوں نے ان واقعات کے متعلق بھی پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے ۔ سنگ باری آتش باری وغیرہ کے جھوٹے الزام امیر یزید مرحوم کے فرستادہ لشکر پر بھی لگائے ہیں ۔ ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بھی غلط اور سراپا کذب و بہتان الزام ہیں ۔ ہماری مذکورہ بالا بحث اور تحقیق ان کو بھی باطل اور غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے ۔ جن کذابوں نے حجاجؒ مرحوم اور عبدالملک مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان باندھے ہیں انہیں نے امیر یزید مرحوم اور حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر پر بھی بہتان باندھے ہیں اور ان سب پر جھوٹے اتہامات لگائے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مسلم بن عقبہؓ اور حضرت ابن زبیرؓ کے درمیان کوئی جنگ حرم مکہ کے اندر نہیں ہوئی ۔ انہوں نے بھی صرف محاصرہ کیا تھا ۔ دونوں فوجوں میں جو معمولی سی لڑائی ہوئی وہ حرم کے باہر ہوئی ۔ احترام حرم کا پاس و لحاظ فریقین کرتے رہے ۔ طبری وغیرہ تاریخوں میں جو سنگ باری وغیرہ کے قصے اس حادثہ کے متعلق ملتے ہیں وہ سب روافض اور والضیت نوازوں کے گڑھے ہوئے ' بے اصل و بے بنیاد جھوٹے قصے ہیں ۔ ہماری بحث مذکور سے یہ حقیقت خوب روشن ہو جاتی ہے ۔ ذرا غور کی ضرورت ہے ۔

جنگ مذکور کے اسباب

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور دو اموی خلفاء کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی اس کے اسباب کیا ہوئے ؟ اس کی تفصیل مورخ کا کام ہے ۔ اظہار حقیقت تاریخ کی کتاب نہیں ۔ اس کا پہلا مقصد تو درحقیقت اصلاح عقائد ہے ۔ اس لئے ہم تفصیل کو نظر نداز کر کے صرف اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو اس خلفشار ' اور باہمی منازعت و تفرقہ کا حقیقی سبب بنا ۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس سوء ظن کو دور کیا جائے جو مورخین کے غلط اور نامناسب اسلوب بیان اور سبائیوں کے وضع کئے ہوئے جھوٹے قصص و روایات کی وجہ سے متعلق افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے ۔

پہلی بات کے متعلق ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ دونوں لڑائیاں سراسر شیعوں اور شیعت نوازوں کی ریشہ دوانیوں بسیسہ کاریوں ' اور فتنہ پردازیوں کا نتیجہ تھیں ۔ ورنہ دو فریقوں کا وجود ہی نہ ہوتا اور ان کے درمیان کسی جنگ کا تصور ہی نہ کیا جا سکتا ۔ اختصار

کے ساتھ اس کی توضیح یہ ہے کہ شیعوں نے جو تقیہ کرکے دمشق میں بھی جمع ہوگئے تھے۔ عبداللہ بن مطیع کو اپنا آلہ کار بنایا ' انہوں نے نیز بعض دوسرے تقیہ باز سبائیوں اور سبائیوں کے ایجنٹوں نے حضرت ابن زبیرؓ کو یہ باور کرادیا کہ امیریزید فاسق و فاجر ہیں ' ملت ان سے بیزار ہے۔ صالحین قوم کسی ایسی اولوالعزم شخصیت کے خروج کے منتظر ہیں جو اصلاح حال کے امیریزید پر سختی کے ساتھ نکیر کرے۔ اگر وہ نہ مانیں تو بزور قوت انہیں معزول کردے۔ نیز انہیں یہ باور کرایا کہ قوم کی نظریں آپ کی طرف ہیں۔ اور وہ آپ کو **خلیفۃ المسلمین** بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری طرف امیرالمومنین کے کان بھرتے رہے اور انہیں یہ باور کرایا کہ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ جاہ اقتدار کے طالب ' خلافت کے خواہاں اور آمادہ بغاوت ہیں۔ ان دونوں کو ورغلا کر ان سبائی منافقین نے دونوں کی فوجوں کو آمنے سامنے صف آراء کردیا۔ امیریزید کی خلافت کے زمانہ میں پورا عالم اسلامی ایک مرکز پر مجتمع ہوگیا تھا۔ یہ چیز شیعوں اور یہود کے لئے سوہان روح تھی۔ امیریزیدؒ کے تدبر اور ان کی دانشمندی اور اعلیٰ صلاحیت حکمرانی (STATES MANSHIP) کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ امت میں خلفشار پیدا کرنے کی شیعی اور یہودی مساعی کے باوجود انہوں نے امت کو ایک مرکز پر مجتمع رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد روافض اور ان کے آلہ کار رافضی نوازوں ' نیز یہود کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ و علانیہ دسیسہ کاریوں اور فساد انگیزیوں کی وجہ سے عالم اسلامی میں سخت خلفشار ' اور لا مرکزیت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "تین ماہ تک عالم اسلامی بغیر کسی امام اور خلیفہ کے رہا" (۱) اس لا مرکزیت اور افراتفری کے عالم میں اہل حجاز نے حضرت ابن زبیرؓ سے بیعت کرلی اور شام کے لوگوں نے حضرت مروان سے بیعت کرکے انہیں خلیفہ منتخب کرلیا۔ بیعت دونوں میں سے کس سے پہلے کی گئی اور کس سے بعد کو؟ اس کا کوئی قطعی جواب نہیں مل سکا۔ سبائیوں نے فساد پیدا کرنے کے لئے اسے اور مبہم بنادیا۔

ان شیعہ مفسدین کے دو گروہ ہوگئے اور آپس میں صلاح و مشورہ کرکے دونوں طرف پہنچ گئے۔ ایک گروہ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو باور کرادیا کہ ان کی بیعت پہلی ہے۔ اس لئے حضرت مروانؓ اور ان کے جانشین عبدالملکؒ باغی ہیں اور حفاظت خلافت کے لئے ان سے قتال و جدال کرنا واجب ہے۔

دوسری طرف دوسرے گروہ نے حضرت مروانؓ اور عبدالملکؒ کو اسی طرح اولیت کا

---

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۸۔ ص ۲۳۹

یقین دلا کر بغاوت فرو کرنے اور اس کے لئے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ مفسد منافقین ان صالح مسلمانوں کے دو ایسے گروہوں کو میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لے آئے جو اپنے مسلمان بھائیوں سے قطعاً جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق یہ سوء ظن کرنا کہ انہوں نے جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لئے جنگ کی سخت غلطی ہے۔ آں محترم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ اس ورطہ میں مبتلا نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر وقتی طور پر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس کی بقاء غیر ممکن تھی کیونکہ پوری جماعت صحابہؓ کا ایک خاص وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ

وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (آل عمران : ۱۳۵)

"وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جانتے ہوں"

صحابہ کرام معصوم نہیں تھے۔ معصیت کا صدور ان سے بھی ممکن تھا، مگر کسی معصیت کا عادی ہوجانا، یا اسے بار بار دہرانا، ان کے لئے غیر ممکن تھا۔ جنگ و جدل کا سلسلہ خاصی مدت تک جاری رہا۔ اگر اس کا محرک جذبہ حب جاہ و اقتدار ہوتا تو اتنے دن اس کی بقاء کا شمار "اصرار علی المعصیۃ" میں ہوتا۔ جس کا صدور ان سے ازروئے قرآن کریم غیر ممکن اور محال تھا۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخلص تھے۔ اور انہوں نے اپنے اجتہاد کے بموجب اتباع شریعت ہی کے لئے جنگ کی۔

ان کے مقابلہ میں عبدالملکؒ تھے۔ وہ اگرچہ صحابی نہیں ہیں مگر ان کی پوزیشن بھی ازروئے شریعت اور دستور اسلامی مستحکم تھی۔ انہوں نے بھی اپنے اجتہاد کے بموجب خلوص کے ساتھ اتباع شریعت ہی کے لئے جنگ کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں حب جاہ و اقتدار کا مریض قرار دیں۔ وہ صحابی نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے اس کی قطعی نفی کی تو کوئی دلیل شرعی ہمارے پاس نہیں۔ لیکن ازروئے شریعت اسلامیہ و دستور اسلامی ان کا موقف بھی مستحکم تھا۔ اور جس طرح حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لئے حفاظت خلافت اور بغاوت ختم کرنے کے لئے قتال و جدال شرعاً جائز تھا۔ اسی طرح ان کے لئے بھی جائز تھا۔ دونوں کے اجتہادوں میں سے کس کا اجتہاد صحیح تھا؟ اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اور اب اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جب تک کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک ان کی نیت پر بھی شبہ کرنا جائز نہیں۔ انہیں بھی مخلص ہی کہا جائے گا۔ اختلاف اجتہاد کی وجہ سے جدال و قتال ہوجانا۔ کوئی عیب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ طاعت ہی تھی معصیت

نہیں تھی ۔ اپنے اخلاص کی وجہ سے ابن زبیرؓ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے ۔

حضرت مروان ' اور حضرت مسلم بن عقبہ رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی یہی تقریر کافی ہے ۔ یہ حضرات بھی مخلص تھے اور اپنے مخلصانہ عمل میں ماجور ہوئے ۔ فریق مقابل کے مقابلے میں یہ حضرات دلیل شرعی کی بناء پر خود کو حق پر سمجھتے تھے ۔ اور فریق مقابل کو اسی دلیل کی بناء پر برسرباطل جانتے تھے ۔ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے ان کی رائے صحیح تھی یا غلط ؟ اس سے بحث نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ ان کی نیت کی بناء پر ہوگا ۔ اپنی دانست میں انہوں نے حکم شرعی پر عمل کیا ۔ اس لئے وہ گناہ گار نہیں ہوئے ۔ بلکہ ماجور ہوئے۔حرم شریف میں سنگ باری اور اس کے دوسرے متعلقات کی بحث تو ختم ہوئی ۔ اس کے ساتھ خلافت عادلہ امویہ کے اوپر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کی غلطی بھی ثابت ہوگئی ۔ یہ اعتراضات و الزام مخالفین بنی امیہ کے لئے مایہ ناز ہیں ۔ لیکن اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں نے دیکھ لیا کہ یہ صحت و حقیقت سے کس قدر دور ہیں ۔ اور صرف بغض و عناد اور حسد سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کی کوئی مستحکم اصل و بنیاد نہیں ۔ اسی بحث کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کے دوسرے غلط اعتراضات پر بھی نظر کرنا چاہئے ۔ انشاء اللہ ان کی غلطی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی ۔ اس کے پیش نظر ہم اس بحث کو بالکل ختم کردیتے لیکن سبائی دروغ بافی ' مغالطہ دہی اور سوء تعبیر کی ایک عجیب مثال پیش کئے بغیر اس بحث سے قلم روکنے کو جی نہیں چاہتا ۔ یہ مثال ایسی ہے جس میں سبائی آرٹ خوب نمایاں ہے ۔ مگر باوجود اس کے بڑے بڑے محققین اور فضلاء اس دام فریب میں گرفتار نظر آتے ہیں ۔ اسی پہلو کے پیش نظر ہم نے اسے عجیب مثال کہا ہے ۔ مخالفین خلفاء بنی امیہ کا مشہور اعتراض ہے کہ " بعض اموی افراد نے جوخلیفۃ المسلمین ہشام رحمہ اللہ سے قرابت رکھتے تھے بعض ذمیوں کی زمینیں غصب کرلی تھیں ۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو ان اہل ذمہ نے موصوف سے فریاد کی ۔ اور موصوف ایک دن خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے تو خطبہ سے فراغت سے قبل ان سب زمینوں کے متعلق اہل ذمہ کے حق میں فیصلہ کردیا ۔ اور بنی امیہ کے ان افراد کو جو ان کی نظر میں غاصب و ظالم ٹھہرے تھے ' اراضی مذکور مالکان کو واپس کرنے کا حکم دیدیا " ۔ دشمنان خلافت بنی امیہ اس قصے کو عمر بنؒ عبدالعزیز کی منقبت اور بنو امیہ کے منقصت یعنی ان کے ظلم و جور کو ثابت کرنے کے لئے بیان کیا کرتے ہیں ۔

اصل واقعہ

مندرجہ بالا قصہ سبائی فن دروغ گوئی اور مسخ حقائق کا ایک شاہکار ہے۔ پورا قصہ بالکل غلط اور کذب خالص ہے۔ اصل واقعہ کی تعبیر اپنے طبع زاد عنوان و اسلوب سے کرکے بنی امیہ پر بہتان طرازی کی گئی ہے۔ اصل واقعہ کیا تھا؟ اسے معلوم کرنے کے لئے بطور تمہید ایک مسئلہ شرعی کی مختصر وضاحت کرنا پڑے گی۔ جو درج ذیل ہے:۔

جب کوئی ملک فتح ہوکر اسلامی مملکت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پوری زمین مملکت (STATE) کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔ پھر اسلامی حکومت اسے مملکت کے باشندوں کو تقسیم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت جو قطعہ اراضی کسی شخص کو بطور تملیک دیدے تو وہ اس کی ذاتی ملک میں داخل ہوجاتا ہے۔ مفتوحہ زمیں میں " افتادہ " زمین بھی ہوتی ہے۔ جو غیر آباد ہوتی ہے۔ ایسی زمین کو فقہ کی اصطلاح میں " ارض موات " کہتے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ " مردہ زمین " کیا جاسکتا ہے۔ انہیں " موات " (مردہ) ۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اور یہ خالی پڑی ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامیہ ایسی زمینوں کو" احیاء " یعنی انہیں آباد کرنا چاہتی ہے تو اس کے قطعات کرکے اس کے طلب گاروں کو آباد کرنے کے لئے تقسیم کردیتی ہے۔ آباد کرنے کا یہاں وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر مکان وغیرہ تعمیر کرنا' باغ لگانا کاشت کرنا یہ سب چیزیں آباد کرنے میں داخل ہیں۔ محل وقوع اور دوسرے امور کے اعتبار سے آباد کاری کا جو طریقہ مناسب ہو وہی اختیار کرنا ہوگا۔ اور حکومت کو اس کے متعین کرنے کا بھی اختیار ہے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر زمین لینے والا ایک مدت مقررہ کے اندر اس قطعہ زمین کو آباد نہ کرے تو حکومت کو اختیار ہے کہ اس سے وہ زمین واپس لے لے اور کسی دوسرے کو دیدے جو اس کا " احیاء " (آباد کاری) کرکے اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ طریقہ تقریباً ویسا ہی ہے جیسے کراچی میں کے۔ ڈی۔ اے۔ اور لکھنؤ میں امپرومنٹ ٹرسٹ کی طرف سے پلاٹ الاٹ کئے جاتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد مذکورہ بالا واقعہ کی حقیقت پر نظر کیجئے۔ یہ درحقیقت صرف " احیاء موات " کا معاملہ تھا۔ " غصب " اور " ظلم " سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بعض اموی حضرات نے حکومت سے " ارض موات " کے کچھ قطعات حاصل کئے' مگر یہ مدت معین کے اندر انہیں آباد نہ کرسکے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو کچھ ذی

ان زمینوں کے طالب ہوئے ۔ جنہوں نے ان کے " احیاء " (آباد کرنے) کا ارادہ ظاہر کیا ہوگا ۔ اموی خاندان کے نام جو ان کا الاٹمنٹ ہوا تھا اس میں بقاء ملک کے لئے ایک مدت معینہ کے اندر " احیاء " کی شرط تھی ۔ وہ شرط نہیں پوری ہوئی ۔ اس لئے امیر المومنین موصوف نے زمینیں امویوں سے واپس لے لیں اور ان اہل ذمہ کے نام الاٹ کردیں ۔ وہ زمینیں ان اہل ذمہ کی ملکیت نہیں تھیں ۔ اور نہ کبھی ان کے قبضے میں رہی تھیں ۔ وہ سب حکومت کی تھیں ۔ حکومت نے ایک سے واپس لے کر دوسرے کو عطا کردیں ۔ اس میں نہ کوئی غصب تھا اور نہ کوئی ظلم ہوا ۔ اسے " غصب " اور " ظلم " کہنا الزام تراشی اور بہتان طرازی کی بہت ہی مکروہ مثال ہے ۔ آج بھی بکثرت ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ شہر یا دیہات میں لوگ حکومت سے زمین پٹے پر لیتے ہیں ۔ اور اگر وہ ایک مقررہ مدت کے اندر آباد نہیں کرتے تو حکومت ان سے زمین واپس لے کر کسی دوسرے شخص کو الاٹ کردیتی ہے جو اس کا طالب ہوتا ہے ۔ کوئی سمجھ دار آدمی اسے غصب اور ظلم کا معاملہ نہیں سمجھتا اور نہ سمجھ سکتا ہے ۔ پھر زیر بحث معاملے میں بنی امیہ کو غصب اور ظلم کا مرتکب کیوں قرار دیا جاتا ہے ؟

یہ بات کہ یہ معاملہ صرف " احیاء موات " کا تھا غصب اور ظلم کا اس میں شائبہ بھی نہیں تھا مبینہ واقعہ میں معمولی غور کرنے سے واضح ہوجاتی ہے ۔ اگر اسے غصب اور ظلم کا معاملہ کہا جائے ' تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف مستغیث اور مدعی کا دعویٰ سن کر مدعی علیہم کا بیان اور جواب دعویٰ سنے بغیر مدعی کے حق میں فیصلہ کیسے کردیا ؟ یہ تو شرعاً وعقلاً ہر طرح ناجائز اور اصول عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے ۔ مدعی سچا تھا یا جھوٹا لیکن عمر عبدالعزیزؒ کی اس کاروائی کو تو شرعا وعقلاً ظلم اور نا انصافی ہی کہا جائے گا ۔ صحیح اور عادلانہ طریقہ تو یہ تھا کہ موصوف مدعیان کا دعویٰ سننے کے بعد مدعا علیہم کو بلا کر ان کا جواب دعویٰ طلب کرتے ۔ اگر وہ غصب کا اقرار کرتے اور مدعیان کا دعویٰ تسلیم کرلیتے تو زمین ان کے قبضہ سے نکال کر مدعی کو دیدیتے ۔ لیکن اگر وہ انکار کرتے تو مدعیان سے ان کے دعوے پر " بینہ " (ثبوت) طلب کرتے ۔ بصورت ثبوت ان کے حق میں فیصلہ کرتے ۔ عدم ثبوت کی صورت میں مدعا علیہم سے قسم لیتے ۔ اگر وہ قسم نہ کھاتے تو مدعی کے حق میں فیصلہ ہوتا ۔ بصورت قسم ان کے حق میں فیصلہ کرتے اور ان کا قبضہ برقرار رکھتے ۔ اسلامی عدالت کا یہی طریقہ کار (PROCIDURE) ہے ۔ بلکہ اب تو دنیا کی ہر عدالت میں یہی طریق اختیار کیا جاتا ہے ۔ اور اسے لازم سمجھا جاتا ہے ۔

اگر ہم زیر بحث معاملے کو غصب اور ظلم کا مقدمہ اور مناقشہ کہتے ہیں تو ہمیں ان زمیوں کے بجائے بنی امیہ کے افراد مشارالیہم کو مظلوم اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ظالم اور آداب و ضوابط قضاء و عدل سے ناواقف کہنا پڑے گا۔ ہم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو نہ تو ظالم و جابر کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ طریق عدل و قضاء سے جاہل' باعتبار علم و فہم و تقویٰ ان کی عظمت تسلیم شدہ واقعہ ہے۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں۔ کہ مخالفین بنی امیہ مورخین و علماء کا یہ بیان کہ زیر بحث واقعہ غصب کا معاملہ تھا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے جسے صداقت سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ پھر جب یہ غصب کا معاملہ نہیں تھا تو اسے "احیاء موات" ہی کا معاملہ سمجھنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی تیسری صورت معاملہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسا کوئی معاملہ جس میں "خصومت" ہو سکے اور حق تلفی و حق طلبی کا مسئلہ درپیش ہو فرض کرنے سے وہی محذور لازم آتا ہے جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اس واقعہ کا تعلق' "احیاء موات" سے سمجھا جائے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اسے غصب اور ظلم کہنا بنی امیہ پر بہتان اور ظلم ہے۔

تاریخ نگاری کا غلط انداز

جن امہات کتب تاریخ کو سامنے رکھ کر مخالفین اہل سنت خلفاء اسلام پر اعتراضات کرکے اس کا سبائی نقشہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی غلط بیانیوں اور بہتان طرازیوں سے قطع نظر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ان مورخین نے تدوین و تالیف تاریخ کا طرز کیا اختیار کیا تھا؟ اور حوادث و واقعات جمع کرنے میں کیا اصول ملحوظ رکھے تھے؟ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ایک صاحب بصیرت محسوس کرسکتا ہے کہ یہ مولفین مورخانہ ذوق اور سلیقے سے بالکل محروم تھے' اس محرومی کے ساتھ خلفاء اسلام اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ بغض و عداوت نے مل کر انہیں مجبور کردیا تھا کہ اپنی کتابوں میں تاریخ نگاری کا غیر علمی طرز اختیار کریں۔ ان کا طرز بیان اور تدوین تاریخ کا طریقہ سائنٹفک نہیں ہے۔ بلکہ تشہیر' ارجاف اور پروپیگنڈے کا طریقہ ہے۔

زمانہ کا طرز یہ ہے کہ جب کوئی اہم حادثہ پیش آتا ہے' جس کی طرف کسی بڑی جماعت کی نظریں اٹھتی ہیں' تو صحیح واقعات کے ساتھ اس کے بارے میں افواہیں بھی پھیلتی ہیں۔ افواہیں پھیلانے والوں میں افراد حادثہ کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ یہ

افواہیں غلط بھی ہوتی ہیں اور صحیح بھی ۔ مگر کسی حالت میں بھی قابل اعتبار نہیں ہوتیں ۔ مورخ کا کام یہ ہے کہ افواہوں کے انبار میں سے صحیح خبریں نکال کر الگ کرے اور ان کی صحت کی جانچ کرنے کے بعد انہیں تاریخ کا جزو بنائے ۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی مورخین نے جو شیعہ تھے ' اس کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور ہر قسم کی روایتیں بغیر جانچے پرکھے اپنی کتابوں میں جمع کرلیں جس کا ایک اثر یہ ہوا کہ خود انہیں بھی اپنی کتابوں پر اعتماد و اطمینان نہیں ہوا ۔ جس کتاب تاریخ پر خود اس کے مصنف کو اعتماد و اطمینان نہ ہو ' وہ قاری کے نزدیک کیسے قابل اعتماد ہوسکتی ہے ؟ اس پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے ۔ اس بیان کے ثبوت کے لئے تاریخ طبری کے دیباچہ کا اقتباس پیش کرتا ہوں ۔ ملاحظہ ہو :۔

ولیعلم الناظر فی کتابنا هذا ان اعتمادی فی کل ما احضرت ذکره فیه مما شرطت انی راسمه فیه انما هو علی ما رویت من الاخبار انا ذاکر ها فیه والآثار التی انا مسندها الی رواتها فیه دون ما ادرک بحجج العقول ' او استنبط بفکر النفوس الا الیسیر القلیل منه ۔ انا کان العلم بما کان من اخبار الماضین وما هو کائن من انباء الحادثین غیر واصل الی من لم یشاهد هم ویدرک زمانهم الاباخبار المخبرین و نقل الناقلین دون الاستخراج بالعقول والاستنباط بفکر النفوس فما یکن فی کتابی هذا من خبر ذکرنا ه عن بعض الماضین ما یستنکره قارئه او یستشنعه سامعه ' من اجل انه لم یعرف له وجها فی الصحة ولا معنی فی الحقیقة فلیعلم انه لم یؤت فی ذلک من قبلنا ' وانما من قبل بعض ناقلیه الینا وانا انما ادینا ذلک علی نحو ما ادی الینا " (۱)

ہماری اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کتاب میں جو مواد میں نے فراہم کیا ہے وہ ان روایتوں پر مبنی ہے جنہیں میں اس کتاب میں ذکر کروں گا اور ان آثار پر مشتمل ہے جنہیں میں ان کے راویوں کی طرف منسوب کرکے بیان کروں گا ۔ کتاب کے یہ مضامین عقلی استدلال اور فکری استنباط سے نہیں حاصل ہوتے ہیں ۔ ان میں سے بہت قلیل ایسے ہوتے ہیں (جو

---

(۱) دیباچہ تاریخ طبری مطبوعہ مطبعۃ الامیر ۔ قم ۔ ایران ۱۴۰۴ھ

استدلال و استنباط سے حاصل ہوں) ۔ کیونکہ جس نے گذر جانے
والوں یا بزمانہ گزشتہ وجود میں آنے والوں کو خود نہیں دیکھا اور ان کا
زمانہ نہیں پایا یا اسے ان کے متعلق علم خبر دینے والوں کی خبر اور
نقل کرنے والوں کی نقل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے ۔ عقلی استنتاج
اور ذہنی استنباط سے نہیں حاصل ہو سکتا ۔ پس میری اس کتاب میں
جو ایسی خبریں (روایتیں) پائی جاتی ہیں جنہیں پڑھنے والا " منکر "
سمجھتا ہے اور سننے والا شنیع جانتا ہے کیونکہ ان کی صحت کی کوئی
توجیہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور بلحاظ حقیقت اس کے کوئی معنی
نہیں معلوم ہوتے (تو ایسی خبروں کے متعلق سمجھ لینا چاہئے) کہ
ایسی روایتیں ہم اپنی طرف سے نہیں لائے ہیں ۔ بلکہ انہیں نقل
کرنے والوں سے نقل کی ہیں اور ہم نے یہ خبریں (روایتیں) جوں
کی توں ویسی ہی نقل کردیں جیسی ان ناقلوں (راویوں) نے ہمیں
پہنچائی تھیں ۔ "

اس دیباچے سے عیاں ہے کہ مصنف نے جو تاریخی مواد اپنی کتاب میں جمع کیا ہے اس پر اسے خود بھی اعتماد نہیں ۔ اس لئے وہ اس کی صحت و صداقت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ بلکہ " دروغ برگردن راوی " کی آڑ لے کر اپنی گردن چھڑانا چاہتا ہے ۔ مورخ کو جب اپنی کتاب پر خود اعتماد نہ ہو ۔ اور وہ اپنے بیان کئے ہوئے واقعات کی صحت کی ذمہ داری لینے سے گریزاں ہو تو اس کی تاریخ پر کیا اعتماد باقی رہ سکتا ہے اس پر اعتماد کرنا سخت غلطی ہے ۔

تاریخ طبری تاریخ کی امہات کتب میں سے ایک ہے ۔ اور بہت سے مورخین کے نزدیک ان سب میں سب سے زیادہ معتبر اس کا یہ حال ہے تاریخ و سیر کی دوسری اہم کتابوں کا جو بعد کی تاریخوں کا ماخذ ہیں ' جیسے سیرۃ ابن ہشام (جو مغازی محمد بن اسحاق کی تلخیص ہے ۔ اصل کتاب ناپید ہے) ' طبقات ابن سعد ' معارف ابن قتیبہ وغیرہ کا بھی یہی حال ہے ۔ سب میں طرز بیان وہی نقل روایت ہے ۔ اور " نقل راچہ عقل " پر سب کا عمل ہے ۔

اس طرز عمل کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا اور ہوا کہ اخبار صحیحہ اور افواہوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا گیا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان شیعہ مورخین نے اسلامی تاریخ کو تاریک

کرنے کے لئے شیعوں کی گڑھی ہوئی اور مشہور کی ہوئی افواہوں کو چن چن کر اکٹھا کیا اور اس کے انبار میں صحیح واقعات کو چھپانے کی افسوسناک کوشش کی ہے۔

طبری کے دیباچہ کی منقولہ بالا عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب جب شائع ہوئی تو جمہور اہل اسلام میں مقبول نہ ہو سکی۔ بلکہ شروع ہی سے اس پر اعتراضات شروع ہوگئے اور اس کی صداقت پر بے اعتمادی کا اظہار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مصنف کو اس معذرت کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی؟ یہ شیعوں اور شیعیت نواز سنیوں میں مقبول ہوئی ہوگی۔ مگر جمہور اہلسنّت علماء اور عوام اس سے نفرت کرتے تھے اور اسے قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے یہ ناپید ہوگئی تھی۔ کئی صدیوں تک ناپید اور نایاب رہنے کے بعد بیسویں صدی مسیحی میں یورپ کے بعض یہود کو ایک نسخہ کہیں سے دستیاب ہوا۔ جو انہوں نے طبع کرایا۔ وہی نسخہ مختلف مطابع میں طبع ہوتا رہا اور آج ہمارے سامنے ہے(۱)

طبقات ابن سعد بھی مفقود تھی۔ یورپ کی بدولت انیسویں صدی مسیحی میں شائع ہوئی۔ ان کتابوں پر بے اعتمادی کے وجوہ میں اس وجہ کا اضافہ بھی مناسب ہے کہ یہ یورپ کی سرزمین سے یہود کے ہاتھوں ہم تک پہنچیں۔ میں ان کتابوں پر اظہار حقیقت جلد اول میں بحث کرچکا ہوں۔ یہاں ان کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس جگہ پر اس موضوع کو مکرر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی جو امہات الکتب ہیں ان کے مولفین کی شیعیت اور بے راہ روی سے قطع نظر بھی وہ قابل اعتماد نہیں سمجھی جاسکتیں۔ اصول تاریخ نگاری کے اعتبار سے بھی ان میں ایسے اسقام ہیں جو انہیں ساقط الاعتبار بنادیتے ہیں۔ سب سے بڑا سقم تو یہی ہے کہ ان کے مولفین نے قابل وثوق شہادتوں اور افواہوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بعض اوقات ایک ہی حادثے کے متعلق متعدد روایتیں ملتی ہیں جو بعض صورتوں میں نمایاں طور پر باہم دست و گریباں ہوتی ہیں اور بعض مقامات پر تعارض غور و تامل سے سمجھ میں آتا ہے۔ بعض

---

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ تاریخ طبری کا موجودہ نسخہ اصل نسخہ نہیں ہے۔ طبری کی کتاب مفقود ہوچکی۔ یہ ایک شیعہ مورخ سالمی کی تصنیف ہے۔ جو طبری کی طرف منسوب کردی گئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی اس تحقیق سے اتفاق یا اختلاف ہمارے لئے غیر ضروری ہے۔ تاریخ طبری خواہ ابن جریر کی تصنیف ہو یا سالمی کی، ہر حالت میں ایک شیعہ کی تصنیف ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتا ہے۔

مقامات پر تعارض تو نہیں ہوتا مگر اختلاف اسناد کی وجہ سے قاری کے لئے حقیقت واقعہ کا تعین دشوار ہوجاتا ہے ۔ طبری نے تو اپنی اس کمزوری کا اعتراف صراحت کے ساتھ کرلیا ۔ دوسروں کے یہاں یہ تصریح نہیں ملتی مگر مطالعہ کتاب سے عیاں ہوجاتا ہے کہ عمل ان کا بھی اسی غلط اصول پر ہے ۔ تاریخ ابن خلدون سے پہلے جتنی کتب تاریخ لکھی گئی ہیں سب میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے ۔ ابن خلدون" اصول تاریخ کے بانی ہیں ۔ ان کے یہاں یہ عیب تو نہیں ہے ۔ لیکن طبری پر ضرورت سے زائد اعتماد کی وجہ سے وہ بھی بعض اوقات دشمنان خلافت اسلامیہ کی گڑھی ہوئی روایتوں اور ان کے ارجاف کے کانٹوں میں الجھ جاتے ہیں ۔ اس تفصیلی بیان کا اصل مقصد یہ ہے کہ تاریخ اسلام کی ان غیر معتبر کتابوں پر اعتماد

کرکے ' اپنی شاندار اور پاکیزہ تاریخ کو تاریک سمجھنا کسی طرح بھی قرین عقل و دانش نہیں ۔ سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے صحابہ کرام ؓ اور بنو امیہ و بنو عباس کے خلاف بدگمانی ' بد زبانی اور جھوٹے پروپیگنڈے کا جو طوفان برپا کیا ہے اس کا سرچشمہ یہی کتابیں ہیں جو قطعا غیر معتبر ہیں اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے ہی کے لئے لکھی گئی تھیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں ایسی صحیح خبریں اور روایتیں بھی بکثرت موجود ہیں جو امویوں اور عباسیوں کی خوبیوں اور ان کے کردار کی بلندیوں کو ظاہر کرتی ہیں ۔ اس قسم کی خبریں لانے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس وقت اس قدر مشہور و معروف تھیں کہ انہیں نظر انداز کرنے یا چھپانے کی کوشش بالکل ناکام ہوجاتی ۔ اور ان کی کتابیں اس دور میں بالکل ناقص اور ساقط الاعتبار سمجھی جاتیں ۔ اس لئے مجبورا انہیں یہ " ان کہی " کہنا پڑی اور ان واقعات و حوداث کو درج کرنا پڑا جن سے اموی و عباسی ادوار خلافت کی رفعت و عظمت نمایاں ہوتی ہے ۔ دوسرا سبب اپنی نقاب تقیہ کو دبیز اور مضبوط کرنا تھا اگر اپنی کتابوں میں وہ انہیں قلم انداز کردیتے تو ان کی شیعیت بالکل نمایاں ہوجاتی ۔ اور اہلسنّت کو گمراہ کرنے کا مقصد نہ حاصل ہوتا ۔ اگر یہ مجبوریاں نہ ہوتیں تو یہ لوگ ایک روایت بھی ایسی نہ لاتے جس سے ان خلفاء عادلین کی منقبت نکلتی ۔ یہ مجبوریاں تھیں جن کی بناء پر ان دشمنان صحابہ ؓ و اہلسنّت کو زہر کے ساتھ شہد بھی پیش کرنا پڑا ۔

کتب حدیث اور تاریخی روایات

کتب حدیث کی تالیف کا اصل مقصد نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم کے اقوال و افعال کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے ۔ امتیوں کی تاریخ ان کتابوں کا اصل مضمون و

موضوع نہیں ہے۔ تاہم ضمناً و تبعاً بعض تاریخی اخبار و روایات کا ذکر بھی کتب حدیث میں ملتا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ قابل اعتماد ہونے کے اعتبار سے کتب حدیث کا مرتبہ کتب تاریخ سے بلند و برتر ہے۔ اس لئے بکثرت حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جو تاریخی روایت حدیث کی کسی معتبر کتاب میں بھی مذکور ہو' اس کی صحت میں کلام کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اس کی صداقت تسلیم کرلینا واجب و لازم ہے۔ اس بارے میں بعض حضرات کو اتنا غلو ہے کہ جو شخص کسی ایسی تاریخی روایت کو جو کسی حدیث کی کتاب میں مذکور ہو' غلط کہتا ہے اور اس پر نقد کرتا ہے' اسے یہ حضرات بلا تکلف منکر حدیث کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بسا اوقات اس تاریخی روایت کو جس کا انکار کیا گیا ہے حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اس کا تذکرہ کسی ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ضمناً کردیا جاتا ہے۔ اس کے انکار سے حدیث کے اقرار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر بالفرض کوئی اثر پڑے بھی' تو بھی قائل کو منکر حدیث نہیں کہا جاسکتا۔ اس غلط فہمی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگر اکثر نہیں تو بکثرت اہل سنت اس میں مبتلا ہیں۔ اسے دور کرنے کے لئے ایک اصولی بات درج ذیل ہے:۔

تدوین احادیث' اور کتب حدیث کی تالیف سے حضرات محدثین کا اصل مقصد احادیث احکام کو جمع اور مرتب کرنا تھا۔ تاریخ اور اخبار کی تدوین مقصود نہیں تھی۔ یہ کام انہوں نے اصحاب سیر و مغازی کے لئے چھوڑدیا تھا۔ تاریخ بھی انہیں کا میدان ہے۔ محدثین کا میدان نہیں' ان حضرات نے قبول حدیث کے لئے جو چھان بین کی ہے' اور اس میں جو احتیاطیں ملحوظ رکھی ہیں' ان سے تاریخی روایات کے بارے میں کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ اصحاب تاریخ پر اعتماد کرکے انہیں سے نقل کردیئے ہیں۔ کسی تاریخی روایت کو بخاری و مسلم جیسی حدیث کی معتبر کتاب میں دیکھ کر بھی یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا درجہ باعتبار صحت وہی ہے جو اس کتاب کے احادیث کا ہے۔ وہ تاریخ ہی کی روایت رہتی ہے اور اس کے قبول و رد میں انہیں اصول سے کام لیا جائے گا جن سے کتب تاریخ و سیر کے روایات کو پرکھنے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔ کسی تاریخی روایت و حکایت کے لئے صرف اتنی بات کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں بھی مذکور ہے' اس کی صحت کی ترجیح کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ہم جلد اول میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ یاد دہانی کے لئے یہاں مکرر ذکر کیا گیا۔ ہاں اگر ایک ہی واقعہ کے متعلق دو روایتیں ہوں۔ ایک حدیث کی کسی معتبر کتاب میں ہو اور دوسری تاریخ کی کسی کتاب میں' تو جو روایت حدیث کی معتبر کتاب میں ہوگی اسے ترجیح دی جائے گی۔ بشرطیکہ کتاب تاریخ کی روایت کے لئے کوئی دوسری قوی تر دلیل

ترجیح نہ ہو ۔ اگر ایسا ہو تو دلیل کی اتباع کی جائے گی اور جس روایت کی دلیل ترجیح قوی تر ہو اسی کو قبول کیا جائے گا خواہ وہ کتب تاریخ میں ہو یا کتب حدیث میں ۔

حضرات محدثین اہلسنت ہمارے اور ہمارے بعد قیامت تک آنے والے جملہ مسلمین صادقین یعنی اہلسنت کے محسن ہیں ۔ انہوں نے دشمنان اسلام منافقوں سے مقابلہ کیا اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبھا الف الف تحیہ کا ایک ذخیرہ امت تک پہنچایا ۔ یہ ذخیرہ امت کی عملی زندگی کو روشن کرنے کے لئے بالکل کافی ہے ۔ اور اس ذخیرے کی صحت میں بھی کلام نہیں کیونکہ اس کی تصدیق تعامل متواتر سے ہوتی ہے ۔ لیکن یہ حضرات بھی بشر تھے ' ان سے کچھ لغزش بھی ہوئی ایک اہم اور دور رس نتائج رکھنے والی غلطی تو یہ ہوئی کہ ان حضرات نے احادیث احکام ' احادیث اخبار و تاریخ کے درمیان فرق نہیں کیا ۔ اور دونوں کی صحت و صداقت کی تحقیق کے لئے ایک ہی قسم کے اصول و ضوابط سے کام لیا ۔ ان سے اس غلطی کا صدور اصول نفسیات سے بے خبری کی وجہ سے ہوا ۔ ان حضرات نے نفسیات خبر کو بالکل نظرانداز کردیا ۔ یہ تو ان حضرات محدثین کا طرز عمل رہا جنہوں نے احادیث اخبار و تاریخ کو بھی پرکھنے کی ضرورت محسوس کی ورنہ بکثرت محدثین نے تو اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی بلکہ صرف اصحاب سیرو تاریخ کے اعتماد پر اس قسم کی روایتیں بھی اپنی کتابوں میں درج کردیں ۔ احادیث فضائل و مناقب کے بارے میں تو عام طور پر محدثین نے افسوسناک تسامح سے کام لیا ہے ۔ جس کا اقرار خود اکابر محدثین نے کیا ہے ۔

مودودی صاحب کی مذکورہ بالا غلط بیانی کی تردید کے بعد اپنی کتاب کے موضوع کی حد تک ہماری ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے ۔ لیکن موصوف کی یہ غلط بیانی اس قدر خطرناک اور پر ضرر ہے کہ اس کے اصل سبب اور منشاء اور اس کی فتنہ خیزی پر روشنی ڈالنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :۔

شیعہ اور یہود کے گٹھ جوڑ سے جو منصوبہ اسلام کی ترقی کو روکنے ' مسلمانوں کو گمراہ کرنے ' اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو پراگندہ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اس کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ علماء و صلحاء کو خلفاء اور ان کے معاونین سے تابہ امکان بے تعلق کردیا جائے ۔ اور ان کی اس بے تعلقی کی تشہیر کرکے بعد کو آنے والے عوام و خواص کے دلوں میں اسلامی حکومتوں کے خلاف نفرت و تحقیر کا بیج بویا جائے توضیح بیان کے لئے اولاً بطور مثال دو ایک حکایتیں پیش کرتا ہوں ۔ انہیں دیکھنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی ۔

ایک قصہ یہ ہے کہ ایک صوفی عالم دین ' امیرالمومنین ہارون الرشید عباسی کے پاس

پہنچے اور ان سے کہا کہ "پیاس کی شدت سے آپ کی جان پر بن جائے تو کیا آپ ایک پیالہ پانی کے لئے اپنی نصف سلطنت دینے کو تیار نہ ہوجائیں گے؟" خلیفۃ المسلمین نے جواب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا کہ "حبس بول کی صورت میں جب ہلاکت کا اندیشہ ہو تو کیا علاج شافی کے لئے معاوضہ میں نصف سلطنت سے دستبردار نہ ہوجائیں گے؟" اس کا بھی جواب اثبات میں ملا۔ تو وہ بزرگ بولے کہ "آپ کی سلطنت کی قیمت ایک پیالہ پانی' اور ایک پیالہ پیشاب ہے۔"

(۲) دوسرا قصہ سنئے۔ ایک مقدس بزرگ جن کا شمار اکابر علماء اور اکابر صوفیاء میں ہے امیرالمومنین المنصورؒ عباسی کے پاس پہنچے اور نہایت سختی کے ساتھ کہا کہ "تم ظالم ہو تمہارے دروازے پر ظلم ہوتا ہے۔"

منصورؒ یہ سن کر خاموش ہوگئے' بزرگ سے نصیحت اور دعا کی درخواست کی۔ بزرگ موصوف انہیں جھڑک کر رخصت ہوگئے۔ کچھ ہدیہ بھی پیش کرنا چاہا جو انہوں نے قبول نہیں فرمایا۔

(۳) ایک قصہ اور سن لیجئے ہارون رشیدؒ عباسی کے ایک ہم مکتب جو خدمت حدیث میں مصروف تھے اور بہت بڑے درجہ کے محدث تھے' ان سے ملنے کبھی نہیں جاتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین نے بطور دوستانہ شکایت کہلا بھیجا کہ آپ کبھی تشریف کیوں نہیں لاتے؟ حالانکہ میرے اور آپ کے تعلقات دیرینہ ہیں۔ اور میں آپ کی مالی خدمت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ نے جانے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ "میں قیامت کے دن تمہارے معاصی پر تمہارے خلاف گواہ نہیں بننا چاہتا۔"

نمونے کے لئے ہم ان تین حکایتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کے بکثرت قصے ہیں۔ جنہیں ہمارے واعظین خصوصاً صوفیانہ مذاق رکھنے والے حضرات بتکرار بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض تاریخ و سوانح کی کتابوں میں بھی مذکور ہیں۔ افسوس ہے کہ علماء اہل سنت شیعوں کے فریب کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اور ان کا کام انجام دے کر نادانستہ ان کے ناپاک مقاصد کے حصول کا ذریعہ اور ان کے آلہ کار بن گئے۔ اس قسم کی حکایتوں کو شہرت دینے سے شیعوں اور شیعیت نوازوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خلفاء اسلام کو بدنام کریں۔ خلافت اسلامیہ کی وقعت نظروں سے گرائیں۔ اور اسی خلاف واقعہ جھوٹے دعوے کا ثبوت بہم پہنچائیں جو مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب کرتے ہیں۔ اور جس کا غلط ہونا ہم چند سطور پہلے واضح کرچکے ہیں۔ یعنی اموی' و عباسی خلفاء کے ادوار میں علماء نے

نظام خلافت کے متوازی ایک علیحدہ نظام دینی بنالیا تھا۔ اور خلفاء کی حکومتوں سے تعاون ترک کرکے ان سے بالکل بے تعلق ہوگئے تھے " ہم ثابت کرچکے ہیں کہ موصوف کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ لیکن مذکورہ بالا قسم کی حکایتیں اس جھوٹ کو سچ بناکر دکھانے کے لئے پھیلائی گئی ہیں۔ سنی واعظین انہیں اس عنوان سے بیان کرتے ہیں کہ " دیکھو ہمارے علماء متقدمین کتنے حق گو اور بے باک تھے۔ وہ حکومتوں اور سلاطین سے بالکل خائف نہ ہوتے تھے۔ انہیں تنبیہہ و تہدید کرتے تھے' امور سلطنت سے بالکل الگ رہتے تھے اور خلفاء سے کوئی تعاون نہیں کرتے تھے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت تک امت میں ایک جماعت حق گو افراد کی موجود رہے گی۔ اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ ان دونوں ادوار حکومت میں بھی حق گو اور حق پسند علماء موجود تھے۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ یہ خلفاء غلطی پر تھے اور یہ حضرات ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تھے؟ نیز یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جن علماء کے متعلق یہ قصے بیان کئے جاتے ہیں ان کا یہ اقدام صحیح اور حق تھا؟ اور وہ واقعی حق گوئی اور خلیفہ کو تنبیہہ کرنے کے مقصد سے ان کے پاس جاتے تھے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو کبار علماء خلفاء اور ان کے عمال کے ساتھ تعاون کررہے تھے کیاوہ سب کے سب فاسق' باطل پسند' اور ضعیف الایمان تھے؟ اس قسم کی حکایتیں بیان کرنے والوں کا ایک مقصد مسلمانوں کی نظروں سے ان کبار علماء کی وقعت گرانا بھی تھا۔ اس دقیق فریب کو بھی ہمارے سنی بھائی نہیں سمجھ سکے۔ اس شیعی فریب کا پردہ چاک کرنے کے بعد ہم دو لفظ ان قصوں کی نوعیت و حقیقت کے متعلق بھی کہنا چاہتے ہیں:۔

ان قصوں میں سے اکثر و بیشتر تو من گھڑت اور طبع زاد افسانے ہیں' جو کبھی واقع ہی نہیں ہوئے۔ یہ شیعوں' خصوصاً ان کے فرقہ باطنیہ' اور شیعیت نواز سنیوں نے وضع کئے ہیں۔ اور ان میں اپنی افسانہ طرازی کا کمال دکھایا ہے۔ تاہم بعض صحیح بھی ہیں۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ یہ افسانے کیوں گڑھے گئے؟ دوسرا یہ کہ وہ قصے جو واقعات کے مطابق ہیں ان کا وقوع کیوں ہوا؟ اور جن بزرگوں کی حق گوئی کا قصہ بیان کیا جاتا ہے انہوں نے یہ بے باکی کس جذبہ کے ماتحت اور کس مقصد سے دکھائی؟

ان دونوں سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف جو شیعی تحریک چل رہی تھی' بعض علماء و صوفیاء کا زیر بحث طرز عمل بھی اسی کا ایک جزو تھا۔ یہود اور شیعہ باطنیہ' نے اس طریقے کی ابتداء کی۔ اس کے مقصد دو تھے۔ اول خلفاء کو

بدنام کر کے حقیقت سے بے خبر عوام کو ان کے خلاف ہرانگیختہ کرنا ' ان کا دوسرا مقصد جو اس سے زیادہ خطرناک تھا ' یہ تھا کہ علماء اہلسنّت کو حکومت سے بے تعلق کردیا جائے ۔ جب علماء دین اور کار منصبی کی صلاحیت رکھنے والے فقیہ و فہیم افراد حکومت سے بے تعلق اور اس کے ساتھ تعاون کرنے سے کنارہ کش ہوجائیں گے تو حکومت کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہے گا کہ وہ ملازمین و معاونین کی صلاحیت کا معیار گرائے ' اور نا اہل افراد کی خدمات حاصل کرے ۔ اس موقع پر ان سازشیوں کا دوسراونگ حرکت میں آجائے اور خوشامد چاپلوسی سے کام لے کر شیعوں کو ان مناصب پر مقرر کرواکے اس خلاء کو پر کرے ۔ جب اس طرح مملکت کی تنفیذی قوت EXICUTIVE POWER پر قبضہ ہوجائے تو خلیفہ کو شاہ شطرنج بنادینا اور حکومت پر شیعہ نواز سنیوں کی امداد سے شیعوں کا قبضہ جمالینا کوئی مشکل کام نہیں رہتا ۔ اور مناسب موقع دیکھ کر اسے تباہ کرکے بھی اپنے جذبہ عداوت اسلام کو تسکین دی جاسکتی ہے ۔ یہ دو مقصد تھے جنہیں پیش نظر رکھ کر اسماعیلیہ باطنیہ شیعہ نیز اثنا عشریہ وغیرہ دیگر فرق شیعہ اور یہود ' تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر صوفیت کے لباس میں زیر بحث کردار دکھارہے تھے ۔ عباسی خلافت میں ان لوگوں نے یہی طرز اختیار کیا ۔ ایک دور میں حکومت پر بالکل حاوی ہوگئے اور اس کا خون چوستے رہے ۔ دوسرے دور میں تاتاریوں سے سازش کرکے اسے تباہ کردیا ۔ سبائی مکاری اور فریب کاری کا کمال یہ ہے کہ اس الم انگیز حادثہ عظیمہ سے دوچار ہونے کے بعد بھی جن سازشیوں اور فریب کاروں نے اس تباہ کاری کی بنیاد رکھی تھی ' ان کا نام آج بھی ہمارے سنی بھائی احترام کے ساتھ لیتے ہیں ۔ اور اب تک نہیں سمجھے کہ یہ انہیں کے کرتوت تھے ۔ اس گروہ منافقین کا اس تنظیم و سازش سے تیسرا مقصد دین اسلام کے متوازی ایک دین باطل تیار کرنا تھا ۔ یہ مقصد سب سے زیادہ تباہ کن تھا ۔ ان خلفاء اور ان کے عمال و امراء اسلام کو زیر گفتگو خلاف تہذیب اور خلاف شریعت طریقوں سے جھڑکنے اور ملامت کرنے والے افراد باطنیہ تک محدود نہ تھے ۔ بلکہ بعض اہلسنّت علماء و مشائخ بھی ان کے ہم آہنگ ہوگئے تھے ۔ یہ حضرات مخلص تھے ۔ لیکن انہوں نے یہ غلط طرز عمل باطنیہ کے ورغلانے سے اختیار کیا تھا ۔ اور غیر شعوری طور پر ان کے مقاصد پورے کررہے تھے ۔ ان کے اخلاص میں کلام نہیں اور اس کی وجہ سے ہم ان پر معترض نہیں ۔ لیکن اتنا کہنا لازم سمجھتے ہیں کہ ان کا زیر گفتگو طرز عمل شرعاً و عقلاً ہر طرح غلط تھا ' ان کی اس غلطی کو ہم ایک فکری غلطی کہہ سکتے ہیں۔ مگر بلاشبہ یہ غلطی شدید تھی۔ جس کے نتائج افسوسناک ہوئے ۔ جو اہلسنّت

واعظین و علماء زیر بحث قسم کے قصے علماء و صوفیاء کی حق گوئی اور دنیا سے ان کی بے تعلقی کے نمونوں اور مثالوں کے طور پر بیان کرتے ہیں ان سے ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ ان کی رائے ان کبار علماء اور ائمہ مجتہدین کے متعلق کیا ہے جو اموی ' و عباسی خلفاء اور ان کے عمال کے یہاں آمدورفت رکھتے تھے اور حسب موقع ان کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے ؟ امام ابوحنیفہ ' امام اوزاعی ' امام مالک ' ابن ابی لیلیٰ ' امام ابویوسف ' امام محمد ' امام یحیی بن یحیی و امثالہم کیا حق گو اور حق پسند نہ تھے ؟ گزشتہ صفحات میں ہم اس حقیقت واقعیہ کو واقعات و دلائل سے ثابت اور الم نشرح کر چکے ہیں ۔ اموی اور عباسی دونوں ادوار خلافت میں دمشق ' بغداد ' اندلس ہر جگہ ان ادوار کے علماء و صلحاء خلفاء اور ان کے عمال کے ساتھ حسب ضرورت کامل تعاون کیا کرتے تھے ' اور انہیں ان سے ملنے جلنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا ۔ اگر ان کا طرز عمل صحیح تھا تو یقیناً ان صوفی منش علماء کا خلفاء اور امراء پر توہین آمیز اور خلاف تہذیب طریق سے اعتراض کرنا یقیناً بہت غلط اور قابل مذمت طرز عمل تھا۔ اس کی تعریف کرنا بھی افسوسناک غلطی ہے۔

خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے اور امت کے اجتماعی نظام کو پراگندہ کرنے کے لئے باطنیہ کی زیر بحث تدبیر مذموم کی ہم نے تین مثالیں سطور سابقہ میں پیش کی ہیں مناسب ہے کہ ان میں سے ایک قصے کا تجزیہ کردیا جائے ۔ تاکہ سبائیوں کے اس فریب کے تانے بانے اور زیادہ واضح ہوجائیں ۔ جن بزرگ نے امیر المومنین ہارون الرشید سے گفتگو میں ان کی سلطنت و حکومت کی قیمت ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب بتائی تھی انہوں نے خلافت اسلامیہ کی سخت توہین و تنقیص کی ۔ یہ کس قدر مذموم اور افسوسناک بات ہے ۔ خلافت جو پوری امت مسلمہ کے لئے نعمت الٰہی تھی ' اس کی یہ توہین و تنقیص اور ناقدری ' کیا شرعاً جائز تھی ؟ ان بزرگ نے یہ مذموم بات کہہ کر خود انعام الٰہی کے ساتھ بے ادبی کرکے معصیت کا ارتکاب کیا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین کی طرف مبینہ جواب کی نسبت بھی غلط ہے ۔ انہوں نے تو یہ جواب دیا ہوگا کہ میں اپنی جان بچانے یا تکلیف دور کرنے کے لئے معاوضہ میں اپنے املاک دے سکتا ہوں ۔ سلطنت تو میری ملکیت نہیں اسے کسی کو بخش دینے کا مجھے کوئی حق و اختیار نہیں۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ اگر بالفرض انہوں نے غلطی سے وہی جواب دیا تھا جو ان کی طرف اس قصے میں منسوب کیا گیا ہے ' تو ان ناصح بزرگ کو انہیں ٹوکنا چاہئے تھا ' اور ان کی اصلاح کرنا چاہئے تھی۔ انہیں درویش بننے کی نصیحت کرنے سے زیادہ اعتقاد کی اصلاح ضروری

تھی ۔ (۱) اس تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ قصہ ہی غلط اور من گھڑت تھے یا یہ بزرگ ناصح خود باطنی شیعہ تھے، نہیں تو پھر شیعوں کے فریب کا شکار تھے اور ان کے آلہ کار تھے ۔ اس نصیحت پھر اس کی تشہیر کا مقصد خلیفۃ المسلمین کو بدنام کرنا ان کی اور خلافت اسلامیہ کی قدر و عظمت کو عوام کی نظروں میں گھٹانا نیز خلیفہ کے ساتھ تعاون کرنے والے علماء کو عوام کی نظروں سے گرانا اور ترک تعاون کی طرف مائل کرنا تھا ۔ یہ سب مقاصد یقیناً سخت مذموم اور ملت کے لئے ضرر رساں تھے ۔

انہیں شیعہ باطنیہ نے اپنی ایک خفیہ تنظیم بھی بنالی تھی ۔ جس میں اسمٰعیلی باطنی شیعوں کے علاوہ اثنا عشری شیعوں، نیز شیعوں کے بعض دوسرے فرقوں کے افراد بھی داخل ہوگئے تھے ۔ یہ یہود کی فری میسن تنظیم کے طرز کی تنظیم تھی ۔ جو نظام خلافت کے متوازی اس کے خلاف سازشیں کرنے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے بنائی گئی تھی ۔ یہ اسلامی حکومتوں کے خلاف سازشیں کرتی تھی ۔ اور موقع پاکر انہیں تباہ و برباد کرنے، یا ان میں اپنی پسند کا انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی ۔ یہ منافق دشمنان اسلام رُوحانیت کے نام پر اپنے عقائد باطلہ فاسدہ، کی اشاعت کررہے تھے اور عوام اہل اسلام کو گمراہ کررہے تھے ۔ افسوس ہے کہ ان فریب کاروں کے فریب میں مبتلا ہوکر کچھ مخلصین بھی اس تنظیم میں داخل ہوگئے تھے ۔ اور غیر شعوری طور پر دین و ملت کو نقصان پہنچارہے تھے ۔ یہ اہلسنّت مخلص اور نیک نیت تھے، مگر دشمنان ایمان کے فریب میں مبتلا ہوگئے تھے ۔ اس لئے ان پر تو کوئی الزام نہیں مگر یہ بھی غیر شعوری طور پر عوام میں زیغ و ضلال پھیلنے کا ذریعہ بن گئے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائیں ۔ خلفاء اور سلاطین اسلام سے عدم تعاون اور ان سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین اس جماعت کی عام پالیسی تھی ۔ سربراہان مملکت اور حکام کو بدنام کرنا، ان کی تحقیر و تذلیل کی کوشش کرنا اس گروہ کے پروگرام کا اہم جزو تھا ۔ (۲)

---

(۱) دوسری مثال میں منصورؒ یا ان کے عمال پر بلا ثبوت ظلم کا الزام لگا دینا خود افتراء اور ظلم تھا ۔ تیسری مثال سے عیاں ہے کہ جناب ناصح خود عجب و تکبر کے گناہ کبیرہ میں مبتلا تھے ۔ مزید یہ کہ بغیر ثبوت کسی مومن کو معاصی کا عادی کہہ دینا خود معصیت ہے ۔

(۲) اس خوفناک تنظیم و سازش کی مفصل کیفیت و روئداد بیان کرنے کے لئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے ۔ یہاں میں نے اس کی طرف صرف اشارہ کیا ہے ۔ اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت بھی نہیں تھی ۔ اصل مدعا واضح کرنے کے لئے اتنی نشاندہی کافی ہے ۔

مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا شاید مخالفین خلفاء و سلاطین کی اسی مفسدہ پرداز تنظیم کو سامنے رکھ کر اس بے بنیاد و بے دلیل دعوے کی جرأت کرتے ہیں کہ " علماء و صلحاء امت نے نظام خلافت کے لئے متوازی ایک دوسرا نظام دینی بنالیا تھا ۔ اور امت کی قیادت دو حصوں میں یعنی دینی قیادت ' اور سیاسی قیادت میں تقسیم ہوگئی تھی۔" اس تنظیم کی کیفیت و حقیقت پر ہم ابھی روشنی ڈال چکے ہیں جس سے عیاں ہے کہ اسے صلحاء و امت کی تنظیم کہنا جائز ہی نہیں ۔ یہ تو گمراہوں ' مفسدوں اور دشمنان اسلام کی تنظیم تھی اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا ۔ امت کے عام علماء و صلحاء پر اس کا کوئی معتدبہ اثر نہیں ہوا ۔انہوں نے خلفاء اسلام کے ساتھ ہمیشہ تعاون جاری رکھا ۔ اور سیاست کو دین سے الگ کرنے کے کبھی قائل نہیں ہوئے ۔

اس مسئلے پر اس قدر طویل گفتگو کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں صرف مخالفین نہیں بلکہ بکثرت اہلسنت بھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ یہ غلط فہمی مزید غلط فہمیوں کا سبب بنتی ہے ' یہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے ہمارے علماء و مورخین کی خصوصاً صوفیانہ مذاق رکھنے والوں کی ایک تعداد نادانستہ شیعی افکار و تصورات کی اشاعت کرتی ہے ۔ طوالت بحث کا مقصد ان مضرت رساں غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے ۔

مبحث ثانی

تاریخ اسلام کا سبائی نقشہ

گزشتہ سطور میں ہم نے جو عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعوں اور یہود نے تاریخ اسلام کو مسخ کرنے اور اسے تاریک بنانے کے لئے وضع روایات کاذبہ ' سچ میں جھوٹ کی آمیزش نقل خبر میں خیانت اور حذف و اضافہ ' خوبی کو برائی اور ہنر کو عیب بتانے کی کوشش ' رائے اور خبر کی آمیزش ' تلبیس حق بالباطل ایک دو جزئی واقعات سے کلیہ بنا کر اسے مہیب شکل میں پیش کرنا ' عیب آفرینی ' مورخانہ اسلوب بیان کے بجائے مرچفانہ اور تشہیری انداز بیان ' عدل کی ظلم سے اور ظلم کی عدل سے تعبیر فحش نگاری اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز طریقوں سے کام لیا ہے ۔ ان میں سے جن طریقوں کا تذکرہ ہم نے کیا ہے ان میں سے ہر ایک کا نمونہ خود مودودی صاحب کی زیر نظر کتاب سے پیش کردیا ہے اور موصوف نے جو مطاعن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اموی و عباسی خلافت پر کئے ہیں انہیں میں سے بعض کو بطور نمونہ پیش کرکے ان کا جواب پیش کردیا ہے ہمیں درحقیقت یہی دکھانا تھا کہ سبائیوں اور سبائیت زدہ مورخین و رواۃ نے تاریخ اسلام کو بگاڑنے کے لئے کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کئے ہیں ۔ اس ضمن میں موصوف کے وارد کردہ متعدد مطاعن کا کافی و شافی جواب بھی آگیا ۔ سب مطاعن کا جواب دینا ہمارے پیش نظر نہیں تھا۔ اول تو اس لئے کہ ان کا جواب تو دوسرے حضرات دے چکے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ہم نے شیعہ اور یہود نیز شیعیت نواز مورخین و رواۃ کی تکنیک اور ان کی فریب کاریوں کی نشاندہی کرکے ان کے فریب کا پردہ چاک کردیا ہے ۔ اس سے باخبر ہونے کے بعد انشاء اللہ معمولی فہم کا قاری بھی بقیہ مطاعن کا جواب خود سمجھ لے گا ۔ اور ان مطاعن کی لغویت و مہملیت معمولی غور و فکر سے انشاء اللہ آسانی کے ساتھ اس کی سمجھ میں

آجائے گی۔ ان کا جواب کسی دوسرے سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔

سبائی تکنیک اور شیعی آرٹ نیز تحریک شیعیت کے حقیقی اغراض و مقاصد سے ناواقفیت کی وجہ سے کتب تاریخ اسلام دیکھ کر بہت سے لوگ اپنے ماضی سے بدگمان اور بعض گمراہوں سے خوش گمان ہوجاتے ہیں اور اجتماعی خود حقارتی کے پست جذبہ میں مبتلا ہوکر، ذہنی پستی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بلکہ بعض تو خود اسلام سے بدگمان ہوکر وادی زیغ و ضلال میں پہنچ جاتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

سبائی مورخین کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو اسلام سے بیزار اور گمراہ کریں اور غیر مسلموں کو اسلام کی طرف رخ کرنے سے روک دیں۔ اس مقصد اور بعض دوسرے ایسے ہی مکروہ اور قابل نفرت مقاصد کے پیش نظر سبائی منو قلم نے امت مسلمہ کے ماضی کی تصویر تابہ مقدور بہت بھیانک بناکر پیش کی ہے۔ مودودی صاحب کی زیر نظر کتاب میں زیر عنوان "خلافت و ملوکیت کا فرق" اموی و عباسی دور خلافت پر طعن و تشنیع کے سلسلے میں جو ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں انہیں پر نظر کرنے سے عیاں ہوجاتا ہے کہ وہ تاریخ اسلام کا کیسا مکروہ نقشہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تنہا ان کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ سب شیعہ اور شیعیت نواز سنی تاریخ نگار یہی کرتے ہیں۔ ان کے بیانات کو صحیح سمجھا جائے تو اسلامی تاریخ کا مندرجہ ذیل بھیانک نقشہ سامنے آتا ہے:۔

> "عدل و انصاف مفقود، ہر طرف ظلم و وجور کا دور دورہ، خلافت بادشاہی بن چکی ہے اور بادشاہی بھی ایسی جو خون ناحق، قتل و غارتگری استحصال، فسق و فجور میں گلے تک غرق۔ خلفاء و عمال مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی، بے دردی کے ساتھ اپنے عیش و عشرت میں صرف کررہے ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش حکومتوں کے دست راست ہیں۔ حق گوئی اور ظلم پر آہ کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ سچی بات کہنے اور حکومت کی مرضی کے خلاف زبان کشائی پر زبان کاٹی جاتی ہے یا گردن تن سے جدا کردی جاتی ہے۔ آزادی رائے کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ علانیہ فسق و فجور ہورہا ہے۔ مسلمان مخالفین کی سزا قتل تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ان کی باعفت ماؤں بہنوں، اور بہو بیٹیوں کی عصمت و آبرو بھی بے دردی اور بے حیائی کے ساتھ لوٹی جاتی ہے۔ چند آدمیوں کی مخالفت کی بناء پر پورے پورے شہر

میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے ۔ بعض مسلمانوں کو زندہ جلادیا
جاتا ہے ۔ عورتوں بوڑھوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا جاتا شہر کے
شہر تہس نہس کردیئے جاتے ہیں۔"

یہ ہے اسلامی تاریخ کا وہ نقشہ جو شیعہ اور شیعیت نواز تاریخ نگاروں نے پیش کیا ہے ۔ اور جسے مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب مسلمان نوجوانوں کے ذہن میں نقش کرنا چاہتے ہیں۔

خلافت و ملوکیت کے جن عنوانات کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ' صرف انھیں پر نظر ڈالی جائے ' تو بھی کم از کم اجمالی طور ر یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے ۔ اور قاری کے دل میں اسلامی تاریخ سے نفرت و حقارت کے جذبے ابھارنے لگتا ہے ۔ پھر جب وہ تفصیل پڑھتا ہے تو یہ جذبہ اور شدت کے ساتھ ابھرتا ہے ۔

سبائی اور سبائیت نواز تاریخ نگاروں کے قلم سے لکھی ہوئی ان تاریخوں کو دیکھنے کے بعد ایک باحمیت حساس اور غیرت مند مسلمان کے ذہن میں یہ سوالات تو بعد کو پیدا ہوں گے اور ممکن ہے کہ پیدا ہی نہ ہوں کہ خلافت نے ملوکیت کی صورت کب اور کس طرح اختیار کی ؟ اس تبدیلی میں قصور وار کون کون ہے؟ وغیرہ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ کیا واقعی ہماری تاریخ یہی ہے ؟ اور کیا ہمارے ماضی کا یہ نقشہ واقعہ کے مطابق اور صحیح ہے ؟

اگر اسلامی تاریخ کا یہ نقشہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں کا شمار بدترین اقوام میں ہے ۔ اور مسلمان قطعاً اس لائق نہیں کہ اقتدار ان کے سپرد کیا جائے بلکہ اس لائق ہیں کہ ہمیشہ کسی دوسری قوم کی غلامی کرتے رہیں ۔ اور ذلت و محکومی میں زندگی بسر کریں سبائیوں اور یہود نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا ایک اہم مقصد مسلمانوں یعنی اہلسنّت میں یہ احساس خود حقارتی پیدا کرنا بھی تھا ۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے متاثر ہوکر مسلمانوں کے دلوں میں ان ادوار کے مسلمانوں کے لئے ' جذبہ تحقیر و نفرت پیدا ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ یہ جذبہ تحقیر عام مسلمانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ تحقیر صحابہؓ کے مہلک مرض تک پہنچا دیتا ہے ۔ اس افسوسناک اور تباہ کن روحانی مرض میں اہل سنت کی ایک کثیر تعداد مبتلا ہے ۔ یہاں تک علماء و مشائخ کا ایک معتدبہ گروہ بھی اس شیطانی تیر سے مجروح نظر آتا ہے ۔ اس کی تفصیل بخوف طوالت ترک کرتا ہوں بعض اکابر علماء و مشائخ کی تحریر میں دیکھ کر اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔ عوام میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ملے گی جو اپنے جذبات خود حقارتی ' تحقیر تاریخ اور تحقیر

صحابہؓ کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

شیعی موقلم نے اسلامی تاریخ کی جو تصویر تیار کی اور جس میں شیعیت نواز سنی مورخین نے مزید شوخ رنگ بھرا ہے وہ اہل قلم دشمنان اسلام کے لئے ایک سلاح بن گئی۔ وہ اسے اسلام پر طعن و تشنیع کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ امثال کے طور پر مشہور مسیحی فاضل جرجی زیدان آنجہانی کا نام اور کام پیش کردینا کافی ہے۔ اس نے **"تاریخ التمدن الاسلامی"** کے نام سے ایک کتاب اسی مقصد سے لکھی تھی جس میں اسلامی تاریخ کی اسی بھیانک تصویر کو جو سبائی مصوروں نے تیار کی ہے۔ پیش کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے "نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت تقریباً بالکل بے اثر رہی اور دین اسلام عملاً ناکام ثابت ہوا" (معاذ اللہ) اور اس اخذ کردہ نتیجے کو پیش کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں اس نے اپنی پوری ادبی و ارجانی صلاحیتیں صرف کردیں۔ (۱)

---

(۱) اللہ تعالیٰ علامہ شبلی نعمانی پر اپنی مغفرت و رحمت کی بارش فرمائے اور ان کے درجات جنت میں بلند فرمائے کہ انہوں نے اس کتاب کا مدلل رد **"النقد علی تاریخ التمدن الاسلامی"** کے نام سے لکھ کر شائع کیا جس میں شیعوں کے وضع کردہ روایات کی مدلل تردید فرمائی اور جرجی زیدان کے استدلال کی دھجیاں اڑادیں۔

اسلام پر یہود، اور **مسیحیوں**، خصوصاً یورپ و امریکہ والوں کی یورش تاریخ کی راہ سے اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ بالآخر طبری وغیرہ شیعہ مورخین کے پرستاروں، اور شیعہ نوازوں کو بھی کچھ احساس پیدا ہوا۔ دو تین سال ہوئے کہ **دارالمصنفین** اعظم گڑھ (یوپی۔ ہندوستان) میں مسلم دانشوروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ تاریخ اسلامی کے محاذ پر دشمنان اسلام کے حملوں کا کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ نیز یہ کہ تاریخ اسلام کی اصلاح ہونی چاہئے اور اس کی غلطیوں کو دور کرنا چاہئے۔ ابھی تک اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ اور بظاہر کوئی توقع بھی نہیں کہ کوئی مفید نتیجہ نکل سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کانفرنس کے بانی اور شرکاء زیادہ تر **شیعیت نواز** ذہن رکھنے والے، مکائد روافض سے بے خبر، اور ان کے فریب میں گرفتار افراد تھے۔ یہ تاریخ کی اصلاح کیا کرسکتے ہیں؟ جو لوگ ابن جریر طبری، محمد بن اسحٰق، واقدی و **امثالہم** کے ایسے کذابوں، اور دشمنان اہلسنت کو "امام اہلسنت" کہتے ہوں ان کی فریب کاریوں اور دروغ بافیوں سے بے خبر ہوں، اور ان کی کتابوں پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوں اسلامی

جرجی زیدان کا نام میں نے بطور مثال پیش کیا ہے ۔ خصوصاً اس لئے کہ اس معاملے میں اس کی کتاب کی شہرت بہت ہوئی ۔ ورنہ اسلام پر اس پہلو سے حملہ کرنے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے۔

اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے سے منافقین اور یہود کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ یہ غلط تصویر غیر مسلموں کے لئے اسلام کی طرف آنے سے مانع ہوجائے اور ان کی راہ میں حائل ہوکر اسلام کی ترقی اور اس کے پھیلنے کو روک دے ۔

ہم عرض کرچکے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے سبائی نقشے کا تقاضا یہ ہے کہ امت مسلمہ قومی اور اجتماعی اعتبار سے جذبہ خود حقارتی کا شکار ہوجائے ۔ اور خود کو سب اقوام عالم سے زیادہ حقیر و ذلیل سمجھے ۔ لیکن کیا مسلمانوں یعنی اہل سنت میں چودہ پندرہ سو سال کے دوران کبھی ' قومی اور اجتماعی پیمانے پر جذبہ خود حقارتی اور تذلل پیدا ہوا ؟

تاریخ تعامل متواتر ' اور مشاہدات اس امر کی قطعی اور صاف صاف شہادت دے رہے ہیں کہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین پاک سے نسبت رکھنے والوں اور صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ائمہ ہدیٰ سمجھنے والوں میں ابتداء سے لے کر آج تک ایک دن بلکہ ایک لمحے کے لئے بھی یہ ذلیل اور مہلک جذبہ نہیں پیدا ہوا ۔ بعثت نبی کریم علیہ افضل الصلوات و التسلیم کے وقت سے آج تک ایک سیکنڈ کے لئے بھی اہلسنّت کے ذہن میں یہ وسوسہ نہیں گذرا کہ وہ بحیثیت امت اور قوم ذلیل و حقیر ' یا مستحق غلامی و محکومی ہیں۔

پھر تاریخ اسلام کے اس سبائی نقشہ سے دشمنان اسلام نے جو ناپاک اور سراپا کذب و بطلان نتائج نکالے ہیں کیا کوئی مسلمان انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم کرسکتا ہے ؟ کلّا جس شخص کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی موجود ہو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان سراپا کذب اور بدیہی البطلان نتائج کو نہیں تسلیم کرسکتا۔

ان دونوں باتوں پر نظر کرنے سے بدیہی طور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جمہور امت نے کبھی

تاریخ پر عادلانہ نقد کرکے سچ کو جھوٹ سے ممتاز کیسے کرسکتے ہیں ؟ اور اس محاذ پر مخالف اسلام مستشرقین کا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں ؟ اگر اس کانفرنس میں کچھ دانشور اسلامی ذہن اور سنی طرز فکر رکھنے والے بھی شریک ہوئے ہوں تو اس کی توقع ہوسکتی ہے کہ تاریخ کی اصلاح ہو اور وہ قوم کے لئے مفید ثابت ہو ۔ لیکن ان صاحبان کو " خارجی " ' ناصبی " ' " منکر حدیث " کے القاب و خطابات پانے کے لئے تیار رہنا چاہیے ۔

اپنی تاریخ کے اس بھیانک نقشے کو صحیح نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے دشمنان اسلام اور منافقین کی قلم کاری اور دروغ نگاری کا اثر سمجھتے رہے۔ امت کا اسے غلط اور خلاف واقعہ قرار دینا اور اس سے متاثر نہ ہونا اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ یہ خلاف واقعہ سراپا کذب و دروغ نقشہ سبائیوں اور سبائیت نوازوں کا خود ساختہ اور شیعی کارخانہ دروغ بافی و افتراء پردازی کا پرداختہ ہے۔ ہماری تاریخ اس سے بری ہے۔ ہمارے ادوار خلافت ان مکروہ اور سراپا کذب و افتراء الزاموں اور عیوب سے پاک ہیں۔ اگر یہ صحیح اور مطابق واقعہ ہوتا تو یقیناً جمہور اہل اسلام یعنی ان کی اغلب اکثریت اسے ضرور تسلیم کرتی اور خود حقارتی میں ضرور مبتلا ہوجاتی۔ جہاد، حصول آزادی، محکومی سے نفرت کے جذبات اس میں کبھی نہ پیدا ہوتے۔ اگر پیدا بھی ہوتے تو شاذ و نادر نہ کہ اس قدر کثرت و شدت کے ساتھ جو ہماری تاریخ اور اس وقت کے مشاہدات سے ظاہر و باہر ہے۔

علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہوتا تو شیعوں کو ہماری تاریخ تاریک بناکر دکھانے کے لئے تاریخ نگاری اور بیان روایت میں ان غلط اور مبنی بر بد دیانتی و خیانت طریقوں سے کام لینے کی ضرورت نہ پیش آتی، جن کی نشاندہی ہم صفحات ماسبق میں کرچکے ہیں۔ شیعوں کے زبردست پروپیگنڈے اور اسے موثر بنانے کے لئے مکروہ اور ناجائز تدبیریں کرنے سے صرف اتنا اثر ہوا کہ بعض جزئی واقعات کو اہلسنّت کے ایک طبقے نے اجمالی اور جزئی طور پر تسلیم کرلیا۔ مثلاً حادثہ کربلا، کو مگر اس کی بھی تفصیل نہیں تسلیم کی۔ جمہور امت مسلمہ اس زبردست پروپیگنڈے کے باوجود اسے اس طرح تسلیم نہیں کرتی جس طرح شیعہ اور شیعیت نواز سنی اسے بیان کرتے ہیں۔ ایک آدھ جزئی واقعہ کے سوا جمہور امت مسلمہ نے اپنی تاریخ کا وہ نقشہ آج تک صحیح نہیں سمجھا جو شیعہ اور سنی نما شیعہ پیش کرتے ہیں۔ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس اور ان کے ادوار حکومت کے متعلق آج بھی جمہور اہلسنّت جن میں عوام و خواص سب داخل ہیں۔ بہت اچھی رائے رکھتے ہیں، موقع ہوتا ہے تو ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوجاتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ اور یہ فخر بالکل بجا ہے۔ بلاشبہ یہ ادوار بحیثیت مجموعی قابل صد تحسین اور لائق فخر و مباہات ہیں۔ **(ولو کرہ المجرمون)**

مبحث ثالث

ہماری تاریخ ہر طرح قابل ستائش و تحسین، تابندہ، درخشاں اور بے نظیر ہے
ہمیں اپنی تاریخ پر فخر ہے، یہ فخر بجا ہے،
کیونکہ دنیا کی کوئی قوم ایسی درخشاں اور قابل تحسین تاریخ نہیں پیش کرسکتی

مندرجہ بالا عنوان میرے ذہن کا ساختہ نہیں ہے، بلکہ یہ جمہور اہلسنّت کے دل کی آواز اور ان کا وجدانی احساس ہے۔ جسے میں نے اپنے قلم کے ذریعہ ٹیپ کرکے الفاظ کے قالب میں اس مضمون کا عنوان بنالیا۔

آپ کسی پڑھے لکھے مسلمان سے یہ سوال کریں کہ اسلامی تاریخ کیسی ہے؟ اور مسلمانوں کا ماضی کیسا رہا ہے؟ اور اس کا مجمل جواب طلب کریں تو یقیناً وہ یہی جواب دے گا کہ ہماری تاریخ کا کیا پوچھنا؟ وہ تو بہت بلند پایہ، ہر طرح قابل تحسین و ستائش ایک نورانی تاریخ ہے، ہاں یہ جواب دینے کے لئے یہ شرط ہے کہ جس شخص سے آپ سوال کررہے ہیں۔ اس کا ذہن شیعیت کے زہر سے مسموم نہ ہوچکا ہو۔ اہل سنت میں (جن کی دنیا میں غالب اکثریت ہے) صرف ان لوگوں کی زبان سے آپ اسلامی تاریخ کے بارے میں مذمت کے کلمات سنیں گے، جن کے ذہن میں رفض کا زنگ کسی نہ کسی مقدار میں لگ چکا ہے۔ ایسے افراد کی تعداد بہت قلیل ہے۔ جمہور اہل اسلام کا تصور تاریخ کے متعلق وہی ہے، جسے ہم نے عنوان مضمون بنایا ہے۔ لیکن یہ تصور کیوں ہے؟ اس کی اساس اور بنیاد کیا ہے؟

اسلامی تاریخ کی تحسین کی بنیاد

ممکن ہے کہ کسی کو شبہ ہو کہ اپنی تاریخ کی تحسین و ستائش ایک طبعی جذبہ ہے۔ جو ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی تاریخ کی مدح و ستائش کی جائے۔ درحقیقت اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو اپنی عظمت کا قائل بنایا جائے اس اصول کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کو قابل مذمت سمجھنے کے باوجود اس کی مدح و ستائش میں **رطب اللسان** رہتے ہوں۔ تاکہ دوسری قوموں کی نظروں میں امت مسلمہ کا وقار بلند ہو' اور وہ ان کی نظروں سے گر نہ جائیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ بالکل بے بنیاد اور غلط ہے۔ مندرجہ ذیل وجوہ سے اس کی غلطی بالکل واضح ہوجاتی ہے:۔

اول:۔ جو قوم صرف اپنے وقار کے تحفظ کے لئے خلاف واقعہ اپنی تاریخ کی مدح و ستائش کرتی ہے۔ وہ یہ طرز صرف غیروں کے سامنے اختیار کرتی ہے' مگر خود اپنی قوم کے افراد یا جماعتوں کے سامنے اس کا یہ طرز نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے افراد آپس میں اپنی تاریخ کی مذمت کرتے ہیں' اور اپنے ادوار تاریخی کے مذموم و قابل ملامت حوادث و واقعات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اور ایسا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو انہیں غلط بیانی کے الزام کا اندیشہ ہوتا ہے کہ مخاطب جو انہیں کا ہم قوم ہوتا ہے۔ ان کی تکذیب نہ کردے' دوسرے وہ اپنے ہم قوموں کو اپنی اصل قومی تاریخ سے واقف بنانا بھی چاہتے ہیں۔ اس واقف بنانے میں متعدد مصلحتیں ان کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا رویہ یہ نہیں ہے۔ وہ جس طرح غیروں کے سامنے اپنی تاریخ کی مدح و ستائش اور اس پر فخر کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح اپنے ہم قوموں کے سامنے بھی اس کی تابانی و درخشندگی اور خوبی و استحسان کو پورے اطمینان و اعتماد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک سنی جس طرح ایک ہندو' مسیحی' یہودی سے اپنے ادوار تاریخی کی رفعت اور خوبی کا تذکرہ سر افتخار بلند کرکے کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کے سامنے بھی اس کا تذکرہ اسی طرز اور اسی لب و لہجہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس واضح فرق سے عیاں ہے کہ جمہور اہل اسلام اپنی تاریخ کی مدح و ستائش اس لئے نہیں کرتے کہ دوسری قوموں کی نگاہ میں ان کا وقار قائم رہے۔ وہ اس صداقت کی تصدیق اور اس **حقیقت واقعیہ** کا اظہار کرتے ہیں جس کا انہیں پختہ اور کامل یقین ہے۔

دوم :۔ مسلمان اپنی تاریخ کی ستائش و توصیف صرف مثبت انداز میں نہیں کرتے بلکہ غیر مسلموں کے سامنے تقابلی انداز میں بھی بکثرت پیش کرتے ہیں ' روم ' ایران ہندوستان ' ترکستان وغیرہ کے حالات قبل اسلام و بعد از اسلام کا موازنہ کرکے دور خلفاء و سلاطین و امراء اسلام کی مدح و ستائش اور قبل ورود اسلام ان ممالک کے سلاطین و امراء کے دور کی مذمت کرتے ہیں ۔

اس تقابلی بیان تاریخ کی جرات وہی کرسکتا ہے جسے اپنی تاریخ کی خوبی پر پورا اعتماد و یقین ہو ' صرف قومی وقار کے تحفظ کے لئے کوئی بھی غلط بیانی کی جرات نہیں کرسکتا ۔ کیونکہ اگر مقابل اس کے بیان کی غلطی مدلل طریقے سے واضح کردے ۔ تو قصر فخر یکایک مسمار ہوجائے اور قومی وقار میں اضافے کے بجائے مزید ذلت و رسوائی ہو ۔

ان واضح وجوہ سے عیاں ہے کہ شیعی ارجاف کا اثر صرف ایک گروہ پر ہوا ۔ اور جمہور اہل اسلام پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ جمہور مومنین اپنی تاریخ کو پورے وثوق و یقین کے ساتھ قابل صد ستائش اور تابندہ و درخشاں سمجھتے ہیں ۔ اور اس پر فخر کرتے ہیں

ازالہ شبہ کے بعد ہم اصل مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے متعلق جمہور اہل اسلام کی مذکورہ بالا رائے کی بنیاد کیا ہے ؟ کیونکہ ماضی کا مشاہدہ تو غیر ممکن ہے ۔ یہ رائے تو کسی دلیل ہی پر مبنی ہوسکتی ہے خواہ وہ دلیل نقلی ہو یا عقلی ۔ وہ دلیل کیا ہے ؟

تواتر نفسی

ہر انسان بچپن سے بڑھاپے تک منزل بہ منزل پہنچتا ہے ۔ منزل شباب پر پہنچتا ہے تو بچپن کے بہت سے واقعات فراموش کردیتا ہے ' بڑھاپے میں حافظہ اور بھی ضعیف ہوجاتا ہے ۔ اپنے بچپن کے بہت سے ساتھیوں کو اور دوستوں کو دیکھے ہوئے مدت دراز گزر گئی ہو ' تو دیکھنے پر پہچاننے سے قاصر رہتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود بچپن سے لے کر بڑھاپے کی منزل تک جن ادوار اور منازل سے وہ گزرچکا ہے ان کا ایک اجمالی مگر جامع تصور اس کے ذہن میں ضرور محفوظ ہوتا ہے ۔ وہ واقعات کو بھول جاتا ہے ۔ مگر اس فضاء کو نہیں بھولتا جو ان واقعات و حوادث کی وجہ سے پیدا ہوئی ' جسے اس دور کی خصوصیت بلکہ روح (SPRIT OF THEAGE) کہہ سکتے ہیں ۔ واقعات یاد نہیں رہتے مگر یہ یاد رہتا ہے کہ

بحیثیت مجموعی میرا بچپن اور میرا شباب کیسا گذرا؟ صحت اچھی رہی یا امراض کا ہجوم رہا۔ غربت و تنگدستی میں گزری یا سکون و راحت میں؟ اساتذہ شفیق تھے یا نہیں؟ پاس پڑوس کے لوگوں کا برتاؤ اچھا تھا یا برا؟ اور اس طرح کی دوسری باتیں مرتے دم تک اسے یاد رہتی ہیں۔ اور اپنے ان ادوار سے اس تاثر کے تصور کو وہ بسا اوقات اپنی اولاد کی طرف منتقل کردیتا ہے۔

اس مثال کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے مگر قوموں کا حال بھی یہی ہے۔ بلکہ اجتماعی زندگی میں یہ عمل زیادہ نمایاں اور طاقتور ہوتا ہے۔ تاریخ جس طرح کتابوں کے اوراق ' زبانی روایات ' حوادث کے نشانات و علامات کے ذریعہ منتقل ہوتی ہے۔ اسی طرح نفسی طریقہ سے بھی منتقل ہوتی ہے۔ اور یہ طریقہ نسبتاً سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے

کسی قوم پر اس کی ابتداء سے جتنے دور گذر چکے ہیں ' ان میں سے ہر دور کا ایک تصور اس کے قومی اور اجتماعی ذہن میں محفوظ ہوتا ہے۔ جو اسے اپنے پیشرووں سے ورثہ میں ملتا ہے۔ کوئی متمدن قوم اپنی تاریخ فراموش نہیں کرتی۔ اپنے ماضی کے ہر دور کی فضاء اس کے خصائص ' اس کی روح اور اس کا جزو غالب (DOMINANT FACTOR) یہ سب ایک مجمل مگر جامع تصور کی صورت میں اسے ملتے ہیں۔ یہ درحقیقت قوم کے اجتماعی ذہن کا مجموعی تاثر ہوتا ہے جو بصورت تصور وہ اپنے بعد آنے والے دور کی طرف منتقل کرتا ہے اور وہ یہ ترکہ اپنے بعد کے دور کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ زبان یا قلم سے واقعات و حوادث نقل کرنے میں غلطی کا امکان ہے ' بلکہ بکثرت غلطیاں ہوتی ہیں مگر اس نقل نفسی میں غلطی کا امکان بہت کم بلکہ تقریباً معدوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں جا بہ جا مشرکین عرب کے خلاف ان کی تاریخ سے حجت قائم فرمائی گئی ہے۔ اگر یہ تاریخ انہیں یاد نہ ہوتی ' یا وہ اسے صحیح تسلیم نہ کرتے تو اس کا بیان ان پر حجت کیوں ہوتا؟ نیز جادہ حق سے ان کے انحراف کی دلیل کیسے بن سکتا تھا؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اہم واقعات و تصورات ان کے قومی و اجتماعی حافظہ میں موجود تھے۔ مثلاً حضرت ابراہیم و **حضرت اسماعیل علیہما السلام** کا نبی و رسول ہونا ' اور ان دونوں حضرات کا موحد کامل اور توحید کا داعی و معلم ہونا۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے۔ یہ بات اہل عرب کو یاد تھی ان میں سے کسی نے کبھی نہ تو ان کی نبوت کی تردید کی ' اور نہ ان کے موحد ہونے کی۔ دور ابراہیمی اور دور **اسماعیلی (علیہما السلام)** میں جو توحید و عبادت الٰہی کی فضا بنی ہوئی تھی ' اور جس سے ان ادوار بلکہ بعد کے بعض

ادوار کے افراد بھی متاثر تھے ' یہ سب چیزیں عرب کے حافظے میں محفوظ تھیں ۔ تعمیر بیت اللہ ' اس کا مقصد اس کی قدامت و عظمت ' حج ' حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بحکم الٰہی ذبح کرنے کا عزم فرمانا ' بحکم الٰہی آں محترم کو ان کی والدہ محترمہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وادی مکہ میں چھوڑ جانا ' حضرت ہاجرہؓ کا پانی تلاش کرنے کے لئے صفا و مروہ کے درمیان آنا جانا ' زمزم کا جاری ہونا ' وغیرہ واقعات جو ان کے تاریخی ادوار کے خصائص ان کی روح اور ان فضاؤں کے مخصوص الوان تھے ' انہیں محفوظ تھے '

ان ادوار کے اخلاقی اقدار کے تصورات سے بھی ان کا ذہن خالی نہیں تھا ۔ یہاں تک کہ ملت ابراہیم کا اجمالی تصور بھی ان کے ذہن میں موجود تھا ۔ اس کے متعدد اجزاء عملاً بھی ان کے یہاں موجود تھے ۔ اگرچہ خالص نہ رہے تھے بلکہ ان میں بدعات کی آمیزش ہوگئی تھی ۔

اہل عرب کو یہ بھی یاد تھا کہ ان کی تاریخ میں ایک مدت دراز کے بعد ایک دور ایسا بھی آیا جس میں ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والوں نے اس میں تبدیلیاں کیں ' اور قوم شرک و بدعات میں مبتلا ہوگئی ۔ وہ اس دور کے سال و ماہ تو نہیں بتا سکتے تھے لیکن انہیں یاد تھا کہ یہ دور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات پر ایک مدت دراز گذرنے کے بعد شروع ہوا تھا ۔ اہل عرب کے پاس نہ تو کوئی تاریخ کی کتاب تھی۔ اور نہ کوئی باقاعدہ روایت کا سلسلہ تھا ۔ لیکن اپنی تاریخ کا ہر دور اپنی مخصوص فضا اور خصائص و اقدار سے تاثر کی ایک مجمل مگر جامع تصویر کی صورت میں ان [illegible] ذہن میں موجود تھا۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی جس میں یہ واقعات لکھے ہوں ' بلکہ ماضی کا یہ قیمتی سرمایہ ان تک صرف " تواتر نفسی " کے ذریعہ پہنچا تھا ۔ یہ مثال ہمارے اس نظریئے کی ایک واضح دلیل ہے ' کہ کوئی متمدن قوم اپنی تاریخ فراموش نہیں کرتی جزئی حوادث و واقعات اس کے حافظے سے محو ہوسکتے ہیں۔ اور ہوجاتے ہیں۔ لیکن اپنے ماضی کے ہر دور کا ایک مجمل مگر جامع تصور جو اس دور کے خصوصیات ' اس کی روح اور اس کے جزو غالب DOMINANT FACTOR پر مشتمل ہوتا ہے ' اس کے ذہن میں ضرور محفوظ رہتا ہے ۔ کوئی قوم اسے فراموش نہیں کرتی ۔ اور جن قوموں نے خارجی اثرات کی وجہ سے اسے فراموش کردیا وہ بحیثیت قوم اپنا وجود بھی کھو بیٹھیں ۔ ان کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہی اور وہ کسی دوسری قوم میں جذب ہوگئیں ۔ یا کسی قوم کی تابع مہمل بن گئیں۔ اس کی مثال

ہندوستان کے اچھوت ہیں جنہوں نے ہندوؤں میں جذب ہو کر اپنا وقار و استقلال کھو دیا۔(۱)

نفسیات اجتماع کے اسی اصول کے ماتحت امت مسلمہ نے بھی اپنی تاریخ محفوظ رکھی۔ اپنے ماضی کے ہر دور کے متعلق امت کے ذہن میں ایک تصور موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک و مقدس دور اور عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تقدس اور علو و رفعت ' سراپا درخشانی و عظمت اور قابل صد فخر ہونے کا یقین و اذعان تو ایمان کا تقاضا ہے اور ہر مومن کے قلب میں بدیہیات کی طرح جاگزیں ہے۔ اس کے بارے میں کسی بحث و تمحیص کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ سوال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد کے دور کا ہے۔ اگرچہ دور صحابہؓ تو ان پر ختم نہیں ہوا کیونکہ ان کی وفات کے بعد بھی ایک معتدبہ تعداد صحابہ کرامؓ کی خاصی مدت تک باقی رہی۔ مگر دور خلافت راشدہ ان پر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے بعد کوئی صحابی خلیفہ نہیں ہوا۔ (۱) ان کے بعد اندازاً ۷۰ ' ۸۰ سال کا اموی دور کہلاتا ہے۔ اس کے بعد عباسی دور شروع ہوتا ہے ' جو تقریباً ۵ صدیوں تک قائم رہا۔ ان کے علاوہ اندلس (اسپین یورپ) میں اموی عہد خلافت ہے جو تقریباً آٹھ صدیوں تک رہا۔ خلافت اسلامیہ کے یہ ادوار ثلاثہ بھی جمہور اہلسنت کے نزدیک قابل صد فخر ہیں۔ وہ ان کی عظمت و تابانی کے معترف ہیں ' اور بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبی اور رفعت کی نظیر
دنیا کی کوئی قوم نہیں پیش کر سکتی اور تاریخ گواہ ہے کہ ان کے اس دعوے کی مدلل تردید کی جرات آج تک کوئی قوم نہیں کر سکی۔ ان کے اس یقین و اذعان کی دلیل و برہان خود ان کا یہ یقین اور قطعی تصور ہے کیونکہ یہ علم و یقین متواتر قسمی ہے یعنی نسلاً بعد نسلٍ "متواتر قسمی" کے ذریعہ منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا ہے۔ اس کی انتہا اجتماعی مشاہدے پر ہوتی ہے۔ اور تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اجتماعی مشاہدہ انفرادی مشاہدے سے زیادہ طاقتور اور یقین افزا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انفرادی روایات اور کتب تاریخ کے شخصی بیانات کا

---

(۱) مختلف حالات و اسباب سے ہندوستان کی اچھوت قوموں میں اب قدرے بیداری پیدا ہوئی ہے۔ خواب غفلت سے چونکتے ہی انہوں نے اپنی جستجو شروع کر دی۔ اونچی ذات کے ہندو ان کی تاریخ گم کر چکے ہیں۔ اس لئے اس کی بازیابی میں سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔ مگر وہ مصروف جستجو ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود رہی۔ اس لئے ہم نے اس سلسلے میں ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اس حقیقت سے متعارف ہونے کے بعد مخالفین خلافت اسلامیہ کے مطاعن و اعتراضات مذکورہ کا غلط ہونا خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے۔ جو روایتیں اس تصور متواتر کے منافی ہوں اور اسے غلط قرار دیں وہ قطعاً مردود اور کاذب ہیں۔ اخبار آحاد اور انفرادی روایات تواتر نفسی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تاریخی روایتیں مورخین کے آراء و خیالات یا بعض علماء کے ذاتی افکار و آراء، کی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ وہ یقیناً اس کے مقابلے میں مردود ہیں۔

ان مطاعن و اعتراضات کی صحت و غلطی معلوم کرنے کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان روایات کی جانچ پڑتال کریں جن پر یہ مبنی ہیں، اور ان کے رواۃ کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے کتب رجال کی ورق گردانی میں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔ تاریخی روایتیں احادیث نہیں ہیں۔ جن کے رد و قبول کا فیصلہ کرنے کے لئے اتنی درد سری اور کد و کاوش برداشت کی جائے۔ جو روایتیں اسلامی تاریخ کے اس تصور متواتر کے منافی ہیں وہ یقیناً جھوٹی ہیں۔ خواہ ان کے راوی ثقہ ہوں یا غیر ثقہ۔ اپنی تاریخ کے متعلق ہمارا یہ علم و یقین تواتر نفسی اور اجتماعی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس تواتر نفسی کے مقابلے میں انفرادی رواتیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سبائیوں اور سبائیت نوازوں کی دروغ بافی، تشہیر اور ارجاف کے باوجود اپنی تاریخ کی تحسین کا تصور جمہور مسلمین کے ذہن میں علی حالہ قائم اور مستحکم رہا۔ مخالفین کے روایات و آراء اس سے ٹکراکر خود پاش پاش ہوگئے، مگر اس کے استحکام میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔

ہماری تاریخ اموی و عباسی ادوار کے ساتھ تو مخصوص نہیں۔ خلافت ترکیہ بھی مدت دراز تک قائم رہی، ہندوستان میں دولت مغلیہ وغیرہ کے ادوار بھی ہماری تاریخ کا جزو ہیں۔ لیکن دمشق، بغداد اور اندلس کی خلافتوں کو پوری امت مسلمہ جانتی ہے، کیونکہ ان کا سرا اسلام کے اولین دور سے ملتا ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے پوری دنیا میں اسلام کا پیام پہنچایا۔ اس لئے ان کا اثر عالمگیر ہوا۔ دنیا کے سب مسلمان ان سے واقف ہیں۔ بخلاف اس کے خلافت ترکیہ یا بادشاہی ادوار حکومتوں کو یہ وسعت نہیں نصیب ہوئی۔ اس لئے ان میں سے ہر دور کی تاریخ پوری امت کو محفوظ نہیں۔ لیکن جس خطہ ارضی سے ان میں سے کسی حکومت کا تعلق رہا ہے اس میں رہنے والے مسلمانوں کو ان ادوار کی تاریخ بھی یاد ہے اور اس کے متعلق بھی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ انہیں خوبی میں اموی و عباسی ادوار کے برابر نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے فروتر جانتے ہیں۔ اگرچہ دوسری قوموں کی تاریخ سے

بہت بہتر اور اس کے مقابلے میں لائق فخر سمجھتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے مندرجہ بالا ادوار کے فرق مذکور کا احساس و شعور بھی اس بات کی علامت ہے کہ اپنی تاریخ کے متعلق امت مسلمہ کا احساس و شعور اجتماعی بیدار اور قوی ہے۔ اور اپنی تاریخ کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے۔

واقعات جو تواتر سے ثابت ہیں اسلامی تاریخ کی خوبی و عظمت کی شہادت دیتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ کی عظمت اور خوبی جس طرح تواتر نفسی سے ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح ایسے واقعات سے بھی نمایاں ہوتی ہے جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور جنہیں ان کے موافق و مخالف سب تسلیم کرتے ہیں ۔ ان واقعات کو تسلیم کرنے کے بعد ان مبارک ادوار خلافت کی رفعت اور خوبی کو تسلیم کرنا لازم ہے ۔ ان واقعات کا انکار نہیں ہوسکتا ۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ادوار خلافت بہت مبارک تھے اور ان کی جو تصویر سبائیوں نے پیش کی ہے وہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے ۔ خبر متواتر کے مقابلے میں اخبار آحاد خصوصاً تاریخی روایات کی کوئی حقیقت نہیں ۔ اس قسم کی تاریخی روایتیں جو ان مبارک ادوار خلافت کو داغدار ظاہر کرتی ہیں ۔ قطعاً مردود ہیں ۔ ایسی روایتیں سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں کی گڑھی ہوئی ہیں یا ان کے بیان کرنے میں انہیں ارجانی و تشہیری مکائد سے کام لیا گیا ہے جن کا تذکرہ ہم چند صفحات پہلے کرچکے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسی کوئی روایت مل سکتی ہے جسے تسلیم کرنا لازم ہو تو اس کی حیثیت جزوی اور استثنائی ہوتی ہے اور اس کے مخصوص سبب کی تحقیق کے بعد اس کی حیثیت محض اور وقتی رہ جاتی ہے ۔ اس سے کوئی کلیہ اخذ کرنا صحیح اور جائز نہیں اور اسے تاریخ کا جزو سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اب ہم چند ایسے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور جن کی صحت تسلیم شدہ ہے۔

اموی اور عباسی دور میں اسلام کی اشاعت

جب کوئی مملکت (STATE) کسی خاص اصول اور عقیدے کی بنیاد پر قائم کی جائے اور دور موجودہ کی اصطلاح میں "نظریاتی مملکت" ہو، اور وہ عقیدہ صحیح بھی ہو تو حکومت کے حسن و قبح کو معلوم کرنے کا ایک طریقہ اور معیار یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ نئے

اور اجنبی لوگ اس سے کس حد تک متاثر ہوئے ۔ اس زاویئے سے اسلامی تاریخ پر نظر کرنے سے آسانی کے ساتھ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اموی و عباسی ادوار کیسے تھے ؟

علم دین اور دعوت اسلام کی اشاعت کرنا اس کی دعوت دینا ۔ احکام شرعیہ کا نفاذ کرنا اور ہدایات کتاب و سنت کی تعمیل کی ترویج کرنا ' اسلامی مملکت کے مقاصد ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا ادوار خلافت میں یہ مقاصد کس درجہ میں حاصل ہوئے ؟

یہ واقعہ صرف اوراق تاریخ سے نہیں بلکہ تواتر سے ثابت ہے ' جس کا انکار تاریخ اسلام کا بڑے سے بڑا ناقد بھی نہیں کرسکتا ۔ کہ اموی و عباسی ادوار میں اسلام نور آفتاب کی طرح سرعت اور وسعت کے ساتھ پھیلا ۔ اور تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ترکستان ' چین ' افریقہ ' ہندوستان ' جاوا ' یورپ وغیرہ دنیا کے ہر متمدن خطے میں اسلام کا نور پہنچ گیا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود اور دور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جو وراثت انہیں ملی تھی ' اسے انہوں نے اپنی کمائی سے اضعافاً مضاعفۃً کردیا۔ صرف مسلم مورخین نہیں بلکہ مسیحی مورخین بھی بیان کرتے ہیں کہ اسپین میں اموی فاتحین کے قدم پہنچتے ہی اسلام سیل رواں کی طرح پھیلنے لگا اور مسیحی جوق جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے ۔ خلافت یزیدؒ کے دور میں افریقہ کے بربر قبائل تقریباً سب کے سب مشرف بہ اسلام ہوگئے ۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ۔ ہندوستان میں غازی محمد بن قاسم رحمہ اللہ کے داخل ہوتے ہی اسلام پھیلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل گیا ۔ اور اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی ۔ اموی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی اسلام کی روشنی پھیلتی رہی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی ۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوکر پاکستان وجود میں آیا ہے تو سندھ میں مسلمان ۷۵ فیصد تھے ۔ یہ اموی لشکر ہی کی تبلیغ ان کے ایمان اور ان کی اخلاقی بلندی کا اثر تھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی اس سرزمین میں مدت دراز تک نور ہدایت پھیلتا رہا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ۔

مختصر یہ کہ خلافت اسلامیہ کے ان دونوں مبارک ادوار میں اسلام کی اشاعت خوب ہوئی ' اور اتنی کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان ادوار کے حکمراں فاسق و فاجر اور ظالم و جابر تھے ۔ تو انہیں دیکھ کر اتنے آدمی مشرف بہ اسلام کیسے ہوگئے ؟ اسلام کا عملی نمونہ دیکھے بغیر لوگوں کو اسلام کی طرف کشش اور رغبت کیسے ہوئی ؟ جبکہ ان نومسلموں میں ایک فی ہزار بھی ایسا نہ تھا جس

نے اسلام کا مطالعہ کیا ہو ؟

ان مبارک ادوار میں دین حق کا اس تیزی کے ساتھ پھیلنا اور بکثرت غیر مسلموں کا شرح صدر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہونا اس حقیقت کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ یہ حکمران متقی 'رعیت پرور اور اعلیٰ کردار رکھنے والے تھے ۔ اور ان کے ادوار کی فضا اسلامی اور روح پرور تھی ۔ جسے دیکھ کر غیر مسلموں کو اسلام کی طرف کشش اور رغبت ہوتی تھی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے تھے ۔

اگر ہماری تاریخ کی وہ تصویر صحیح ہوتی جو سبائی موقلم نے تیار کی ہے تو اموی و عباسی ادوار میں اسلام اس تیز رفتاری کے ساتھ نہ پھیلتا اور اتنی کثرت کے ساتھ لوگ مشرف بہ اسلام نہ ہوتے ۔ ان خلفاء اسلام اور ان کے عمال وولاۃ نے خود اسلام کی دعوت دی ' تاریخ شاہد ہے کہ ان ادوار ' خصوصاً بنی امیہ کے مبارک دور خلافت میں فوج کے معمولی سپاہی بھی داعی الی اللہ ہوتے تھے اور غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ مسلمانوں کے اخلاق عالیہ ' اعلیٰ کردار ' مساوات ' صداقت ' عفت و پاکبازی ' ان کی ذہنی و فکری بلندی و برتری ' ان کے حکمرانوں کا عدل و انصاف ان کی رعیت پروری ' اور وسعت قلبی و رحم دلی ۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے متاثر ہوکر کثیر تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے (۱)

اگر مسلمان اپنی تاریخ پر ناز کرتے ہیں اور اسے تاریک بتانے والوں کو منافق سمجھتے ہیں تو یقیناً ان کا رویہ بالکل بجا ہے ان کا ناز اور فخر بھی بجا ہے اور ان کی یہ رائے بھی صحیح ہے ۔

ادوار خلافت اسلامیہ پر نظر ڈالنے والے کی توجہ ایک طرف تو اسلام پر لبیک کہنے والوں کا ہجوم اپنی طرف منعطف کرے گا دوسری طرف ان مبارک ادوار کے شاندار دینی '

---

(۱) اس وقت بحمداللہ سعودی عرب (حجاز و نجد) میں صحیح معنی میں اسلامی نظام اور اسلامی حکومت قائم ہے ۔ وہاں کے کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے کے لئے کوریا وغیرہ سے بہت سے آدمی بطور ملازم اور اجیر وہاں آکر مقیم ہوئے ۔ انہیں کسی نے بھی اسلام کی دعوت نہیں دی مگر سعودی عرب کے مسلمان باشندوں کا اعلیٰ کردار ' وہاں کے معاشرے کی خوبی و دل آویزی اور تقویٰ و خشیت و محبت الٰہی کی فضا دیکھ کر ان کی خاصی بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوچکی ہے ۔ الحمدللہ ۔ یہ ایک نمونہ ہے جس سے یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ اسلام کیسے پھیلا ۔

علمی اور روحانی خدمات شدت کے ساتھ اس کی نگاہ کو اپنی طرف کھینچیں گے ۔ اموی و عباسی دور میں قرآن مجید کی جو عظیم الشان خدمت کی گئی ' وہ محتاج بیان نہیں ۔ اگر سب کتب تاریخ دریا برد کردی جائیں تو بھی ان خدمات جلیلہ کی درخشانی پوشیدہ نہیں ہو سکتی ۔ اور امت مسلمہ ان کا اعتراف و اقرار کرتی رہے گی ۔ خصوصاً اموی دور میں جو خدمت کتاب اللہ کی انجام پائی اور جس میں اس دور کا حصہ غالب ہے ' وہ تو اور زیادہ نمایاں اور تابناک ہے ۔ قرآن مجید کی اشاعت و حفاظت کا بذریعہ تحفیظ و کتابت خاص اہتمام کیا گیا۔ خلافت بنی امیہ کے زمانہ میں ' جو پوری ایک صدی پر بھی محیط نہیں ہے ۔ پورا قرآن مجید حفظ کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی ۔ عباسی دور میں یہ لاکھوں سے بھی متجاوز ہوگئی ۔ یہ واقعہ مشہورو معروف ہے کہ قرآن مجید پر اعراب حجاج ابن یوسف مرحوم نے لگوائے ۔ کتاب اللہ کا رسم خط بھی محفوظ رکھا گیا ۔ اور اسی رسم خط میں اعراب لگاکر پورے اہتمام سے پورے قرآن مجید کی کتابت کروائی گئی اور اس مختصر عہد اموی میں ہزاروں مشکول نسخے (۱) نشر ہوکر اہل ایمان کے ہاتھوں میں پہنچ چکے تھے ۔ تجوید قرآن کا بھی خاص اہتمام کیاگیا ۔ بکثرت مجود قرآء تعلیم قرآن کریم میں معروف رہتے تھے ۔ مساجد میں امامت صلوٰۃ کے لئے یہ لازم تھا کہ امام مجود قاری ہو ۔ حکومت کی طرف سے تعلیم و تفہیم اور تحفیظ قرآن کریم کے لئے ۔ دور دراز علاقوں میں بھی علماء و حفاظ بھیجے جاتے تھے ۔ جو اس کی تعلیم کو عام کرتے تھے ۔ اور تابہ امکان بستی کے ہر شخص کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے ۔ اور اس کے معانی و مضامین کی تشریح و تفسیر بھی انہیں سمجھاتے تھے ۔ دشمنان بنی امیہ بھی اس واقعہ کا انکار نہیں کرسکتے کہ بلحاظ خدمت کتاب اللہ بنو امیہ کا یہ مختصر دور خلافت ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۔ عہد بنی عباس میں بھی خدمت قرآن کریم کا کام جاری رہا۔ اس اعتبار سے اس عہد خلافت کا امتیاز یہ ہے کہ اس نشر و اشاعت کے ساتھ تفسیر کتاب مبین کا کام زیادہ ہوا۔ بکثرت تفاسیر اسی دور میں لکھی گئیں (اور یہ خدمات عربوں تک نہیں محدود رہے بلکہ غیر عربی لوگوں نے بھی ان میں پورا پورا حصہ لیا ۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب اللہ کا یہ شغف ان ادوار کی فضائے عام (GENERAL ENVOIRONMENT) تھی ۔ لیکن اس فضائے عام کو وجود میں لانے ' اور خدمت قرآن مجید کا اہتمام کرنے میں خلفاء اور ان کے عمال کے نمایاں حصے

(۱) عربی میں مشکول ایسی عبارت کو کہتے ہیں جس پر اعراب (زیر زبر پیش) لگے ہوئے ہوں۔

سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ بات اس قدر نمایاں اور روشن ہے کہ ان کے مخالفین بھی اسے نہیں چھپاسکے ۔ تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس سے باخبر ہے ۔ قرآن مجید کے بعد حدیث شریف کا درجہ ہے ۔ اس کا شیوع اور چرچا ان ادوار خلافت میں جیسا ہوا ' اس سے حدیث کا ہر متعلم واقف ہے۔ اموی دور میں مکہ معظمہ مدینہ منورہ ' دمشق 'کوفہ ' بصرہ یہ سب تعلیم حدیث کے اہم مرکز تھے ۔ ان مقامات پر ہزاروں طالبان علوم حدیث کا مجمع رہتا تھا ۔ باقاعدہ تدوین حدیث کا کام عہد بنی امیہ ہی میں شروع ہوا۔ عباسی دور خلافت اس کی مزید ترقی کے لئے بہت ساز گار ثابت ہوا ۔ فقہ حنفی عہد اموی ہی میں مکمل ہوچکا تھا ۔ اگرچہ اس کی تدوین کا سلسلہ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں بھی جاری رہا فقہ مالکی کی ابتداء عہد اموی میں ہوئی اور تکمیل عہد عباسی میں ۔ خلافت اسلامیہ امویہ اندلسیہ نے اسے اپنا دستور و قانون بنایا اور صدیوں تک نظام حکومت کتاب اللہ اور موطا امام مالک ؒ کی روشنی میں چلاتے رہے ۔ عہد عباسی کو یہ فخر حاصل ہے کہ فقہ شافعی و فقہ حنفی دو ایسے فقہ جن کے متبعین کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہے ' اسی عہد میں ابتداء سے کمال تک پہنچے تاریخ اسلام کے طالب علم پر یہ حقیقت بھی مخفی نہیں رہ سکتی کہ دمشق ' بغداد ' اندلس میں مسند خلافت پر بیٹھنے والے سب خلفاء صف اول کے علماء دین تھے ۔ یہ مفسر ' محدث اور اعلیٰ درجہ کے فقیہ تھے۔ بلکہ تقریباً سب مقام اجتہاد پر فائز تھے۔ مودودی صاحب اور ان کے ہم مشرب جو تاریخ اسلام کو مسخ کرنا چاہتے ہیں ' یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان سب ادوار میں علماء اور حکومتوں کے درمیان نفرت کی خلیج حائل رہی اور علماء نے جو دینی خدمات انجام دیئے وہ حکومت سے بے تعلق ہو کر اور خود اپنا ایک نظام بنا کر انجام دیئے ۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کو اس قدر کھلی ہوئی غلط بیانی کی جسارت کیسے ہوتی ہے ۔ آئندہ صفحات میں مناسب موقع پر ہم انشاء اللہ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کریں گے ۔

تاریخ اسلام قرآن و حدیث کی روشنی میں

ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی و رسول ہیں۔ اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے ۔ قرآن مجید اور سنت نبی کریم علیہ افضل الصلوات و التسلیم تا قیام قیامت ہادی و رہنما ہیں۔ قرآن مجید اور حدیث شریف

میں یہ بات بہت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ تاکہ کسی کو بھی اشتباہ نہ ہو۔ اور کسی دوسرے دین کی آمد کا انتظار نہ رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح فرمادیا گیا ہے کہ یہ دین قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس کی حفاظت کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ قرآن مجید محفوظ رہے گا۔ سنت نبویہ علی صاحبہا الف الف تحتیہ محفوظ رہے گی۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا امت اس پر عمل کرسکے گی؟ بالفاظ دیگر کتاب و سنت کی تعلیم قابل عمل بھی ہے یا صرف مینی (IDEAL) ہے؟ اس اشکال کو اس طرح حل فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پوری امت تیار کردی جو کتاب و سنت کا کامل عملی نمونہ تھی۔ اور اس نے مختلف حالات میں دین حق پر پورا پورا عمل کرکے دکھادیا۔ یہ امت مقدسہ وہی تھی جسے ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے بلند کردار' اور ان کے روحانی و اخلاقی ذہنی و فکری' عروج و ارتقاء اور ان کی سیرت مقدسہ کو بکثرت و تکرار بیان فرمایا گیا ہے اس طرح دور صحابہ کا پورا نقشہ بتادیا گیا۔ قرآن و سنت کی حفاظت اور اسلام کی بقاء و دوام کا وعدہ بھی قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بقاء بر سبیل خرق عادت ہوگی یا اس کے ظاہری اسباب پیدا کئے جائیں گے۔ اس سوال کا جواب قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں جگہ ملتا ہے۔ آیات و احادیث میں بتادیا گیا کہ ایسے اسباب پیدا ہوں گے جن کے وجود کے بعد عادتاً دین کے معدوم یا مشکوک' یا نسیاً منسیاً ہوجانے کا کوئی امکان نہیں باقی رہتا' قرآن مجید نے ان امور کو معجزانہ اعجاز و جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کی دو تین صدیوں کے حوادث کا مجمل خاکہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ احادیث نبویہ میں ایسی پیشین گوئیاں ملتی ہیں جو ان حوادث اور ان کی نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بلکہ بعض احادیث میں ایسی صراحت ملتی ہے جو قرآن کریم کے بیان کردہ مجمل خاکے کی شرح و تفصیل کردیتی ہے۔

کسی قوم کی تاریخ اس کی اجتماعی زندگی کی حرکت کی تعبیر و تصویر کا نام ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں امت مسلمہ کی حرکت اجتماعی کے خطوط اور ان کے رخ کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اور محرکات کا بھی اجمالی تعارف کرادیا گیا ہے۔ اس طرح اس کے اس دور کا اجمالی نقشہ اس طرح بتادیا گیا ہے جو اس وقت کی امت مسلمہ کے لئے پیشین گوئی تھی اور ہمارے لئے تاریخ ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص کسی قافلے کو سفر پر روانہ کررہا ہو اور

ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دور تک راستے کو دیکھ کر قافلے والوں کو راستے کے حالات ' اس پر چلنے پھرنے والوں کی کیفیت ' راستے کے نشیب و فراز ' ان سب امور سے آگاہ کر رہا ہو ۔ اسی طرح قرآن مجید اور حدیث شریف نے امت کی رہنمائی فرمائی ہے کہ دین اسلام کس طرح پھیلے گا اور کس صورت سے محفوظ رہے گا ۔ سیاسی ' معاشی' معاشرتی ' حالات کا اس کی بقاء سے کیا ربط ہوگا ؟ اس کے ضمن میں خود امت کے نفسی احوال اور اس کے کردار کا اجمالی نقشہ بھی واضح فرمادیا ۔ یہ قرآنی ' اور حدیثی نقشہ اسلام کی تقریباً ابتدائی دو صدیوں کی عکاسی کرتا ہے ۔ اور یہی زمانہ اہم ہے ۔ ہر دین و ملت کے لئے اس کا ابتدائی دور ہی اہم ترین دور ہوتا ہے ۔ اسی میں اس کی آئندہ بقاء اور فنا کا فیصلہ ہوجاتا ہے ۔ بنو اسرائیل میں دور نبوت ختم ہونے کے بعد ایک صدی بھی نہ گذرنے پاتی تھی کہ امت میں فساد شروع ہوجاتا تھا ۔ اور بدعات و تحریفات کے انبار میں اصل دین گم ہوجاتا تھا ۔ یہاں تک کہ پھر دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آجاتی تھی ۔ اس لئے قرآن و حدیث میں مخصوص طور پر اس ابتدائی اور اہم ترین زمانہ میں کتاب اللہ سنت نبوی اور دین اسلام کی بقاء و قوت کے متعلق اطمینان دلایا گیا ہے ۔ اور اس کے اسباب ظاہری سے روشناس کرایا گیا ہے ۔

قرآن و حدیث کی پیشین گوئیاں قطعاً صحیح اور وعدے یقیناً سچے ہیں ۔ ہم ان کی روشنی میں تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کی صحیح اور حقیقی شکل و صورت نمایاں ہوجائے گی۔ آئندہ سطروں میں اسی طریق کو اختیار کرکے اپنی تاریخ پر ایک اجمالی تبصرہ پیش کیا گیا ہے ' جس سے قطعی طور پر معلوم ہوسکتا ہے کہ ہماری ابتدائی تاریخ قابل فخر ہے جیسا کہ ہم کو احساس ہوتا ہے ؟ یا باعث شرم و ندامت جیسا کہ روافض اور رافضیت زدہ لوگوں کا بیان ہے۔ تاریخ اسلام پر اسلامی ذہن کا یہ اجمالی تبصرہ آئندہ سطروں میں ملاحظہ فرمایئے :۔

قرآن مجید کی روشنی میں

دین اسلام ساری دنیا کے لئے اور تا قیام قیامت باقی رہنے کے لئے آیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء اور اس کی حفاظت کے ظاہری اسباب بھی پیدا فرمادیئے ۔ جس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی تعلیم دی اور امت کو قرآن مجید پڑھایا ' سمجھایا ' اور یاد کرایا ' اس میں بغیر سیاسی طاقت و قوت کے کسی دین کا تحفظ عادتاً غیر ممکن تھا ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو پورا جزیرۃ العرب آپ

کے زیر نگیں تھا ۔ اور مسلمانوں کو اتنی سیاسی قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی ، جتنی حفاظت و بقاء دین کے لئے اس دور کے لحاظ سے ضروری تھی ۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیا ہوگا ؟ اس وقت دنیا میں دشمنان اسلام کی دو عظیم الشان متمدن اور طاقتور حکومتیں قائم تھیں ، جن کی سرحدیں عرب سے ملتی تھیں ۔ اس دور کی یہ دونوں برتر قوت رکھنے والی طاقتیں (SUPER POWERS) دین اسلام کے فروغ کو دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہیں۔ مگر رعب نبوت کی وجہ سے ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے سوا کسی تباہ کن مخالفانہ تدبیر کی جسارت نہ کر سکیں ۔ لیکن یہ رعب تو ایک معجزہ تھا ۔ سوال یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کیا ہوگا ؟ کیا یہ اور ان کی معاون طاقتیں اسلام کے مٹانے کے درپے نہ ہو جائیں گی؟ اور کیا امت ان کا مقابلہ کر کے اسلام کا تحفظ کر سکے گی ؟

آیت استخلاف

مندرجہ ذیل آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ان سب تشویشات کے ازالے اور شفاء صدور مومنین کا پورا سامان موجود ہے ۔ یہ آیت جو آیۃ استخلاف کے نام سے مشہور ہے درج ذیل ہے :-

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فا و لئک ھم الفسقون ○ (النور : ۵۵)

ترجمہ " (اے مجموعہ امت محمدیہ) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا ۔ جیسے ان سے پہلے اہل ہدایت لوگوں کو حکومت دی تھی ۔ اور جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) ان کے لئے پسند فرمایا ہے ۔ (یعنی اسلام) اس کو ان کے (نفع آخرت کے لئے) قوت دے گا ۔ اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کردے گا ۔ بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں۔ اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں ۔ اور جو

مخص بعد (ظہور) اس (وعدہ) کے ناشکری
کرے گا۔ تو یہ لوگ بے حکم ہیں ۔ "

اس آیت مقدسہ میں امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیتہ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اسے دنیا میں اقتدار عطا فرمایا جائے گا ۔ بشرطیکہ وہ ایمان و عمل صالح پر مستقیم رہے ۔ پھر یہ بتادیا گیا کہ یہ استخلاف فی الارض اور اقتدار و حکومت اس امت سے پہلے بھی ایک امت مومنہ کو عطا فرمایا جاچکا ہے (اشارہ بنی اسرائیل کی جانب ہے کہ انہیں جیسا اقتدار عطا فرمایا گیا تھا ویسا ہی اقتدار تمہیں عطا فرمایا جائے گا) اس اقتدار کا اہم ترین فائدہ یہ ہوگا کہ دین اسلام کو قوت و ترقی حاصل ہوگی ۔ اس کے ساتھ کفار کی جانب سے اسلام اور امت مسلمہ کو مٹانے کا جو خوف اس وقت پایا جاتا ہے وہ دور ہوجائے گا ' اور مسلمان اس جانب سے بالکل مامون اور بے خوف ہوجائیں گے ۔ یہ اقتدار امت مسلمہ کے ہاتھ میں اس وقت تک باقی رہے گا جب تک وہ توحید خالص پر قائم رہے گی ' پھر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ حصول خلافت کے بعد جو لوگ اس نعمت کی ناشکری کریں گے وہ فاسقوں میں شمار کئے جائیں گے ۔ ناشکری فسق ہے۔ اور اس کا مرتکب فاسق۔

چند وضاحتیں : آیت مقدسہ کا پورا مطلب سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے ۔ ۱ :۔ " استخلاف " کے معنی ہیں خلیفہ بنانا ۔ آیت میں خلافت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے ۔ اس میں خلافت کے معنی ہیں اقتدار و حکومت ۔ مراد یہ ہے کہ اس امت کو بھی زمین پر اقتدار حاصل ہوگا ۔ نزول آیت کے وقت بھی امت کو اقتدار حاصل تھا ۔ پورا ملک عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر اقتدار آچکا تھا ۔ اور آنحضور علیہ الصلوات والسلام کے واسطے سے یہ اقتدار اس وقت کی پوری امت کو حاصل تھا۔ اس کے پیش نظر آیت میں عطاء اقتدار کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اقتدار تمہیں اس وقت حاصل ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اور اس کی وسعت و قوت میں اضافہ ہوگا ۔ مراد نفس اقتدار و حکومت ہے ۔ اس کی کوئی خاص شکل مراد نہیں ۔ اسے خلافت کہا جائے۔ یا ملک یا سلطنت ہر صورت میں ایسے ایفائے وعدہ مذکور کا مصداق اور اس کی ایک شکل کہا جاسکتا ہے۔

۲ :۔ " استخلاف " سے مراد امر تکوینی سے عطائے خلافت و اقتدار ہے۔ امر تشریعی سے مراد نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے اسباب پیدا فرمائیں گے جو امت مومنہ کے

برسر اقتدار آنے پر فتح ہوں گے ۔ اور ان پر یہ نتیجہ بھی ہماری مشیت تکوینیہ ہی سے مرتب ہوگا ۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی حکم لوگوں کے نام نازل ہوگا کہ فلاں شخص کو خلیفہ بنالو ' یا اقتدار فلاوں جماعت کے سپرد کردو ۔ اس قسم کا کوئی حکم اسلام میں کبھی نہیں نازل ہوا اور نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں باقی رہا۔

۳:۔ اسلامی نقطہ نظر سے اقتدار اور حکومت فی نفسہ کوئی نعمت مطلوبہ نہیں ہے۔ نہ اسے امت مسلمہ کے ساتھ کوئی خصوصیت حاصل ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک دنیوی نعمت کہا جاسکتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے اسے نعمت عظیمہ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ یہ دوسری مطلوبہ نعمتوں کا ذریعہ بنتی ہے ۔ اس حقیقت کی روشنی میں غور کیجئے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کہ آیت موصوفہ میں صرف خلافت کا وعدہ نہیں فرمایا گیا ہے ۔ بلکہ ایسی خلافت و حکومت عطا فرمانے کا وعدہ ہے جو ذریعہ بنے گی تمکین دین اور حصول امن کی نعمتوں کا ۔ یہ دونوں نعمتیں ' عظیم اور فی نفسہ مطلوب ہیں۔ تمکین دین کا مطلوب ہونا تو ظاہر ہے۔ دشمنان دین کی ضرر رسانی سے امن بھی نعمت مطلوبہ ہے۔ امن حاصل ہو تو مومن اللہ تعالی کی عبادت آزادی اور یکسوئی کے ساتھ کرسکتا ہے ۔ اس کے بغیر عبادت میں خلل واقع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے ۔ دین حق کی اشاعت دعوت اسلام پھیلانے کا کام بھی امن مذکور حاصل ہونے ہی کی صورت میں سہولت کے ساتھ ہوسکتا ہے ۔ اور مسلمانوں کی جان و آبرو کی حفاظت بھی فی نفسہ ایک شرعی مقصد ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ امن مذکور ایسی نعمت عظیمہ ہے جو شرعی نقطہ نظر سے مطلوب ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو خلافت موجودہ امت کو حاصل ہوگی اس میں دونوں وصف ضرور پائے جائیں گے۔ یعنی تمکین دین اور اعداء اسلام کے شر سے امن ۔ یہ خلافت ایک انعام ہے اور اس کا وعدہ بشارت ہے ۔ انعام نعمت مطلوبہ سے خالی نہیں ہوسکتا ۔ اگر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو لیکن اس کی وجہ سے تمکین دین اور امن مذکور نہ حاصل ہو تو اس اقتدار و حکومت کو خلافت موعودہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ سمجھیں گے کہ یہ اقتدار عام قانون الٰہی تکوینی کے مطابق حاصل ہوا ہے ۔ جس میں مومن و غیر مومن کی کوئی تخصیص نہیں ۔ یہ وہ انعام نہیں ہے جس کا وعدہ آیتہ استخلاف میں فرمایا گیا ہے ۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ امن سے مراد یہ نہیں ہے کہ کفار کی طرف سے کسی ضرر رسانی کا احتمال ہی نہ باقی رہے ۔ ایسا امن حاصل ہونا تو عادتاً محال ہے ۔ اور مسلمانوں کا اس قدر

مطمئن ہو جاتا کہ دل میں ان کی طرف سے کسی شرانگیزی کا شبہ اور احتمال بھی باقی نہ رہے ' شرعاً و عقلاً ہر طرح ممنوع ہے ۔ اہل ایمان کو تو کفار کی طرف سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے اور ان کے حرکات و سکنات پر ہمہ وقت نظر رکھنا چاہئے ۔ ایسا امن ' جو غفلت پیدا کرے آیت میں مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نعمت نہیں معصیت ہے ' جو بہت سے مصائب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے ۔ بلکہ امن سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ظن غالب قریب بہ یقین ہو کہ کفار انھیں کوئی معتدبہ ضرر قوی پیمانے پر پہنچانے کا ارداہ نہیں کرسکتے ۔ اور اگر ارادہ کریں گے تو منہ کی کھائیں گے ۔ خلافت اسلامیہ ان سے مغلوب نہیں ہو سکتی ۔ ان پر یقیناً غالب ہوگی ۔ امن کا یہی درجہ مطلوب ہے ۔ اور اسی کا وعدہ آیتہ کریمہ موصوفہ میں فرمایا گیا ہے ۔ پھر جس طرح ہم اس حکومت کو جو ان دونوں نعمتوں یا ان میں کسی ایک سے خالی ہو موعودہ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ہمیں اس کا عکس بھی تسلیم کرنا پڑے گا یعنی جس خلافت میں یہ دونوں وصف پائے جائیں وہ یقیناً خلافت موعودہ ہے ۔ اور یہ سمجھنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ ایسی خلافت وحکومت اس انعام الٰہی کا ایک حصہ ہے جس کی بشارت آیتہ استخلاف میں دی گئی ہے۔

خلافت اسلامیہ کی تاریخ آیتہ استخلاف کی روشنی میں

آیت کی تفسیر و تشریح کے بعد ہم اس کی روشنی میں تاریخ اسلام پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی روشنی میں تاریخ اسلام کا اہم ترین دور یعنی ابتدائی چند صدیاں کیسی نظر آتی ہیں ۔

آیت شریفہ موصوفہ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ امت مسلمہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کی نعمت حاصل ہوئی۔ اس کا ابتدائی دور ' خلافت راشدہ کا دور کہلاتا ہے ۔ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے شروع ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے ۔ حضرت معاویہؓ آخری خلیفہ راشد تھے (۱) ان کے بعد دمشق کی خلافت تقریباً ایک صدی تک امت کی سربراہی کرتی رہی

اس کے بعد مرکز خلافت بغداد بنا اور خلافت عباسیہ قائم ہوئی ' جو اندازاً پانچ صدیوں تک امت پر عائد ہونے والا یہ فرض کفایہ ادا کرتی رہی ۔ اموی خلافت ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اندلس میں ایک اور خلافت کی بنیاد پڑگئی ۔ یہ بھی اموی خلافت کے نام سے مشہور ہے

---

(۱) خلافت راشدہ کی اصطلاح پر گزشتہ صفحات میں اطمینان بخش بحث گزر چکی ہے ۔

۔ اور کم و بیش سات سو سال تک قائم رہ کر دین و ملت کی خدمت انجام دیتی رہی ۔

ان ادوار خلافت کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے درمیان تسلسل قائم رہا ۔ خلافت راشدہ جو حضرت معاویہؓ کی خلافت پر ختم ہوئی ۔ خلافت دمشق خلافت بغداد اور خلافت اندلس ان چاروں خلافتوں کے درمیان کوئی خلا اور وقفہ نہیں ہے ۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں اور ایک ہی دور کے مختلف حصے تھے ۔ اس دور میں جو انقلابات ہوئے وہ صرف اتنے تھے کہ حکمران تبدیل ہوگئے ۔ مگر مملکت کی نوعیت اس کے اصول و نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ حکمرانوں کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کسی خلیفہ کو بقاء دوام نہیں حاصل ہو سکتی۔ ان کا بدلنا تو ناگزیر ہے اگر کسی فرد کے ساتھ خاندان بھی بدل گیا اور ایک خاندان کے سے تعلق رکھنے والے کی جگہ کسی دوسرے خاندان کا کوئی فرد خلیفہ ہوگیا تو اس سے نفس خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اور اسے خلافت میں تبدیلی نہیں کہہ سکتے۔ سلسلہ خلافت ایک ہی رہا اور اس میں کسی جگہ بھی فصل و رخنہ نہیں پڑا ۔ خلافت کا یہ تسلسل بتارہا ہے کہ یہ پورا سلسلہ خلافت موعودہ تھا ۔ اللہ تعالٰی نے امت مسلمہ کو جس خلافت کی بشارت دی تھی وہ یہی تھی ۔ خلافت راشدہ بھی خلافت موعودہ مبشرہ تھی ۔ اور اموی و عباسی خلافتیں بھی موعودہ اور مبشرہا تھیں ' علیٰ ہذا خلافت اندلس بھی جو اموی خلافت تھی ' خلافت موعودہ اور "مبشرہ" خلافت تھی جس طرح حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین آیتہ استخلاف کے مصداق تھے۔ اسی طرح اموی و عباسی خلفاء بھی اس کے مصداق تھے ۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرات خلفاء راشدین کا عنداللہ مرتبہ دوسرے خلفاء سے بہت اعلٰی و افضل ہے ۔ لیکن آیتہ استخلاف کا مصداق ہونے میں سب یکساں ہیں۔ خود حضرات خلفاء راشدین کے درمیان مراتب و درجات کا فرق عظیم ہے۔ مگر مصداق آیتہ استخلاف ہونے میں سب یکساں ہیں۔ مثلاً آیتہ استخلاف میں امت کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ فرمایا گیا تھا ' اس کے ایفاء عملی کی شکل جس طرح یہ ظاہر ہوئی کہ صدیق اکبرؓ سربراہ مملکت ہوئے ۔ اسی طرح یہ بھی اسی کی ایک شکل تھی کہ امیر المومنین عبدالملک کو بھی سربراہ مملکت منتخب کیا گیا ۔ یہی معنی ہیں مصداق ہونے کے ۔ اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح خلفاء دمشق و بغداد و اندلس بھی آیتہ استخلاف کے مصداق تھے۔ بشارت اقتدار مندرجہ آیت مقدسہ خلافت راشدہ کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی اور خلافت دمشق و اندلس و بغداد

کی صورت میں بھی ۔ (۱)

اس تسلسل و ارتباط سے قطع نظر مذکورہ بالا سلسلہ خلافت کے خلافت موعودہ ہونے کی ایک قوی دلیل یہ ہے کہ ان سب خلافتوں میں تمکین دین اور امن مذکورہ کی نعمت امت کو

(۱) مصداق آیت ہونے کے معنی سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ جب حضرت علیؓ بھی مصداق آیۃ استخلاف ہیں تو حضرت معاویہؓ پر واجب تھا کہ انہیں خلیفہ تسلیم کرلیں۔ انہوں نے ان کی خلافت سے اختلاف کیا۔ تو یہ ان کی خطاء اجتہادی کہی جائے گی ۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ مصداق آیت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت نے انہیں خلافت کے لئے نامزد کردیا تھا ۔ یا انہیں خلیفہ مقرر کرنے کا حکم دیا تھا بلکہ مصداق ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس وعدے کا ظہور اس طرح بھی ہوا کہ اہل ایمان کی ایک جماعت نے انہیں خلیفہ منتخب کرلیا ۔ اس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ اگر کچھ لوگوں نے انہیں خلیفہ منتخب کرلیا تو دوسرے رائے دہندگان کا حق رائے دہی ختم ہوگیا ۔ اور انہیں اختلاف کا حق باقی نہیں رہا ۔ اور ان پر آں محترم کو خلیفہ تسلیم کرلینا واجب ہوگیا۔ اختلاف کا حق اس وقت کے ہر مسلمان کو حاصل تھا ۔ حضرت معاویہؓ تو ارباب حل و عقد میں تھے ۔ ان کے ہمنوا صحابہ کرامؓ بھی ارباب حل و عقد تھے ۔ انہیں تو یہ حق بدرجہ اولی حاصل تھا ۔ انہوں نے شرعی حق کا استعمال کیا جو شرعاً ان کے لئے بالکل جائز تھا ۔ شرعی اعتبار سے اس میں کسی خطا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔

آیۃ استخلاف میں عطائے خلافت کا وعدہ قوم اور جماعت سے فرمایا گیا تھا۔ حضرت علیؓ سے نہیں فرمایا گیا تھا وعدہ امت سے تھا اور پورا ہورہا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بھی خلافت باقی رہی۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں اختلاف ہوا ۔ یہ اس وعدے کے منافی نہیں آیت میں یہ وعدہ نہیں کیا گیا ہے کہ اس وعدے کے مطابق جو خلافتیں قائم ہوں گی ان میں کسی خلیفہ کے متعلق کوئی اختلاف بھی نہ ہوگا ۔ علاوہ بریں حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت سے حضرت سعدؓ بن عبادہؓ نے اختلاف کیا ۔ اور آخر عمر تک اس اختلاف پر قائم رہے ۔ لیکن آج تک کسی نے انہیں خطا اجتہادی کا مرتکب نہیں کہا۔ پھر حضرت علیؓ کی خلافت سے اختلاف کو حضرت معاویہؓ کی خطاء اجتہادی کیوں کہا جائے ؟ ۔

رہے اس دور مسعود کے بعد آنے والے مسلمان جیسے ہم لوگ ۔ تو ہم اس دور کے رائے دہندہ نہیں ہیں ۔ مندرجہ بالا موقف ان حضرات کا تھا جنہیں اس وقت نصب خلیفہ کے بارے میں حق رائے دہی حاصل تھا ۔ ہمارا وہ موقف نہیں ہوسکتا ۔ بلکہ ہم صحابہ کرامؓ

حاصل رہی۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ان خلافتوں کا بڑے سے بڑا مخالف بھی نہیں کرسکتا۔ روافض بھی جو ان کے شدید ترین دشمن ہیں، اس اقرار پر مجبور ہیں کہ ان سب کے زمانے میں مذہب اہلسنّت کو فروغ ہوا۔ اور نظام حکومت شریعت اہلسنّت کے مطابق

کے تمبع ہیں اور ان کے ساتھ حسن عقیدت رکھنا ہم پر واجب ہے۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم ان کی تصویب کریں اور آں محترم کو اسی وقت سے خلیفہ برحق سمجھیں اگرچہ اس وقت ان کی خلافت متفق علیہ نہیں تھی۔ مگر ہمیں اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ دوسری طرف ایک جماعت صحابہؓ نے جس کے سربراہ حضرت معاویہؓ تھے انہیں خلیفہ منتخب کرنے سے اختلاف کیا تھا۔ اور ان کی خلافت اس وقت کی اسلامی دنیا کے ایک خاصے بڑے حصے نے نہیں تسلیم کی تھی۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم ان کی بھی تصویب کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ ان کا یہ طرز عمل بھی شرعاً جائز تھا۔ شرعی نقطہ نظر سے اسے خطاء اور غلطی نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس حصے نے حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم نہیں کی تھی وہ وہاں کے خلیفہ اور سربراہ مملکت نہیں تھے۔ جب اجتماع اذرح میں جماعت صحابہ نے اس حصہ ملک کا خلیفہ حضرت معاویہؓ کو بنادیا تو وہ اس حصے کے سربراہ مملکت ہوگئے اور آیۃ استخلاف کا مصداق بنے۔

مزید یہ کہ ہم جو حضرت علیؓ کو خلیفہ برحق مانتے ہیں اس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ یا اور کسی صحابیؓ پر بھی انہیں خلیفہ برحق تسلیم کرنا واجب ہوگیا تھا، ہماری رائے ان پر یا اس زمانہ کے کسی رائے دہندہ مومن پر حجت نہیں ہے۔ ہم اپنی رائے قائم کرنے کے مجاز ہیں لیکن ان کا تخطیہ کرنے کے مجاز نہیں زمانہ اور احوال کے فرق نے ہماری اور ان کی حیثیتوں میں بہت فرق پیدا کردیا ہے۔ اس فرق کو نظرانداز کرنا گمراہ کن ہے۔ اس فرق کی وضاحت مزید کے لئے مندرجہ ذیل مثال انشاء اللہ مفید ہوگی۔

ایک کالج کے پرنسپل کا تقرر مجلس منتظمہ کے بعض ارکان نے کردیا۔ مجلس کے بعض ارکان اس وقت موجود نہیں تھے۔ وہ اس تقرر کو ناجائز کہتے ہیں اور اسے جائز پرنسپل تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو ارکان کمیٹی کا اختلاف ہے۔ لیکن طلبہ اور ٹیچروں کو ارکان مجلس کے اس اختلاف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ پرنسپل مذکور کو پرنسپل تسلیم کریں، اور اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ اس کے ساتھ انہیں اس کی پرنسپلی سے اختلاف کرنے والے ارکان کا تخطیہ کرنے یا ان کے اس اختلاف پر معترض

جاری رہا ۔ اسی مذہب کے احکام و قوانین ممالک محروسہ میں جاری تھے ' اور انہیں کے مطابق فیصلے ہوتے تھے ۔ اس کا اتنا اقرار تو شیعہ بھی کرتے ہیں ۔ اور اس اقرار پر مجبور ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دین اہلسنت کو دین ہی نہیں کہتے ۔ مگر ان کے اس خیال باطل کا کوئی اثر ہماری اس دلیل پر نہیں پڑتا ۔ مودودی صاحب بھی اس کا اقرار کرچکے ہیں۔ جو ہم چند صفحات پہلے نقل کرچکے ہیں ۔

ہونے کا بھی کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس مثال سے زیر بحث مسئلہ سہولت کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خلفاء راشدینؓ میں سے کسی کی خلافت کسی نص سے ثابت نہیں ۔ خلافت و امامت کا نص سے ثابت ہونا شیعوں کا مسلک ہے۔ اہلسنت کا اجماع ہے کہ خلافت و امامت "نصب" سے ثابت ہوتی ہے ۔ اسی لئے شیعہ اہلسنت کو "ناصبی" کہتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ حضرت علیؓ کی خلافت نص سے ثابت ہوگئی تھی ' بالکل غلط اور اہلسنت کے مسلک و عقیدے کے خلاف ہے ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی منصوص نہیں تھی۔ بلکہ "اقتضاء النص" سے ثابت ہے۔ اگر ان کی خلافت کو صحیح اور برحق نہ تسلیم کیا جائے تو لازم آتا ہے آیت میں جو وعدہ استخلاف اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے وہ پورا ہی نہیں ہوا ۔ اس لئے انہیں خلیفہ برحق تسلیم کرنا واجب و لازم ہے۔ مگر اقتضاء النص سے ثابت ہونے کو منصوص نہیں کہتے۔ ان کے متعلق بھی یہ نہیں کہہ سکتے اور کوئی کہتا بھی نہیں کہ ان کی خلافت پر نص ہے ' یا ان کی خلافت منصوص ہے عبارت النص سے ثبوت کو ثبوت بالنص کہتے ہیں۔ نص کے مقتضی کو منصوص' نہیں کہتے۔ حضرت علیؓ کی خلافت اقتضاء النص سے بھی ثابت نہیں۔ اگر کوئی ان کی خلافت کو نہ تسلیم کرے تو یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالٰی کا وعدہ پورا نہیں ہوا ۔ کیونکہ ان سے پہلے تین حضرات خلفاء ہوچکے تھے ۔ اور اللہ تعالٰی کا وعدہ پورا ہوچکا تھا ۔ اس لئے اسے ثابت بالنص کہنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں۔ آیۃ استخلاف کا مصداق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ذاتی طور پر ان کی خلافت نص سے ثابت ہے یا یہ آیت ان کی خلافت پر نص ہے ۔ مصداق ہونے کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ آیت میں جو وعدہ خلافت فرمایا گیا ہے اس وعدے کے پورے ہونے کی ایک شکل یہ ہوئی کہ حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس کا مصداق ہوتا ۔ ان کے تقرر بحیثیت خلیفہ سے وعدہ پورا ہونے کی ایک شکل کا ظہور ہوا ۔ ان کی خلافت سے اختلاف کرنے نہ کرنے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اختلاف کا حق بھی کسی سے سلب نہیں ہوجاتا ۔ وہ خلیفہ

اس مقام پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تمکین دین کے معنی کیا ہیں ؟

تمکین کے لغوی معنی مکان یعنی جگہ دینے کے ہیں محاورے میں اس کے معنی ہیں کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ قائم کردینا کہ وہاں سے ہٹائی نہ جاسکے ۔ ان معنی کے پیش نظر تمکین دین کا مطلب یہ ہے کہ دین کو ایسی مضبوطی اور قوت حاصل ہوجائے کہ اس کی بقا اور اس کے تحفظ کے لئے کوئی خطرہ نہ باقی رہے ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایسے اسباب

ہوگئے ' ان کی خلافت مختلف فیہ تھی تو بھی وعدہ الٰہی پورا ہوا۔ اور وہ اس کے مصداق ہوگئے۔ جب حضرت معاویہؓ ان کے متوازی خلیفہ ہوگئے تو وہ بھی اسی آیت کے مصداق ہوگئے ۔ مطلب یہ ہے کہ امت کو خلافت دینے کا وعدہ فرمایا گیا تھا اس کے ایفاء کا سلسلہ جاری رہا۔ زیر بحث دور میں دو خلافتوں کی صورت میں وعدہ پورا ہوا ۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جب کسی شخص کو مشیت تکوینی سے کوئی کمال یا منصب حاصل ہو تو اسے تسلیم کرنا کسی پر شرعاً واجب نہیں ہوتا۔ مثلاً مشیت تکوینی سے کوئی شخص بہت حاذق طبیب ہوجائے تو کسی شخص پر شرعاً واجب نہیں کہ اس کی حذاقت کو تسلیم کرکے اس کا علاج کرے۔ یا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینیہ سے ولی اللہ ہوجائے تو کسی شخص پر شرعاً واجب نہیں کہ اسے ولی اللہ کہے ۔ اور اس کی ولایت کا اعتراف کرے ۔ البتہ اگر مشیت تشریعی سے کسی کو کوئی منصب حاصل ہوا ہے تو اسے تسلیم کرنا واجب ہے۔ مثلاً نبی کی نبوت کو تسلیم کرنا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت مشیت تکوینی ہی سے قائم ہوئی تھی ' اس لئے اسے تسلیم کرنا کسی شخص پر شرعاً واجب نہ تھا ۔ ہر شخص کو اس سے اختلاف کا حق تھا ۔ حضرت معاویہؓ نے اگر اس سے اختلاف کیا تو کسی امر شرعی کی خلاف ورزی نہیں کی اس لئے اسے ان کی خطا اور غلطی نہیں کہا جاسکتا ۔ نہ اجتہادی نہ غیر اجتہادی ۔ ہاں اگر آں محترم کی خلافت پر اتفاق ہوجاتا یا اگر ارباب حل و عقد کی اکثریت انہیں منتخب کرلیتی اور یہ اکثریت واضح ہوتی تو اختلاف کا حق تو پھر بھی باقی رہتا لیکن اطاعت واجب ہوجاتی ۔ لیکن صورتحال یہ نہیں تھی ۔ اکثریت نے بھی حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی تھی ۔ نیز حضرت معاویہؓ خود ارباب حل و عقد میں سے تھے ۔ ان کا حق اختلاف رائے بھی تو بہت قوی تھا وہ زائل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے سے انکار نہیں کیا ۔ وہ انہیں عبوری خلیفہ کہتے تھے ۔ اور دوبارہ انتخاب کا مطالبہ کرتے تھے ۔ اس لئے کوئی شبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ظاہری پیدا ہوجائیں، جس کے ہوتے ہوئے کسی دین کا مٹنا یا اس میں تحریف وغیرہ ہونا عادتاً محال اور غیر ممکن ہوجائے۔

یہ بات تو بعنایت الٰہی حضرات خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں کامل طور پر حاصل ہوچکی تھی۔ مگر تمکین یعنی قوت و طاقت ایسی چیز ہے جس میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور کمی بھی یعنی اس کے مختلف مدارج و اقسام ہوسکتے ہیں۔ عہد بنو امیہ و عہد بنو عباس میں تمکین دین کی دو صورتیں پائی گئیں۔ اول یہ کہ جو تمکین دین عہد خلفاء راشدین میں حاصل ہوگئی تھی وہ باقی رہی، اور وہی اس کا اہم ترین اور ضروری حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں زمانہ او رماحول کے لحاظ سے اضافہ ہوتا رہا اور جس دور میں اس کے خصوصیات کے لحاظ سے جس مخصوص درجہ تمکین کی ضرورت تھی وہ حاصل ہوتا رہا۔ مثلاً قرآن مجید عہد نبویؐ ہی میں محفوظ ہوچکا تھا۔ اور اسے سینہ و سفینہ میں محفوظ رکھنے والے اتنے ہوگئے تھے کہ اسے درجہ تواتر حاصل ہوگیا تھا۔ اور اس میں تحریف و تغیر کا یا اس کے معدوم یا نایاب ہوجانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ خلفاء راشدین کے عہد معدلت مہد میں اس کی حفاظت میں اور اضافہ ہوا اسے سینہ و سفینہ میں محفوظ رکھنے والوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوگئی اور ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچی۔ مکتوب صورت میں بھی اس کے نسخوں کی تعداد کثیر ہوگئی۔ دوسری طرف روم و ایران کی دشمن اسلام طاقتیں مغلوب ہوگئیں اور یہ خطرہ بھی کلیتہً دور ہوگیا کہ کوئی دشمن اسلام طاقت مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرکے اور اپنی سیاسی و عسکری قوت سے کام لے کر قرآن مجید کو معاذاللہ مٹادے یا اس میں تحریف کردے۔ بنو امیہ کے مبارک عہد میں اس تمکین میں اور اضافہ ہوا قرآن مجید پر اعراب لگوائے گئے اور تجوید کے ساتھ اس کی تعلیم کا انتظام و اہتمام کیا گیا۔ اس طرح یہ خطرہ بھی دور ہوگیا کہ اہل عجم اعراب یا تجوید کی غلطیاں کریں یا ان کے دلوں میں یا کتاب الٰہی کے بارے میں شکوک و وساوس پیدا ہوں۔ تدوین فقہ اور تدوین حدیث کی ابتداء اموی عہد ہی میں ہوگئی تھی لیکن اس کی تکمیل عہد عباسی میں ہوئی۔ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح، نقد و جمع حدیث اور توسیع فقہ کا کام، خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ہوا اور اسی دور میں علم کلام کمال کو پہنچا۔ اندلس کی اموی خلافت کے زمانہ میں بھی تمکین دین کی یہی صورتیں ہویدا ہوئیں۔ اس کے ساتھ ایک اہم اور عظیم کام یہ ہوا کہ اندلس کے عربوں نے دنیا کو قرآنی طرز فکر سے آشنا کیا اور محرف مسیحیت کا سحر یورپ کے ذہن پر سے اترنے لگا۔ آزاد فکر کا آغاز ہوا۔ جس کا نتیجہ اس براعظم میں اشاعت اسلام کی صورت میں نکلا۔ اور آج یورپ و امریکہ میں جو لوگ

اسلام قبول کر رہے ہیں وہ اسی مبارک اسلامی دور کی مساعی کا اثر ہے ۔ یہ سب تمکین دین ہی کی صورتیں تھیں ۔ جس کا وعدہ آیہ استخلاف میں فرمایا گیا تھا ۔ یہی وعدہ مختلف صورتوں سے کئی صدیوں پر محیط اس دور خلافت میں پورا ہوتا رہا ۔

اس بیان سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ عہد اموی و عہد عباسی میں تمکین دین کی نعمت امت کو حاصل رہی اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خلفاء راشدین کی خلافتیں خلافت موعودہ تھیں اسی طرح دمشق ' بغداد اور اندلس کی خلافتیں بھی خلافت موعودہ تھیں ۔ یہ اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے شروع ہوا تھا ۔ یہ سلسلہ کہیں ٹوٹا نہیں ۔ کسی مرحلے پر بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ سلسلہ خلافت کلیۃً ختم ہوکر حکمرانی کسی غیر مسلم کے ہاتھ میں آگئی ہو ۔ جزوی طور پر بعض ممالک و بلاد خلافت کی ماتحتی سے نکل گئے لیکن خلافت قائم رہی ۔ کئی صدیوں کے بعد بغداد و اندلس دونوں مقامات پر خلافت کا خاتمہ ہوگیا ۔ اس وقت وہ خلافت موعودہ ختم ہوئی (۱) ۔

ان خلافتوں کو آیۃ استخلاف کا مصداق اور خلافت موعودہ سمجھنے کے بعد ہر وہ شخص جو قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے ان سب خلافتوں اور ان کے ادوار کی خوبی و رفعت نشان کا اقرار کرنے پر مجبور ہے ۔ کوئی یہ بات کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جو خلافت عطا فرمائی تھی وہ ظالم و جابر تھی اور اس میں کسی فاسق و فاجر کو بھی خلیفہ اور سربراہ بنایا گیا تھا ۔ یہ خلفاء اور ان کے عمال معصوم تو نہیں تھے ۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں ہوتا ۔ لیکن آیت مقدسہ کے اقتضاء سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب خلفاء صالح تھے اور ان کی خلافتیں صحیح معنی میں اسلامی اور مثالی تھیں ۔ اگر ہم ان کے صحیح کردار سے بالکل بے خبر ہوں تو بھی آیت مقدسہ مذکورہ اتنا بتانے کے لئے کافی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کردار بحیثیت مجموعی اچھا اور قابل

---

(۱) وعدہ اب بھی قائم ہے ۔ اگر ایمان و عمل صالح کی شرط پوری کی جائے تو آج بھی امت کو انعام خلافت حاصل ہوسکتا ہے ۔ لیکن اس سے مراد ایمان اجتماعی اور اجتماعی صلاح اعمال ہے ۔ نہ کہ صرف انفرادی ۔ نیز وعدہ کمال ایمان پر ہے ۔ جو ذہن کو عقائد فاسدہ سے پاک کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے ۔ حصول خلافت کے لئے قومی اور اجتماعی ذہن کو عقائد فاسدہ سے پاک ہونا چاہئے ۔ بغیر اصلاح عقائد اور حصول کمال ایمان اجتماعی امت کو کوئی غلبہ نہیں حاصل ہوسکتا ۔

تعریف ہی کہا جاسکتا ہے۔ مذموم اور ناپسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا شمار صالحین میں کیا جاسکتا ہے۔ فاسقوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ جو خلافت امت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام عطا فرمائی گئی ہو اس میں خلفاء فاسق و فاجر نہیں ہوسکتے۔ اگر ہوسکتے ہیں تو صرف اس صورت میں کہ امت کی اکثریت میں فسق پھیل گیا ہو۔ وہ اجتماعی ضعف ایمان اور اجتماعی فسق میں مبتلا ہوگئی ہو۔ اور اس نے اپنے ضعف ایمان اجتماعی اور صلاح و تقویٰ کے نقص کی وجہ سے کسی نا اہل کو سربراہ مملکت بنالیا ہو۔ خلافت راشدہ کی بلندی کو کوئی خلافت نہیں پاسکتی اور نہ دور صحابہؓ کے مثل کوئی دور ہوسکتا ہے ان کے بعد کے ادوار اور خلفاء و عمال خلفاء کو ان کے مقابلے میں رکھ کر دیکھنا غلطی ہے۔ لیکن احکام شرعیہ اور اخلاق عالیہ کی روشنی میں بنظر انصاف دیکھنے سے یہ حقیقت بالکل روشن ہوجاتی ہے' کہ دور صحابہؓ کے بعد کے دور کی خلافتیں فی نفسہ مثالی خلافتیں تھیں۔

آیتہ استخلاف میں جو وعدہ عطائے خلافت کا فرمایا گیا ہے وہ بطور انعام ہے۔ اور امت مومنہ کے لئے یہ خلافتیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تھیں۔ پھر کیا اللہ تعالیٰ کا انعام اور اس کی عطا فرمائی ہوئی نعمت خلافت کی تصویر وہ ہوسکتی ہے جو شیعہ اور شیعیت نواز' پیش کرتے ہیں جو مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت میں کھینچی ہے؟

مختصر یہ کہ آیت پر نظر کرنے سے یہ بات بالکل روشن ہوجاتی ہے کہ خود ان موعودہ خلافتوں کے خلفاء اور ان کے عمال کے اندر کوئی فساد اور بگاڑ نہ ہوگا اور یہ سب صالح اور اس منصب کے اہل ہوں گے۔ اگر کسی خلیفہ اور اس کی حکومت میں فساد اور بگاڑ نظر آئے تو اس کی ابتداء جمہور اور عام امت کی طرف سے ہوئی ہوگی۔ کسی خلیفہ کی خرابی امت' میں فساد و عیب نہیں پیدا کرے گی بلکہ امت کی خرابی اور اس کے مزاج و کردار کا فساد خلیفہ اور اس کے عمال میں بگاڑ اور فساد پیدا کرے گا۔ جب تک جمہو راہل اسلام ایمان و عمل صالح کی شرط پوری کرتے رہیں گے اس وقت تک حکومت و خلافت میں برائی نہیں پیدا ہوسکتی۔ کیونکہ آیت کی موعودہ خلافت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اللہ تعالیٰ کا انعام کبھی مصیبت و نقمت نہیں بن سکتا۔ نعمت الٰہی نقمت نہیں بن سکتی۔

بلاشبہ دمشق' بغداد اور اندلس کی یہ سب خلافتیں امت مسلمہ میں مقبول و محبوب تھیں اگر ایک قلیل گروہ اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کی وجہ سے انہیں ناپسند کرتا تھا تو یہ کوئی عیب نہیں۔ یہ ان خلافتوں کا عیب نہیں بلکہ ان خود غرض لوگوں کا عیب و قصور تھا۔ امت کی غالب اکثریت ان سے خوش تھی اور ان کی حکومت کو پسند کرتی تھی۔ اگر

شیعوں اور شیعیت زدہ لوگوں کے بیان کو صحیح فرض کرلیا جائے تو یہ خلافتیں نعمت کے بجائے امت کے لئے نقمت و عذاب نظر آتی ہیں۔ تو کیا آیتہ استخلاف میں امت مومنہ کو نعمت خلافت سے نوازنے کے وعدے کے بجائے اس پر عذاب بھیجنے کی وعید سنائی گئی ہے۔؟ العیاذ باللہ۔

ایک مومن کا قلب کبھی ان شیعہ اور شیعیت زدہ مورخین کے بیانات کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور وہ پورا ہوا۔ آیتہ استخلاف میں انعام کا وعدہ بصورت خلافت فرمایا گیا تھا۔ اور یہ سب خلافتیں ایفاء وعدہ خلافت کی شکلیں تھیں اس لئے یقیناً یہ نعمتیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا انعام پاکر مومن کا جی خوش ہوتا ہے۔ بلکہ نعمت وہی ہے جس سے منعم علیہ کو اطمینان و مسرت حاصل ہو۔ اس لئے یقیناً یہ سب خلافتیں امت مسلمہ کی پسندیدہ اور جمہور اہل ایمان کے درمیان مقبول و محبوب خلافتیں تھیں۔ آیتہ استخلاف سے جس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین اور صحابی خلفاء کا دور تو بے نظیر' باعظمت او رمبارک ترین دور خلافت تھا ہی۔ ان کے بعد اموی' و عباسی ادوار خلافت بھی بہت مبارک باعظمت اور مثالی تھے۔ جن کی نظیر ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد آج تک نہیں نظر آئی۔ اسی طرح اس آیت مبارکہ سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دور صحابہ ختم ہونے کے بعد بھی جو خلفاء ہوئے' خواہ وہ اموی ہوں یا عباسی' عادل تھے۔ اور امیر یزید سے لے کر آخری خلیفہ اندلس تک خلافت عادلہ صالحہ قائم رہی۔

اگر ہم شیعہ اور شیعیت نواز تاریخ نگاروں یا شیعی پروپیگنڈے سے دھوکہ کھانے والے یا خاندانی و نسبی تعصب سے مغلوب علماء و مورخین کے بیانات کو باور کریں تو لازم آتا ہے کہ آیتہ استخلاف میں وعدہ تو نعمت خلافت عطا فرمانے کا فرمایا گیا مگر اس نعمت کو کچھ ہی دن کے بعد عذاب میں تبدیل کردیا گیا۔ العیاذ باللہ' آیت مقدسہ اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتی ہے کہ استخلاف کا وعدہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہے۔ وعدہ قوم اور امت سے ہے امت کو نعمت خلافت سے سرفراز فرمانا اس امر کی دلیل قوی اور برہان جلی ہے کہ جن ادوار میں یہ خلافتیں قائم رہیں ان میں امت مومنہ میں صالحین کی اکثریت تھی۔ ورنہ یہ نعمت نہ ملتی۔ چنانچہ جب صالحین کی اکثریت نہیں رہی تو یہ نعمت زائل کردی گئی۔ اور خلافت ختم ہوگئی۔ پھر جب صالحین کی اکثریت بھی تھی تو ان کے اوپر کسی ظالم و جابر یا فاسق و فاجر کو مسلط کرنے کو عذاب کہا جائے گا یا انعام؟ گویا اللہ تعالیٰ نے وعدہ تو کیا انعام دینے کا اور اس کے بجائے امت پر عذاب مسلط فرمادیا "العیاذ باللہ۔ کوئی

مومن ایسی باطل اور احمقانہ بات کہہ کر کفر صریح کا ارتکاب نہیں کرسکتا ۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا اور حق یہی ہے کہ مذکورہ بالا سب خلفاء عادل ' اور صالح و متقی تھے ۔ آیۂ کریمہ مذکورہ کے الفاظ " کما استخلف الذین من قبلکم ○ " بھی قابل غور ہیں اور ہماری تاریخ پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ تشبیہ بے وجہ تو نہیں۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ تمہیں اسی نوعیت کا اقتدار بطور انعام عطا فرمایا جائے گا جس نوعیت کا اقتدار بطور انعام پچھلی امتوں ' یعنی بنی اسرائیل کو عطا فرمایا گیا تھا ۔

خلافت بنی اسرائیل کی ابتداء حضرت سموئیل علیہ السلام کے زمانہ سے ہوتی ہے۔ دستور خلافت کی نوعیت یہ رکھی گئی تھی کہ حضرت سموئیل علیہ السلام جو نبی تھے' اصل خلیفہ اور مملکت کے سربراہ اعلیٰ تھے۔ انہوں نے بحکم الٰہی انتظام مملکت کے جملہ اختیارات اپنے ایک صحابی حضرت طالوت رضی اللہ عنہ کے سپرد کردیئے تھے۔ اور وہ خود ان کے کام کی نگرانی فرماتے تھے ۔ اور حسب ضرورت انہیں ہدایتیں دیتے رہتے تھے ۔ ازروئے قرآن

حضرت طالوت صالح اور مقبول بارگاہ الٰہی تھے ' ان کی حکومت عادلانہ اور بہت بابرکت تھی ' ظاہر ہے کہ ایک نبی علیہ السلام کی نگرانی و سرپرستی میں جو حکومت قائم ہو اس کی خوبی میں کیا کلام ہوسکتا ہے ۔ اس خلافت کی صحیح مدت کا تو علم نہیں مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ایک طویل مدت تک قائم رہی حکم الٰہی کے بموجب حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کو ہدایت فرمائی کہ حضرت طالوت کو اپنا ملک بنائیں ۔ کچھ حیص بیص کے بعد ان لوگوں نے انہیں اپنا ملک بنالیا ۔ وہ خلیفہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ ان کا لقب "ملک" تھا۔ پھر دوسرے خلیفہ حضرت داؤد علیہ السلام اور تیسرے حضرت سلیمان علیہ السلام تھے ۔ ان دونوں انبیاء علیہما السلام کی مدت خلافت چالیس چالیس سال ہے۔ (۱) ملک طالوت کے دور کو اگر بیس سال بھی سمجھا جائے تو یہ ان سے لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے اختتام تک پوری ایک صدی ہوتی ہے ۔ یعنی بنو اسرائیل کو جو خلافت بطور انعام عطا فرمائی گئی تھی وہ پورے ایک سو سال اس کیفیت سے قائم رہی کہ اس کی خوبی اور سراپا برکت ہونے میں کسی کلام کی قطعاً گنجائش نہیں بلکہ اس کی خوبی اور اس کے علو مرتبت میں شک کرنا کفر ہے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے رحبعام خلیفہ ہوئے۔ ایک مدت تک وہ بھی عدل و تقویٰ کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے۔ پھر بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایک

---

(۱) سلاطین (۲:۱۱و۱۱:۴۲)

شخص کے ورغلانے سے ان کی مخالف ہوگئی۔ اس شخص کا نام "ربعام" تھا اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی سخت مخالف تھا۔ مگر بنو اسرائیل کے خاندان بنی یہوداہ پر ان کی سلطنت قائم رہی۔ ان کی مدت خلافت سترہ سال تھی ایک مدت کے بعد بنو اسرائیل کی بڑی تعداد شرکت، بدعت اور فسق و فجور میں مبتلا ہوگئی اگرچہ "رجبعام" صالح رہے اور ان کے ساتھ ایک جماعت بھی صالح رہی لیکن فاسقوں کی اکثریت ہوگئی۔ اس لئے ان سے خلافت چھین لی گئی۔ اور ان پر تباہی و بربادی آئی![1] امت مسلمہ کے استخلاف کو بنی اسرائیل کے "استخلاف" سے تشبیہ دینے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس امت میں بھی خلافت طویل مدت تک یعنی کم از کم ایک صدی تک قائم رہے گی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی۔ اگر اس سے زیادہ ہوجائے تو تشبیہ کے خلاف نہیں اس سے کم ہو تو مشبہ و مشبہ بہ میں پوری مطابقت نہیں باقی رہتی۔ اور مدت خلافت امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیتہ کو مدت خلافت بنی اسرائیل سے کم تسلیم کرنا۔ مقتضائے تشبیہ کے خلاف ہے۔ تشبیہ مذکور کا تقاضا یہ ہے کہ اموی و عباسی خلافتوں کے پورے دور کو خلافت موعودہ کا دور سمجھا جائے نیز اللہ تعالیٰ کا انعام اور باعث خیر و برکت سمجھا جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ آیت استخلاف میں تو صرف نفس "استخلاف" (عطائے خلافت) کو استخلاف سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے خلافت عطا کی تھی اس طرح تمہیں عطا فرمائیں گے۔ وجہ شبہ صرف اتنی ہی ہے جو تشبیہ کے لئے کافی ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ دونوں امتوں کی خلافتیں سب احوال و اوصاف اور پوری کیفیت میں باہم مشابہ اور یکساں ہوں۔ بنو اسرائیل کو جو خلافت عطا فرمائی گئی تھی اس کی ابتداء تو ایک نبی مرسل حضرت داوٗد علیہ السلام کی خلافت و سلطنت سے ہوئی تھی۔ پھر ان کے جانشین بھی ایک نبی مرسل حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے۔ اس طرح اسّی سال تک دو نبی علیہما السلام اس میں حکمرانی کرتے رہے۔ امت مسلمہ کو جو خلافت عطا فرمائی گئی تھی اس میں تو کوئی نبی و رسول خلیفہ ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ سلسلہ نبوت و رسالت ختم ہوچکا تھا۔ چنانچہ امتی ہی خلفاء ہوئے۔ پھر خلافت بنی اسرائیل سے کامل مشابہت کہاں پائی گئی؟ اس سے عیاں ہے کہ آیت مقدسہ میں تشبیہ سے دونوں خلافتوں کے درمیان ہر وصف میں مشابہت مراد نہیں ہے۔ اس لئے ممکن ہے

(۱) سلاطین (۱۴: ۲۲ تا ۲۴)

کہ امت مسلمہ کی خلافت کا کوئی حصہ خیر و برکت اور عدل قائم کرنے میں خلافت بنی اسرائیل کے مشابہ نہ ہو۔ یا اس کے خلافت کی مدت بقاء خلافت بنی اسرائیل کی مدت بقاء سے کم ہو۔

اس کا جواب عرض کرنے سے پہلے اس اصول کا تذکرہ مفید بلکہ لازم ہے کہ قرآن مجید بلکہ کسی کلام بلیغ کو بغیر ذوق لسان و بیان محض منطقی اور فلسفیانہ طرز فکر سے نہیں سمجھایا جاسکتا۔ معترض کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ یہاں صرف استخلاف کو استخلاف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ مگر کیوں؟ اسے سمجھنے کے لئے یہ بات ملحوظ رکھنا چاہئے کہ استخلاف یا عطائے اقتدار امر تکوینی سے ہوا امر تشریعی سے نہیں ہوا۔ اور اسی کا وعدہ فرمایا گیا تھا اور مخالفین نے یہی سمجھا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے امر تکوینی سے عطائے اقتدار کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ نظم و تغیرات عالم کے عام قوانین تکوینی کے ماتحت کسی قوم کو اقتدار دیا جاتا اور کسی قوم کے ہاتھ سے زمام اقتدار چھین لی جاتی ہے۔ یہ سیاسی تغیرات عالم میں اللہ تعالیٰ کے امر تکوینی اور اس کے بنائے ہوئے عام قوانین تکوینیہ کے ذریعہ ہوتے رہے ہیں۔ اس سنت اللہ کے مطابق جس طرح بعض کافر قوموں اور امتوں کو اقتدار ملتا ہے اسی طرح بعض اوقات مسلم قوموں کو بھی اسی سنت اللہ کے ماتحت اقتدار عطا فرمایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وتلک الایام نداولھا بین الناس" (آل عمران ۱۴۰)

دوسری صورت استخلاف یا عطائے اقتدار کی یہ ہے کہ یہ اقتدار اللہ تعالیٰ کے مقرر فرمائے ہوئے عام تکوینی قوانین کے ماتحت امر تکوینی سے نہیں عطا فرمایا جاتا بلکہ کسی مخصوص امر تکوینی سے بطور انعام عطا فرمایا جاتا ہے اس مختصر تمہید کو سامنے رکھ کر آیت مقدسہ پر غور کرنے سے تشبیہ کا فائدہ روشن ہوجاتا ہے۔ اگرچہ استخلاف کی خبر بعنوان وعدہ خود بشارت اور مسرت خیز ہے لیکن پھر بھی مخاطب کے دل میں ہلکی سی خلش پیدا ہوسکتی تھی کہ یہ خلافت و مملکت عام قوانین تکوینی کے ماتحت حاصل ہوگی یا بطور انعام اور عطائے خاص؟ اس شبہ کو دور کرنے اور بشارت میں مزید اضافہ فرمانے کے لئے کما استخلف الخ فرماکر تشبیہ کے ذریعہ بات بالکل صاف فرمادی گئی اور اپنے مقبول بندوں کو اس طرح مزید مسرت و طمانینت بخشی گئی کہ تمہیں ہم خلافت و اقتدار بطور انعام عطا فرمائیں گے۔ یہ ہماری عطا فرمائی ہوئی نعمت ہوگی۔ اور ایسی نعمت ہوگی جو بہت سی نعمتوں کے حصول کا

سبب بنے گی۔ تشبیہ مذکورہ کا یہ فائدہ بدیہی طور پر سمجھ میں آتا ہے اسے پیش نظر رکھنے کے بعد ہمارا استدلال بالکل بے غبار ہوجاتا ہے اور یہ حقیقت بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ آیت میں تشبیہ صرف استخلاف کو نہیں دی گئی بلکہ نوعیت و کیفیت استخلاف کو نوعیت و کیفیت استخلاف سے دی گئی ہے اور اس کا تقاضا وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ یعنی خیرو برکت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہونے میں بھی اس خلافت کو سابقہ مشبہ بہا خلافتوں کے مثل ہونا چاہئے۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے تو تشبیہ سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ عطائے اقتدار میں مشابہت ہونے سے کیا فائدہ؟ یہ مشابہت تو اسے ہر سلطنت و حکومت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ خواہ وہ اہل ایمان کی سلطنت ہو یا غیر مسلمین کی۔ اس میں اہل ایمان کے اقتدار کی کیا تخصیص ہے؟ اس سے یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہوجاتی ہے کہ آیت میں تشبیہ صرف استخلاف کے ساتھ نہیں دی گئی ہے بلکہ کیفیت و نوعیت استخلاف کو کیفیت و نوعیت استخلاف کے مشابہ ظاہر فرمایا گیا ہے۔

شبہ تو بحمد اللہ بالکل صاف ہوگیا اور آیت سے ہمارا استدلال بالکل بے غبار ہوگیا مگر مخالفین خلفاء کی آنکھوں کا غبار دور کرنے کے لئے انہیں **آیتہ استخلاف** کے اس آخری جزو کی طرف متوجہ کرتا ہوں :۔

"ومن کفر بعد ذلک فا و لئک ھم الفاسقون"

اور جو لوگ اس کے بعد ناشکری کریں تو یہی لوگ فاسق ہیں

نعمت خلافت کے کفران کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسے نعمت کے بجائے **نقمت** کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ خلافت امت مسلمہ کو بطور انعام عطا فرمائی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انعام الٰہی سراپا خیرو برکت ہی ہوتا ہے ۔ خلافت راشدہ کے سراپا خیرو برکت ہونے میں تو کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں ۔ ان کے بعد بھی شام و اندلس کی اموی **خلافتیں** بغداد کی عباسی خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اسی خلافت کا حصہ تھیں ' جس کا وعدہ **آیت استخلاف** میں فرمایا گیا ہے اور جسے مدلل طریقے سے ہم چند سطور پیشتر واضح کرچکے ہیں۔ اس لئے **بفحوائے** آیت مقدسہ مذکورہ وہ سب امت محمدیہ **علی صاحبہا الف الف تحیتہ** کے لئے موجب فلاح و صلاح اور خیرو **طمانینت** تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی مذمت کرنا۔ خلفاء کو ظالم و جابر ' یا فاسق و فاجر کہنا ان کی خلافتوں کو ناجائز کہنا ' انہیں روم و ایران کے کافر و فاسق بادشاہوں سے تشبیہ دینا ' ان کے دور کو روم و ایرانی قسم کی " ملوکیت " کہنا ان پر افتراء کرنا کہ وہ کافر بادشاہوں کی طرح بیت المال کو اپنی ذاتی ملک سمجھے

تھے ۔ اور مسلمانوں کے مال کو اپنے تعیش کے لئے صرف کرتے تھے ۔ ان پر یہ بہتان باندھنا کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرسکتے تھے ۔ اور بے گناہوں کو قتل کرکے خون ناحق بہاتے تھے ' ان پر اور ان کے معاونین پر یہ اور اس قسم کے دوسرے الزام لگانا ۔ اور یہ کہنا کہ علماء و صلحاء کا طبقہ ان سے بیزار اور مایوس ہوگیا تھا اس لئے وہ ان سے بالکل الگ ہوگیا تھا ۔ ان خلفاء اور ان کے معاونین اور حامیوں پر اس طرح کی الزام تراشیاں کرکے تقریباً سات آٹھ سو سال تک باقی رہنے والی اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمت خلافت کو شر و فساد اور مصیبت و بلا ظاہر کرنا کیا کفران نعمت نہیں ہے ؟ پھر کیا آیت مقدسہ میں کفران نعمت کرنے والوں کو فاسق نہیں کہا گیا ہے ؟ اس آیت کا شیعوں پر صادق آنا تو بالکل واضح ہے ۔ لیکن وہ سنی جو اموی خلافت اور اموی خلفاء کی مذمت کرتے رہتے ہیں ان سے بغض و عداوت رکھتے ہیں اور جو شخص ان کی تعریف کرے اسے خارجی اور ناصبی کے القاب سے یاد کرتے ہیں ' ذرا غور کرلیں کہ کہیں وہ بھی تو اس آیت کریمہ نذیرہ کی زد میں نہیں آجاتے ہیں؟

دوسری آیت

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ ○ (آل عمران پ ۴)

" تم سب امتوں سے بہتر ہو (اور ایسی بہترین امت ہو جو دنیا میں سب لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجی گئی ہے تم حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور روکتے ہو برے کاموں سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر "

اس آیت شریفہ میں مخاطب پوری جماعت صحابہؓ ہے ۔ اس جماعت مقدسہ کو خیر امت یعنی بہترین امت یا خیر الامم ہونے کی سند عطا فرماکر اس اعلیٰ لقب سے یاد فرمایا گیا ہے ۔ اس کے بعد یہ خوش خبری بھی انہیں دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص رحمت سے تمہیں نوازا ہے اور تمہیں دوسری امتوں سے ممتاز کیا ہے ۔ تمہارا امتیاز یہ ہے کہ تمہیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے ۔ اور تمہاری پیدائش میں ایک حکمت خاص ہے ۔ وہ حکمت یہ ہے کہ تم دوسری امتوں اور افراد کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا عملی نمونہ ' اس کے مبلغ اور اس کے معلم بنائے گئے ہو ۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا کہ یہ

امت (امت صحابہؓ) اپنی ذمہ داری سے باخبر ہے اور اپنا فریضہ ادا کرتی ہے۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکران کا شیوہ ہے۔ اور یہ کمال ایمان سے متصف ہیں۔ ان کے یہ اوصاف حمیدہ ان کے ایمان کامل ہی کے آثار ہیں۔

آیت کا مفہوم واضح ہونے کے بعد غور فرمائیے کہ یہ آیت مقدسہ ہماری تاریخ پر کس طرح روشنی ڈال رہی ہے؟ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیا میں باقی رہیں گے اس وقت تک امت میں صلاح و تقویٰ کا دور دورہ رہے گا۔ جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی کبیرہ یا صغیرہ امت میں عام نہ ہوگا۔ کچھ افراد اگر کسی معصیت کبیرہ یا صغیرہ کا ارتکاب کریں تو اسے اس پیشین گوئی کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن کسی معصیت کا رواج عام ہوجانا' یا کسی کا کبیرہ پر اصرار' یا کھلم کھلا کسی فسق میں مبتلا ہونا۔ پھر اس سے توبہ نہ کرنا۔ اور اس پر کسی کا روک ٹوک نہ کرنا یہ سب امور غیر ممکن ہیں۔ اور جب تک صحابہ کرامؓ باقی رہیں گے معاشرے اور قوم میں ان کا پایا جانا محال ہے۔

امیر المومنین یزید مغفور کے زمانہ خلافت میں کئی سو حضرات صحابہؓ موجود تھے۔ مخالفین بنی امیہ امیر یزیدؒ پر فسق و فجور' اور ظلم و جور کا الزام لگاتے ہیں۔ اور ان کی مذمت کرنے کو کار خیر سمجھتے ہیں' وہ اس سوال کا جواب دیں کہ ان صحابہ کرامؓ نے امیر یزید کو اس فسق و فجور سے منع کیوں نہ کیا؟ قرآن مجید تو حضرات صحابہؓ کو "الآمر بالمعروف والناہی عن المنکر" ہونے کی سند دے رہا ہے اور بتارہا ہے کہ تمہارا مزاج یہی ہے کہ تم "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کرتے ہو۔ تو کیا قرآن مجید کا یہ بیان غلط ہے؟ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔

کیا فسق و فجور سے منع کرنا اور اتباع شریعت کی تائید کرنا اس وقت کے مسلمانوں' خصوصاً صحابہ کرامؓ پر فرض نہ تھا؟ پھر یہ فرض انہوں نے کیوں نہ ادا کیا؟

جن فاسقانہ اعمال کی نسبت امیر یزیدؒ کی طرف یہ سبائیت نواز حضرات کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی عمل پر بھی کسی صحابیؓ نے موصوف کو کبھی نہیں ٹوکا اگر ان سبائی ذہن والوں کا بیان صحیح مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس دور کے سب مسلمان خصوصاً صحابہؓ اس فرض کو ترک کرنے کے عصیان کبیر کے مرتکب ہوئے۔ العیاذ باللہ۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے کہ بعض صحابہؓ نے منع کیا ہو مگر وہ نہ مانے ہوں' تو اس کا جواب یہ ہے کہ کہ یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ صرف امکان سے الزام دور نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے

ثبوت درکار ہے۔ اور ذرہ برابر بھی اس کا ثبوت موجود نہیں کہ کسی صحابیؓ نے امیر یزید مرحوم پر ان کے کسی مبینہ فسق کے اوپر نکیر کی ہو ' یا کسی مبینہ فجور اور معصیت یا ظلم و جور سے منع کیا ہو۔ بلکہ اس کے بجائے تاریخ بتاتی ہے کہ بعض صحابہ اور اجلہ تابعین امیر یزیدؒ کے یہاں جاکر کئی کئی دن قیام کرتے تھے ۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاجزادے حضرت علی المعروف بزین العابدین رحمہ اللہ کی امیر یزیدؒ سے تو بہت مخلصانہ دوستی تھی جو عمر بھر قائم رہی ۔ حادثہ کربلا کا اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا ۔ اچھا بالفرض ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ کسی صحابیؓ نے انہیں فسق و فجور سے منع بھی کیا تھا اور امر بالمعروف بھی کیا تھا مگر انہوں نے ان کی بات نہ مانی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان حضرات صحابہؓ نے انہیں معزول کیوں نہ کیا ؟ اور ان سے ملنا جلنا کیوں نہ ترک کیا ؟ ان کی اعانت کیوں کرتے رہے ؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جماعت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا رواج عام ہو۔ اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ تربیت پانے والے اور انوار نبوت و رسالت سے بلا واسطہ اپنے قلوب کو منور کرنے والے اولیاء اللہ بتعداد کثیر موجود ہوں ' اور اس کی تربیت و تعلیم میں مصروف رہیں ' اس جماعت کی ایمانی و اخلاقی کیفیت کی سطح یقیناً بہت بلند و برتر ہوگی ۔ آیت کا مقتضا یہ ہے کہ جب تک صحابہ کرامؓ دنیا میں موجود رہے اس وقت تک مسلم معاشرہ کا اخلاقی و عملی ' معیار یقیناً بلند رہا ۔ اور اس کا ایمان کامل رہا ۔ پھر اتنے اچھے پاکیزہ اور منور معاشرے میں حکمران فاسق کی گنجائش کیسے نکل آئی ؟ کسی اچھے معاشرے میں کسی فاسق کا حکومت پر قابض ہوجانا بالکل بعید از قیاس ہے اور تاریخ میں اس کی ایک نظیر بھی نہیں ملتی ۔ اگر دھوکہ میں کبھی ایسا ہوجاتا ہے تو ایسا حکمران معزول یا قتل کردیا جاتا ہے ۔ تاریخ میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں لیکن ایسا کوئی واقعہ نہ ملے گا کہ کسی اچھے اور معیاری معاشرے نے کوئی برا حکمران پیدا کیا ہو یا اسے پسند اور گوارہ کیا ہو۔

مخالفین بنی امیہ نے جو الزام خلفاء بنی امیہ خصوصاً امیر یزیدؒ پر لگائے ہیں اگر انہیں صحیح تسلیم کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ جو صحابہ کرامؓ اس وقت موجود تھے وہ سب خاطی اور عاصی تھے اور انہوں نے اپنا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں ادا کیا۔ پھر اس سے معاذ اللہ آیت قرآنی کی تکذیب لازم آتی ہے۔ اسی طرح مخالفین بنی امیہ کے زیر بحث الزاموں اور بیانات کو صحیح تسلیم کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس وقت

کا معاشرہ فاسق و فاجر ہوگیا ہو۔ حالانکہ آیت کا مقتضا یہ ہے کہ اس وقت کا معاشرہ صالح، تھا اور ایمان و تقویٰ کی روشنی سے منور تھا۔ کوئی مومن قرآن مجید کی تکذیب نہیں کرسکتا۔ کلام اللہ یقیناً و قطعاً سچا اور حق ہے۔ اس لئے بداہتاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خلافت و خلفاء بنی امیہ پر ان کے مخالفین شیعوں اور شیعیت نوازوں کے جملہ اعتراضات و الزام قطعی طور پر غلط اور جھوٹے ہیں۔ درحقیقت خلافت بنی امیہ کا دور شاندار، عادلانہ، مبارک اور قابل فخر دور تھا۔ اس کے خلاف شیعہ اور شیعیت نواز، مورخین اور ان کے متبعین کے روایات اور بیانات یقیناً جھوٹے اور غلط ہیں۔ قرآن مجید حق ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کا بیان کوئی چیز نہیں۔ اور اس کے خلاف جس کا بھی بیان ہو وہ باطل ہے۔

شیعہ تو اس کا یہ جواب دے کر کہ معاذ اللہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے۔ اور یہ آیت دوسری طرح تھی، اپنی جان چھڑا لیں گے ان سے ہمارا خطاب بھی نہیں۔ سوال تو ان سنیوں سے ہے جو بنو امیہ خصوصاً امیر یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم و جابر کہنا بمنزلہ واجب و فرض سمجھتے ہیں۔ اس تبرا پسندی اور شوق سب و شتم کو سنیت کی علامت کہتے ہیں۔ یہ لوگ اس آیت مقدسہ کا کیا جواب دیں گے؟ وہ تو قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور سب صحابہؓ کو اچھا اور صالح کہنا بھی شعار اہلسنت جانتے ہیں۔

تیسری آیت

عسى الله ان يجعل بينكم و بين الذين عاديتم منهم مودة والله قدير (الممتحنہ جز ۲۸)

قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان محبت پیدا کردے جن سے تمہیں (اس وقت) دشمنی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔

یہ آیت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ یہ ہماری ابتدائی تاریخ کی نشاندہی اس طرح کررہی ہے کہ فتح مکہ کے بعد قریش کے وہ لوگ جو نزول آیت کے وقت تک کافر تھے مسلمان ہوجائیں گے۔ اور اس وقت کے اہل ایمان یعنی صحابہ کرامؓ اور ان کفار قریش کے درمیان اختلاف دین کی وجہ سے جو عداوت اور دشمنی ہے وہ دور ہوجائے گی اور اس کے بجائے دونوں جماعتوں کے درمیان محبت اور مودت پیدا ہوجائے گی۔

نزول آیت کے وقت تو یہ مستقبل کی خبر اور اطلاع تھی۔ لیکن اب یہ ماضی کی خبر اور اسلام کے دور اول کی تاریخ ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل قطعی اور یقینی ہے کہ فتح مکہ کے بعد مہاجرین و انصار، اور بعد فتح مکہ ایمان لانے والے قریش و غیر قریش کے درمیان

کوئی عداوت اور دشمنی نہیں باقی رہی تھی بلکہ اس کے بجائے ان کے درمیان محبت و مودت پیدا ہوگئی تھی جو زندگی بھر باقی رہی۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک کسی ایک فرد کے دل سے بھی زائل نہیں ہوئی۔

آیت سے روز روشن کی طرح یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ مخالفین بنی امیہؓ بنو ہاشم و بنو امیہ کے درمیان حسد و عداوت کا جو افسانہ بیان کرتے ہیں وہ سرتاپا غلط اور جھوٹ ہے۔ صحابہؓ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان محبت اور مودت پیدا ہوگئی تھی۔ جو قائم و دائم رہی۔

آیت کے لفظ عادیتم پر غور کیجئے۔ یہ فعل ہے جو حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے اس طرف اشارہ سمجھ میں آتا ہے کہ بنو ہاشم و بنو امیہ کے درمیان کوئی قدیم دشمنی اور عداوت نہیں تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بھی دونوں کے درمیان محبت کا تعلق تھا۔ عداوت اس وقت پیدا ہوئی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی۔ جن حضرات نے دعوت پر لبیک کہا ان سے ان لوگوں کو عداوت پیدا ہوئی جو اپنے کفر پر جمے رہے تھے۔ اور جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ عداوت اختلاف دین کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے سے نہیں تھی۔ پھر جب ان لوگوں کو بھی ہدایت ہوئی اور وہ بھی دولت اسلام سے مالا مال ہوگئے تو وہ عداوت خود بخود جاتی رہی اور اس کی جگہ مودت و محبت نے لے لی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ اور شیعیت نواز تاریخ نگاروں نے ان دونوں خاندانوں کے درمیان قدیم عداوت و دشمنی کی جو کہانی گڑھی ہے وہ قطعاً جھوٹی اور سرتاپا کذب و دروغ ہے۔ جو سبائی کارخانہ دروغ بافی و افتراء پردازی کی تیار کی ہوئی ہے۔ (۱)

---

(۱) سبائی اور سبائیت پرور کہانی کہنے والوں نے ایک عجب قصہ گڑھ کر مشہور کیا ہے کہ عبد شمس اور ہاشم جڑواں پیدا ہوئے تھے اور ان کے سر جڑے ہوئے تھے انہیں تلوار سے جدا کیا گیا تو قبیلہ کے کسی کاہن نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی۔ یہ بے سروپا احمقانہ کہانی خوب مشہور کی گئی۔ حیرت ہے کہ اچھے اچھے ثقہ حضرات، یہاں تک کہ بعض علماء بھی اسے سچ سمجھتے ہیں اور اس کا یقین کرتے ہیں۔ بغداد کے ایک بڑے عالم دین نے بھی یہ من گڑھت قصہ اپنی ایک کتاب میں نقل کردیا۔ حالانکہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی اس پر ذرا غور کرے تو اس کا سرتاپا جھوٹ ہونا واضح ہوجاتا ہے۔ اول تو

احادیث

قرآن مجید کے جو آیات مقدسہ اوپر نقل کیے گئے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سے آیات قرانیہ سے اسلامی تاریخ کے دور اول پر روشنی پڑتی ہے۔ اور تقریباً ایک صدی کی تاریخ کا مزاج اور اس کا مخصوص رنگ ان سے معلوم ہوجاتا ہے، مگر ہم بخوف طوالت انہیں آیات کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس بحث کا محور خلافت ہے۔ اس لئے اب ہم اس سلسلہ میں چند احادیث شریفہ نقل کرتے ہیں جن سے اسلام کے ابتدائی ادوار کی تاریخ کی ایک تصویر سامنے آنے کے علاوہ ان ادوار کے نظام خلافت کی نوعیت و کیفیت کا نقشہ مخصوص طور پر واضح ہوجاتا ہے۔ اور آیتہ استخلاف کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

پہلی حدیث

"حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا محمد بن جعفر قال ثنا شعبة عن فرات القزاز قال سمعت ابا حازم قال قاعدت ابا هريرة خمس سنين فسمعته يحدث عن النبي صلى الله عليه وسلم قال كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء كلما هلك نبي خلفه نبي، وانه لا نبي بعدي و سيكون خلفاء فيكثرون قالوا فما تامرنا يا رسول الله ؟ قال ! فوا ببيعة الاول

"(بیان سند کے بعد) ابو حازم کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس پانچ سال رہا میں نے ان سے یہ بات سنی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کا سیاسی انتظام انبیاء کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ ایک نبی کے انتقال کے بعد دوسرے نبی ان کے (جانشین) ہوجاتے تھے اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، بلکہ خلفاء ہوں گے جو بکثرت ہوں گے، لوگوں نے (صحابہؓ نے) عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں کیا حکم ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ پہلے کی بیعت کے وفادار رہو۔ انہیں ان

دونوں کا جڑواں پیدا ہونا ہی ثابت نہیں۔ دوسرے بچوں کا سر اس طرح جڑا ہوا ہو تو ان دونوں کو کاٹ کر جدا کرونا موجودہ دور میں بھی بہت مشکل بلکہ تقریباً غیر ممکن ہوتاہے جبکہ سرجری بہت ترقی کرچکی ہے۔ چہ جائیکہ اس زمانہ میں۔ اس طرح جدا کرنے سے دونوں مرجاتے ہیں پھر بالفرض یہ جدائی ممکن بھی ہو تو تلوار سے جدا کرنے کا یہ اثر کہ دونوں کے درمیان تلوار چلے محض خرافاتی بات ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں۔

فالأول فالأول اعطوهم حقهم فان الله سائلهم عما استرعاهم" — کا حق دو' ان کی رعیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا۔"

(بخاری ج اول جز ۱۳ کتاب الانبیاء
باب' ماذکر عن بنی اسرائیل ص ۴۹۱)

مسلمہ مسئلہ ہے کہ سنت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم' کتاب کریم کا بیان کرتی ہے اور قرآن مجید کے احکام عملیہ کی عملی شکل کی وضاحت کرتی ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس حدیث شریف پر غور کیجئے۔ اس میں اس خلافت موعودہ کی عملی اور خارجی شکل و صورت کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے تو اس کی کیفیت اور اس کے مزاج کو بقدر ضرورت روشن کردیتا ہے۔ حدیث مذکور میں مندرجہ ذیل اہم خبریں بیان فرمائی گئی ہیں:۔

۱ :۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے آنحضور علیہ السلام کے بعد خلفاء اور سربراہان مملکت امتی ہوں گے۔ کوئی نبی نہیں ہوگا۔

۲ :۔ خلفاء کثیر تعداد میں ہوں گے۔ خلفاء راشدین کی تعداد حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر حضرت معاویہؓ تک صرف چھ ہوتی ہے۔ چھ کی تعداد کو عرف و محاورے میں کثیر نہیں کہا جاتا۔ کثرت تو اسی وقت ثابت ہوگی جب سب خلفاء بنو امیہ و بنو عباس کو اس زمرے میں شامل کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں علاوہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے دمشق' بغداد اور اندلس کے سب اموی و عباسی خلفاء کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔

۳ :۔ بعض صحابہ کرامؓ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب خلفاء کی تعداد کثیر ہوگی تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دو جماعتیں دو الگ الگ اشخاص کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ اس وقت کا کیا حکم ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا کہ جسے پہلے منتخب کیا جاچکا ہو اسی کو خلیفہ تسلیم کرو دوسرے کا انتخاب کالعدم ہے۔ اور اسے اپنا امام و سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں۔

سوال مذکور کا جواب دینا اس بات کی روشن علامت ہے کہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کے نزدیک بھی خلفاء کی اتنی کثرت ہوسکتی تھی اور سائل نے جس احتمال کی بناء پر سوال کیا تھا وہ احتمال محض ایک مفروضہ نہیں تھا' بلکہ خاصا قوی احتمال تھا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ باخبار الٰہی اس امر کو جانتے تھے کہ امت کو ایک بہت وسیع و عریض سلطنت ملے گی' جس میں دو یا زیادہ افراد کا امیدوار خلافت ہونا

بھی ممکن ہوگا ۔ کیونکہ کسی چھوٹے سے ملک میں اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے ۔ اس حدیث شریف کے یہ مضامین تو بالکل عیاں ہیں ۔ ان کے لئے تأمل و تعمق کی احتیاج نہیں، لیکن مندرجہ ذیل مضمون ذرا دقیق ہے اور تدقیق نظر سے سمجھ میں آتا ہے ۔

۴ :۔ حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی سیاست ایک مدت تک انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں رہی ۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے عدل قائم فرمایا اور قوم کی صلاح و فلاح کی کوشش فرمائی پھر ارشاد ہوا کہ بیشک میرے بعد کوئی نبی' نہ آئے گا بلکہ خلفاء ہوں گے ۔ اس سے صاف اشارہ اس امر کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ قیام عدل اور صلاح و فلاح امت کا جو کام بنی اسرائیل میں انبیاء علیهم السلام انجام دیتے تھے وہ کام اس امت میں خلفاء سے لیا جائے گا۔ یعنی اس طرح کہ یہ خلفاء اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اور میری سنت کو قائم کریں گے اور میرے بتائے ہوئے طریقوں سے ملت کی صلاح و فلاح کی فکر و کوشش کریں گے ۔ ان کے ادوار میں دین قائم ہوگا اور عدل کا رواج ہوگا ۔

دوسری حدیث

بخاری شریف کتاب الاحکام میں ان خلفاء کی ایک خصوصیت کا بھی بیان فرمایا گیا ہے ۔ حدیث درج ذیل ہے :۔

باب : حدثنا محمد بن المثنی حدثنا غندر حدثنا شعبة عن عبد الملک قال سمعت جابرؓ بن سمرةؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیه وسلم یقول : "یکون اثنا عشر امیرا" فقال کلمة لم اسمعها فقال ابی انه قال : "کلهم من قریش"

(بخاری شریف ج ثانی کتاب الاحکام ص ۱۷۲)

(سند کے بعد) عبدالملک سے مروی ہے کہ انہوں نے (حضرت) جابر بن سمرہ (رضی اللہ عنہ) سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ " بارہ امراء ہوں گے " ' (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ) اس کے بعد (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بات فرمائی جو میں نہیں سن سکا پھر میرے والد (حضرت سمرۃؓ) نے بتایا کہ بیشک (آنحضورؐ نے) یہ فرمایا کہ "وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے"

تیسری حدیث

حدثنا هداب بن خالد الازدی قال نا حماد بن سلمة قال سمعت جابر بن سمرةؓ یقول سمعت رسول الله صلی الله علیہ وسلم یقول : "لایزال الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفة" ثم قال کلمة لم افہمہا فقلت لابی ما قال فقال "کلہم من قریش"

(مسلم ج ۲ کتاب الامارۃ)

(سند کے بعد) حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بات سنی آنحضور فرمارہے تھے کہ "اسلام بارہ خلفاء کے (دور تک) غالب رہے گا" پھر آنحضور نے ایک بات فرمائی جو میں نہیں سمجھ سکا۔ پس میں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ آنحضورؐ نے کیا فرمایا تھا۔ (میرے والد نے) جواب دیا کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا "سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔"

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صراحت کے ساتھ یہ بشارت دی ہے کہ ان خلفاء کے دور میں اسلام عزیز یعنی غالب اور معزز رہے گا۔ اسلام کے غالب اور عزیز ہونے کے سوا اس کا کوئی مطلب نہیں ہوسکتا کہ اسلامی ملک میں رہنے والے سب مسلمان یا کم از کم ان کی اغلب اکثریت اس پر عمل پیرا ہوگی۔ اور دشمن اسلام طاقتیں ان کے سامنے سپرانداز ہونے پر مجبور ہوں گی۔ دشمنان صحابہؓ اور اعداء بنو امیہ ذرا غور کریں کہ اگر ان خلفاء میں سے کوئی ظالم و جابر یا فاسق و فاجر ہوتا تو کیا اس کی سربراہی اور خلافت کے دور کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں "اسلام عزیز" یعنی غالب رہا؟ جب سربراہ مملکت جو عزت اسلام کی بقاء اور اس میں اضافہ کا ذمہ دار ہے خود ہی اس کی خلاف ورزی کرکے اس کی عزت کم کرتے تو اسلام کو "عزیز" اور غالب کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر واقعی ایسا ہوا تو معاذ اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی صحیح نہ نکلی۔ ایک مسلمان کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کا غلط ہونا غیر ممکن اور محال ہے۔ اس لئے سبائیوں اور سبائی ارجاف و غلط بیانی سے متاثر ہونے والے تاریخ نگاروں نے ان خلفاء پر جو الزام لگائے ہیں وہ یقیناً غلط اور کذب و افتراء ہیں۔

انہوں نے اپنے ذہنوں اور دلوں کی سیاہی ہماری تاریخ پر پھیر کر اسے تاریک بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ بہت ناپاک اور قابل نفرت کوشش ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف بتادیا کہ میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے اور ان کے دور میں اسلام کا غلبہ ہوگا۔ یعنی فضاء پر تقویٰ چھایا ہوا ہوگا' عدل و انصاف قائم ہوگا' صالحین کی حکومت ہوگی۔ علم اسلام بلند ہوگا اور علم کفر سرنگوں ہوگا۔ اسلام کے عزیز اور غالب ہونے کے اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔

چوتھی حدیث

بخاری شریف کی ایک قدرے طویل حدیث کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی ہماری تاریخ کی تابانی سے صاحبان بصیرت کی آنکھیں روشن کررہا ہے۔

"ان هذا الامر فی قریش لا یعادیهم احد الا کبه الله علی وجهه ما اقاموا الدین

(صحیح بخاری ج اول کتاب المناقب باب مناقب قریش ۴۹۷)

"بے شک یہ امر (یعنی خلافت) قریش کے ہاتھ میں رہے گا جو شخص ان سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل گرادے گا۔ (خلافت ان کے پاس اس وقت تک رہے گی) جب تک وہ دین کو قائم کرتے رہیں گے۔"

اس حدیث کے رواۃ: ابو الیمان' شعیب' زہری' محمد بن جبیر بن مطعم' حضرت معاویہ ہیں۔

حدیث کا آخری فقرہ فیصلہ کن ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ کہ جب تک قریش دین کو قائم رکھیں گے اس وقت تک خلافت انہیں کے ہاتھ میں رہے گی۔ اور کوئی غیر قریشی خلیفہ نہ ہوگا۔ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی غلط نہیں ہوسکتی' تو یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک خلافت بنی امیہ' و بنی عباس قائم رہی اس وقت تک خلفاء اور ان کے معاونین اور قریشی مسلمان دین کو قائم کرتے رہے۔ کیونکہ ازروئے حدیث نعمت خلافت ان میں اسی وقت تک رہ سکتی تھی جس وقت تک وہ اقامت دین کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ دمشق' بغداد اور اندلس کی سب خلافتیں برحق اور دین کو قائم کرنے والی متقی و صالح خلافتیں تھیں' خلفاء اور ان کے معاونین عادل صالح اور دین دار تھے۔ اور اخلاص کے ساتھ اقامت دین کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اگر وہ صالح نہ ہوتے تو اقامت دین کا فریضہ کیسے ادا ہوسکتا تھا؟

اس مقام پر یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ حدیث کے آخری فقرے میں لفظ "اقاموا" جمع ہے اور ضمیر جمع کا مرجع پورا قبیلہ قریش ہے، کوئی فرد خاص نہیں ہے۔ مطلب صاف ہے کہ قریش کے ہاتھ سے خلافت و حکومت اس وقت نکل جائے گی جب خاندان قریش میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوگا۔ اور وہ اقامت دین کا فریضہ ادا کرنے میں غفلت برتیں گے، کسی خلیفہ کی غفلت و کوتاہی کو اس کا سبب نہیں بتایا گیا، خلفاء کی کسی کوتاہی و غفلت کی طرف اشارہ تک نہیں فرمایا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت قریش کا زوال اقامت دین کی طرف سے کسی خلیفہ وقت کی کسی کوتاہی اور غفلت کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ عوام قریش کی غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے ہوگا۔ اگر اس زوال میں کسی خلیفہ کی غفلت کو دخل ہوتا تو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف کم از کم اشارہ فرماتے۔ زوال خلافت کے لئے اموی یا عباسی خلفاء کو الزام دینا گمراہ کن غلطی ہے۔

مضمون حدیث کی تشریح میں اس اہم نکتہ پر متنبہ کردینا بھی ضروری ہے کہ حدیث میں بارہ خلفاء کی پیشین گوئی کا یہ مطلب نہیں کہ صرف بارہ ہی خلفاء ہوں گے۔ بلکہ یہ بیان کثرت کے لئے ہے۔ بخاری کی جو روایت اس حدیث سے پہلے نقل کی جاچکی ہے اس میں "لیکثرون" یعنی مطلق کثرت کا بیان ہے۔ محاورہ عرب میں بارہ کا عدد مطلق کثرت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں بھی بارہ کا مطلب یہی ہے کہ بکثرت خلفاء ہوں گے۔ یا یہ کہ کم از کم بارہ ضرور ہوں گے۔ اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ کثرت کا اثبات ہے۔ زیادتی کی نفی نہیں ہے۔

حدیث کی اہمیت ۔ نشان رسالت

اس حدیث شریف میں بارہ خلفاء کی پیشین گوئی دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلفاء تو بارہ سے زیادہ ہوئے۔ اس سے پہلے جو حدیث ہم نے نقل کی ہے خود اس میں لیکثرون کا لفظ ہے۔ یعنی خلفاء بتعداد کثیر ہوں گے۔ لیکن اس پیشین گوئی کے بعد مخصوص طور پر بارہ خلفاء کی خبر دینے میں کیا حکمت ہے؟ غور کرنے سے اس تخصیص کی بعض حکمتیں سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن اتفاق سے تورات کا مطالعہ کیا تو ایک عجیب حکمت سمجھ میں آئی جس سے اس حدیث شریف کی اہمیت اور اس پیشین گوئی کی عظمت و اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ بائبل کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے

برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا۔ اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے۔ اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا ○"

(پیدائش: ۱۷: ۲۰)

خط کشیدہ فقروں پر غور کیجئے۔ بارہ خلفاء یہ وہی بارہ سردار تھے جن کی خوش خبری تورات شریف کی ان آیتوں میں دی گئی ہے۔ اور ان کا ہونا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آنحضور علیہ الصلوات و السلام کی صداقت کا ایک نشان، اور مسیحیوں، یہودیوں کے مقابلے میں ایک حجت و برہان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص طور پر ان بارہ خلفاء کی پیشین گوئی فرمائی اور قطع و یقین کے ساتھ فرمایا کہ یہ سب قریش ہی میں سے ہوں گے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہوں گے۔ جس کی خبر تورات شریف میں دی گئی ہے۔ یہ حدیث علامت نبوت و صداقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اہل کتاب پر قوی حجت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود اور شیعوں کو ان خلفاء سے سخت دشمنی ہے۔ اس بشارت کو پیش نظر رکھ کر ہر فہیم شخص جس کا ذہن نسبی عصبیت اور شیعیت کے اثر سے پاک ہو یہی سمجھے گا کہ ان بارہ خلفاء میں سے کوئی بھی فاسق و فاجر ظالم و جابر نہیں ہو سکتا بلکہ بلا شبہ سب کے سب عادل اور صالح تھے۔ بات روشن ہے کہ جن لوگوں کے اقتدار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و رسالت کی ایک دلیل بتایا گیا ہو برے اور ظالم کیسے ہو سکتے ہیں؟ یقیناً وہ صالح متقی اور عادل ہوں گے۔ جو روایتیں ان کے خلاف ہیں وہ یقیناً غلط ہیں۔

اس پیشین گوئی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صحابہ کرامؓ کو اسلام کی بقاء دائم، اس کی آئندہ ترقی، اور امت مسلمہ کی تعداد و قوت میں اضافے کی بشارت دینا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس ارشاد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل قریب میں امت کے کردار ان کے طرز رفتار اور اس دور کی نوعیت و کیفیت کے اجمالی خاکے سے اس وقت کی امت موجودہ کو روشناس کرادیا۔ اور ان ادوار کے بعد آنے والی امت کا اجمالی تعارف ان کی تاریخ سے کرادیا۔ تاکہ وہ اپنی شاندار اور درخشاں تاریخ سے قوت حاصل کرکے اپنے حال و مستقبل کو روشن کرسکے۔ یہ اعلیٰ مقاصد و مصالح بھی حدیث مذکور کو بشارت ہی بتاتے ہیں۔ بشارت نعمت ہی کی دی جاتی ہے۔ مصیبت کی نہیں دی جاتی۔ ان بارہ خلفاء کی خلافتیں بلکہ بغداد و اندلس کی بھی سب خلافتیں، اس

حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہی تھیں، ورنہ ان کی خوشخبری نہ دی جاتی - پھر جب نعمتیں تھیں تو یقیناً یہ جائز، عادلانہ اور باعث خیر و برکت تھیں۔ شیعوں اور شیعی الفکر لوگوں نے جو اعتراضات ان پر کئے ہیں وہ بالکل غلط او رکذب و دروغ ہیں -

پانچویں حدیث

اسی سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیث بھی دیکھئے :-

"حدثنا قتيبة بن سعيد و هناد بن السرى قالا نا ابو الاحوص عن منصور عن ابراهيم بن يزيد عن عبيدة السلمانى عن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خير امتى القرن الذين يلونى ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم يجيئى قوم تسبق شهادة احدهم يمينه و يمينه شهادته لم يذكر هناد القرن فى حديثه تقال قتيبه ثم يجيئى اقوام"

(صحیح مسلم ج ۲ کتاب الفضائل - باب الفضائل - باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم الخ ص ۳۰۹)

"(سند کے بعد) حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو میرے زمانہ میں میرے ساتھی ہیں - پھر (خیریت اور بھلائی میں) ان لوگوں کا درجہ ہے جو ان کے (میرے ساتھ والوں کے) ساتھی ہوں گے - ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جو ان کے (میرے ساتھیوں کے ساتھ والوں کے) ساتھی ہوں گے پھر ایسی قوم آئے گی جن کی (جن کے افراد کی) گواہی قسم سے پہلے اور قسم گواہی سے پہلے ہوگی - (یعنی گواہی دینے اور قسم کھانے میں احتیاط نہیں برتیں گے - بلکہ جلدی کریں گے)"

"ہناد نے اپنی حدیث میں لفظ "القرن" نہیں ذکر کیا ہے - اور قتیبہ نے (قوم کے بجائے) "ثم يجيئى" اقوام کہا ہے۔"

حدیث شریف کا مطلب صاف ہے - خیر الخلائق نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم فرماتے ہیں کہ میری امت میں بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں اور میرے ساتھ ہیں - یعنی صحابہ کرامؓ - مختصر الفاظ میں صحابہ کرامؓ امت کا بہترین حصہ اور

افضل ترین جماعت ہیں اور دور نبوی ؑ امت کے ادوار میں سب سے بہتر اور اعلیٰ حصہ ہے ۔ اس کے بعد وہ لوگ بہتر اور خیر امت ہیں جو میرے بعد دور صحابہؓ میں ہوں گے اور صحابہ کرامؓ کے ساتھی ہوں گے۔ یہ گروہ خیر و خوبی میں صحابہؓ کے درجہ پر تو نہ ہوگا بلکہ اس سے فرو تر ہوگا۔ لیکن اس دور کے بعد آنے والی امت کے ہر حصے سے اعلیٰ و بہتر ہوگا۔ اس گروہ کا لقب عرف علماء اہلسنّت میں تابعین ہے۔ اس کے بعد خیر اور بھلائی میں ان لوگوں کا درجہ ہے جو ان صحابہؓ کو دیکھنے والوں کے ساتھی ہوں گے یعنی جن کا لقب عرف علماء اہلسنّت میں تبع تابعین ہے ۔ یہ خیر میں تابعین کے درجہ کے تو نہ ہوں گے مگر اپنے بعد آنے والی امت سے بہتر اور برتر ہوں گے ۔ ان سب طبقات میں خیر ایک مشترک وصف ہوگا۔ یعنی ان میں شر نہ ہوگا ۔ خیر ہی خیر ہوگی ۔ البتہ خیر کے درجات میں تفاوت ہوگا ۔ اس ارشاد نبوی کا خلاصہ یہ ہے کہ افراد امت میں بہترین افراد صحابہ کرامؓ ہیں ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین ۔ دوسرے الفاظ میں بہترین دور دور نبویؐ ہے اس کے بعد دور صحابہؓ ' اس کے بعد دور تابعین ' اس کے بعد دور تبع تابعین اور تبع تابعین کے بعد جو "قرن" یا دور آئے گا اس میں امت کی اس خیریت میں نقص پیدا ہونا شروع ہوجائے گا ۔ اس نقص کی ابتداء اس صورت سے ہوگی لوگ شہادت دینے اور قسم کھانے کے بارے میں غیر محتاط ہوجائیں گے ۔ جن حالات میں بلا طلب شہادت دینا شرعاً ضروری نہ ہوگا ' وہاں بلا طلب گواہی دینے کے لئے تیار ہوجائیں گے ۔ اسی طرح بلا ضرورت اور بغیر طلب بھی قسم کھانے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوگی ۔ اس ارشاد نبوی سے عیاں ہے کہ تبع تابعین کے بعد امت کے تقویٰ میں کمی ہوجائے گی ' اور یہ کمی اس طرح شروع ہوگی کہ لوگوں کے دلوں میں صدق و امانت کی وہ قدر و قیمت نہیں باقی رہے گی جس کے یہ اوصاف مستحق ہیں۔ اسی لئے وہ شہادت دینے اور قسم کھانے میں سبقت کریں گے اور انہیں ان کا وزن محسوس نہ ہوگا ۔ حدیث میں **ثم یجیئ** قوم یا اقوام کے الفاظ صاف اشارہ کررہے ہیں کہ یہ نقص تقویٰ ان تبع تابعین سے ملنے والوں اور ان سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے والوں میں نہ پیدا ہوگا ۔ بلکہ یہ اس قوم (یا ان اقوام) میں نمودار ہوگا جو **حدیث العہد بالاسلام** ہوں گی یعنی نو مسلم قوم یا اقوام میں نمودار ہوگا۔ جو لوگ دور نبوی میں ہم آغوش اسلام ہوئے وہ متقی رہیں گے اور ان کی اولاد در اولاد جو اسلام پر قائم رہی' وہ تقویٰ پر قائم رہے گی اور اس میں مذکورہ بالا نقص نہیں پیدا ہوگا ۔ اگر "شہادت و یمین" میں سبقت اور صدق و امانت کی ناقدری کا نقص ان **قدیم العہد** اہل ایمان میں پیدا ہونے

کا اندیشہ ہوتا تو ثم یجیئی قوم (یا اقوام) (پھر ایک قوم یا کچھ قومیں آئیں گی) نہ فرماتے۔ اور صاف صاف اس نقص کی نسبت انہیں کی طرف کردیتے۔ اس فقرے سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ اس دور میں یعنی خیرالقرون رابع کے بعد جن لوگوں میں نقص مذکور ظاہر ہوگا وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گے جو پشتینی مسلم ہوں گے اور جن کے یہاں دولت اسلام خیرالقرون اول سے ان کے قرن تک وراثتاً" منتقل ہوئی ہوگی بلکہ نومسلم قوموں میں سے ہوں گے۔ اور پشتینی مسلمانوں کے لئے بحیثیت جماعت اور قوم اجنبی ہوں گے۔

حدیث شریف کا مطلب سمجھنے کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی چار قرون سراپا خیر و برکت اور دنیا کی تاریخ میں بے مثال تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش خبری ایک صدی سے زائد کی اسلامی تاریخ کا نقشہ امت کے سامنے پیش کررہی ہے۔ اس نے خیرالقرون کے بعد آنے والی امت مسلمہ کے لئے ان کا ماضی مستقبل کے آئینہ میں منعکس کرکے محفوظ فرمادیا۔ اسی میں دور نبویؐ کی امت نے مستقبل کا چہرہ دیکھا۔ اور بعد کو آنے والی امت مسلمہ اسی آئینہ مجلا میں اپنے ماضی کا سراپا دیکھ سکتی ہے۔

ازروئے حدیث مذکور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی خیرالقرون اعلیٰ اور سراپا برکت و صلاح قرن کے بعد قرن صحابہؓ شروع ہوا، جو خیرالقرون ثانی تھا۔ اس کی ابتداء نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ اس مبارک قرن کو ہم دو حصوں میں منقسم کرسکتے ہیں۔ پہلا حصہ عہد خلافت راشدہ کا ہے۔ یہ سیدنا ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے شروع ہوتا ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ سب حضرات خلفاء راشدین تھے۔ حضرت معاویہؓ پر خلافت راشدہ ختم ہوگئی اس کے بعد ازروئے حدیث خیرالقرون ثانی کا دوسرا حصہ شروع ہوا اور امیر المومنین عبدالملک" بن مروان؂ کی وفات پر ختم ہوا۔ اس قرن کے دونوں حصوں کا مجموعہ قرن صحابہؓ یعنی ازروئے حدیث خیرالقرون ثانی تھا۔ اس لئے کہ اس پورے زمانہ کے اختتام تک ان کی ایک معتدبہ تعداد موجود رہی، ان کی تعلیم و تربیت اور اذیت و مصاحبت سے امت فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس قرن کے بعد قرن تابعین شروع ہوا جس کی انتہا امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت پر ہوتی ہے۔ یہ مضمون حدیث شریف کے مطابق "خیرالقرون" ثالث تھا۔ اس کے اختتام پر یعنی جب صحابہ

کرامؓ کے دیکھنے والے اہل ایمان جن کا لقب تابعین ہے دنیائے اسلام میں نہیں باقی رہے تو، تبع تابعین کا قرن شروع ہوا جو امیرالمومنین منصور عباسی کے دور خلافت تک باقی رہا۔ یہ زمانہ ازروئے حدیث خیرالقرون رابع تھا۔

یہ حدیث شریف جس کا مطلب واضح ہے۔ صاف صاف بتارہی ہے کہ خلافت بنو امیہ کا پورا زمانہ اور خلافت عباسیہ کا ابتدائی زمانہ یعنی امیرالمومنین منصورؒ تک خیرالقرون میں داخل ہے۔ خیرالقرون ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ اس دور میں مسلم معاشرے اور ان کی اجتماعی زندگی میں خیر اور خوبی کو بہت نمایاں غلبہ حاصل رہا۔ اس معاشرے میں جس میں سب صحیح العقیدہ اہل ایمان شریک تھے یا تو شر کا وجود ہی نہیں تھا یا اگر تھا تو اتنا قلیل اور ضعیف تھا کہ اسے قابل شمار و قابل اعتناء نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر گمراہ، فاسد العقیدہ یا منافقوں کے معاشرہ میں "شر" کثیر و شدید کا وجود تھا تو اس سے اس قرن کے خیرالقرون ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ شر اسلامی معاشرے میں نہیں تھا اسے امت مسلمہ اور اہلسنّت کے اجتماع کی طرف نہیں منسوب کیا جاسکتا۔ یہ شر ان ادوار میں امت مسلمہ پر کبھی غالب نہیں ہوسکا اور ازروئے حدیث غالب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

(۱) جو شخص حدیث شریف کو صحیح سمجھتا ہو اور مخبر صادق نبی امین علیہ افضل الصلوات والتسلیم کی پیش خبری پر یقین رکھتا ہو وہ کبھی اس مبارک دور کے بارے میں ان روایات و بیانات کاذبہ پر کان نہیں دھر سکتا، جو شیعہ اور شیعیت نواز تاریخ نگار اور مصنّفین بیان کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ نسلی تعصب، یا شیعی تشہیر و ارجاف سے متاثر ہونے والے؛ یا شیعوں اور شیعیت زدہ تاریخ نویسوں اور داستان نگاروں کے فریب میں مبتلا ہونے والے علماء کے بیانات کو بھی یقیناً غلط سمجھے گا جو بنی امیہ کے مبارک دور خلافت کو ظلم و جور کا دور ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس کی تصویر کو بھیانک بناکر پیش کرتے ہیں۔ یہ

(۱) یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم معاشرہ معصومین اور فرشتوں کا معاشرہ بن گیا تھا۔ یا بالکل عہد نبوی کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ ایسی بات تو کوئی جاہل ہی کہہ سکتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مجتمع اور معاشرے کی غالب اکثریت صالح اور متقی لوگوں پر مشتمل تھی۔ سوسائٹی میں خیر ہی خیر تھی۔ کسی معصیت کا رواج نہیں تھا۔ شامت نفس سے بعض افراد سے اگر کسی معصیت اور شر کا صدور ہوتا تھا تو وہ اس پر نادم ہوکر اس سے تائب ہوتے تھے۔ معصیت اور شرانگیزی کے عادی نہیں ہوجاتے تھے۔ اسلامی اخلاقی قدریں محفوظ تھیں اس قرن کو خیرالقرون کہنے کے یہی معنی ہیں۔

حقیقت محتاج ثبوت نہیں کہ ازروئے حدیث مذکور خلافت بنو امیہ کا پورا زمانہ ' اور خلافت بنو عباس کا ابتدائی زمانہ ' خیر القرون میں داخل ہے ۔ لیکن اگر مخالفین بنی امیہ کے مخالفانہ و معاندانہ بیانات و اعتراضات کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ قرن شر القرون ٹھہرتا ہے ۔ تو کیا صادق مصدوق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خبر غلط تھی ؟ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ ۔

عرض کرچکا ہوں کہ خیر القرون ثانی یعنی قرن صحابہ امیر المومنین عبدالملک کی خلافت کے زمانے تک ممتد ہوا۔ امیر یزید ؒ کے دور خلافت میں تو صحابہ کرام ؓ کی کثیر تعداد موجود تھی جن میں اجلہ صحابہ اصحاب بدر و بیعت رضوان بھی تھے۔ اگر امیر یزید مغفور فاسق و فاجر و جابر و ظالم تھے تو یہ سب صحابہ ؓ مداہنت اور اشاعت فسق و فجور پر سکوت کرکے اس میں ایک نوع کی اعانت کے مرتکب ہوئے یا نہیں ؟ العیاذ باللہ علاوہ بریں یہ بات عادتاً محال ہے کہ کسی صالح معاشرے میں سربراہ مملکت فاسق و فاجر ہو جس طرح یہ محال عادی ہے کہ کسی گندے معاشرے میں کوئی صالح شخص حکمران بن جائے۔ اگر یزید ؒ فاسق و فاجر اور جابر و ظالم تھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت پورے مسلم معاشرے پر ظلم و جور ' اور فسق و فجور چھایا ہوا تھا ۔ اور معاشرہ فاسق و فاجر و جابر تھا ۔ اس مرحلے پر شیعوں سے تو کچھ کہنا فضول ہے ' اس لئے کہ وہ تو یہی کہتے ہیں اور یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت پورا معاشرہ گندہ تھا ۔ العیاذ باللہ ۔ لیکن میں ان صاحبان سے جو سنی ہونے کے دعویدار ہیں اور اموی خلفاء پر لگائے ہوئے غلط الزاموں کی تردید کرنے والوں کو خارجی اور ناصبی کا خطاب دیتے ہیں پوچھتا ہوں کہ کیا قرن صحابہ و تابعین گندہ اور فاسقانہ ہوسکتا ہے ؟ ۔ کیا امیر یزید ؒ کو فاسق و فاجر کہنے سے اس پورے قرن کو معاذ اللہ قرن فسق و فجور کہنا لازم نہیں آتا ؟

آیہ کریمہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس الایۃ کے اولین مخاطب و مصداق حضرات صحابہ کرام ؓ ہیں ۔ اگر بقول معترض یزید ؒ کے فسق و فجور اور ظلم و جور کا علم ہونے کے باوجود ان حضرات صحابہ ؓ نے ان پر کوئی نکیر نہیں کی۔ اور انہیں معزول نہیں کیا تو نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ اس سے ایک طرف تو ان سب کا مداہن اور تارک فرض ' عاصی اور گناہ گار ہونا لازم آتا ہے ۔ (۱) (معاذ اللہ) اور دوسری طرف اس

---

(۱) امیر یزید مغفور کی خلافت (۶۰ تا ۶۴ ھ) کے زمانہ میں دو سو سے زائد صحابہ کرام موجود تھے۔ جن میں بعض کا شمار اکابر صحابہ میں ہے۔ ان میں بدری ' صحابہ بھی ہیں اور اصحاب

آیت مقدسہ کی تکذیب لازم آتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ آیت تو انہیں **الآمر بالمعروف والناہی عن المنکر** بتارہی ہے۔ اور ان کے اس وصف کی ستائش کررہی ہے۔ بلکہ ان کے اس وصف کی بناء پر انہیں خیرالامم کی لقب دے رہی ہے۔ مگر بقول معترض ان میں اس وصف کا وجود ہی نہ تھا۔ کیونکہ انہوں نے امیر یزید پر نکیر نہیں کی اور انہیں معروف کا حکم نہیں دیا۔ نہ انہیں توبہ پر مجبور کیا اور نہ معزول کیا۔ یہ آیت کی کھلی ہوئی تکذیب ہے یا نہیں ؟ العیاذ باللہ اسی طرح یہ حدیث خیر القرون کی تکذیب ہے۔ و العیاذ باللہ۔ حدیث بیعت رضوان بھی۔ بطور مثال ان میں سے چند حضرات صحابہؓ کے اسماء گرامی مع سنین وفات درج ذیل ہیں :-

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔ مہاجر از اصحاب بیعت رضوان ، وفات ۷۴ ھ۔ (۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مفسر قرآن وفات ۶۸ ھ۔ (۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما وفات ۶۳ ھ۔ (۴) حضرت عبداللہ بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ وفات ۶۸ ھ حضرت یزید بن الاسود الجرشی رضی اللہ عنہ شام میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مستجاب الدعوات تھے۔ (۵) حضرت عبداللہ بن حازم السلمی رضی اللہ عنہ ساکن بصرہ وفات ۷۱ ھ (۶) حضرت معبد بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ قبل فتح مکہ اسلام لائے۔ فتح کے مکہ دن قبیلہ جہینہ کا علم ان کے ہاتھ میں تھا ، وفات ۷۲ ھ

(۷) حضرت عوف بن مالک الاشجعی الغطفانی فتح مکہ میں شریک تھے۔ شام میں انتقال ہوا ، وفات ۷۳ ھ

(۸) ثابت بن الضحاک الانصاری ابو زید الاشہلی۔ شریک بیعت رضوان وفات ۷۳ (۹) عبداللہ بن ابی حدردالاسلمی رضی اللہ عنہ ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا ، وفات ۷۳ ھ

(۱۰) عمرو بن اخطب ابوزید الانصاری رضی اللہ عنہ۔ تیرہ غزوات میں معیت نبی کریم علیہ الصلوات والتسلیم کا شرف انہیں حاصل ہوا۔ وفات ۷۱ ھ

(۱۱) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ مبایعین بیعت عقبہ ثانیہ میں سے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۱۹ غزوات میں شریک رہے۔ وفات ۷۸ (۱۲) حضرت عبداللہ بن بسرالمازنی رضی اللہ عنہ شام میں قیام تھا ، وفات ۸۰ ھ (۱۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ خادم رسول ہیں۔ بصرے میں مقیم تھے۔ وفات ۹۳ ھ

شریف تو اس دور کو " خیر القرون " کہہ رہی ہے۔ اور یہ معترضین و مخالفین یزید" اس میں شر کا غلبہ بتا کر اسے شر القرون بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چھٹی حدیث

"حدثنا عبداللہ بن محمد نا سفین عن عمرو سمع جابرا عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : یاتی زمان یغزو فیہ فئام من الناس فیقال فیکم من صحب النبی فیقال نعم فیفتح علیہ ثم یاتی زمان" فیقال فیکم من صحب اصحاب النبی فیقال نعم فیفتح ثم یاتی زمان فیقال فیکم من صحب صاحب اصحاب النبی

"حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں مسلمانوں کے کچھ گروہ جہاد کے لئے نکلیں گے ' تو پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی" نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ؟ تو کہا جائے گا کہ ہاں (ہیں) تو اس جماعت کو فتح حاصل ہوگی پھر ایسا زمانہ آئے گا جس میں یہ پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی کے صحابی (یعنی تابعی) موجود

---

(۱۴) حضرت جابر بن عتیک انصاری رضی اللہ عنہ۔ بدری ہیں۔ وفات ۶۱ ھ۔

(۱۵) حضرت صدی بن عجلان ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ اصحاب بیعت رضوان میں ہیں ' وفات ۸۶ ھ۔

یہاں صحابہ کرام میں امتیازی شان رکھنے والے صحابہ کرام" میں سے چند حضرات کے نام صرف بطور نمونہ اور مثال ذکر کر دیئے گئے۔ ورنہ اس وقت اگر استقصاء کیا جائے تو ان صحابہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز نکلے گی جو امیر یزید مغفور کے خلافت کی زمانہ میں موجود تھے بلکہ اس کے بعد کے زمانہ تک موجود رہے ان سب کے اسماء لکھنے میں بہت طوالت ہے۔ ان چند اسماء گرامی کے تذکرے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس وقت دور صحابہ" یعنی خیر القرون (ثانی) تھا۔ اگر سربراہ مملکت اور حکمران پارٹی کو فاسق و فاجر کہا جائے تو کسی عاقل کے نزدیک اسے خیر القرون نہیں کہا جاسکتا۔ نیز سب صحابہ کرام" مجروح ہوتے ہیں۔ اور آیات قرآنی کی تکذیب لازم آتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

اصابہ ' استیعاب ' اسد الغابہ وغیرہ سے ان صحابہ کرام" کے اسماء مبارک معلوم ہوسکتے ہیں جو وقت مذکور میں موجود تھے۔

فیقال نعم فیفتح (بخاری ج ۱ کتاب الجہاد باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب ص ۴۰۶)

ہیں تو کہا جائے گا کہ ہاں (ہیں) تو اس جماعت کو فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم میں کسی صحابی کے صحبت یافتہ تبع تابعی) موجود ہیں۔ جواب ملے گا کہ ہاں موجود ہیں۔ تو یہ جماعت بھی فتح یاب ہوگی۔"

اس حدیث سے عیاں ہے کہ دور تابعین میں بھی جمہور اہل اسلام کو صحابہ کرامؓ سے شدید اور قوی عقیدت ہوگی ۔ ان کے وجود کو باعث برکت اور ان کی اتباع کو سعادت جانتے ہوں گے ۔ یہاں تک کہ ان کی دیکھنے والوں کے ساتھ بھی انہیں عقیدت و محبت ہوگی ' اور ان کے وجود کو بھی بابرکت اور باعث کامیابی و سعادت سمجھتے ہوں گے ۔ یہ حدیث حدیث سابق یعنی خیرالقرون الخ کی تائید کررہی ہے ۔ اور اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث سابق کے مطابق دور تبع تابعین بھی خیر القرون میں داخل تھا ۔ اس لئے خلافت بنی امیہ کا پورا زمانہ اور عباسی خلافت کا اولین دور (خلافت منصور کا زمانہ) بابرکت ترقی و شوکت اسلام ' اور مسلمانوں کے عروج و اطمینان کا قرن تھا ۔ یہ سب خلافتیں عدالت و تقویٰ اور برکت و سعادت کے صفات سے متصف تھیں ' جن کے ادوار امت مسلمہ کے لئے قابل فخر ہیں ۔

مودودی صاحب یا انہیں کی طرح نسلی تعصب کے دوسرے مریضوں نے جو اعتراضات ان پاک طینت خلفاء اور ان کے معاونین پر کئے ہیں ۔ اگر صحیح تسلیم کرلئے جائیں تو اس حدیث شریف کی تکذیب لازم آتی ہے ۔

عادتاً یہ غیر ممکن اور محال ہے کہ کسی متقی معاشرے کا سربراہ فاسق و فاجر ہو ۔ اگر معاشرے پر تقویٰ اور صلاح کا غلبہ ہوگا تو اس کا سربراہ بھی متقی اور صالح ہوگا ۔ سربراہ مملکت کا فاسق ہونا اس امر کی قطعی علامت ہے کہ معاشرہ فاسد ہوگیا ہے ' اگر ہم امیر یزیدؒ یا اس دور کے جسے خیرالقرون کہا گیا ہے کسی اور اموی یا عباسی خلیفہ یا اس کے معاونین کو فاسق و ظالم کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم صرف ان اشخاص و افراد کو فاسق نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اس وقت کے مسلم معاشرے کو فاسقانہ اور اس وقت کی امت مسلمہ کو فاسق کہہ رہے ہیں جبکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ متقی اور صالح تھا ۔

معترضین و مخالفین کے فاسد افکار و بیانات کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد اس حدیث شریف کی تصدیق کی کوئی صورت متصور نہیں ہوتی اور کوئی تاویل لزوم تکذیب حدیث کے گناہ عظیم سے نہیں بچا سکتی ۔

ساتویں حدیث

"حدثنا عبداللہ بن یوسف عن مالک عن اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحۃ عن انس بن مالک انہ سمعہ یقول کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدخل علی ام حرام بنت ملحان فتطعمہ وکانت ام حرام تحت عبادۃ بن الصامت فدخل علیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطعمتہ فجعلت تفلی راسہ فنام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم استیقظ وھو یضحک قالت فقلت مایضحکک یا رسول اللہ! قال: ناس من امتی عرضوا علی غزاۃ فی سبیل اللہ یرکبون ثبج ھذا البحر ملوکا علی الاسرۃ او مثل الملوک علی الاسرۃ شک اسحاق۔ قالت فقلت یا رسول اللہ ادع اللہ ان یجعلنی

حضرت انسؓ بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کبھی کبھی) حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا (۱) کے یہاں تشریف لے جاتے تھے۔ اور حضرت ام حرامؓ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں ۔ اور (جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لے جاتے تھے تو) وہ آنحضرتؐ کو کھانا کھلاتی تھیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا کھلایا۔ اور سر مبارک کے بالوں میں جوئیں دیکھنے لگیں ۔ (۲) (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے پھر کچھ ہی دیر بعد) ہنستے ہوئے بیدار ہوئے ۔ ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے ہنسنے کا کیا سبب ہے ؟ آنحضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ میرے سامنے پیش کئے

---

(۱) حضرت ام حرامؓ بنت ملحان رضاعی رشتہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محرمات میں سے تھیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محرم تھے۔

(۲) آنحضورؐ کے جوئیں نہیں پڑتی تھیں مگر انہیں خیال ہوا کہ شاید کسی دوسرے سے جوں آگئی ہو۔

منهم فدعا لها رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم وضع راسه ثم استیقظ وهو یضحک فقلت مایضحکک یا رسول الله قال ناس من امتی عرضوا علی غزاة فی سبیل الله کما قال فی الاولی قالت فقلت یا رسول الله ادع الله ان یجعلنی منهم قال : انت من الاولین ' فرکبت البحر فی زمان معاویة بن ابی سفیان فصرعت عن دا بتها حین خرجت من البحر فهلکت"

(صحیح بخاری جلد اول کتاب الجهاد باب الدعاء بالجهاد والشهادة للرجال والنساء ص ۳۹۱)

گئے (یعنی خواب میں مجھے دکھائے گئے ۔ یہ بھی یاد رہے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے) جو بیچ سمندر میں مصروف جہاد فی سبیل اللہ تھے ۔ (اور ایسی شان و شوکت رکھتے تھے) جیسے سلاطین تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے ہوں ۔ (ایک راوی اسحاق کو شک ہے کہ "ملوکا" فرمایا یا "مثل الملوک" ۔ مطلب دونوں کا ایک ہے) (حضرت ام حرامؓ کہتی ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! اللہ تعالٰی سے دعا کیجئے کہ مجھے بھی ان میں شامل کردے ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ان کے لئے بھی یہی دعا فرمائی ۔ پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سرمبارک تکیہ پر رکھ کر (دوبارہ) سوگئے۔ پھر (کچھ دیر کے بعد) ہنستے ہوئے بیدار ہوئے (حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے ؟ (آنحضورؐ نے) فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ میرے سامنے اس حالت میں پیش کئے گئے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف تھے ' جیسے پہلے ارشاد فرمایا تھا (یعنی جو بات پہلی مرتبہ ارشاد فرمائی تھی وہی پھر ارشاد فرمائی) (ام حرامؓ) فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالٰی سے دعا کیجئے کہ مجھے بھی ان میں شامل کردے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی والی جماعت میں شامل ہو۔"

(راوی کہتے ہیں کہ) "حضرت ام حرام
ؓ نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ
عنہما کے زمانہ میں بحری جہاد میں شرکت کی
اور بحری سفر کیا۔ سمندر سے خشکی پر اترنے
کے بعد اپنی سواری سے گر پڑیں اور انتقال
فرما گئیں۔

حدیث شریف میں دو مرتبہ بحری جہاد کے ہونے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے' ان میں سے پہلے جہاد کے متعلق اختلاف ہے کہ کب واقع ہوا؟ بعض کے نزدیک حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کا واقعہ ہے۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ اس جہاد کے سربراہ اور ناظم اعلیٰ حضرت معاویہؓ ہی تھے۔ اسی جہاد کے دوران راویہ حدیث ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

دوسرا جہاد بالاتفاق حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا۔ اس کا نظام بھی آں محترم ہی نے بنایا تھا۔

اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر منقولہ بالا حدیث شریف پر نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی تاریخ کے ایک شاندار اور پاکیزہ دور کا ایک مجمل مگر روشن و تابان حصہ امت کو دکھا رہے ہیں۔ حدیث پڑھنے کے بعد اس سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:۔

۱۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں امت مسلمہ کی دینی حالت و کیفیت اعلیٰ درجہ کی تھی امت کا تعلق مع اللہ بہت قوی تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت' اس کا کلمہ بلند کرنے' اور اس کے دین کو پھیلانے کے لئے جاں نثاری کا جذبہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ تقویٰ و طہارت' اخلاص و للہیت اتباع شریعت مقدسہ اسکا مزاج عام تھا اور عدل و انصاف' مواسات و اخوت اس کی طبیعت ثانیہ تھی۔ مختصر یہ کہ امت مومنہ کا مزاج خالص اسلامی مزاج تھا۔ اس میں کوئی کمزوری یا خرابی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

اس مضمون پر حدیث کی دلالت بالکل واضح ہے۔ اگر امت دینی اعتبار سے اس نقطہ عروج پر نہ ہوتی تو اس میں سے ہزاروں افراد خلوص و للہیت کے ساتھ سمندر میں جہاد فی

سبیل اللہ کے لئے نہیں نکل سکتے تھے ۔ خصوصاً اس وقت جبکہ مسلمانوں کی تعداد پوری دنیائے اسلام میں لاکھوں سے زیادہ نہیں تھی ۔ اور سمندر میں اترنا بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا پھر یہ حضرات اس قدر مخلص تھے اور ان کا جہاد اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسا مقبول اور پسندیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی مقبولیت ، اور ان مجاہدین کے اخلاص و للہیت سے مطلع فرمایا کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے ۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خوشخبری امت کو دی ۔

۲۔ دنیاوی حیثیت سے امت مومنہ کا معیار زندگی اونچا ہوگیا تھا اور انہیں ایسی شان و شوکت حاصل تھی کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کی شان و شوکت سے تشبیہ دی یعنی شاہانہ شان و شوکت اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی تو اس کی اہمیت زیادہ نہ ہوتی مگر جس چیز نے اس میں چار چاند لگادیئے اور اس کی اہمیت کو کئی گنا زیادہ کردیا وہ یہ ہے کہ حدیث سے بہت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی اس شان و شوکت اور ان کے اس معیار زندگی کی بلندی پر اظہار مسرت فرمایا۔ اپنی امت کی جس حالت سے رسول کریم علیہ افضل **الصلوات و التسلیم** کے قلب مبارک کو خوشی حاصل ہوئی اسکی خوبی میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

۳۔ حدیث سے عیاں ہے کہ جو جماعت مجاہدین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی گئی اس کے شرکاء سب مقبول عنداللہ اور ولایت کے اونچے درجہ پر فائز تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے نہ جاتے اور بالفرض اگر دکھائے جاتے تو آنحضور علیہ **الصلوات والتسلیم** ان کی مدح و ستائش نہ فرماتے۔ اور ان کی حالت پر اس قدر مسرت کا اظہار نہ فرماتے ۔

۴ ۔ ظاہر ہے کہ جو جماعت مجاہدین فی سبیل اللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں دکھائی گئی ، اس کا اور اسے جہاد کے لئے تیار کرکے بھیجنے والوں کا شمار امت کے حکمراں طبقہ میں تھا۔ حدیث سے عیاں ہے کہ وہ مقبول عنداللہ ہونے کے ساتھ مقبول عندالناس بھی تھے۔ یعنی جمہور مسلمین اور عوام امت کے دلوں میں ان کی عظمت و محبت تھی۔ وہ ان کی حکومت کو پسند کرتے تھے اور انہیں صالح و عادل حکمران سمجھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز خوش نہ ہوتے ۔ کیونکہ جابر و ظالم حکمرانوں سے جو عوام میں نامقبول اور مبغوض ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خوش نہیں ہوسکتے تھے۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس وقت کا حکمران طبقہ عوام کا

کوئی استحصال نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے معیار زندگی کی بلندی اور ان کی شان و شوکت کی وجہ یہ تھی کہ پوری امت کا معیار زندگی بلند تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو امت میں ان کے خلاف ناراضگی ہوتی ' اور حکمراں نیز ان کے معاونین عوام مسلمین میں مقبول نہ ہوتے ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مدح و ستائش نہ فرماتے ۔ حدیث نبوی سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت بہت ہی مبارک دور تھا ۔ وہ اور ان کے معاونین جیسے ان کے مقرر کئے ہوئے جمہور عمال و حکام سب مقبول عنداللہ اور مقبول عندالناس تھے ۔ اور ان کی خلافت و حکومت کو جمہور اہل اسلام بہت پسند کرتے تھے

۵ ۔ حدیث مذکور میں غور کرنے سے یہ حقیقت بھی روشن ہوجاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ کا امیر یزید مغفور کو ولیعہد بنانا جمہور مسلمین کو پسند تھا۔ اور وہ آں محترم کے اس عمل خیر سے خوش اور مطمئن تھے ۔ حدیث سے اس مضمون کا استنباط اس طرح ہوتا ہے ' کہ اگر ایسا نہ ہوتا اور جمہور مسلمین اس سے ناراض ہوتے تو اس رؤیائے صادقہ کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوشی کا اظہار کبھی نہ کرتے ۔ اور جنگ کے لئے سمندر میں اترنے والوں کو مجاہدین فی سبیل اللہ نہ کہتے ۔ رؤیائے صادقہ وحی ربانی تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رؤیا دکھا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک خوش کردیا ۔ اگر حضرت معاویہؓ اور انہیں امیر یزیدؒ کو ولی عہد بنانے کا مشورہ دینے والوں اور ان کی اعانت کرنے والوں کے اس کام اور ان کی اس پالیسی سے جمہور اہل اسلام ناراض ہوتے اور انہیں یہ سیاسی اقدام ناپسند ہوتا ' تو انہیں اس کے ماننے پر مجبور کرنا ایک نوع کا ظلم ہوتا ۔ اس حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش اور راضی کیسے ہوسکتے تھے ؟ اور ان کی اس اعلیٰ کیفیت و حالت کی اطلاع اپنے مبارک زمانے کی امت کو بطور خوش خبری کیوں دیتے ؟ ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر یزید مغفور کو ولی عہد بنانا اس وقت جمہور مسلمین اور عوام و خواص مومنین کی رائے اور ان کی مرضی کے مطابق تھا ۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ روء یائے مذکورہ میں تو امت کے ایک دور کی حالت دکھائی گئی تھی جو بہت اچھی اور قابل تعریف تھی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد دوسرے زمانوں اور ظروف میں بھی ان کی وہی حالت باقی رہی ہو امیر یزیدؒ کو ولی عہد بنانے کا واقعہ اس کے بعد کا ہے ' ممکن ہے کہ اس وقت حضرت معاویہؓ اور ان کے معاونین میں وہ اخلاص نہ باقی رہا ہو اور بمقتضائے بشریت ' محبت و شفقت پدری اور حب

اقتدار سے مغلوب ہوکر انہوں نے جمہور اہل ایمان کی رائے اور ان کی مرضی کے خلاف امیر یزید مرحوم کو ولی عہد بنادیا ہو ؟ اس شبہ کی غلطی مندرجہ ذیل وجوہ سے بالکل عیاں ہے :۔

اول :۔ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس لئے خواب مذکور اخبار بالغیب کی ایک صورت تھا ۔ اس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر القرون (ثانی) میں آپ کی امت کی حالت کی خبر اور اطلاع دی گئی تھی۔ اور یہ خبر بطور بشارت آنحضور نے اپنے مبارک دور (خیر القرون اول) کی امت کو پہنچائی مگر اس خبر سے یہ حقیقت بھی بدیہی طور پر واضح ہوگئی تھی کہ امت خصوصاً اس کے حکمران طبقے میں اخلاص و تقویٰ عام ہوگا ۔ اگر حکمراں طبقہ کی حالت اس حالت رفیعہ میں ذرہ برابر انحطاط و تغیر کا امکان ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی وحی رؤیائی میں اسے بھی ظاہر کردیا جاتا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے قرن کی امت مومنہ کو اس کی اطلاع دے دیتے۔ ورنہ لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ دھوکہ دیا ۔ یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دور کی امت کی ایک اچھی حالت کی تو اطلاع دی مگر انجام کار جو بری حالت ہونے والی تھی اس کی اطلاع نہ دی ۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ ۔ اس سے روز روشن کی طرح روشن ہے کہ شبہ بالکل غلط اور لغو ہے ۔

دوئم :۔ زیر بحث حدیث شریف مخبر صادق نبی امین علیہ افضل الصلوات والتسلیم کی ایک پیشین گوئی ہے ۔ جس میں بضمن بیان واقعہ مبارکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر بھی دی ہے کہ اس قرن میں میری امت ایمان و اخلاص اور تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہوگی ' خصوصاً اس کا حکمراں طبقہ نہایت مخلص ' صالحین و ابرار اور اولیاء اللہ پر مشتمل ہوگا ۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ حکمراں طبقہ جس کے سربراہ حضرت معاویہؓ تھے ' اور ان کے معاونین ایک مدت کے بعد مخلص نہیں رہے تھے ۔ اور تقویٰ کی دولت سے محروم ہوگئے تھے ' معاذ اللہ ' تو لازم آتا ہے کہ نبی کریم علیہ افضل الصلوات کی یہ پیشین گوئی معاذ اللہ غلط اور خلاف واقعہ تھی ۔ کیونکہ "انما الاعمال بالخواتیم" مانا ہوا اصول ہے۔ یعنی کسی شخص کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ اس کی آخری زندگی کے اعمال سے ہوتا ہے۔ اگر یہ حضرات اپنے آخری دور میں متقی اور مخلص نہیں رہے تھے تو انہیں مخلص اور متقی کہنا اور ان کا تعارف مخلصین و متقین کی حیثیت سے کرانا' خلاف واقعہ اور غلط ہوا ۔ کسی مومن کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہوسکتی ۔ اس لئے شبہ مذکور یقیناً اور قطعاً غلط اور لغو ہے ۔ اور حدیث شریف سے جو مضامین ہم نے

مستنبط کر کے صفحات سابقہ میں بیان کئے ہیں وہ بالکل صحیح اور حق ہیں۔

آٹھویں حدیث

اس سلسلے میں یہ حدیث بھی قابل ذکر ہے :۔

"حدثنا اسحاق بن یزید ثنا یحیی بن حمزہ ثنی ثور بن یزید عن خالد بن معدان ان عمیر بن الاسود العنسی حدثہ انہ اتی عبادۃ بن الصامت وھو نازل فی ساحل حمص وھو فی بناء لہ و معہ ام حرامؓ قال عمیر فحدثتنا ام حرام انھا سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اول جیش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا قالت ام حرام قلت یا رسول اللہ انا فیھم قال انت فیھم قالت ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم فقلت انا فیھم یا رسول اللہ قال لا"

(بخاری ص۴۰۹، ج اول باب ماقیل فی قتال الروم)

"عمیر بن الاسود العنسی بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبادہ ابن الصامتؓ کی خدمت میں گئے، جو حمص کے ساحل پر اپنی ایک عمارت میں تھے، اور ان کے ساتھ (ان کی زوجہ محترمہ) حضرت ام حرامؓ بھی تھیں۔ عمیر کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ام حرامؓ نے بیان کیا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کے اس لشکر کے لئے جو سب سے پہلے بحری جہاد کرے گا جنت واجب ہوگئی ۔ حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں بھی ان میں سے ہوں ؟ آنحضور ؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں تم بھی ان میں سے ہو (تم بھی اس بحری جہاد میں شرکت کرو گی) حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا وہ لشکر جو سب سے پہلے قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا اس کے سب شرکاء مغفور ہیں۔ (یعنی ان کے سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں بھی ان میں سے

ہوں گی آنحضور ؐ نے فرمایا کہ نہیں (تم ان
میں شامل نہ ہوگی) (حضرت ام حرامؓ کا اس
واقعہ سے پہلے ہی انتقال ہوگیا۔ اس لئے وہ
اس جہاد میں حصہ نہیں لے سکیں)

اس حدیث کی راوی بھی حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا ہیں۔ اور اس میں جس بحری جہاد کی تذکرہ ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر اس سے پہلے والی حدیث میں ہوچکا ہے۔ پہلا جہاد وہی ہے، جس میں حضرت ام حرامؓ شریک ہوئیں، اور انتقال فرمایا۔ یہ حضرت معاویہؓ کی سربراہی میں فتح قبرس کے لئے ہوا۔ دوسرا جہاد امیر یزید کی سربراہی میں ہوا۔ اس کا تذکرہ بھی حدیث مذکور میں ہے۔ مگر اس حدیث میں مزید اضافہ ہے کہ دونوں جہادوں کے شرکاء کے اجر و ثواب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر انعام کا تذکرہ بھی ہے اگرچہ اس سے پہلے والی حدیث سے بھی ان مجاہدین کا ماجور ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن اس حدیث میں اس کی تصریح ہے۔ پہلی حدیث میں دوسرے بحری جہاد کا تذکرہ تو ہے مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس سفر جہاد کی منزل کیا ہوگی؟

اس حدیث سے یہ ابہام دور ہوجاتا ہے کہ اس میں صراحت کے ساتھ بتادیا گیا ہے

کہ یہ جہاد مدینہ قیصر یعنی قیصر روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے ہوگا۔ دوسرا جہاد، یعنی قسطنطنیہ پر اولین حملہ حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ میں ہوا اس لشکر کے بھیجنے والے وہی تھے۔ اور اس لشکر کے قائد اور کماندار اعلیٰ امیر یزیدؒ بن معاویہؓ تھے لشکر اسلام قسطنطنیہ تک پہنچا اور اس پر حملہ آور ہوا اور یہ "مدینہ قیصر" پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ اور غزوہ تھا۔ جس کی تحسین اور جس میں شریک ہونے والوں کے لئے انعام الٰہی کا تذکرہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

اس اولین غزوہ قسطنطنیہ میں متعدد صحابہؓ شریک تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن الزبیر، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم۔ اس غزوے کے دوران حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ۵۲ ہجری میں انتقال فرمایا۔ یہ حدیث بھی احادیث مذکورہ سابقہ کی طرح اسلامی تاریخ کا ایک سنہرا باب امت کے سامنے پیش کررہی ہے۔ خیر القرون (ثانی) یعنی دور صحابہؓ میں عام امت کا کیا حال تھا؟ ان کی دینی و سیاسی کیفیت کیا تھی؟ اس حدیث سے اس کا جو

جواب معلوم ہوتا ہے ۔ وہ درج ذیل ہے۔
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ۔
عام امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیتہ کا اس وقت حال یہ تھا کہ وہ کامل الایمان صالحین و اتقیاء کی ایک جماعت تھی جو ساری دنیا میں اپنے ایمان و عمل صالح کی وجہ سے ممتاز اور امام الاقوام تھی ۔ یوں کہنا چاہئے کہ خیر الامم اس وقت بھی موجود تھی ۔ اس کی روشن دلیل یہ ہے کہ امت میں سے اس وقت ہزاروں افراد ایسے نکلے جنہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی ۔ یہی نہیں بلکہ ہزاروں افراد پر مشتمل ایک طبقہ امت میں ایسا تھا جسے اسی دنیا میں مغفرت ذنوب و زلات کی بشارت دے دی گئی تھی یہ بھی باختلاف الفاظ جنت ہی کی بشارت تھی کیونکہ جب کسی کے سب گناہ معاف ہوجائیں تو اس کا ٹھکانہ جنت ہی ہے ۔ امت مسلمہ کے افراد کی تعداد اس وقت چند لاکھ سے زیادہ نہ تھی ۔ اگر اس وقت مسلمانوں کے تعداد ایک کروڑ بھی فرض کریں تو بھی ایک کروڑ افراد میں کئی ہزار کی تعداد ایسے کامل الایمان ' مخلص ' متقی ' اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھنے والے اللہ کے نام پر جاں نثار کرنے والے اہل اسلام کا وجود یقیناً اس حقیقت کو ظاہر کررہا ہے کہ اس وقت کا اسلامی معاشرہ ایمان و عمل صالح اور تقویٰ و طہارت ' حسن کردار ' اخلاق و تہذیب نفس کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھا اور پوری امت مسلمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور اعلاء کلمتہ اللہ کے مقصد عظیم کے لئے جان و مال ' عزت و آبرو ہر چیز کی قربانی کے لئے تیار اور مستعد رہتی تھی ۔ اگر پوری امت ایسی نہ ہوتی تو اس میں اتنی کثیر تعداد ایسے اولیا اور صالحین کی قطعاً نہ ہوتی ' جن کی مقبولیت عنداللہ کی خوشخبری خود سید المرسلین رسول امین سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی۔ تجدید توجہ کے لئے گزارش ہے کہ حدیث میں "قد اوجبو" (یعنی ان کے لئے جنت واجب ہوگئی) کے الفاظ پہلے بحری غزوے کے شرکاء کے لئے ہیں۔ اور "مغفور لہم" کے الفاظ دوسرے بحری غزوے یعنی مدینہ قیصر پر حملہ کرنے والوں کے لئے ہیں' غور کیجئے تو یہ حدیث بھی حدیث نبوی خیر القرون قرنی الخ کی ایک شرح ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حدیث مبارک خیر القرون الخ میں جو پیشین گوئی فرمائی گئی ہے ' وہ کن شکلوں میں پوری ہوگی ؟ جس طرح وہ احادیث جو اس سے پہلے مذکور ہوئے ہیں اس حدیث مبارک کی شرح اور تائید کررہے ہیں ۔ یہ حدیث حدیث خیر القرون الخ کے علاوہ ' دوسرے احادیث منقولہ سابق

خصوصاً حدیث ام حرام رضی اللہ عنہا کی تائید کررہی ہے۔ اس حدیث اور اس حدیث کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔

اسلامی تاریخ کی مندرجہ بالا تصویر سامنے لانے کے علاوہ یہ حدیث شریف جادہ تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر بھی روشنی ڈال رہی ہے، جس کے زاویئے کو شیعہ مورخین و موجلین اور ان سے متاثر ہونے والے، نیز نسبی عصبیت سے مغلوب سنی مورخین و مولفین نے تاریک بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ۴۹ھ اور اس کے بعد کے ایسے زمانے سے جس میں صحابہ کرام؄ موجود تھے اس حدیث مبارک کا تعلق واضح ہے یہ دور بھی اگرچہ دور صحابہ؄ اور ازروئے حدیث "خیر القرون" ثانی تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ قرن ختم ہورہا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی مگر ایک بڑی تعداد جنت مکان ہوچکی تھی۔ جو حضرات صحابہ؄ موجود تھے ان میں پختہ عمر کے جوان صحابہ؄ تھے اور کچھ بوڑھے ہوچکے تھے لیکن ہمت سب کی جوان تھی۔ کوئی گوشہ نشین نہیں ہوا تھا۔ دین اسلام کی خدمت و نصرت میں ان کا ہر فرد معروف تھا۔ مگر امت مسلمہ کے ان ائمہ ہدیٰ، اور نجوم ہدایت کا رجحان عام یہ ہوگیا تھا، اور ہونا چاہئے تھا کہ آفتاب ہدایت خاتم الرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امانت آئندہ آنے والی امت تک پہنچانے کے لئے ان کے سپرد کی تھی۔ اسے انتہائی احتیاط و حفاظت کے ساتھ نئی امت مسلمہ کے سپرد کردیں اور ایسا انتظام کردیں کہ وہ ان کے پاس بھی محفوظ رہے۔ اور وہ بھی اپنے بعد آنے والی امت تک اسے پہنچائیں۔ اس کے پیش نظر اس دور میں صحابہ کرام؄ کی پوری توجہ دعوت اسلام پھیلانے، حلقہ بگوش اسلام ہونے والی امت کو قرآن مجید، اور سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ کی تعلیم دینے، ان کی روحانی، ذہنی اور اخلاقی و عملی تربیت کرنے انہیں پیش آنے والے انفرادی و اجتماعی مسائل حیات کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں تلاش کرنے، اور اس کی تعلیم دینے کی طرف منعطف ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ وہ کتاب و سنت خصوصاً قرآن مجید کی حفاظت کے اسباب کو ترقی اور تقویت دینے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ قرآن مجید اگرچہ خود آنحضور صلی اللہ علی وسلم ہی کے زمانہ سے سینوں اور سفینوں میں ایسا محفوظ ہوگیا تھا کہ نظر بظاہر اسباب بھی اس کے ضیاع یا اس میں کسی تحریف اور تبدیلی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن صحابہ کرام ان اسباب کو اور زیادہ قوی کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تو ان حضرات کا مذکورہ بالا رجحان تھا، جو بہت شدید تھا۔ اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ دوسری طرف خلافت اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہوچکا تھا۔ دنیا کے

دو براعظموں یعنی ایشیا و افریقہ کا خاصا بڑا حصہ اس میں داخل ہوچکا تھا۔ یورپ کا بھی ایک چھوٹا سا حصہ خلافت اسلامیہ کے زیر نگین آچکا تھا۔ اس عظیم الشان سلطنت کا نظم و نسق قائم اور درست رکھنا' اس کی حفاظت کرنا اور اس کی فلاح و ترقی کی کوشش کرنا بھی ضروری تھا۔

حضرت معاویہؓ کے دور خلافت تک نظام مملکت کی سربراہی و نگرانی کا کام صحابہؓ ہی انجام دیتے رہے۔ لیکن مذکورہ بالا رجحان کی وجہ سے ان حضرات کی رائے یہ ہوئی کہ یہ کار عظیم اس نسل کے سپرد کیا جائے جو اگرچہ اسلام کے آغوش میں پلی ہے اور پیدائشی مسلم ہے لیکن صحابیؓ نہیں ہے تاکہ صحابہؓ کرام دعوت اسلام دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانے۔ اور امت جدیدہ کی تعلیم و تربیت کرنے کا کام زیادہ قوت اور یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ نیز یہ کہ نئی نسل کو جو صحابیؓ نہیں ہے اس خالص دینی و اسلامی نظام کو چلانے اور اسے قائم و باقی رکھنے نیز اسے ملت اسلامیہ کے لئے نافع اور مفید بنانے کی تربیت بھی دے دی جائے۔ یہ اس طرح کہ سربراہ مملکت کوئی صحابیؓ نہ ہو بلکہ غیر صحابیؓ ہو اور اس کے کام کی نگرانی صحابہؓ کرام کرتے رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کے سامنے امیر یزید مغفور کو ولی عہد بنانے کی تجویز پیش کی۔ خود حضرت معاویہؓ کا ذہن مذکورہ بالا مصلحت تک نہیں پہنچا تھا۔ جو بکثرت صحابہ کرامؓ کے پیش نظر تھی۔ اس لئے انہوں نے بعض صحابہؓ ہی کو ولی عہد بنانا تجویز کیا تھا' جسکا تذکرہ ہم بحوالہ تاریخ گزشتہ صفحات میں کرچکے ہیں۔ مگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تجویز سے ان کا ذہن مذکورہ بالا مصلحت' اور صحابہ کرامؓ کی مذکورہ بالا رائے کی طرف منتقل ہوا۔ اور وہ بھی اس سے متفق ہوگئے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا' کہ مذکورہ بالا رائے سب صحابہ کرامؓ کی متفقہ رائے تھی' اور اس کے کہنے کی ضرورت بھی نہیں' نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے شوریٰ کرکے مذکورہ بالا رائے پر اتفاق کرلیا تھا لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے اور کہتے ہیں' کہ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد کی رائے یہی تھی بلکہ تابعین اور تبع تابعین کی رائے عامہ کا رجحان بھی یہی ہوگیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے ولی عہد یزیدؒ کے متعلق مشورہ دینے کے لئے جو وفود حضرت معاویہؓ کے پاس آئے جو اپنے حلقہ قیادت و نمائندگی' کی رائے عامہ معلوم کرکے آئے تھے ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ کسی صحابیؓ کو ولی عہد بنائیے' یا صحابہؓ کو چھوڑ کر کسی تابعی کو ولی عہد بنانا عوام کی نظر میں قابل اعتراض ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات جو خود صحابیؓ تھے اور وہ عوام مسلمین جن کی وہ نمائندگی کررہے تھے ۔ سب کی رائے کا رجحان یہی تھا کہ اب نئی نسل کی تربیت کرنا چاہئے اور بار خلافت کسی نوجوان تابعی کے کندھوں پر ڈالنا چاہئے تاکہ صحابہ کرامؓ اس عنوان اور جہت سے بھی اپنے بعد والی امت کی تربیت کردیں ۔ اور امانت خلافت و مملکت بھی حفاظت و احتیاط کے ساتھ امت مستقبلہ کی طرف منتقل کردیں۔

مدینہ منورہ میں جب حضرت معاویہؓ امیر یزید مغفور کی ولی عہدی کے لئے عام مشورہ کیا تو کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ نے کسی صحابیؓ کو ولی عہد کیوں نہیں بنایا ؟ اور آپ کو چاہئے کہ یہ امانت خلافت کسی صحابیؓ ہی کے سپرد کریں ۔

یہاں تک کہ جن پانچ حضرات نے ولی عہد بنانے کے مسئلے میں آں محترم سے اختلاف کیا تھا۔ جیسا کہ بیان کیاجاتا ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے صحابہؓ کو چھوڑ کر ایک تابعی کو ولی عہد کیوں بنایا ؟ ۔ ہم صفحات سابقہ میں واضح کرچکے ہیں کہ ان حضرات نے امیر یزیدؒ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا ۔ صرف حضرت معاویہؓ کے اس عمل سے اختلاف کیا تھا کہ وہ ولی عہد بنارہے ہیں۔ اگر انہیں یزید کی خلافت پر اعتراض ہوتا یا غیر صحابیؓ یعنی تابعی یا تبع تابعی کی خلافت نامناسب اور خلاف مصلحت سمجھتے تو انہیں یہ بات کہنا چاہئے تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کی رائے بھی یہی تھی کہ اب منصب خلافت نئی نسل کی طرف منتقل کرنا مناسب تر ہے اور کسی غیر صحابی کو خلیفۃ المسلمین بنانا قرین مصلحت ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مذکورہ بالا طرز عمل کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی یہ تمہید اسلامی تاریخ کے اس موڑ کی نشاندہی کرتی ہے جس کا تذکرہ میں نے ابتداء بحث میں کیا تھا ۔ مدینہ قیصر پر غزوے کے اس واقعہ کے کچھ مدت بعد امیر یزید مغفور کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ولی عہد بنایا ۔ تاریخ کا یہی وہ زاویہ ہے جسے تاریک بنانے کے لئے مخالفین صحابہؓ نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا ہے ۔ اس طویل بحث و تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اہلسنّت ولی عہدی کے اس واقعہ کی اس حدیث کی روشنی میں دیکھیں ۔ یہ بھی حضرت ام حرامؓ ہی کی روایت ہے ۔ اس حدیث کو آں محترمہ کی اس حدیث کا تکملہ کہہ سکتے ہیں جو ابھی چند سطریں پیشتر نقل ہوچکی ہے ۔ دونوں کے مضامین میں بڑی حد تک یکسانیت ہے ۔ اس لئے اسلامی تاریخ کے نقشے کے جو خطوط و حدود اور اشکال و نقوش اس حدیث سے سامنے آتے ہیں انہیں کو یہ حدیث شریف بھی نمایاں کرتی ہے اس لئے اعادے کی حاجت نہیں ، لیکن اس میں ایک مضمون اس حدیث کے مضامین

سے زائد ہے ' اس کے بارے میں دو لفظ کہنا ہیں ۔ پہلی حدیث جس میں دوسرے بحری غزوے کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے ' جس میں راویہ حدیث حضرت ام حرامؓ نے پہلے غزوے کی طرح شرکت کی تمنا ظاہر فرمائی تھی 'مگر یہ تمنا پوری نہیں ہوئی کیونکہ اول الذکر بحری جہاد میں شرکت کے دوران ان کا انتقال ہوگیا ۔ اس دوسرے غزوے کے متعلق زیر غور حدیث میں یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اس سے مراد رومی سلطنت کے پایہ تخت یعنی قسطنطنیہ پر پہلا غزوہ اور حملہ ہے۔ اس تعین مراد اور وضاحت مضمون کی وجہ سے اسلامی تاریخ کے ساتھ اس حدیث شریف کا ربط زیادہ قوی اور واضح ہوجاتا ہے۔ یہ حدیث ہماری تاریخ کے ایک اہم اور عظیم الشان باب کا روشن عنوان ہے ' ایسا عنوان جو پورے باب کا خلاصہ ہے اور اس کی درخشانی و تابانی کی شہادت دے رہا ہے ۔ اس اجمال کی توضیح یہ ہے کہ باتفاق محدثین و اصحاب سیر و مورخین یہ غزوہ خلیفہ راشد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا تھا اور اس مبارک لشکر اسلام کے سپہ سالار اور کماندار اعلیٰ حضرت معاویہؓ کے فرزند ارجمند امیر یزیدؒ تھے ۔ خود صحیح بخاری میں ایک دوسری حدیث میں ضمناً اس واقعہ کا تذکرہ آتا ہے ۔ بخاری جلد اول کتاب الصلاۃ باب صلوٰۃ النوافل جماعۃً میں ایک صحابی صغیر حضرت محمود بن الربیعؓ ایک صحابی کبیر حضرت عتبان بن مالک انصاریؓ سے سن کر بیان کرتے ہیں ۔ حدیث طویل ہے اور اس کا کوئی تعلق غزوہ و جہاد سے نہیں ہے ۔ لیکن اس میں ضمناً زیر گفتگو غزوے کا تذکرہ اس طرح آگیا ہے۔

"قال محمود بن الربیع فحدثتہا قوما فیہم ابو ایوب انصاری صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوتہ التی توفی فیہا و یزید بن معاویہ علیہم بارض الروم"

(بخاری کتاب الصلاۃ باب صلاۃ — النوافل)

(حضرت) محمود بن الربیعؓ نے بیان کیا کہ میں نے یہ حدیث ایک جماعت کے سامنے بیان کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی (حضرت) ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے ' اور یہ (حدیث میں نے ان سے اس زمانہ میں بیان کی تھی جب وہ) اس غزوے میں (معروف تھے) جس میں ان کی وفات ہوئی ۔ اور جس میں لشکر کے سالار یزید بن معاویہ تھے " (یعنی غزوہ مدینہ قیصر)

باتفاق محدثین و مورخین و اصحاب سیر و رجال ' حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ

عنہ کی وفات اسی مبارک بحری جہاد کے دوران ہوئی تھی، جس کی فضیلت حدیث ام حرامؓ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ آں محترم کی قبر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے قریب زیر دیوار آج بھی موجود ہے۔ بخاری شریف کی اس روایت میں صاف صاف مذکور ہے کہ اس مبارک لشکر کے سپہ سالار امیریزید مغفور تھے۔ "علیہم یزید بن معاویہؓ" کے الفاظ سے یہ بالکل عیاں ہے۔ مزید یہ کہ حضرت محمود بن الربیعؓ کا مشاہدہ تھا وہ خود بتارہے ہیں کہ انہوں نے یہ روایت اسی لشکر میں بیٹھ کر بیان کی تھی جس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ شریک تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمود بن الربیعؓ خود اس بحری جہاد میں شریک اور اس لشکر میں شامل تھے۔ اور امیریزید مغفور کا اس لشکر کا سپہ سالار ہونا، ان کا مشاہدہ تھا۔

علامہ قسطلانیؒ شارح بخاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"کان اول من غزا مدینۃ قیصر یزید بن معاویۃ و معہ جماعۃ من سادات الصحابۃ کابن عمر و ابن عباس و ابن الزبیر وابی ایوب الانصاری و توفی بھا ابو ایوب سنۃ اثنین و خمسین من الھجرہ"

"سب سے پہلے جس شخص نے مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا وہ یزید بن معاویہ ہیں۔ اور ان کے ساتھ سادات صحابہؓ کی ایک جماعت تھی جیسے ابن عمرؓ و ابن عباسؓ و ابن زبیر و ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور اس غزوے کے دوران ۵۲ ہجری میں ابو ایوب انصاریؓ کا انتقال ہوا" (رضی اللہ عنہ)

دوسری شروح باری حشل الخیر الجاری و فتح الباری، وغیرہ میں بھی یہی مضمون درج ہے۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجرؒ بسلسلہ شرح حدیث اس غزوے میں امیریزید کی بحیثیت سپہ سالار شرکت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"قال المھلب فی ھذا الحدیث منقبۃ لمعاویۃ لانہ اول من غزا البحر و منقبۃ لولدہ لانہ اول من غزا مدینۃ قیصر"

وتعقبہ ابن التین و ابن المنیر بما حاصلہ انہ لا یلزم من

"مہلبؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں حضرت معاویہؓ کی منقبت ہے اس لئے کہ سب سے پہلے بحری جہاد انہیں نے شروع کیا، (اس کے ساتھ حدیث میں) ان کے بیٹے کی بھی منقبت ہے کیونکہ وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ قیصر (یعنی قسطنطنیہ) پر حملہ

دخوله فی ذلک العموم ان لایخرج بدلیل خاص اذ لایختلف اہل العلم ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم "مغفور لہم" مشروط بان یکونوا من اہل المغفرۃ حتی لو ارتد احد ممن غزا ھا بعد ذلک لم ید خل فی ذلک العموم اتفاقا فدل علی ان المراد مغفور لمن وجد شرط المغفرۃ فیہ منہم" (۱)

کیا۔"

(اس بات پر) ابن التین اور ابن المنیر نے مہلبؒ کا تعاقب کیا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ (یزید کے) اس عموم (مغفرت) میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس (عموم) سے کسی دلیل خاص کی بناء پر خارج نہ ہوجائے ' کیونکہ اس بارے میں اہل علم کے درمیان ---

کوئی اختلاف نہیں ہے کہ (نبی کریم) صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "مغفور لہم" اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ (شرکاء غزوہ مذکور) مغفرت کے اہل بھی ہوں۔ یہاں تک کہ اگر اس غزوے میں شرکت کرنے والوں میں سے کوئی اس میں شرکت کے بعد مرتد ہوجاتا تو بالاتفاق اس عموم میں داخل نہ ہوتا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس غزوے میں شریک ہونے والوں سے وہی افراد مغفور کے مصداق ہیں جن میں شرط مغفرت پائی جائے۔"

فتح الباری کے حوالے سے علامہ ابن التینؒ و علامہ ابن المنیرؒ کا مندرجہ بالا قول ہم نے اس لئے نقل کیا ہے کہ اس کا جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ ان کا یہ قول بکثرت شیعیت نواز سنی یا سنی نما شیعہ علماء و مورخین کی بے راہ روی اور مغالطہ دہی کے لئے سہارا بنا ہوا

(۱) المہلب بن احمد بن اسید الاسدی التمیمی ابوالقسم ' ابن ابی صفرۃ فقیہ محدث من اہل المریتہ ۔۔ من آثارہ شرح الجامع الصحیح البخاری (متوفی ۴۳۵ ھ ۱۰۴۴ء) معجم المولفین ' ج ۱۳ از عمر رضا ۔ مطبوعہ دمشق ۱۹۶۱ ع نیز کشف الظنون حاجی خلیفہ والصلتہ لابن بشکوال ص ۵۶۷ ' و ۵۶۸ الدیباج لابن فرحون ص ۳۴۸ ۔ الوافی للصفدی ج ۶ ص ۱۱۵

ہے ۔ ان دونوں حضرات کا یہ قول پیش کرکے وہ ناواقف اہلسنت کو گمراہ کرتے ہیں اور جویائے صداقت کے لئے صداقت تک پہنچنے کا راستہ بند کردیتے ہیں ۔ اس قول پر تبصرہ ملاحظہ ہو :۔

شارحین بخاری اور جملہ مورخین و محدثین و اصحاب سیر متفق ہیں کہ مدینہ قیصر پر حملہ کرنے کے لئے جو اولین لشکر گیا تھا اس میں امیر یزیدؒ بن معاویہؓ شریک تھے۔ فتح الباری جلد رابع ماقیل فی قتال الروم کی شرح میں علامہ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں کہ " فانه (یعنی یزید) کان امیر ذلک الجیش بالاتفاق " (۱) (یعنی باتفاق علماء اس لشکر کے سپہ سالار امیر یزید تھے) اور اس شرکت میں بھی ان کا حصہ بہت سے دوسرے شرکاء سے بڑا تھا کیونکہ وہ اس مبارک لشکر مجاہدین کے سپہ سالار اعظم اور کمانڈار اعلیٰ تھے ۔ یہ دونوں حضرات بنو امیہ اور خصوصاً امیر یزید کے سخت مخالف ہونے کے باوجود اس کا انکار کرنے کی جسارت نہ کرسکے ۔

لیکن تعصب اور عداوت یزیدؒ کے جوش کی وجہ سے انہیں یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ امیر یزیدؒ کو مغفور کہیں اور یہ بشارت ان کے لئے بھی ثابت سمجھیں ' اس لئے انہوں نے حدیث میں تحریف معنوی کرنے کی ناکام کوشش کی ۔ ان کے قول کا ماحصل یہ ہے کہ امیر یزید کی مغفرت نہ ہوگی ۔ ان کا یہ قول ایک دعویٰ ہے جو دلیل سے قطعاً محروم ہے بلکہ دلیل کے خلاف ہے۔ لہذا قطعاً باطل ہے۔ انہوں نے جو توجیہ اس کی پیش کی ہے وہ غلط ہونے کے علاوہ اس قدر رکیک ہے کہ ان کے ایسے صاحبان علم کے قلم سے اس کا تحریر ہونا تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔ ان کے قول کی غلطی اور رکاکت کے وجوہ ملاحظہ ہوں :۔

اولاً۔ انہوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اس حدیث کے عموم میں یزید کے داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی دلیل خاص کی بناء پر وہ اس عموم سے خارج نہ ہو۔" اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت وہ دلیل خاص کون ہے جس کی بناء پر آپ اس عموم بشارت سے امیر

(۱) فتح الباری کی یہ عبارت عموماً بخاری شریف جلد اول کے حاشئے پر اکثر محشی صاحبان نقل کرتے ہیں ہند و پاک کی مطبوعہ ہر محشی بخاری شریف کے حاشئے پر یہ عبارت ملے گی شاید ہی کوئی نسخہ اس سے خالی ملے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً محشی حضرات کو امیر یزیدؒ سے اس قدر بغض و عداوت ہے کہ ان کی مدح و ستائش سخت گراں گزرتی ہے اور وہ حدیث کی یہ رکیک تاویل ضرور نقل کرتے ہیں۔

یزید مغفور کو خارج کر رہے ہیں ؟ کیا کوئی دوسری حدیث ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان کی مغفرت نہ ہوگی ؟ اور وہ اس عموم سے خارج ہیں ؟ اگر نہیں تو قطعاً ان دونوں بزرگوں کا یہ قول۔ دعویٰ بے دلیل اور باطل ہے۔

ثانیاً :۔ اگر یہ کہا جائے کہ یزید فاسق و فاجر اور ظالم ہوگئے تھے' اور فسق و فجور اور ظلم موجب عذاب ہے جس پر قرآن و حدیث میں صاف صاف عذاب کی وعید ہے ۔ ان کی اس حالت کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ وہ اس بشارت مغفرت کے عموم میں داخل نہیں ہیں ' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یزید مغفور کا فاسق و فاجر اور ظالم و جابر ہونا بہتان بلا دلیل ہے۔اور یہ دعویٰ بالکل غلط اور باطل ہے جس کا پر کاہ کے برابر بھی ثبوت موجود نہیں۔

ثانیاً اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ کس دلیل شرعی سے ثابت ہے کہ فاسق و ظالم کی مغفرت نہ ہوگی ؟

اللہ تعالیٰ کا تو ارشاد ہے کہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا

(ترجمہ) " بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف فرمادیتا ہے ۔ "

قرآن مجید سے ثابت اور اہلسنّت کے نزدیک مسلمہ عقیدہ ہے کہ شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کے متعلق اس کا امکان ہے کہ بغیر توبہ بھی اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنی رحمت اور اپنے کرم سے اسے معاف فرمادے سوا حقوق العباد کے کہ وہ صاحب حق کے معاف کرنے کے بغیر معاف نہیں ہوسکتے ۔ لیکن اس میں بھی اس کا امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب حق کو راضی کردے اور وہ عفو کرنے میں اپنا نفع دیکھ کر اپنی خوشی سے ظالم کو معاف کردے ۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت سے اسے معاف فرمادے۔ اس توضیح کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ قبل موت توبہ کرلینے سے تو شرک و کفر بھی معاف ہوجاتا ہے ۔ ایک مشرک خلوص کے ساتھ شرک سے توبہ کرکے مسلمان ہوجائے تو اس کا شرک سابق معاف ہوجاتا ہے اور اس کی وجہ سے آخرت میں اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی ۔ اس کے پیش نظر شرک و کفر کے ناقابل عفو مغفرت ہونے کا یہی مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ ان گناہوں کے بغیر توبہ معاف ہونے کا امکان ہی نہیں ۔ جبکہ ان کے سوا ہر گناہ کے لئے خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ' اس کا امکان ہے ۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود ان دونوں بزرگوں نے یہ فیصلہ کیسے کرلیا کہ امیر یزید کی مغفرت نہیں ہوسکتی ؟ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو معاف فرمائے جوش مخالفت میں انہیں

شاید اس حدیث سے ذہول ہوگیا:۔

"عن جندب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدث "ان رجلا قال واللہ لا یغفر اللہ لفلان وان اللہ تعالی قال من ذاالذی یتالی علی انی لااغفر لفلان ؟ فانی قد غفرت لفلان و احبطت عملک" او کما قال رواہ مسلم"

(مشکوۃ المصابیح الفصل الاول باب الاستغفار کتاب اسماء اللہ تعالی والتوبۃ ص ۲۰۴ مطبع مجیدی کانپور ۱۳۴۵ھ)

حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (کسی پہلی والی امت کا واقعہ) بیان فرمایا کہ ایک شخص نے یہ کہا کہ قسم اللہ کی اللہ تعالی فلاں شخص کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔ اور اللہ تعالی نے فرمایا کہ یہ کون ہے جو میرے اوپر قسم رکھتا ہے کہ میں فلاں شخص کی مغفرت نہ کروں گا ؟ پس بے شک میں نے اس فلاں شخص کی مغفرت کردی اور تیرے عمل کو رائیگاں کردیا ۔" یا اس کے مثل فرمایا ۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ بالکل عیاں اور واضح ہوجاتا ہے کہ کسی گناہ گار مومن کے متعلق، خواہ وہ کتنا ہی گناہ گار ہو یہ کہنا کہ اللہ تعالی اس کی مغفرت نہ فرمائے گا، ممنوع، ناجائز اور سخت گناہ ہے ۔ جس سے حبط اعمال کا خطرہ ہوتا ہے۔

جو لوگ نسبی تعصب یا شیعوں کی تشیر' سے متاثر ہوکر امیر یزیدؒ کے متعلق یہی بات دہرایا کرتے ہیں جو ان دونوں بزرگوں نے غلطی سے لکھ دی ہے انہیں اس معصیت سے توبہ کرنا چاہئے اور اس حدیث کے تقاضے کے مطابق اپنی زبان اور اپنے قلم کو اس خطرناک غلط بیانی سے بچانا چاہئے جو ان کے لئے بہت ہی تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ ان بزرگوں کا یہ کہنا بھی بے جا اور ان کے لئے بے سود ہے کہ "مغفرت کے لئے اہل مغفرت ہونا شرط ہے" بے جا اس لئے ہے کہ ہر مومن مغفرت کی اہلیت رکھتا ہے مرتد کی مثال بھی بے محل اور بے موقع ہے۔ کیونکہ یہاں گفتگو تو مومن کے متعلق ہورہی ہے نہ کہ مرتد کے متعلق اور ہر مومن اہل مغفرت ہے خواہ کیسا ہی عاصی ہو۔

پھر یہ کہ اگر مرتد بھی توبہ کرلے اور دوبارہ مسلمان ہوجائے تو اس کی بھی مغفرت ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی تصریح فرمائی گئی ہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ امیر یزیدؒ باتفاق جمہور اہلسنت مسلمان تھے ۔ کسی سنی نے انہیں کافر نہیں کہا ۔ جمہور اہلسنت انہیں پکا مومن اور مسلمان سمجھتے ہیں ۔ البتہ روافض ان کی تکفیر کرتے ہیں مگر وہ تو

صحابہ کرامؓ کی بھی تکفیر کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ) پھر مرتد کی مثال دینے سے کیا فائدہ ؟ اس
مقام پر یہ مثال بالکل بے محل اور نامناسب ہے۔ اس سے ناواقف کو یہ غلط فہمی پیدا
ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں محدثین کرام جمہور اہلسنت کی رائے کے خلاف امیر یزید مغفور کو
مرتد اور کافر کہتے ہیں۔ اور کسی مسلمان کو کافر کہنا حرام، معصیت کبیرہ اور شدید گناہ ہے
۔ جس کا وبال بہت ہولناک ہے۔ ازروئے حدیث شریف جو شخص کسی مومن کو کافر کہے
جبکہ درحقیقت وہ کافر نہ ہو، وہ کفر اسی کہنے والے کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ثالثاً :- ان کا یہ کہنا کہ یہ " انه لا یلزم من دخوله فی ذلک العموم ان لا یخرج بدلیل
خاص " (یعنی "اس عموم میں اس کے (یزید کے) داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ
وہ کسی مخصوص دلیل کی بناء پر اس سے خارج نہ ہو۔ ") شرعاً و عقلاً ہر اعتبار سے غلط
ہے۔ عقلاً اس لئے کہ اگر ہر کلام عام میں یہ احتمال نکلنا ممکن ہو تو کسی حکم عام یا خبر عام
کے متعلق یہ کہنا کہ وہ عام ہے اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک کوئی دلیل اس پر قائم
نہ ہو کہ اس عموم سے کسی فرد کے خارج ہونے کا کوئی احتمال و امکان نہیں باقی رہا۔ اور
کلام عام کی مراد سمجھنا اور متعین کرنا، اور اس پر اعتماد کرنا غیر ممکن ہوجائے گا۔ مثلاً ایک
قابل اعتماد شخص دوسرے شخص کو کچھ رقم ایک لفافہ میں بند کرکے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ
اس میں دس نوٹ ہیں اور ہر نوٹ سو روپے کا ہے۔ اگر زیر بحث اصول کی صحت تسلیم
کرلی جائے تو مخاطب کو اس کی اس بات پر اعتماد نہ کرنا چاہئے کیونکہ بقول ان دونوں
بزرگوں کے " لازم نہیں ہے ہر نوٹ سو ہی روپے کا ہو۔ ممکن ہے کہ کسی دلیل خاص سے
کوئی نوٹ اس سے مستثنیٰ ہو۔ مثلاً ایک نوٹ صرف پچاس روپے کا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو
لفافے میں ایک ہزار کے بجائے صرف نو سو پچاس روپے ہوں گے۔ اس لئے لفافہ دینے
والے کی بات کا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ اس مثال سے ان دونوں حضرات محدثین کے زیر
بحث قول کی غلطی واضح ہوجاتی ہے۔ عرفاً وعادتاً کسی کلام عام سے اس قسم کے خروج و
استثناء کا احتمال کسی کے ذہن میں نہیں پیدا ہوتا۔ عام کی تخصیص ہوسکتی ہے لیکن اس کے
لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی دلیل اس پر قائم نہ ہو اس وقت تک اس میں
تخصیص کا احتمال نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر بالفرض پیدا بھی ہوتا ہے تو وہ محض فلسفیانہ احتمال
عقلی ہے۔ جس کا شرعاً و عرفاً کوئی اعتبار نہیں۔ کسی کے کلام اور اس کی مراد کو سمجھنے میں
اس احتمال کا قطعاً لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ کلام عام سے مضمون و مفہوم عام ہی سمجھا جائے
گا، اور تخصیص کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

حق یہ ہے کہ عموم سے قطعی طور پر عموم ہی مراد ہوتا ہے۔ اور جب کوئی حکم عام بیان کیا جائے تو لازم ہے کہ اس سے کوئی فرد خارج نہ ہو اور یہ سمجھنا بھی لازم ہے کہ متکلم کے نزدیک اس خبر یا انشاء کے حکم سے کوئی فرد بھی خارج نہیں۔ خروج کا احتمال پیدا کرنے کے لئے خود کلام میں کوئی قرینہ صارفہ ہونا چاہئے اگر کوئی قرینہ نہیں ہے تو اس کے عموم سے کسی فرد کے خروج کا احتمال نکالنا قطعاً باطل ہے۔ زیر مطالعہ حدیث میں اس قسم کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

افسوس ہے کہ جو لوگ مخالفت یزید کے جوش سے مغلوب اور رافضی تشہیر و ارجاف سے مسحور ہو کر زیر بحث رکیک تاویل کرتے ہیں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ ماوشا کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ سید الصادقین، خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مبارک ہے۔ اس مبارک کلام کے عموم سے کسی دلیل خاص کی بناء پر کسی فرد کے خروج کا احتمال پیدا کرنا بے ادبی اور گستاخی ہے۔ (العیاذ باللہ)

ہم نے اوپر جو لفافہ کے نوٹوں کی مثال ذکر کی ہے اس پر دوبارہ نظر ڈالئے۔ یہ احتمال نکالنا کہ ممکن ہے کہ اس میں ایک نوٹ سو کے بجائے پچاس روپے کا ہو کیا لفافہ دینے والے کی تکذیب نہیں؟ یا کم از کم اس کا تخطیہ نہیں؟ اگر بالفرض لفافہ کھولنے پر ایک نوٹ پچاس روپے کا نکل آیا اور روپے کی مجموعی تعداد ایک ہزار کے بجائے نو سو پچاس ہی نکلی تو کیا مخاطب یعنی جسے لفافہ ملا ہے، متکلم یعنی لفافہ دینے والے کو کاذب نہ کہے گا؟۔ اگر بربناء حسن ظن اسے کاذب نہ کہے تو اس کے قول مذکور کو اس کی غلطی اور خطا تو ضرور کہے گا۔ کسی امر اخروی کے بیان میں نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غلطی کا صدور غیر ممکن اور محال ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کا قائم کیا ہوا زیر بحث اصول شرعاً بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اسے صحیح تسلیم کرکے اس حدیث پر منطبق کرنے سے ایک باطل بات لازم آتی ہے۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تخطیہ لازم آتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ "ان دونوں محدثین نے جو بات کہی ہے یعنی کسی حکم عام سے کسی فرد یا بعض افراد کا کسی دلیل خاص کی بناء پر خارج ہونا جائز ہے۔ اس اصول اور قاعدے کو غلط کہنا صحیح نہیں کیونکہ احکام میں نسخ بالاتفاق جائز ہے بلکہ متعدد احکام شرعیہ کا منسوخ ہونا ثابت ہے۔ جس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ کسی دلیل خاص کی بناء پر کسی حکم عام سے کسی فرد یا چند افراد کو خارج کر دینا یہ بھی نسخ ہی کی صورت ہے۔ جس کا عنوان بیان یہ بھی

ہو سکتا ہے کہ حدیث میں جو عموم کے ساتھ سب شرکاء جہاد مذکورہ کے مغفور ہونے کا حکم بیان فرمایا گیا تھا وہ عموم ایک دلیل خاص کی بناء پر منسوخ ہوگیا - اور حدیث کا حکم عام مخصوص منہ البعض ہوگیا اس قسم کے نسخ کی مثالیں شریعت مطہرہ میں بکثرت ہیں - اس لئے محدثین موصوفین کے بیان کو غلط نہیں کہا جاسکتا - " یہ شبہ جو درحقیقت ایک مغالطہ ہے' اس قدر بے جان ہے کہ قابل ذکر و التفات بھی نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ بعض شیعیت سے متاثر اہل علم بھی بعض اوقات ناواقفوں کو مغالطہ دینے اور دلیل و برہان سے اپنی تہی دستی کو چھپانے ' کی غرض سے اس باطل شبہ اور مغالطے کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے اس کا تذکرہ کردیا - اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ احکام شرعیہ یعنی امر و نہی میں جائز ہے۔ قرآن و حدیث کے اخبار میں نسخ قطعاً جائز نہیں یعنی غیر ممکن اور محال ہے۔ زیر مطالعہ حدیث شریف میں "مغفور لهم" ایک خبر ہے - کوئی حکم شرعی یعنی امر یا نہی نہیں ہے - خبر میں نسخ کے کیا معنی؟ کسی خبر کے کلیتہً یا اس کے کسی جزو کے منسوخ ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم نے غلطی کی - اگر پوری خبر منسوخ ہو تو پوری خبر کے بارے میں ' اور اگر اس کا کوئی جزو منسوخ ہو تو اس جزو کے بارے میں نیز بحیثیت مجموعی پوری خبر کے بارے میں متکلم یعنی مخبر کی غلط بیانی ثابت ہوتی ہے - بدیہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غلط بیانی کا صدور غیر ممکن اور محال ہے - اور ان کی طرف غلطی کی نسبت کرنا کفر ہے۔ اسی لئے اہلسنت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ قرآن و حدیث کی کسی خبر کا منسوخ ہونا قطعاً غیر ممکن اور محال ہے جس کا تصور بھی کوئی مومن نہیں کرسکتا -

ہم نے ان دونوں بزرگ محدثین کے بیان کردہ زیر بحث اصول کی غلطی واضح کرنے کے لئے گزشتہ سطور میں جو وجہ ثالث بیان کی ہے اس سے بھی اس مسئلہ کی وضاحت ہوتی ہے -

شبہ مذکور کی رکاکت و لغویت تو واضح ہوگئی - لیکن استطراداً بطور فائدہ زائدہ اس امر کا تذکرہ بھی انشاء اللہ مفید ہوگا کہ اگرچہ احکام شرعیہ یعنی امر و نہی میں نسخ جائز ہے مگر اس نسخ کا جواز اور وقوع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی حکم شرعی کا منسوخ ہونا غیر ممکن اور محال ہے - کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم امر یا نہی کو کلی یا جزوی طور پر منسوخ کرنے کا حق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم نسخ کا علم نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے بعد کسی ذریعہ سے بھی ممکن نہیں۔

رابعاً :۔ زیرِ گفتگو حدیث شریف میں جو خبر دی گئی ہے اس کے جو مقاصد و فوائد بداہتاً سمجھ میں آتے ہیں درج ذیل ہیں۔

(الف) مخلصین کا جی خوش کرنا کہ آنے والے دور یعنی خیر القرون ثانی میں امت کی ایمانی، و دینی حالت بہت اعلیٰ ہوگی۔ اللہ کا کلمہ بلند ہوگا اور اسلام کو ہر طرف غلبہ حاصل ہوگا۔

(ب) جس دور کی خبر دی گئی ہے اس کے بعد آنے والی امت کو بتانا کہ تمہاری تاریخ درخشاں اور قابل فخر ہے۔

(ج) ان بحری جہادوں کے شرکاء کا جی خوش کرنا اور ان کی کیفیات ایمانی اور ان کے نور اخلاص میں اضافہ کرنا۔

(د) غور کرنے سے کلام مبارک کا ایک مقصد اور فائدہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد قسطنطنیہ والے دور کے بعد آنے والی امت اپنی تاریخ کو درخشاں اور قابل مدح و ستائش سمجھے اور اس دور کی حکومت اور جمہور امت کا احترام کرنے اور اپنی اس تاریخ کی روح و تابانی سے کام لے کر اپنے مستقبل کو روشن اور جاندار بنائے۔

اگر ہم یہ فرض کریں کہ خوش خبری سے ایک فرد خارج ہوسکتا تھا تو ان مقاصد و فوائد میں سے ایک بھی کماحقہ نہیں حاصل ہوسکتا تھا۔ ایک کا اخراج ہر ایک کے اخراج کا احتمال پیدا کرتا اور کسی کو بھی صحیح معنی میں اس سے خوشی نہ حاصل ہوتی۔ علیٰ ہذا بعد کو آنے والی امت کو بھی شرکاء جہاد اور اس وقت کے جمہور مومنین مخلصین کے ساتھ جیسا چاہئے ویسا حسن ظن نہ پیدا ہوتا، کیونکہ دوسروں کے متعلق بھی شک پیدا ہوجاتا کہ شاید وہ بھی خارج ہوں۔

خامساً :۔ "مغفور لہم" کی بشارت سے اگر امیر یزید کو خارج کیا جائے تو یہ اخراج ان تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس جہاد میں شرکت کرنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے خارج کرنا پڑے گا۔ بات صاف ہے کہ فسق اور ظلم میں کسی فاسق اور ظالم کی رعایت کرنا۔ یا اقتدار کے بارے میں اس سے تعاون کرنا، اس کے گناہوں میں تعاون کرنے والے کو بھی شریک کردیتا ہے۔

اس واقعہ کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس جہاد میں شریک ہونے والوں اور "مغفور لہم" کا مصداق بننے والوں میں ایک بڑی تعداد بلکہ کثرت ایسے حضرات کی تھی

جنہوں نے امیر یزید مغفور سے ان کی خلافت کے زمانہ میں اور اس سے پہلے بھی پورا تعاون کیا اور اخیر دم تک خلافت بنی امیہ کے وفادار رہے ان میں اکثر تو تابعین اور بعض صحابہ کرامؓ تھے ۔ ان سب کا اس حدیث شریف کی بشارت سے خارج ہونا لازم آتا ہے ۔ اور یہ لازم قطعاً باطل ہے ۔ اسے تسلیم کرنے کے لئے تو کوئی سنی بھی تیار نہیں ہو سکتا ۔ جب یہ لازم ناقابل تسلیم ہے تو اس کا ملزوم بھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ یعنی امیر یزید مغفور کو بھی اس بشارت سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔

سادساً :۔ "مغفور لہم" کہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انہیں معاذ اللہ گناہوں کی چھوٹ دے دی گئی تھی ۔ قطعاً و یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مراد نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ یہ بات تو منصب نبوت کی شان کے خلاف ہے ۔ اس لئے اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ شرکاء غزوہ مذکور کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب نہیں ہوں گے ۔ اسی طرح کسی صغیرہ پر بھی کبھی اصرار نہ کریں گے ۔ یہ تو بشارت عام ہے مگر جو صحابہ اس غزوے میں شریک تھے وہ تو یقیناً پہلے ہی ایسے تھے کہ اسلام لانیکے بعد کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں گے۔ اور ممکن ہے کہ جو تابعین شریک تھے ان میں بھی بکثرت ایسے ہی ہوں۔

سابعاً :۔ اگر ان دونوں بزرگوں کا بیان کیا ہوا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے تو اہل زیغ و ضلال اس سے اپنے زیغ و ضلال کی تائید حاصل کر سکتے ہیں ۔ مثلاً ایک بدبخت خارجی کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ حضرت علیؓ بیعت رضوان میں شریک تھے لیکن ضروری نہیں کہ ان کے لئے وہ فضائل ثابت ہوں جو قرآن مجید میں اصحاب بیعت رضوان کے لئے مذکور ہیں ۔ کیونکہ وہ ایک دوسری دلیل خاص کی بناء پر اس عموم سے خارج ہیں " العیاذ باللہ ۔

اسی طرح کوئی بدنصیب رافضی حضرت عمرؓ کے متعلق اسی قسم کی حقیر تقریر کر سکتا ہے ۔ والعیاذ باللہ۔

اس طرح تو اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں پر سے امان ہی اٹھ جائے گی اس سے بالکل عیاں ہے کہ ابن التینؒ و ابن المنیرؒ کا قول بالکل غلط ہے اور انہوں نے جو قاعدہ مذکور وضع کیا ہے وہ شرعاً و عقلاً عرفاً لغتہ ہر اعتبار سے غلط ہے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے ۔ ان سے یہ سخت غلطی ہوئی ۔

ثامناً :۔ حدیث شریف میں غزوہ قسطنطنیہ کے شرکاء کو مغفور لہم (بخشے ہوئے) فرمایا گیا ہے۔ یغفر لہم (بخش دیئے جائیں گے) نہیں فرمایا گیا ہے۔ جملہ اسمیہ ثبات پر دلالت کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ۔ یہ خبر مغفرت ہے دعاء و

مغفرت یا وعدہ مغفرت نہیں ہے۔ اس کے بعد اس سے خارج ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر اس سے کوئی خارج ہو تو لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلط خبردی - بدیہی بات ہے کہ یہ غیر ممکن اور محال ہے -

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں اور روشن ہوگئی کہ زیر مطالعہ حدیث شریف کی بشارت زیر بحث غزوہ قسطنطنیہ کے سب شرکاء کے لئے تھی - اس سے امیر یزید کو خارج کرنا سخت غلطی ہے - اور معمولی غلطی نہیں بلکہ حدیث کی تحریف معنوی ہے۔ تاویل مذکور بالکل غلط اور انتہائی رکیک ہے' اسے ذکر کرنا بھی اہل علم کی شان سے فرو تر ہے۔

ان غزوات اور ان کے دور کی اہمیت

حضرت ام حرامؓ کی مندرجہ بالا حدیث پر(جس کے متعلق بحث ابھی گذر چکی ہے) غور کرنے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں - پہلا سوال یہ ہے کہ اولین غزوہ بحر اور اولین غزوہ قسطنطنیہ کو اتنی فضیلت و اہمیت کیوں دی گئی کہ اول الذکر میں حصہ لینے والوں کے لئے جنت واجب ہونے کی بشارت سنائی گئی اور ثانی الذکر میں شرکت کرنے والوں کو "مغفور لہم" کا تمغہ عطا فرمایا گیا جو باعتبار مال جنت ہی کا وعدہ ہے ؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس دور کی جس میں یہ دونوں غزوات واقع ہوئے ایسی کیا خصوصیت و اہمیت ہے کہ اس کا تذکرہ کیا گیا اور اس کے واقعات کو بیان فرمایا گیا؟

ان دونوں سوالات کا جواب اگرچہ ہمارے موضوع کے دائرے سے باہر ہے اور ان کا جواب ہماری ذمہ داری نہیں - لیکن ان مسائل کی توضیح انشاء اللہ بہت مفید ہوگی' اس لئے قاری سے امید ہے کہ اس غیر ضروری مگر مفید و نافع طوالت کو گوارہ فرمائیں گے - بحث کی افادیت انشاء اللہ دوران بحث خود واضح ہوجائے گی "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید"

غزوہ قبرص

بحث کی ابتداء ہم دونوں غزوات کی اہمیت کے بیان سے کرتے ہیں۔ ان میں اولیت غزوہ قبرص کو حاصل ہے - یعنی اس بحری جہاد کو جو حضرت معاویہؓ کی سربراہی میں یورپ کے جزیرہ قبرص پر حملے کی صورت میں ہوا تھا - اس غزوے میں شریک ہونے والوں کے متعلق حدیث مذکور میں "اوجبوا" فرمایا گیا ہے۔ یعنی جنت ان کے لئے واجب ہوگئی۔

یہی نہیں بلکہ حضرت ام حرامؓ کی اس روایت میں جو زیر بحث حدیث سے پہلے نقل کی گئی ہے، یہ بھی ہے کہ ان مجاہدین کی ظاہری شان و شوکت اور ان کے معیار زندگی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار مسرت بھی فرمایا۔ واقعات میں غور کرنے سے اس کی اس اہمیت و فضیلت کا سبب سمجھ میں آتا ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ غزوہ قبرص اولین بحری غزوہ ہے۔ مسلمانوں نے اس وقت تک دین اسلام خشکی میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچادیا تھا۔ لیکن جن ممالک تک پہنچنے کے لئے سمندر کا پار کرنا ناگزیر تھا وہاں دعوت اسلام واضح صورت میں نہیں پہنچی تھی۔ قبرص پر بحری حملہ کرکے مسلمانوں نے ان ممالک تک دعوت اسلام پہنچانے کا راستہ کھول دیا۔ دعوت اسلام قبرص تک پہنچی تو یورپ میں داخل ہوگئی۔

(۲) عام طور پر مسلمانوں کو اس بحری جہاد اور بحری سفر کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس بحری جہاد نے امت مسلمہ کے لئے دعوت اسلام پھیلانے اور غیر ممالک سے تجارت کرنے کا نیا دروازہ کھول دیا، جو اس وقت بالکل بند تھا۔

(۳) یورپ کے وہ ممالک جہاں مسلمانوں کے رسائی کا ذریعہ صرف سمندر ہی ہوسکتا تھا، بالکل مطمئن تھے کہ عرب ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس اطمینان کی وجہ سے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے غزوہ قبرص کے بعد ان کا یہ اطمینان زائل ہوگیا اور مسلمانوں کا خوف ان کے دل میں پیدا ہوا۔ اسی وجہ سے انہیں دین اسلام اور مسلمانوں سے واقفیت پیدا کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ ان کی اس نفسی کیفیت نے دعوت اسلام کو ان میں بڑھنے کا موقع دیا ان میں سے خاصی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ اگر غزوہ قبرص مذکور نہ ہوتا تو شاید اندلس کی عظیم الشان خلافت اسلامیہ بھی قائم نہ ہوتی۔ اور ہندوستان میں بھی اسلام اس وقت نہ پہنچتا جس وقت وہ پہنچا بلکہ اس سے بہت دن بعد پہنچتا۔ (۴) مسلمانوں کو بحری قوت کی اہمیت کا احساس ہوا۔ انہوں نے بحری قوت پیدا کی۔ اور عطائے خلافت کے ساتھ خوف دور کرکے امن عطا فرمانے کا جو وعدہ تھا وہ ایک نئی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ جب تک یہ غزوہ نہ ہوا تھا اس وقت تک روما کے بحری حملوں سے اہل اسلام مامون نہیں تھے۔ اس غزوے میں اہل ایمان کی زبردست بحری قوت، اور بحری جنگ میں ان کی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت کا اظہار ہوا جس نے رومی بحری بیڑے کو بھی مرعوب کردیا۔ اس طرح مسلمانوں کو ایک نیا امن حاصل

ہوا۔

(۵) مسلمانوں کو علم ہیئت اور ریاضی کے دوسرے شعبوں نیز جغرافیہ اور سائنس کی طرف توجہ ہوئی۔ اور انہوں نے ان علوم میں بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاید اسی رجحان کا نتیجہ تھا کہ خالدؒ بن یزیدؒ بن معاویہؓ نے ان علوم کو حاصل کیا۔ سائنس میں تو انہیں جدید کیمسٹری کا بانی کہنا بے جا نہیں۔ اس دور میں علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والے اور لوگ بھی ہوں گے، مگر افسوس ہے کہ تاریخ نے اموی دور کے متعلق بخل اور خیانت سے کام لیا ہے اس لئے اس کے متعلق زیادہ مواد نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ وسیع اور دقیق مطالعے سے اس موضوع کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔ (۱)

(۶) بات یہ ہے کہ یہ اولین بحری غزوہ تھا۔ اسی سے امت مسلمہ کے بحری جہاد اور سمندر کے سینہ پر چل کر دعوت پہنچانے کا آغاز ہوا۔ ظاہر ہے کہ کسی خیر کی ابتداء کرنا بہت اہم اور بہت زیادہ موجب اجر و ثواب ہے۔ کسی خیر کی ابتداء کرنے والوں کی فضیلت ان کی اتباع کرنے والوں پر ایک تسلیم شدہ بات ہے۔ اس خیر عظیم کی ابتداء اور اس کے افتتاح کی فضیلت حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوئی۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی کیونکہ ان کے حکم اور ان کی اجازت سے یہ غزوہ ہوا تھا۔

(برہانِ نبوت ختم المرسلین علیہ افضل الصلوات والتسلیم)

(۷) اسباب اہمیت و فضیلت غزوہ قبرص مذکور میں اس سبب کو آخر میں بیان کرنا چاہتا

---

(۱) یہ مسئلہ ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن بات یہاں تک پہنچ چکی ہے تو اتنی بات اور کہہ دوں کہ شیعہ داستان سراؤں نے خالدؒ بن یزیدؒ موصوف کے بہت سے علمی کارناموں کو ازراہ حسد و عناد جابر بن حیان کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کی ہے اور جابر بن حیان کو جناب جعفر صادقؒ کا تلمیذ مشہور کیا۔ حالانکہ جناب جعفر صادقؒ کو ان علوم سے ادنیٰ تعلق بھی نہ تھا نہ انہیں ان سے کوئی دلچسپی ہو سکتی تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جابر بن حیان جناب جعفر صادقؒ کا شاگرد تھا۔ جابر بن حیان اپنی جگہ فاضل شخص تھے اور سنی تھے۔ شیعہ انہیں شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس بہتان کے ساتھ دوسرا جھوٹ یہ بولتے ہیں کہ انہوں نے جناب جعفرؒ سے یہ علوم حاصل کئے تھے۔ حالانکہ افادہ و استفادہ تو بڑی چیز ہے ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ ہوگا اور ان دونوں کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔

ہوں ۔ جو سب اسباب و حکم مذکورہ پر بدرجہا فائق ہے ۔ اگر اس غزوہ بحری میں اس حکمت کے سوا کوئی اور حکمت اور مخصوص افادیت نہ ہوتی تو بھی اس کی عظمت و فضیلت و اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا ۔ اس سب و حکمت کو معلوم کرنے کے لئے بائبل کے مندرجہ ذیل آیات پر نظر کیجئے :۔

" دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے ۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی ۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا ○ وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھمکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے ○ اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں ○"

(یسعیاہ ۴۲ : ۱ ۔ ۴) ص ۶۸۸

اس وقت ہم صرف خط کشیدہ آخری علامت سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ان آیات میں نبی آخر الزماں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی علامتیں بیان فرمائی گئی ہیں وہ سب ظاہر ہو چکی تھیں ۔ اور ان سب کا مشاہدہ یہود و نصاریٰ کر چکے تھے ۔ ان کے علماء و احبار خوب سمجھ گئے تھے کہ یہ وہی نبی و رسول ہیں جن کی بعثت کی بشارت ان آیات میں دی گئی ہے ۔ لیکن ضد و عناد کی وجہ سے اس کا اقرار نہیں کرتے تھے ۔ مگر ان علامات میں سے ایک علامت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں نہیں ظاہر ہوئی تھی ۔ وہ علامت وہ ہے جو آخری آیت میں مذکور ہے۔ اس خط کشیدہ فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلام بحر (سمندر) کو عبور کرلے گی اور سمندر پار کے ممالک میں اسلام پھیلے گا ۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین بحری جہاد و غزوہ کریں گے۔ اور سمندر پار دعوت اسلام پہنچائیں گے ۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے بیشتر اور حضرت معاویہؓ کے اس بحری جہاد سے پہلے جس کی تحسین و ستائش حضرت ام حرامؓ کی حدیث مذکور میں فرمائی گئی ہے۔ کوئی بحری جہاد مسلمانوں نے نہیں کیا ۔ اور اس بحری بیڑے سے پہلے جو حضرت معاویہؓ نے تیار کیا تھا مسلمانوں کے پاس کوئی بحری بیڑا نہیں تھا۔ اسی جہاد سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آنحضورؐ کی صداقت کی ایک برہان جلی تکمیل کو پہنچی ۔ اور اہل کتاب پر ایک حجت اور قائم اور واضح ہوئی۔ جس سے اتمام حجت کو کمال مزید حاصل ہوا ۔ یہ فضل و شرف اللہ

تعالٰی نے حضرت عثمانؓ کے لئے مقدر اور مخصوص فرمایا تھا کہ ان کے دور خلافت میں ان کی اجازت سے یہ حجت رسالت ظاہر اور عیاں ہوئی ۔ اور اسی طرح یہ فضل و شرف حق تعالٰی شانہ نے حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء جہاد کے لئے مقدر اور مخصوص فرمایا تھا کہ انہوں نے عملاً اس حجت رسالت ختم المرسلین کو ظاہر کیا اور اسے صرف ایشیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ یورپ تک پہنچادیا جس میں مسیحیت و یہودیت کے مرکز تھے اور جو یہود و نصاریٰ سے بھرا ہوا تھا ۔ اس نکتہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ قبرص کی عظمت و اہمیت کتنی ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشین گوئی فرمائی ۔ اس کی عظمت و اہمیت بیان فرمائی ۔ اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور اس میں شریک ہونے والوں کو جنت کی بشارت دی ۔

غزوہ مدینہ قیصر

جو سوال غزوہ قبرص کے متعلق پیدا ہوا ہے ۔ وہی غزوہ مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ کے متعلق پیدا ہوتا ہے ۔ اس جہاد میں شریک ہونے والوں کو " مغفور لہم " ہونے کی بشارت حدیث مذکور میں دی گئی ہے ۔ اس کی اس اہمیت اور خصوصیت کی کیا وجہ ہے ؟

اس سوال کا جواب ملاحظہ ہو:۔

(۱) قسطنطنیہ ایک پہاڑ پر آباد ہے جس پر بحری راستے سے حملہ کرنے کے لئے درہ دانیال سے گذرنا پڑتا ہے۔ درہ دانیال کی تنگی اور اپنے محل وقوع کی وجہ سے اس شہر کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا ہے ۔ آج سائنس کی اس کی ترقی کے زمانہ میں بھی درہ دانیال کو قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے کے لئے وادی موت سمجھا جاتا ہے ۔ اس مستحکم قلعہ بند اور بظاہر ناقابل تسخیر شہر پر سمندر کے راستے حملہ کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ اس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی ہمت بلند ہوئی ۔ دوسری طرف رومی سلطنت پر مسلمانوں کا رعب چھاگیا ۔ اور اسے معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی حربی طاقت بہت زیادہ ہے ۔ بحری جنگ میں ان کی مہارت اور ان کے بحری بیڑے کی قوت اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اب رومن امپائر سے لڑائی میں آغاز کار (INITIATIVE) انہیں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ حقیقت بھی ان پر عیاں ہوگئی کہ نصرت الٰہی مسلمانوں کے ساتھ ہے ۔

اسلام کے شیدائیوں کو دعوت اسلام کو پھیلانے اور دین حق کی تبلیغ و اشاعت کرنے کے لئے ایک نئے میدان کا راستہ ملا۔ رومی عوام کو جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق حقیقت

حال سے بے خبر تھے، خود اسلام اور مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ دوران محاصرہ وہ اہل اسلام کے طرز زندگی اور ان کے اخلاق و عادات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ جو بہت موثر ثابت ہوا۔ مسلمانوں کے متعلق بکثرت مسیحیوں کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اور وہ اسلام کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے۔ غزوہ قبرص اور غزوہ مدینہ قیصران دونوں غزوات کی اہمیت کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ انہوں نے یورپ اور مسیحیوں سے اسلام کا تعارف کرادیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسپین کی سرزمین پر اہل اسلام کے مبارک قدم پہنچتے ہی وہاں اسلام پھیلنا شروع ہوگیا۔ یہ انہیں دونوں مبارک غزوات کا اثر تھا۔ اگر یہ دونوں غزوات نہ ہوتے تو اسپین میں اس تیزی کے ساتھ اسلام مقبول نہ ہوتا۔

ایک اور نشان نبوت و رسالت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور

(۳) غزوہ قسطنطنیہ کی اہمیت و خصوصیت کے جو اسباب ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ اگرچہ مفید مقصد ہیں لیکن غور کرنے سے اس کی ایک ایسی توجیہ سمجھ میں آتی ہے جو تنہا اسے اہمیت کے اس درجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ جس کی نشاندہی حدیث مذکور کر رہی ہے۔ اس مبارک غزوے کی اہمیت و عظمت کے اسرار کو سمجھنے کے لئے خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامہ مبارک کو پڑھنا چاہئے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "ہرقل" کو ارسال فرمایا تھا اور جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ نامہ مبارک درج ذیل ہے:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من محمد عبداللہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدی ' اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم ' یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الیریسیین و یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے عظیم روم ہرقل کے نام۔ اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرے سلامتی ہو۔ اما بعد میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تو سلامت رہو گے۔ اور تمہیں اللہ دوہرا ثواب عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم رو گردانی کروگے تو تم

الله ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون O"

(بخاری ج ۱ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص۵)

پر تمہاری رعایا کے پست طبقے (یعنی کاشتکاروں اور خدام وغیرہ) کا بھی گناہ لادا جائے گا۔ (اس کے بعد قرآن مجید کی آیت ہے) " اے اہل کتاب ایک ایسے کلمہ (عقیدے) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے (اور وہ یہ ہے) کہ ہم سوا اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' اور ہم میں سے بعض لوگ اللہ کے علاوہ دوسرے بعض لوگوں کو اپنا رب نہ بنائیں۔ " پس اگر اہل کتاب سے روگردانی کریں تو (اے مسلمانوں) کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہو کہ ہم سب مسلم ہیں۔ "

نامہ مبارک کو غور سے دیکھئے۔ " اسلم تسلم " میں ہرقل سے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمان ہوجاؤ تو سلامت رہو گے۔ یعنی دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ علی الاطلاق سلامتی کو اس وسیع معنی میں لیا جاسکتا ہے کہ جو دنیا و آخرت اور دونوں جہانوں کی سلامتی پر مشتمل ہو۔ اس کا مفہوم مخالف' جو ایسے مقامات پر یقیناً معتبر ہوتا ہے' یہ نکلتا ہے کہ اگر تم اسلام نہ لائے تو دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں سلامتی سے محروم رہوگے۔ آخرت کا عذاب تو اپنی جگہ برحق ہی ہے دنیا میں بھی تمہاری سلطنت و شوکت نہیں سلامت رہے گی۔ اس فقرے سے اس مضمون کی طرف صاف اشارہ ہے۔ اس کے بعد خط کشیدہ عبارت پر نظر کیجئے۔ اس میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو غریب کاشتکار وغیرہ نچلے طبقہ کے گمراہ رہنے کا گناہ اور عذاب بھی تمہارے اوپر ہوگا۔ کیونکہ تم اسے قبول حق سے روکتے ہو۔ اور اس پر ظلم کرتے ہو۔ اس لئے اس کے کفر کے تم بھی ذمہ دار ہو۔ اس

فقرے سے روم کے سیاسی و معاشی نظام کی ظالمانہ نوعیت اور نچلے طبقہ کی مظلومیت اور بے چارگی کی طرف اشارہ صاف صاف سمجھ میں آتا ہے۔

نامہ مبارک میں جو آیت قرآنی تحریر ہے اس میں ارشاد ہوا ہے کہ کسی انسان کا دوسرے انسان کو 'رب' بنالینا یعنی حسب بیان حدیث شریف اسے تحلیل و تحریم میں مختار سمجھنا شرک اور گناہ عظیم ہے۔ رومی ان سب گمراہیوں اور معاصی میں مبتلا تھے۔ اپنے مذہبی پیشواؤں کو انہوں نے اپنا 'رب' بنالیا تھا۔ انہیں تحلیل و تحریم میں مختار سمجھتے تھے۔ اور اونچا طبقہ خصوصاً برسراقتدار گروہ نچلے اور غریب طبقہ مثلاً کاشتکار، غلام، اہل حرفہ، ادنیٰ خدام اور مزدوروں پر سخت ظلم کررہا تھا۔ ان کا استحصال بھی کرتا تھا۔ اور انہیں اذیت بھی پہنچاتا تھا، اس کے ساتھ قبول حق سے روکتا تھا۔

اس پس منظر میں غزوہ قسطنطنیہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک غزوے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کی یاد دہانی اس کی عملی تصدیق اور رومی مسیحیوں پر اتمام حجت کا شرف حاصل ہے۔ اس غزوے سے ظاہر ہوگیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ مبارک میں اسلام سے اعراض کی صورت میں رومی سلطنت کے زوال کی طرف جو اشارہ فرمایا تھا۔ اس کا سب سے پہلا عملی ظہور اس غزوے سے ہوا۔ اس سے پہلے جو جہاد رومی سلطنت کے خلاف ہوئے تھے وہ سب رومی سرزمین سے باہر اور اس سے دور تھے۔ ان میں سے کسی سے بھی رومی تخت و تاج کو خطرہ نہیں لاحق ہوا تھا۔ اس کے مرکز قسطنطنیہ پر چڑھائی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلمان اسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کے فقرہ مبارکہ "اسلم تسلم" کی تجدید ہوگئی۔ اور نامہ مبارک میں جو وعید خفی تھی اس کی صداقت ظاہر ہوگئی۔ پھر یہ کہ اس مرتبہ قسطنطنیہ فتح نہیں ہوا بلکہ رومن امپائر کو بہت ذلیل ہوکر صلح کرنا پڑی۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ نامہ مبارک نے جس طرح انہیں تنبیہہ کرکے غور و فکر کے لئے مہلت دے دی تھی اسی طرح تجدید کے بعد بھی رومی سلطنت کو سوچنے سمجھنے کے لئے مہلت دے دی گئی۔ تاکہ وہ سوچ سمجھ کر دو چیزوں یعنی ایمان لانے یا دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھانے میں سے ایک چیز کا فیصلہ کرلے۔

اس نکتہ کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قسطنطنیہ روم کا سیاسی اور مذہبی مرکز تھا۔ پاپائی شریعت، اور رومی قانون، دونوں کا نفاذ وہاں سب سے زیادہ نمایاں تھا،

نچلے طبقے مثلاً کاشتکار وغیرہ کو یہ قانون کوئی حق نہیں دیتا تھا۔ انہیں شہریت بھی نہیں حاصل ہوتی تھی۔ اونچا خصوصاً حکمراں طبقہ ان کا استحصال کرتا تھا اور انہیں تختہ مشق ستم بناتا رہتا تھا۔ رومی قانون اس اونچے طبقے کی حمایت و سرپرستی کرتا تھا۔ روڈس اور قبرص کے غزوات اور حالات اہل روما تک ضرور پہنچے ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مذکور کا مضمون جس سے یریسیین یعنی کاشتکاروں اور انہیں کی طرح نچلے طبقے کے لئے ہمدردی و انصاف کی طرف واضح اشارہ سمجھ میں آتا ہے۔ ان میں ضرور مشہور ہو گا۔ ان حالات میں جب مسلمان قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے پہنچ گئے اور وہاں مدت تک مقیم رہے تو رومیوں کے نچلے طبقے (کاشتکار، مزدور، غلام ادنیٰ ملازمین وغیرہ) نے ان کے اعلیٰ اخلاق، ان کی پابندی شریعت باہمی مساوات، عبادت الٰہی سے ان کا شغف وغیرہ اعلیٰ اوصاف اور مثالی کردار کا مشاہدہ کیا ہو گا۔

ان کے دل میں یہ تمنا یقیناً پیدا ہوئی ہو گی کہ کاش شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف الف تحیتہ نافذ ہوتی۔ افواج اسلامیہ کو اپنے شہر کے قریب پاکر اس تمنا کے ساتھ انہیں اس کا انتظار بھی پیدا ہوا ہو گا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر بائبل حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی مذکورہ بالا وحی کی آخری آیت پھر پڑھئے:

"اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں"

بائبل کی اس بشارت اور نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے نشان کا ظہور اگرچہ غزوہ قبرص اور غزوہ روڈس سے ایک درجہ میں ہو گیا تھا لیکن غزوہ قسطنطنیہ سے جتنا اس کا ظہور ہوا اتنا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ اول تو اس وجہ سے کہ وہاں نامہ مبارک کا مضمون مشہور و محفوظ تھا۔ دوسرے وہ رومی شریعت و قانون کا مرکز تھا اور روم خصوصاً قسطنطنیہ میں ان کے ظالمانہ قوانین اور ان کی ظالمانہ خود ساختہ پاپائی شریعت کی جور نوازی، غرباء کشی، اور امارت پروری سب مقامات سے زیادہ نمایاں اور غالب تھی۔ اس لئے وہاں مسیحی عوام بلکہ اوسط طبقے کی مذکورہ بالا تمنا اور شریعت اسلامیہ کے لئے ان کا انتظار دونوں چیزوں میں شدت پیدا ہوگی اور دونوں نمایاں ہوئیں ہوں گی۔

اس بیان و توضیح کے بعد زیر بیان غزوہ قسطنطنیہ کی اہمیت و عظمت مذکورہ کی توجیہ سمجھ لینا مشکل نہیں رہتا۔ یہ وہ غزوہ ہے جس نے مسیحی دنیا قلب و دماغ میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مبارکہ کی تجدید اور آنحضور علیہ السلام کے نامہ مبارکہ کی تصدیق کردی ۔ اسی غزوہ مبارکہ نے حضرت مسیحِ نبی علیہ السلام کی وحی بشارت کی صداقت عملاً ظاہر کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا ایک نشان عظیم ظاہر کردیا ۔ اور مسیحیوں پر ایک اور حجت قائم کردی۔

معاندین کا ایک نیا مغالطہ

یہ حقیقت تو روز روشن کی طرح روشن ہوگئی کہ مذکورہ بالا حدیث متعلق غزوہ مدینہ قیصر کا مصداق وہی لشکر ہے جس کے امیر یزید مرحوم و مغفور تھے۔ مگر معاندین کے دل میں بغض بنی امیہ اور بغض یزید مرحوم و مغفور بھرا ہوا ہے۔ اس لئے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ثبوت و صحت کا انکار نہ کرسکے۔ رکیک تاویلیں کیں مگر وہ بھی نہ چلیں ۔ اور ان کی غلطی و رکاکت سب پر واضح ہوگئی ۔ انہیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑا کہ اس لشکر کے سالار اعلیٰ یزید مغفور تھے۔ لاجواب ہوکر ایک مدت تک مبہوت و ساکت رہے۔ اب کچھ دنوں سے ایک نیا مغالطہ اور جھوٹ ایجاد کرکے بازار میں لائے ہیں۔ ان کے چند سربراہوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ " حدیث تو صحیح ہے مگر اس کے مصداق یزید" نہیں ہیں بلکہ سلطان محمد فاتح مرحوم ہیں جنہوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تھا۔ بغض و عناد نے انہیں اس کذب صریح اور مغالطہ دہی کی جرأت دلائی۔ ان کے اس قول کی غلطی اور ان کی دروغ بافی بالکل واضح ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں "اول جیش من امتی" الخ میری امت کا پہلا لشکر الخ) یہ " پہلا لشکر " وہی تھا جس نے امیر یزید" بن معاویہؓ کی قیادت میں مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا تھا ۔ سلطان محمد فاتح کا لشکر اول جیش یعنی پہلا لشکر نہیں تھا ۔ ان کے حملے سے پہلے مسلمانوں کے کئی لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کرچکے تھے ۔ اسے فتح نہ کرسکے ۔ تعجب ہے کہ ان معاندین کو اس قدر کھلا ہوا جھوٹ بولتے اور ایسا رکیک مغالطہ دینے میں کوئی شرم و حیاء نہیں محسوس ہوئی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جب امیر یزید رحمہ اللہ نے قسطنطنیہ پر حملہ مذکور کیا ہے تو اسی غزوے کو حدیث کا موعودہ غزوہ سمجھ کر بہت سے اکابر و اصاغر صحابہؓ نے بہت اہتمام کے ساتھ اس میں شرکت کی' تاکہ مغفور لہم کی بشارت و فضیلت

حاصل کر سکیں ۔ حضرت ابو ایوب انصاری ' حضرت حسن ' حضرت حسین رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرامؓ خاصی کثیر تعداد میں ' ان کے علاوہ اجلہ تابعین بڑی تعداد میں شریک ہوئے ' اور صرف اس لئے شریک ہوئے کہ اس غزوے کے مجاہدین و شرکاء کی جو فضیلت حدیث شریف مذکور میں وارد ہوئی ہے اسے حاصل کریں ۔ میں ان معاندین سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ حضرات و صحابہ و تابعین حدیث شریف کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے تھے ؟ گویا حدیث کا صحیح مطلب اور اس کی صحیح مراد پندرھویں صدی کے ان معاندین و مخالفین ہی کی سمجھ میں آئی چودہ سو سال تک صحابہ ' تابعین ائمہ مجتہدین حدیث کے شارحین سب حدیث کی صحیح مراد سے بے خبر رہے؟ ۔ ان مخالفین یزیدؒ نے جہل اور ہٹ دھرمی کی حد کردی ۔ ذرا یہ لوگ غور کریں کہ وہ دیدہ و دانستہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات کی نسبت کررہے ہیں ۔ کلام نبوی کی اصل مراد ' کے بجائے اپنی طرف سے اس کی مراد اور اس کے مطلب کو بدل کر ایک غلط بات کو مراد حدیث کہنا بھی حدیث کی تحریف معنوی ' اور افتراء علی الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک ایسی

بات کی نسبت ہے جو آپ نے نہیں فرمائی ۔ یہ معصیت کبیرہ ہے جس پر سخت وعید ہے ۔ ازروئے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کسی بات کی غلط نسبت کرنے کا انجام جہنم ہے ۔ ان معاندین کو چاہئے کہ اس حدیث کو دیکھیں اور اس غلط بیانی اور مغالطہ دہی سے باز آجائیں ۔

اس دور کی اہمیت کی وجہ

دوسرا سوال یہ تھا کہ جس دور میں یہ دونوں غزوات واقع ہوئے اس دور کی کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اسے اس قدر اہمیت دی گئی کہ اس کے دو غزوات کا مخصوص طور پر تذکرہ فرمایا گیا ' اور ان غزوات کے شرکاء کی فضیلت بیان فرماکر انہیں جنت و مغفرت کی بشارت دی گئی ؟

بطور تمہید عرض ہے کہ :۔

رسول کریم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے آخری نبی و رسول ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد باب نبوت و رسالت بند ہوگیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بکثرت انبیاء و مرسلین

علیہم الصلوٰت والتسلیم تشریف لائے۔ سب انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے۔ صرف شریعتوں میں فرق و اختلاف ہے۔ جس وقت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہ سب مذاہب و ادیان ختم ہو چکے تھے۔ صرف ملت ابراہیم علیہ الصلوٰت والتسلیم کے کچھ اجزاء باقی رہ گئے۔ یہ ادیان کیونکر ختم ہوگئے ؟ انبیاء سابقین کی تعلیم کیسے گم ہوگئی ؟ کتب الہیہ سابقہ کیوں مفقود یا محرف کالمفقود ہوگئیں ؟۔ قرآن مجید نے ان سب سوالات کا بہت جامع جواب دیا ہے۔ سورہ مریم علیہا السلام میں متعدد حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر اور ان کی کیفیت عبدیت و انابت الی اللہ کا تذکرہ فرمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے :۔

"فخلف من بعد ھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا ○ (مریم : ۵۹)

" ان کے بعد کچھ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نمازیں ضائع کیں اور اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کی پس وہ ضرور آخرت کی مصیبت میں پڑیں گے۔

آیت سے مندرجہ بالا سب سوالات کا جواب معلوم ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی علیہ السلام کا لایا ہوا دین تمام و کمال ان کے زمانہ حیات میں محفوظ رہا۔ اور ان کے صحابی اس پر عامل رہے اور اس کی حفاظت کرتے رہے۔ کسی نبی کے اصحابؓ میں کوئی بگاڑ اور فساد نہیں پیدا ہوا۔ مگر نبی کے انتقال کے بعد جو نسل پیدا ہوئی جو ان نبی علیہ السلام کی زیارت اور شرف صحابیت سے محروم تھی اس میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوا۔ ان ناخلف لوگوں نے نبی علیہ السلام کے صحابہ کی توقیر۔ اور اتباع سے روگردانی کی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوتاہی کی۔ صلوات کو رائیگاں کیا۔ ہوائے نفس کی پیروی کی فسق و فجور میں مبتلا ہوئے ' دین کی طرف سے غفلت اور لاپروائی برتی یہاں تک کہ اسے نسیاً منسیاً کردیا۔ اور ضلال و کفر کی ہلاکت خیز وادی میں پہنچ گئے۔

قرآں مبین کا یہ بیان دیدہ اعتبار کے لئے سرمہ بصیرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دین کی بقاء کے نقطہ نظر سے وہ زمانہ سب سے اہم اور پر خطر ہوتا ہے جب اس دین کے لانے والے نبی علیہ السلام اور ان کے اصحاب دنیا سے چلے جائیں۔ اور ایسی نئی نسل پیدا ہو جس کی بصارت ان نبی علیہ السلام کے دیدار سے اور جس کی سماعت ان کی گفتار سننے سے محروم رہی ہو۔ اگر یہ نسل اس دین کی علمی و عملی حفاظت سے دستکش ہوکر اپنے نفس کی پیروی اختیار کرے تو وہ دین باقی نہیں رہ سکتا۔ اور کچھ دنوں میں بالکل

مفقود یا محرف ہو کر حتی مفقود ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ نسل صالح ہو۔ دین کی علماً و عملاً ہر طرح حفاظت کرے، اور اسے احتیاط و حفاظت کے ساتھ اپنے بعد والی نسل کی طرف اس طرح منتقل کرے کہ وہ بھی اسے ذوق و شوق کے ساتھ قبول کرے، اس کی عظمت کو پہچانے اس پر عمل کرے اور اس کی حفاظت کرے تو اس کے محفوظ رہنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ دوسری نسل کے بعد تیسری نسل تک دین منتقل ہونے کا مرحلہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اگر یہ تیسری نسل بگڑ جائے تو بھی دین محفوظ نہیں رہتا۔ اگر باقی رہتا ہے تو محرف صورت میں اور رفتہ رفتہ بالکل ہی بدل جاتا ہے۔ گویا معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر تیسری نسل کماحقہ اس کی حفاظت کرے تو اس کی بقاء کا پہلو بہت قوی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مٹنے کا امکان تقریباً معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ دینی، عمرانی اور اجتماعی نفسیات کا اہم نکتہ ہے۔ جو دین حق کی تاریخ کا ایک اہم حصہ (MOMENTOUS) ہے۔ اور جس کی طرف قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیت نے اشارہ فرمایا ہے۔ اس نفسی اصول کی عقلی و نفسی توجیہ یہ ہے کہ نبی کے اصحاب خود نبی کو دیکھتے ہیں اور ان کی تعلیم اور ان کے فیضان سے بلا واسطہ مستفید ہوتے ہیں۔ نبی کی سیرۃ مقدسہ اور اس کے قلب کی نورانیت ان کے دلوں کو نبی پر اعتماد کامل کے ساتھ کمال ایمان ویقین کے نور سے منور کردیتی ہے۔ لیکن وہ نسل جو کسی نبی کے دیدار سے محروم ہوتی ہے۔ اصحاب نبی پر اعتماد کے بغیر کمال ایمان کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور ان کی اتباع کے بغیر نبی کی اطاعت بھی نہیں کرسکتی۔ جب اس نسل کو صحابہ پر کماحقہ اعتماد نہ ہو تو اس کا صراط مستقیم سے ہٹ جانا، اور زیغ وضلال میں مبتلا ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صحابہ پر بے اعتمادی اور ذہن میں ان کی بے توقیری یا کم توقیری کے بعد نبی کی تعلیم اور اس وحی پر جو اس پر نازل ہوئی تھی اعتماد باقی نہیں رہ سکتا۔ پھر جسے دین پر پورا یقین و اعتماد نہ ہو، وہ دین کو محفوظ رکھنے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کی کوشش کیوں کرے گا؟ اور جب دوسری نسل میں دین باقی نہ رہے تو آئندہ اس کی بقاء کیسے ہو سکتی ہے؟ آیت مقدسہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امم سابقہ نے اپنے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ان کے لائے ہوئے دین کو اسی طرح بھلا کر ہاتھ سے کھودیا۔ اور ایسا کھویا کہ اگر قرآن مجید نہ بتاتا تو ان انبیاء علیہم السلام کی نبوت اور ان کی اصل تعلیم کا معلوم کرنا بھی تقریباً غیر ممکن ہوتا۔ اگر نبی کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی نسل اصحاب نبی پر پورا اعتماد رکھتی ہو اور ان کی اتباع کرتی ہو تو وہ دین کو حفاظت کے ساتھ اپنے بعد والی نسل کی طرف منتقل کردیتی ہے۔ اور وہ نسل بھی ایسی ہی

کامل الایمان ' امین اور دین حق کی حفاظت واشاعت میں کوشاں ہوتی ہے ' تو اس کی بقاء یقینی ہوجاتی ہے ۔ کیونکہ وہ آبائی دین ہوجاتا ہے اور اس میں رسم و رواج اور قومی ثقافت کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے تجربات شاہد ہیں کہ رسم و ثقافت ہر قوم میں بہت مستحکم ہوتی ہے ۔ ہر قوم اس کی حفاظت کرتی ہے اور بہت اہتمام و احتیاط کے ساتھ آئندہ نسل کی طرف منتقل کرتی ہے ۔

اس تمکین دین کے بعد دین حق کے لئے زوال و فنا کا خطرہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے کہ خود اس کی پیروی کرنے والے فسق و فجور میں مشغول ہوکر اس کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتیں ۔ دین میں بدعات اختراع کریں اور اپنے فسق و فجور اور بدعات و اختراعات کی جگہ دین حق میں نکالنے کی کوشش کریں ۔ اس طرح تحریفات و بدعات کو اصل دین بنالیں اور اصل دین کو بھول جائیں ۔ دوسری صورت اس کے فنا ہونے کی عقلاً یہ ہوسکتی ہے کہ باطل کی کوئی غیر معمولی قوت اس کو اور اس کی پیروی کرنے والوں کو مٹادے ۔ ان صورتوں کے سوا تیسری نسل کے بعد کسی دین حق کے مٹنے یا محرف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اگر اس قسم کے اسباب نہ پیدا ہوں ' یا پیدا ہوں مگر امت میں ان کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہوجائے تو دین حق قیامت تک نہیں مٹ سکتا ۔ ان اسباب اور ان کے مقابلے ' کے مسئلے پر بحث ہمارے موضوع کے دائرے سے خارج اور غیر ضروری ہے ۔ یہ حقیقت الم نشرح ہوچکی کہ دین حق کی بقاء اور اس کے استقلال و تمکن کے لئے اس کے دور ظہور کے بعد دوسری اور تیسری نسل کے ادوار بہت اہم اور فیصلہ کن ہوتے ہیں ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت اور اجتماعی و دینی نفسیات کا ثابت شدہ اصول ہے ' جس کی طرف قرآن مجید کی زیر مطالعہ آیت اشارہ کررہی ہے ' جس کے سامنے عقل سلیم سر تسلیم خم کرتی ہے اور تجربات اس پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں ۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء ومرسلین علیہم **الصلوات والتسلیم** اور ان کی امتوں خصوصاً بنی اسرائیل کے حالات کا غائر مطالعہ بھی ہمارے بیان کردہ اس نکتہ کو ثابت اور واضح کرسکتا ہے ۔ اس تمہید کی روشنی میں زیر بحث مسئلہ پر نظر ڈالنے سے اس دور کی اہمیت روز روشن کی طرح روشن ہوجاتی ہے ۔ جس میں مذکورہ بالا دونوں غزوات واقع ہوئے تھے ۔ یہ وہ دور تھا جب صحابہ کرام؃ دوسری نسل کو دین اسلام کی دولت سے مالا مال کررہے تھے انہیں اس کی حفاظت و ترقی کا ذمہ دار بنارہے تھے اور اس کے لئے ان کی تربیت کررہے تھے ۔ اگر یہ نسل اس وراثت کی اہل نہ ہوتی یا اس میں

لاپروائی برتی تو بقاء اور اس کا تمکن خطرے میں پڑجاتا ۔ بلکہ اس کی بقاء کے امکانات میں کمی ہوجاتی ۔ سابق انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں اور دینی تعلیمات کے ساتھ جو کیفیت گذری تھی وہ قرآن نے بیان فرمائی ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین سابق نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ **الصلوۃ والسلام** کی تعلیم دین ' اور ان پر نازل شدہ کتاب انجیل شریف کا صرف نام باقی رہ گیا ۔ اور آنحضرت علیہ السلام کے "**رفع الی السماء**" کے کچھ ہی دن بعد ان کی تعلیم اور کتاب دونوں میں تحریف ہوگئی اور ان کا لایا ہوا دین مفقود ہوگیا ۔ ان کے اصحاب رض (حواری رض) کی وفات کے بعد یہ فساد نمایاں ہوا اور بڑھتا ہی چلاگیا ۔ یہاں تک کہ حقیقی دین عیسوی جو اسلام ہی تھا بالکل معدوم ہوگیا ۔ اور مسیحیت کے نام سے یہودیت کا ایک جدید ایڈیشن نکل آیا ۔ ان واقعات پر نظرکرکے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک و مقدس دور میں بعض کفار جو شاید موروثی روایتوں کی وجہ سے ان واقعات سے کسی درجہ میں واقف تھے ' یہ خیال رکھتے تھے کہ یہ دین بھی ادیان سابقہ کی طرح چند سال باقی رہے گا اور زیادہ سے زیادہ دور صحابہ رض تک چل سکے گا ۔ نئی نسل اسے چھوڑ کر اپنے قدیم دین کو اختیار کرلے گی ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں یہود اور منافقین یہود ' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم **اجمعین** کو معاذ اللہ بدنام کرنے اور بے وقار بنانے کی جو ناپاک کوشش کررہے تھے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہ تھی ۔ یہود و منافقین یہود کے کذب و افتراء کی تردید قرآن مجید میں بار بار فرمائی گئی ہے ۔ دشمنان اسلام کی اس مکروہ روش کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ اس قسم کے اعداء اسلام زیر بحث ادوار کے اہل ایمان خصوصاً خلفاء اور ارباب حکومت ' اور **متبعین** صحابہ رض کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کریں گے اس کے لئے جھوٹ ' اور افتراء و بہتان کے ڈھیر لگادیں گے ۔ امت مومنہ کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش میں کوئی کمی نہ کریں گے ۔ ان مہلک فتنوں اور خطرات کو دفع کرنے اور ان کا سدباب کرنے کے لئے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایسے مضامین بیان فرمائے گئے ہیں جن سے دور صحابہ رض اور ان کے بعد کے دور خلافت خصوصاً زیر بحث ادوار کی تاریخ کی روح پرور نورانیت اور تابناکی واضح ہوتی ہے ۔ اور منافقین نیز ان کی کورانہ تقلید کرنے والے متشیع مورخین اور فضلاء کی پھیلائی ہوئی ظلمت کافور ہوجاتی ہے ۔ اس کے ثبوت میں آیہ استخلاف کی طرف اشارہ کافی ہے ۔ جس کی تفسیر اور مضمون مذکور پر اس کی دلالت کی توضیح ہم صفحات سابقہ میں پیش کرچکے ہیں ۔ دوسرے آیات قرآن

جو ہم نے نقل کئے ہیں اس کا ثبوت مزید ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ادھر خصوصی توجہ فرمائی۔ اور ان ادوار کی آنے والی تاریخ کا خاکہ بطور پیشین گوئی امت کو دکھادیا۔ اس سلسلہ کے متعدد احادیث ہم انہیں صفحات میں نقل کرچکے ہیں۔ زیر مطالعہ حدیث بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس میں صاف صاف فرمادیا کہ اس دور میں امت محمدیہ (علی صاحبہا الف الف تحیتہ) کی حالت دین و ایمان اور اخلاق کے اعتبار سے اس قدر بلند ہوگی کہ انہیں زندگی میں جنت و مغفرت کی بشارت اور سند عطا فرمائی جائے گی' سبحان اللہ ان مجاہدین کرام کا عنداللہ کیا مرتبہ ہے!۔ بہت سے وہ بزرگ جنہیں عام طور پر اولیاء اللہ سمجھا جاتا ہے۔ جن کا نام بھی لوگ ادب سے لیتے ہیں۔ اور جن کی قبروں پر اہل بدعت چادریں اور غلاف چڑھاتے ہیں۔ کیا ان میں کوئی ایسا ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ نے یہ کلمات بشارت ارشاد فرمائے ہوں؟ ایسا ایک بھی نہیں نکل سکتا۔ تو ماننا پڑے گا کہ بہت سے ان مقبول عوام وخواص صوفیاء' علماء اور اولیا ء اللہ سے قبرص اور قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والوں اور ان غزوات مبارکہ میں شریک ہونے والوں کا رتبہ بلند و برتر ہے۔ ان میں جو صحابی نہیں ہیں ان کا مرتبہ بھی ان بزرگوں سے بہت بلند و برتر ہے۔ جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر ان ماؤں اور باپوں کا مرتبہ کتنا بلند تھا جنہوں نے اپنے جگر گوشوں کو ان خطرناک مہمات اور جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے لئے خوش دلی کے ساتھ اجازت دی' اور ان سہاگنوں کا درجہ کتنا اونچا تھا جنہوں نے اپنے شوہروں کو جو انہیں اپنی جان سے زیادہ محبوب تھے' اپنے سہاگ اجڑنے اور اپنے بچوں کے یتیم ہونے کا خطرہ مول لے کر توفیق اعلاء کلمتہ اللہ کی مبارک باد دیتے ہوئے رخصت کیا۔

بطور یاد دہانی عرض ہے کہ اس تفاضل کا تذکرہ ان شرکاء غزوات مذکورہ کے بارے میں ہے جو صحابی نہیں تھے۔ جو صحابیؓ تھے ان کا بعد کے سب اولیاء سے افضل و برتر ہونا تو تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ کوئی غیر صحابی کسی صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ بلاشبہ ادوار مذکورہ میں جو امت مسلمہ تھی اس کا مرتبہ بہت بہت بلند ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ حسب ارشاد نبی کریم صلی اللہ وسلم یہ دور بلکہ اس کے بعد کا متصل دور "خیر القرون" میں داخل تھا۔ ان ادوار میں پوری امت صالح اور متقی تھی۔ معاشرہ متقی اور صالح تھا۔ اور اجتماعی زندگی دین و تقویٰ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اس قرن کی اس خیریت اور اس کے متقیانہ رنگ کا اثر اس کے بعد کے آنے والے دور پر بھی پڑا۔ جس نے اسے بھی حسب ارشاد خاتم النبیین

علیہ الصلوۃ والتسلیم "خیرالقرون" کا ایک حصہ بتادیا ۔ زیر بحث غزوات اور انکے قرن و دور کی اہمیت اور شان امتیاز کے بارے میں ابھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے ۔ لیکن بیان بہت طویل ہوجائے گا ۔ اور ہم اپنے موضوع سے بہت دور نکل جائیں گے ۔ اس لئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں ۔مگر خاتمہ بحث میں قاری کو اس تاریخی نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شیعوں نے اگرچہ ہر اسلامی سلطنت بلکہ ہر اسلامی ادارے کی مخالفت کی ہے ' اور برابر کرتے آئے ہیں ۔ خلفاء و سلاطین ' اسلام نیز ان کے معاونین ' کے خلاف زہر اگلنا ان کا شعار ہے ' اہل سنت یعنی مسلمانوں سے عداوت ان کا مذہبی مزاج ہے ۔ اور اسلام و اہل اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے ۔ مگر شیعہ مذہب اور شیعی مورخین کے تصانیف و روایات سے واقفیت رکھنے والے کی نظر سے یہ واقعہ مخفی نہیں رہ سکتا کہ ان لوگوں نے ان ادوار و قرون کے بارے میں جتنا زہر اگلا ہے ' جنہیں نبی کریم خاتم النبیین والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرالقرون کا لقب عطا فرمایا تھا ' اس قدر زہر چکانی کسی دور اور قرن کے متعلق نہیں کی ہے ۔ خصوصاً "خیر القرون" ثانی ' و ثالث و

رابع یعنی دور صحابہ اور تابعین اور دور تبع و تابعین کے متعلق ۔ ان قرون کو بدنام کرنے کے لئے انہوں نے اپنی دروغ بافی ' بہتان طرازی ' افتراء پردازی ' اور الزام تراشی کا بہت بڑا ذخیرہ کردیا ہے ۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ جو شخص شیعہ تحریک اور شیعہ مذہب سے واقف ہے اس کے لئے اس سوال کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں ۔ جو لوگ اس سے ناواقف ہیں ان کے لئے عرض کرتا ہوں کہ اس کی دو وجہیں بہت نمایاں ہیں۔

اول :۔ ان قرون و ادوار کی اہمیت جس کے اسباب مذکور ہوچکے ۔

دوم :۔ تاریخ میں شیعوں کا کردار دیکھنے سے یہ واقعہ بدیہی ہوجاتا ہے کہ شیعوں کو اصل عداوت دین اسلام سے ہے ۔ وہ قرآن مجید کے دشمن ہیں اور جن پر قرآن مجید نازل ہوا یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دشمن ہیں ۔ زیر بحث قرون کو بھی نبی کریم علیہ افضل الصلوات والتسلیم نے " خیر القرون " میں داخل فرمایا ہے۔ شیعہ انہیں شرالقرون ظاہر کرکے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

آیت کریمہ آیہ استخلاف بتارہی ہے کہ یہ خلافت اللہ تعالی کی ایک نعمت تھی جو امت مسلمہ کو عطا فرمائی گئی تھی ۔ شیعہ اس آیت کی (معاذ اللہ) تکذیب و تغلیط کرنا چاہتے ہیں اور قرآن مجید جس چیز کو نعمت بتارہا ہے اسے معاذ اللہ نقمت و معیبت ظاہر کرنا چاہتے

ہیں ۔ قرآن مجید اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی دشمنی اور دین اسلام کی عداوت کی وجہ سے یہ گروہ ان مبارک قرون اور ان ادوار کے اہل ایمان کے دشمن ہوگئے ۔ اور اس نے بدنام کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی پوری کوشش کی ۔ کاش ہمارے وہ سنی تاریخ نگار اور علماء جو ان ادوار کی تاریخ اور اس کے ممتاز رجال کے کردار کے بارے میں شیعوں کی آواز میں آواز ملاتے ہیں ' اور ان کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں ۔ امیر یزید یا کسی اور اموی یا عباسی خلیفہ یا ان کے عمال کی توہین و تذلیل کرنے میں ان کی ترجمانی اور ہم آہنگی کرتے ہیں" اس واضح نکتے سے واقف ہوجائیں کہ وہ شیعوں کے ہم نوا ہوکر غیر شعوری طور پر قرآن و حدیث کی مخالفت اور نبی معصوم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تخطیہ کرتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ وہ کیا کررہے ہیں اور صراط مستقیم سے کتنی دور جاپڑے ہیں ' انہیں اپنی روش سے توبہ کرنا چاہئے۔ اور چند صدی بیشتر جن سنی علماء و مورخین نے اس " تبرا " میں حصہ لیا ہے ان کے اس فعل کو ان کی نا دانستہ غلطی ' اور غلط فہمی پر محمول کرکے ان کے لئے دعا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف فرمائے ۔ اور ان سے اس کا مواخذہ نہ فرمائے ۔ ان حضرات کی کورانہ تقلید کرکے دیدہ و دانستہ اس معصیت پر اصرار کرنا اور ان بزرگوں کے اقوال کو بطور سند پیش کرنا نہ شرعاً جائز ہے اور نہ عقلاً و اخلاقاً ۔

جمہور متقدمین علماء کرام و فقہاء عظام کی شہادت

تیسری صدی ہجری ' یا اس سے پہلے جو علماء دین رہبر و رہنما رہے ہیں وہ بالاتفاق بنوامیہ کے دور خلافت کو اسلامی دور ان کے نظام کو اسلامی نظام ' اور ان خلفاء نیز ان کے عمال کو ثقہ ' عادل ' فقیہ ' و متقی سمجھتے تھے ۔ ان کی یہ رائے جو ان کے مشاہدے یا خبر متواتر پر مبنی تھی ۔ ان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے ۔ اور تواتر التزامی کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے ۔ اس لئے ہم اموی دور خلافت کو مبارک ' درخشاں ' اسلامی ' عادلانہ اور اسلامی نظام حکومت کا قابل تقلید نمونہ سمجھنے اور اس کا یقین رکھنے میں حق بجانب ہیں ۔ اسی طرح ہم یہ سمجھنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ شیعی اور شیعیت نواز مورخین ' یا نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریض ' سنی تاریخ نگاروں نے ان خلفاء ' صالحین اور ان کے مبارک ادوار کے خلاف جو کچھ لکھا ہے ' اور ان کی توہین و تنقیص کے لئے جو روایتیں بیان کی ہیں وہ حقیقت سے دور ' خلاف واقعہ ' من گھڑت اور دروغ محض ہیں' وہ

درحقیقت شیعوں نیز خاندانی تعصب کے مریض سنی نما شیعوں اور یہود کی وضع کی ہوئی کہانیاں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ۔

علماء متقدمین کی اس پاکیزہ رائے کو علماء متاخرین بھی برابر صحیح تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اور آج تک تسلیم کی جاتی ہے ۔

جمہور اہلسنت کو جو اپنی تاریخ کی خوبی ' رفعت ' اور تابناکی ' کا یقین اور اس پر فخر ہے ۔ جو تواتر نفسی کے طریقہ سے چودہ سو برس سے ہر قرن میں منتقل ہوتا ہوا ' دور موجودہ تک پہنچا ہے ۔ جس کا تفصیلی تذکرہ ہم چند صفحات پیشتر کرچکے ہیں ۔ اس کا ایک سبب علماء عظام کی مذکورہ بالا رائے بھی ہے ۔ جس سے عام مسلمان بھی بے خبر نہیں ہیں ۔ کیونکہ وہ تواتر التزامی کے طریقے سے بواسطہ خواص ان تک پہنچی ہے ۔

اموی دور خلافت کی ابتداء امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت سے سمجھی جاتی ہے ۔ ان کے عہد خلافت سے دمشق کی اموی خلافت کے خاتمہ تک جو نظام حکومت رہا ' اور خلفاء اور ان کے قضاۃ و عمال نے جو فیصلے کئے یا فتوے دیئے ' اور نئے پیش آنے والے مسائل کے جو شرعی حل نکالے ان کو متقدمین فقہاء ملت و حکماء امت نے اہم اور وزنی قرار دیا ہے ۔ اور ان سے حسب موقع استشہاد کرکے انہیں فقہی و قانونی نظائر اور فتاویٰ کا درجہ دیا ہے ۔ اسی طرح خلفاء کے ادوار حکومت کے تعامل کو بھی دلیل اور حکم شرعی کی معرفت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ انہیں کے مطابق فتویٰ دیا ۔ اور حکومت عباسیہ کو ان قوانین و ضوابط کو جاری و نافذ رکھنے کا مشورہ دیا ہے ۔

اموی عہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے شروع ہوتا ہے ۔ حضرت معاویہ ؓ صحابی ہیں ۔ اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔ ان کے قول و عمل سے فقہاء و علماء نے بکثرت استدلال و استناد کیا ہے ۔ خصوصاً فقہاء احناف نے مثلاً امام محمد صاحب رحمہ اللہ اپنی کتاب "السیرالکبیر" میں یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر بیت المال میں اخراجات جہاد کی گنجائش نہ ہو تو اخراجات جہاد و دفاع کے لئے مسلمانوں پر مزید ٹیکس لگانا جائز ہے ۔ اور دلیل میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ آں محترم نے اپنے زمانہ خلافت میں ٹیکس لگایا تھا ۔ شرعی نقطہ نظر سے مسلمانوں پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ بہت اہم ہے ۔ مگر اس ٹیکس کے جواز کے لئے امام محمدؒ حضرت معاویہ ؓ کے عمل سے استدلال کافی سمجھتے ہیں ۔ کتب فقہ اور شروح حدیث میں ان کے قول و عمل سے

استدلال کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں ۔ ایک مسئلہ کا تذکرہ ہم نے بطور مثال کردیا ۔ ورنہ ان کے دور خلافت کے مبارک و مستحسن ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ۔ کیونکہ وہ صحابی اور خلیفہ راشد ہیں ۔ اور صحابہ کی عدالت وثقاہت اور ان کا راشد و ہدایت یافتہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے ۔ اور ان کا مقبول عنداللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم ان کے بعد کے ادوار خلافت اسلامیہ کے متعلق علماء کرام ' و فقہاء ومحدثین عظام کے طرز عمل کو سامنے لائیں گے۔

امام یوسف رحمہ اللہ کی جلالت شان کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ۔ اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں مفتوحہ ممالک میں کفار محاربین کی متروکہ آراضی کے بارے میں امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ کے ایک سوال کا جواب دینے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"فھذا سبیل القطائع عندی فی ارض العراق والذی صنع الحجاج ثم فعل عمر بن عبد العزیز فان عمر رضی اللہ عنہ اخذ بذلک بالسنۃ فان من اقطعہ الولاۃ المھدیون فلیس لاحد ان یرد ذلک" (۱)

"پس ارض عراق میں زمینداریوں کے بارے میں میرے نزدیک یہ حکم ہے اور یہ وہی ہے جو حجاج نے کیا تھا پھر عمر بن عبدالعزیز نے بھی وہی کیا ۔ بیشک عمر بن عبدالعزیز نے (اللہ ان سے راضی ہو) سنت کے مطابق عمل کیا ۔ کیونکہ جب کسی کو (کوئی قطعہ زمین) ہدایت یافتہ والی عطا کردے تو کسی کے لئے اسے واپس لینا جائز نہیں۔"

امام یوسف" ' حجاج" کے عمل سے استدلال فرمارہے ہیں ۔ کیا کسی ظالم و جابر کے عمل کو بطور نظیر پیش کرکے اس کی پیروی کی تلقین کی جاسکتی ہے ؟ پھر بتاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے حجاج کے عمل کی پیروی کی اور " اقطاع " کے بارے میں ان کے حکم و فیصلے کو برقرار رکھا اور خود بھی وہی حکم دیا یہی نہیں بلکہ حجاج اور دوسرے اموی عمال وولاۃ کو " مہدی " ۔

یعنی ہدایت یافتہ کہتے ہیں ۔ گویا ان کے عام طرز عمل کی تحسین و تقویت اور اس کے مطابق شریعت ہونے کی تصدیق و توثیق کرکے اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں نیز امیر المومنین ہارون الرشید" کو ان کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں ۔

---

(۱) کتاب الخراج فصل فی ذکر القطائع ص ٦٣

خلافت بنی امیہ کے متعلق امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے تنہا ان کی رائے نہ تھی۔ بلکہ اس دور میں جملہ فقہاء و محدثین و علماء اعلام کی رائے تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے فتوے پر امیرالمومنین ہارون الرشیدؒ نے عمل کیا، اور کسی عالم دین نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ فتویٰ فقہ اسلامی کا جزو بن گیا۔ اور کتب فقہ کے ہزاروں نسخوں میں مندرج ہوا، علماء ہر زمانہ میں اسے پڑھتے پڑھاتے رہے، اور آج بھی ان مسائل کی تعلیم جاری ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خلافت بنی امیہ کی مذکورہ بالا تحسین و ستائش جمہور علماء اہلسنت کی رائے ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہے اور جس کی ابتداء مشاہدے سے ہوئی۔ فقہ حنفی کی تدوین، عہد بنی امیہ میں ہوئی تھی۔ امام ابو یوسفؒ اسی دور میں امام فقہ بنے تھے۔ خلافت اسلامیہ کے اس تابندہ دور کا خود انہوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے وہ "کتاب الخراج" میں جو مالیات، و انتظامیات ودستور وغیرہ کے مسائل بیان کرتے ہیں اور جو فتوے دیئے ہیں، ان میں عہد بنی امیہ کے تعامل کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوئی ہے وہاں صراحت کے ساتھ اس کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اوپر گزری دوسری مثال ملاحظہ ہو:۔

امام ابو یوسفؒ یہ مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر اہل کتاب سے شرائط صلح میں یہ بات طے پائی ہو کہ ان کے گرجا، اور بیعے باقی رہیں گے۔ تو قبضہ کے بعد انہیں منہدم کرنا جائز نہیں۔ اس فتوے پر عہد خلافت بنی امیہ کے ایک واقعہ، اور اس پر اس دور کے علماء کے فتوے، اور اس فتوے پر اموی حکومت کے عمل سے استدلال کرتے ہیں:۔

"وقد كان نظر في ذلك غير واحد من الخلفاء الماضين وهموا بهدم البيع والكنائس التي في المدن والامصار فاخرج اهل المدن الكتب التي جرى الصلح فيها بين المسلمين وبينهم ورد عليهم الفقهاء والتابعون ذلك وعابوه عليهم فكفوه عما ارادوا من ذلك" (۱)

"ایک سے زیادہ گزشتہ خلفاء نے اس مسئلے پر نظر ثانی کی تھی اور شہروں اور بستیوں میں تعمیر شدہ بیعوں (یہود کی عبادت گاہیں) اور کنیسوں (گرجے) کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو ان شہر والوں (یہود اور مسیحیوں) نے وہ مکتوبات نکال کر دکھائے جن میں وہ صلح نامہ درج تھا، جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اور فقہاء و تابعین نے (ان خلفاء کو عمارات مذکورہ منہدم

---

(۱) کتاب الخراج زیر عنوان "فصل في البيع والكنائس [illegible]" ص ۱۵۹

کرنے سے) منع کیا اور اسے معیوب قرار دیا
پس (یہ خلفاء) اپنے اس ارادے سے باز
آئے ۔ (یعنی ان عمارات کو منہدم کرنے
سے باز آگئے)"

یہود و نصاریٰ اپنی ان عبادت گاہوں کو اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ انہیں عمارتوں میں بیٹھ کر شیعہ اسلام و خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کے لئے یہود و نصاریٰ سے گٹھ جوڑ کرکے اپنے ناپاک منصوبے بناتے تھے۔ ان مفاسد پر نظر کرکے ان خلفاء اسلام نے انہیں منہدم کرنے کا ارادہ فرمایا ہوگا۔ (۱) مگر چونکہ یہ معاہدے کی خلاف ورزی تھی اس لئے فقہاء نے اس سے روکا ۔ اور یہ حضرات خلفاء باوجودیکہ خود فقہاء مجتہدین تھے، مگر انہوں نے جمہور علماء کی اتباع کی اور اپنا ارادہ ترک کردیا ۔ یہ ان کے متقی خدا ترس، اور متبع شریعت ہونے کی ایک روشن دلیل ہے ۔

دوسری طرف اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے علماء دین اپنے فریضہ احتساب حکومت سے غافل نہیں رہتے تھے ۔ اور حسبۃً اسے انجام دیتے رہتے تھے۔ نیز اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال رحمھم اللہ کی نظر میں علماء دین و فقہاء ملت کی کیسی عظمت وقعت تھی ۔ اور حکومت و عوام مسلمین پر علماء دین کا کتنا اثر تھا۔

خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال و معاونین کے متعلق امام ابو یوسف" کی جو تحسین آفرین رائے ظاہر ہورہی ہے وہ تنہا ان کی رائے نہیں ہے بلکہ ان دور بلکہ ان سے پہلے کے ادوار کے جملہ علماء و فقہاء کی رائے تھی، جس کی وضاحت ہم کرچکے ہیں ۔

امام مالک رحمہ اللہ کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی رفعت و عظمت معروف و مشہور ہے ۔ ان کی کتاب موطا کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں :-

"حدثنی مالک عن ابن شہاب ان عبد الملک بن مروان قضی فی امراۃ اصیبت مستکرھۃ بصداقتھا علی من فعل ذلک بھا" (۱)

---

(۱) اگر بالفرض یہ مفاسد نہیں تھے تو بھی کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔ مگر حکم شریعت کے مقابلے میں یہ صالح اور متقی خلفاء اس سے دستبردار ہوگئے ۔

(۱) موطا امام مالک باب المستکرھۃ من النساء

" امام مالک" ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ (امیر المومنین) عبدالملک نے ایک عورت کے بارے میں جس سے زنا بالجبر کیا گیا تھا' یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس نے جبرا اس کی عصمت دری کی ہے' وہ اس کا مہرادا کرے "

ملاحظہ ہو ۔ امام مالک" کے ایسے جلیل القدر امام مجتہد اور فقیہ لبیب امیر المومنین عبدالملک" اموی کے فیصلے کو نظیر کا درجہ دے رہے ہیں ۔ اور اسی کے مطابق فتوے دیتے ہیں ۔ موطا میں امیر المومنین عبدالملک" کے فیصلے سے کتاب المکاتب اور کتاب العقول میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ امام مالک" خلیفتہ المسلمین عبدالملک" سے کس قدر حسن ظن رکھتے تھے ۔ اگر انہیں خلیفہ عادل فقیہ مجتہد' متقی متورع نہ سمجھتے تو ان کے فیصلے سے استدلال کیسے کرتے ؟ کیا کسی ظالم کے فیصلے اور فتوے کو بھی دلیل بنایا جاسکتا ہے ؟

امام قاضی ابو عبید قاسم بن سلام البغدادی الفقیہ (متوفی ۲۲۴ ھ) مشہور فقیہ و محدث ہیں۔ ایک مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے۔ اسحاق بن راھویہ رحمہ اللہ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں" اپنی مشہور کتاب "الاموال" میں لکھتے ہیں:

"حدثنی نعیم بن حماد عن ضمرة بن ربیعۃ عن رجاء بن ابی سلمۃ ان فلانا ذکر رجلا من خلفاء بنی امیۃ اقطع سعید بن عبد الملک نہرہ الذی علی الفرات' وکان غیضۃ فیھا سباع فاعطاھا ایاہ فعمرھا' فھی نہر سعید" (۱)

"مجھ سے نعیم بن حماد نے ضمرہ بن ربیعہ کے واسطے سے رجاء بن ابی سلمہ کی یہ روایت بیان کی کہ فلاں شخص یعنی خلفاء بنی امیہ کے ایک خلیفہ نے سعید بن عبدالملک کو وہ زمین بطور اقطاع (جاگیر) دی تھی' جس پر انہوں نے فرات سے نہر نکالی ۔ وہاں پہلے جنگل تھا جس میں درندے رہتے تھے ۔ (ان خلیفہ نے) انہیں یہ زمین عطا کی اور انہوں نے نہر نکال کر اسے آباد کیا ۔ اسی لئے اس نہر کا نام نہر سعید ہے ۔

پھر ایک دو سطروں کے بعد عمر بن عبدالعزیز" کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح "اقطاع" کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "رجلا من خلفاء بنی امیۃ" سے مراد عمر عبدالعزیز" نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ کوئی دوسرے اموی خلیفہ ہیں۔ پھر ان کا نام لئے بغیر

(۱) الاموال لابی عبید قاسم بن سلام زیر عنوان " اقطاع احد ۔ خلفاء بنی امیہ ۔ سعید بن عبدالملک " ص ۲۸۴ مطبوعہ مصر۔

ان کے عمل سے استدلال کے کیا معنی ؟ اس کی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے اور یہی صحیح ہے کہ مصنف اور اس دور کے جمہور علماء اہلسنّت کے نزدیک سب خلفاء بنی امیہ ثقہ ' عادل ' فقیہ اور قابل اعتماد تھے ' اس لئے نام لینے کی ضرورت نہ تھی ۔ رجاء بن ابی سلمہ نے ان کا نام لیا تھا مگر نعیم بن حماد کو یاد نہیں رہا ۔ اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوئی ۔

زیاد بن ابی سفیانؓ مرحوم پر شیعہ اور شیعیت نواز (بقول ایک بزرگ " گلابی شیعہ ") طعن و تشنیع کی بوچھار کرتے رہتے ہیں ۔ لیکن امام شاطبیؒ ان کے ایک عمل سے استشہاد کرتے ہیں ۔ موصوف اپنی مشہور و مقبول ' بلند پایہ تصنیف "الموافقات" میں سد ذرائع سے بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"وقد عول العلماء على هذا المعنى وجعلوه اصلا يطرو ومدارج الى سد الذرائع"

علماء نے اس معنی پر اعتماد کیا ہے اور اسے ایک مطرد قاعدہ اور سد ذرائع کے مقصد تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنالیا ہے'

پھر اسی سلسلہ میں چند سطروں کے بعد اس کی مثالوں کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

"وراعى زياد مثل هذا فى صلاة الناس فى جامع البصرة والكوفة فانهم اذا صلوا فى صحنه ورفعوا من السجود مسحوا جباههم من التراب فامر بالقاء الحصى فى صحن المسجد وقال: لست امن ان يطول الزمان فيظن الصغير اذا انشا ان مسح الجبهة من اثر السجود سنة فى الصلاة" (۱)

"زیاد نے جامع بصرہ و جامع کوفہ کے نمازیوں کے بارے میں اس اصول کی رعایت کی واقعہ یہ ہوا کہ لوگ جب ان مسجدوں کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو نماز سے فراغت کے بعد اپنی پیشانیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے ۔ یہ دیکھ کر زیاد نے صحن مسجد میں بجری بچھانے کا حکم دیا اس کی وجہ یہ بیان کی کہ کہیں نئی نسل کے بچے نماز کے بعد پیشانی پر مسح کو بھی سنت صلوٰۃ نہ سمجھ لیں"۔

امام شاطبی رحمہ اللہ کے ایسے جلیل القدر عالم دین اور محقق فقیہ کے اس بیان سے ایک طرف تو زیاد مرحوم کا تفقہ اور ان کی دینی بصیرت ' نیز حفاظت کے لئے ان کا اہتمام ظاہر ہورہا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ امام شاطبیؒ اور ان کے دور کے

(۱) الموافقات فى اصول الشريعة للامام ابى اسحاق ابراهيم بن موسى الشاطبى الغرناطى رحمه الله القسم الرابع ج ۳ الفصل الخامس فى البيان والاجمال المسئلة السادسة

علماء و فقہاء کے نزدیک ان کی گورنری کا دور عدل و تقویٰ کا دور تھا جس میں شریعت کے نفاذ کے ساتھ ایسے بدعات اور کمی بیشی سے محفوظ رکھنے کا اہتمام عمال حکومت بھی کرتے تھے۔ اسی لئے وہ ان کے فعل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں ۔ جو ایک درجہ میں دلیل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

واضح رہے کہ اسے صرف امام شاطبیؒ کی رائے نہیں کہا جاسکتا۔ موصوف زیاد کا عمل مذکور سد ذرائع کی مثال اور اس اصول پر مبنی احکام کے لئے ایک نظیر و دلیل کے طور پر پیش کررہے ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے زمانہ کے جمہور علماء و فقہاء زیاد مرحوم کو معتمد علیہ ' صالح ' عادل ' قابل اتباع اور ان کے دور کو عادلانہ دور سمجھتے تھے ' ورنہ امام شاطبی رحمہ اللہ ان کے فعل سے استدلال نہ کرتے ۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی اس مقام پر نہ کرتے ۔ کسی کی مدح و ستائش تو آدمی اپنی انفرادی رائے کی بناء پر ذکر کرسکتا ہے مگر کسی کے عمل کو بطور دلیل اور قابل اتباع نظیر اس وقت تک نہیں پیش کرسکتا ' جب تک وہ دوسروں کو بھی تسلیم نہ ہو ۔ اس سے عیاں ہے کہ اس وقت کے جمہور علماء و فقہاء اہلسنت زیاد مرحوم اور ان کے دور ولایت کے متعلق یہ حسن ظن رکھتے تھے ۔

"الاموال" میں (جس کا تذکرہ اوپر ہوچکا ہے) جو اسلامی مالیات(FINANCE) پر بہت بلند پایہ تصنیف ہے ۔ علامہ ابو عبیدؒ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اہل قبرص سے حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں صلح ہوگئی تھی ۔

خلافت عباسیہ کے زمانہ میں جب عبدالملک بن صالح مرحوم قبرص کے والی ہوئے تو اہل قبرص سے بعض ایسے افعال سرزد ہوئے جن کے متعلق والی موصوف کی رائے یہ تھی کہ یہ عہد شکنی اور غدر ہے ۔ شرائط صلح میں یہ دفعہ بھی تھی کہ بصورت بدعہدی حکومت اسلامیہ انھیں جلا وطن کرسکتی ہے ۔ موصوف نے بربناء احتیاط اپنی رائے کی بناء پر کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس دور کے ائمہ فقہ سے اس بارے میں استفسار کیا اور مندرجہ ذیل اکابر حضرات فقہاء نے اس کا جواب دیا ' لیث بن سعد ' مالک بن انس ' سفیان بن عیینہ ' موسی بن اعین ' اسماعیل بن عیاش ' یحیی بن حمزہ ' ابو اسحاق فزاری ' مخلد بن حسین رحمھم اللہ ۔ ان میں سے بعض نے تو اہل قبرص کے افعال کو نقض عہد کہا اور ان کے خلاف کاروائی کو جائز قرار دیا ۔ اور بعض نے لکھا کہ یہ مخصوص افراد کے افعال ہیں ۔ پوری قوم کے نہیں ہیں ۔ اس لئے قوم کی طرف سے نقض عہد میں شمار نہ ہوں گے ۔ اور ان کی بناء پر پورے گروہ کے خلاف کاروائی کرنا جائز نہیں یہ سب جوابات تلخیص و اختصار کے

ساتھ علامہ ابو عبید" نے نقل کئے ہیں۔ منجملہ ان کے اسماعیل بن عیاش" کا جواب بھی ہے۔ انہوں نے افعال مشارالیہا کو نقض عہد نہیں قرار دیا۔
وہ اصولی دلیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

"وانی اری ان یقروا علی عھدھم وذمتھم' فان الولید بن یزید قد کان اجلاھم الی الشام فاستفظع ذلک واستعظمہ فقہاء المسلمین فلما ولی یزید بن الولید ردھم الی قبرس فاستحسن المسلمون ذلک وراوہ عدلا" (۱)

"اور میری رائے یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل قبرص) اپنے عہد و ذمہ پر باقی رکھے جائیں' ولید بن یزید (خلیفہ) نے انہیں شام کی طرف جلاوطن کردیا تھا ۔ فقہاء اسلام کو یہ بات بہت ناگوار اور گراں گزری ۔ امیر المومنین یزید بن الولید خلیفہ ہوئے تو انہیں شام سے قبرص بلالیا ۔ جمہور اہل اسلام نے خلیفتہ المسلمین کے اس فعل کو مستحسن اور پسندیدہ اور قرین عدل و انصاف قرار دیا" ۔

ملاحظہ ہو کہ اسماعیل بن عیاش رحمہ اللہ ایک فقیہ مجتہد اموی خلیفہ امیرالمومنین یزید بن الولید" کے عمل سے استشہاد و استدلال کررہے ہیں اور اسے نقل کرکے علامہ ابو عبید" بھی اس کی تائید کررہے ہیں ۔ یہ بھی دکھارہے ہیں کہ ان خلفاء بنی امیہ کے دور سعید میں علماء وفقہاء آنکھیں بند کرکے نہیں بیٹھے رہتے تھے ۔ عوام اور حکومت کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور مجتہد فیہ امور میں بھی جس بات کو غلط سمجھتے تھے اس پر ٹوکتے تھے' یا کم از کم اس سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے تھے ۔ نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی دور میں بھی عمال انتظامی و سیاسی امور میں کس قدر متقی' محتاط اور متبع شریعت تھے ۔ عبدالملک بن صالح مرحوم کا مذکورہ بالا طرز عمل اس کا ایک نمونہ ہے ۔

ان کبار علماء و فقہاء محدثین عارفین کتاب و سنت کے منقولہ بالا گرانقدر آراء و بیانات جو بحیثیت مجموعی تواتر التزامی کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں ۔ اثبات مدعا کے لئے کافی و وافی ہیں ۔ ان حضرات میں سے بعض تو وہ ہیں جنہوں نے عباسی دور کے ساتھ اموی دور بھی دیکھا تھا ۔ اور بعض نے صرف عباسی دور دیکھا تھا لیکن اموی دور کی کیفیت کی اطلاع انہیں یقین پیدا کرنے والے ذرائع سے ملی تھی ۔ اس لئے ان کے اقوال و آراء بہت وزنی

(۱) "الاموال" لابی عبید" نمبر ۴۷۲ ص ۱۷۳

ہیں ۔ انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اس واقعہ پر بھی غور کریں کہ اس زمانہ کے مقبول ترین فقہاء و مجتہدین امام ابو حنیفہ و امام مالک رحمھما اللہ کے فقہ کا اہم ترین مأخذ قرآن مجید کے بعد تعامل صحابہؓ ہے ۔ خصوصاً سیاسی ' مالی اور معاشی مسائل میں تو ان کے فقہ میں تعامل کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اموی دور خلافت میں اگر تعامل صحابہؓ باقی نہیں رہا تھا بلکہ معاشرہ بدل گیا تھا اور ظلم و جور کا دور دورہ ہو گیا تھا ' جیسا شیعہ اور شیعہ نواز کہتے ہیں ' تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تعامل صحابہؓ ان حضرات تک تواتر کے ساتھ نہیں پہنچا ۔ پھر اس تعامل سے ان حضرات کا استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے ؟ اگر ان حضرات کا فقہ قابل اعتماد ہے اور یقیناً قابل اعتماد ہے تو ماننا پڑے گا کہ اموی دور بھی دور صحابہؓ کے مطابق اور اس کا آئینہ دار تھا ۔ اور اس پر جو الزام لگائے جاتے ہیں وہ قطعاً غلط ہیں ۔

قاری کو یہ روشن حقیقت بھی ذہن میں مستحضر کر لینا چاہئے کہ منقولہ بالا آراء و خیالات ان علماء کبار کے انفرادی آراء نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے دور کے جمہور علماء اہلسنّت کے آراء ہیں ۔ اگر یہ جمہور علماء اہلسنّت کی متفقہ رائے نہ ہوتی اور جمہور علماء اہلسنّت بنی امیہ و بنی عباسؓ کے متعلق وہی حسن ظن نہ رکھتے ہوتے ' جو علماء و ائمہ مذکور ان کے ساتھ رکھتے تھے ۔ یا ان ادوار خلافت کی خوبیاں اور برکتیں قطعی و یقینی طریق سے منقول نہ ہوتیں ' تو ان کے تعامل اور قضایا کو نظائر بنا کر انہیں ملکی قانون کا درجہ کبھی نہ دیا جاتا ۔ جمہور علماء اس طرز عمل سے یقیناً اختلاف کرتے اور ان پر عملدرآمد نہ کرتے ۔ نیز انہیں اپنے تصانیف و تالیفات میں کبھی نہ لکھتے ۔ حالانکہ یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ علماء مذکور کے دور کے بعد کے دور میں انہیں ملکی قوانین کا درجہ حاصل رہا ۔ اور برابر ان پر عملدرآمد ہوتا رہا ۔ نیز یہ مسائل و احکام آج تک کتب فقہ میں درج ہیں اور جمہور علماء اہلسنّت ان کی تصویب کے ساتھ درس و تدریس افتاء و تصنیف و تالیف کے ذریعہ ان کی تعلیم ' ترویج اور تبلیغ کرتے رہتے ہیں ۔ اور ان کا مجموعہ تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے ۔ اگر جمہور اہلسنّت کے اس طرز عمل کو ہم مستحسن اور متواتر سمجھتے ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اموی اور عباسی دور کے علماء و فقہاء اموی دور خلافت کو بہت اچھا مبارک اور قابل تقلید دور سمجھتے تھے ۔ ان کی رائے میں وہ دور صحیح معنی میں خلافت اسلامیہ کا دور تھا جس میں شریعت مقدسہ اسلامیہ نافذ تھی ۔ حکومت اور عوام سب شرعی قوانین کے پابند تھے ۔ اموی اور عباسی ادوار خلافت کے بارے میں ان ادوار کے علماء کبار اور فقہاء

محدثین صالحین وائمہ مجتہدین کے آراء و افکار جن سے ان ادوار کی تحسین و ستائش، ظاہر ہوتی ہے، بکثرت ہیں ۔ مگر بغرض اختصار ہم مندرجہ بالا آراء و اقوال فقہاء کرام و علماء عظام نقل کرنے کے بعد صرف امام اوزاعیؒ کی رائے اور ان کے طرز عمل کا تذکرہ کر کے اس بحث کو ختم کردیں گے ۔ موصوف کا اسم گرامی عبدالرحمٰن بن عمرو بن **یحمد (بضم یا و سکون حاو کسرمیم)** ہے امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ان کے قبیلے کے ایک بطن کی طرف نسبت ہے جو اوزاع کے نام سے موسوم تھا ۔ اصلاً یمنی اور قحطانی عرب ہیں ۔ ان کی جلالت شان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مجتہد کبیر اور اپنے زمانہ کے امام اعظم ہیں ۔ یہ دمشق میں مقیم تھے مگر ان کا فقہ شام سے نکل کر اندلس تک پہنچا اور دور دور اس پر عمل ہوتا رہا ۔ خلافت اندلس ختم ہوگئی اور مسلمان وہاں سے بے دخل کردیئے گئے ۔ لیکن عجب نہیں کہ شام میں آج بھی ان کے مقلدین، اور پیرو موجود ہوں ۔ ان کے معاصر، ان کے بعد کے فقہاء و مجتہدین، اور علماء و ربانیین، ان کے ثنا خواں ہیں۔ امام شافعیؒ تو ان کی مدح و ستائش کے ساتھ ان کے فتاویٰ و اقوال سے استدلال بھی کرتے ہیں فقہ شافعیؒ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس میں فقہ اوزاعیؒ کا ایک معتدبہ حصہ شامل ہے ۔

موصوف نے عہد بنی امیہ بھی دیکھا ہے ۔ اور عہد عباسی بھی ۔ بنو عباس نے ان کے سامنے اموی خلافت کے خلاف خروج کیا، اور کامیاب ہوئے ۔ امیرالمومنین منصورؒ کا زمانہ انہوں نے پایا ہے ۔ یہ واقعہ بھی مشہور و معروف ہے اور کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ یہ خلافت بنی امیہ کے پرجوش حامی تھے ۔ اس کی مدح و ستائش کرتے تھے اور اس کے خلاف عباسیوں کے خروج کو علی الاعلان ناجائز اور بغاوت کہتے تھے ۔ لیکن جب عباسی غالب ہوگئے اور انکی خلافت جمہور اہل اسلام نے تسلیم کرلی تو امام اوزاعیؒ نے بھی ان کی خلافت تسلیم کرلی اور ان کی مخالفت ترک کردی ۔ الاستاذ عبدالعزیز مصری لکھتے ہیں :۔

" کان فی الاوزاعی میل للامویین کشان کثیر من فقهاء الشام و اهلها فلما زالوا حزن من اجلهم، ولکنه امسک عن الکلام فی العباسیین منذان تبینت طلائع دولتهم ثم ما لبث ان سایرهم،

" امام اوزاعی کا میلان بنی امیہ کی جانب تھا، جیسا کہ عام طور پر فقہاء شام اور اہل شام کا طرز رہا ہے ۔ او رجب ان کی خلافت کو زوال ہوگیا تو ان کے زوال سے وہ (امام اوزاعی) رنجیدہ ہوئے۔ مگر جب عباسیوں کی حکومت قائم ہوگئی تو انہوں نے (امام اوزاعی

واستقضى حاجته من بعض امرائهم، ثم اتصلت بينه و بين داؤد بن علي مودة و صحبة (۱)

نے) ان کے (عباسیوں کے) خلاف گفتگو کرنا چھوڑ دی۔ اور ان کا ساتھ دینے لگے۔ اور ان کے بعض افراد سے اپنی بعض ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بھی کہتے تھے پھر ان سے اور داؤ بن علی سے دوستانہ تعلقات ہو گئے۔"

امام اوزاعیؒ اموی خلافت کے مداح تھے۔ اور جب تک یہ خلافت باقی رہی اسکے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ لیکن جب عباسی غالب آگئے اور عباسی خلافت قائم ہوگئی تو انہوں نے حکم شرعی کے مطابق اس کے ساتھ تعاون کیا اور عمر بھر اس کے خیر خواہ رہے۔ خلفاء و حکام عباسیہ سے ان کے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ وہ ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے امراء و حکام سے ان کی سفارش کردیتے تھے۔ اور ان کی سفارش منظور کی جاتی تھی۔ مصنف موصوف منقولہ بالا سطور کے بعد لکھتے ہیںؒ:-

" و كثيرا ما كتب الاوزاعي الى امراء العباسية و ولاتها يستشفع لديهم لقضاء حاجات الناس فكانوا يقضونها و قد كثر ذلك منه لدى ايام ابي جعفر المنصور" (۲)

"امام اوزاعی بسا اوقات عباسی امراء کو اہل حاجت کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سفارشی خط لکھ دیا کرتے تھے۔ اور وہ (امراء) ان کی ضرورتیں پوری کردیا کرتے تھے۔ یہ سفارشیں زیادہ تر انہوں نے ابو جعفر منصورؒ کے عہد خلافت میں کیں۔"

حکومت بنو امیہ کی حمایت و ستائش اور اس کے ساتھ تعاون فی الخیر صرف امام اوزاعیؒ کا طریقہ نہیں تھا بلکہ سب فقہاء شام کا طرز عمل یہی تھا۔ منقولہ بالا عبارت کے اول الذکر حصے میں اس کی صراحت موجود ہے۔ پھر جب عباسی خلافت کو استقلال حاصل ہوگیا تو ان کے ساتھ علماء شام کا طرز عمل وہی رہا جو امام اوزاعیؒ کا تھا۔ اور جو حکم شرعی کا تقاضا تھا۔

اموی خلافت کے خلاف جب بنو عباس نے خروج کیا تو امام اوزاعی نے خلافت بنی امیہ کی اس قدر پرجوش حمایت کی کہ عباسیوں کی فتحیابی کے بعد انہیں خطرہ ہوا کہ کہیں

(۱) الامام الاوزاعی فقیہ اہل الشام تالیف الاستاذ عبدالعزیز سید الاہل طبع ۱۳۸۶ھ - ۱۹۶۶ء ۱۵۳ - ناشر لجنۃ التعریف (۲) ص ۱۵۹

انہیں بنی امیہ کا سرگرم حامی سمجھ کر عباسی حکومت اس کی سزا نہ دے۔ یہاں تک کہ سزائے موت کا بھی امکان ان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے حق کہنے سے گریز نہیں کیا۔ چنانچہ جب عباسی والی نے انہیں بلایا اور ان سے پوچھا کہ بنی امیہ سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ مطلب یہ تھا کہ ہم نے ان کے خلاف جو خروج کیا وہ آپ کے نزدیک جائز تھا یا نہیں؟۔ اس کے جواب میں امام اوزاعی نے صاف صاف کہا:۔

"قد کانت بینک وبینهم عهود وکان الا جدر ان تفوا بها" (۱)

"تمہارے اور ان کے درمیان معاہدے تھے، اور مناسب یہی تھا کہ تم ان کی پابندی کرتے"۔ مطلب یہ تھا کہ خلافت بنی امیہ کے خلاف تمہارا خروج کرنا خلاف شریعت اور ناجائز تھا۔ انہوں نے عباسیوں کی غلطی کی نشاندہی کردی لیکن چونکہ عباسی خلافت منعقد ہوچکی تھی اور اموی خلافت کی بقاء یا عود کا بظاہر کوئی امکان نہیں باقی رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کی خلافت تسلیم کرلی اور ان کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا جو بنی امیہ کے ساتھ اختیار کیا تھا، یعنی جب ان کی خلافت مستحکم ہوگئی۔ اور جمہور مسلمین نے اسے قبول کرلیا تو انہوں نے بھی اسے قبول کرلیا۔ اور اس کے مطیع و خیر خواہ رہے۔ اور انہوں نے کبھی عباسی خلیفہ اور ان کی خلافت کی کوئی مخالفت یا مذمت نہیں کی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے بھی پسند کرتے تھے۔

خلیفۃ المسلمین منصور عباسیؒ سے امام اوزاعیؒ کی ملاقات بھی ہوئی اور دونوں کے درمیان مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ منصور نے ان کی سابق مخالفت کو قطعاً نظرانداز کردیا اور ان کا بہت اکرام کیا او رجب تک وہ زندہ رہے ان کی تعظیم و تکریم کرتے رہے۔ وہ خلیفہ اور ان کے عمال کو نصیحت بھی کرتے تھے۔۔ اس کے ساتھ ان کے خیر خواہ اور مطیع بھی تھے، او رانہیں حکومت کا اہل سمجھتے تھے اور ان کی خلافت کو اللہ تعالیٰ کی انعامی خلافت بھی سمجھتے تھے۔

امام اوزاعیؒ کی رائے اور طرز عمل کا تذکرہ ہم نے مخصوص طور پر اس لئے کیا کہ وہ بنو امیہ کے گرم جوش حامی اور مداح تھے۔ پھر امیر المومنین منصورؒ کی خلافت قائم ہوگئی تو اس کے متعلق بھی ان کی رائے اچھی رہی اور وہ اس کے بھی حامی رہے۔ نیز عباسی خلیفہ

(۱) ایضاً نیز ملاحظہ ہو تاریخ بغداد (خطیب)

و عمال کے ساتھ ان کے تعلقات بھی خوشگوار رہے اور وہ ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے ۔ موصوف نے دو دور دیکھے دونوں کی خوبی کے قائل رہے ۔ ان کی شخصیت باعتبار علم و تقویٰ اس قدر اونچی ہے کہ تنہا ان کی رائے اموی خلافت ' اور عباسی خلافت بزمانہ منصور کی خوبی ' و برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ چہ جائیکہ ان کے ساتھ شام کے سب علماء دین تھے ۔ ان کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیرون شام کے بکثرت علماء و فقہاء بھی ان کے موید ہوں گے۔ ان اکابر علماء ربانیین اور فقہاء مجتہدین کے آراء اور طرز عمل سے یہ حقیقت مہر نیمروز کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ خلافت بنو امیہ کا پورا دور عدل و انصاف ' تقویٰ ' اتباع شریعت اور دعوت الی اللہ کا دور تھا ' جو ہر طرح مبارک و مسعود تھا ۔ یہ حقیقت تواتر التزامی سے ثابت اور یقینی ہے ۔ کیونکہ ان علماء و صلحاء کے آراء و اقوال مذکورہ اور ان کا مذکورہ بالا طرز عمل یہ سب امور متواتر ہیں۔ انہیں صحیح تسلیم کرنے سے اس دور کے مبارک و مسعود ہونے کی خبر کو بھی متواتر ماننا پڑتا ہے ۔ اس لئے کہ یہ ان کی تصدیق کے لئے لازم ہے ۔ اور ملزوم کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد لازم کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا ۔ لازم ملزوم سے جدا نہیں ہوتا ' اگر ملزوم متواتر ہے تو لازم بھی متواتر ہے ۔

خلافت عباسیہ کا دور بھی مبارک تھا ۔ اس کا مبارک و مسعود ہونا بھی اسی طرح ثابت ہے ۔ امام ابو حنیفہ ' امام اوزاعی ' امام مالک ' امام ابو یوسف ' امام محمد رحمہم اللہ کی ایسی عظیم شخصیتوں نے خلفاء عباسیہ اور ان کے عمال کے ساتھ تعاون کیا ۔ ان خلفاء نے ان ائمہ فقہ اور دوسرے اکابر علماء کے مشورے سے حسب ضرورت قوانین ملکی مقرر کئے ۔ باوجودیکہ خلافت عباسیہ کی تعمیر خلافت امویہ کے کھنڈر پر کی گئی تھی ' مگر انہوں نے اموی خلفاء کی عظمت و دیانت کا اعتراف کیا اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ' ان کے تعامل کو نظیر سمجھا اور اس کی اتباع کی ۔ عباسی خلفاء کے اس طرز عمل کو ان کے عدل و انصاف ' تقویٰ اور للہیت کی دلیل قرار دینا بالکل صحیح استدلال ہے۔

تاہم ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عباسی دور خلافت بحیثیت مجموعی اموی دور خلافت کی بلندی کو نہیں پہنچتا ۔ دونوں دور مسعود تھے ' اور دونوں کی خلافت موعودہ انعامی خلافت تھی ۔ مگر دونوں کے درمیان درجہ اور مرتبہ سعادت کا فرق کرنا ناگزیر ہے ۔ اس کی وجہ بنی عباسؓ کی ایک غلطی تھی جو آخر کار ان کے زوال کا باعث بنی ۔ انہوں نے شیعوں کے ساتھ اتحاد کیا اور حصول خلافت میں ان سے بھی اعانت حاصل کی۔ اس کی وجہ سے

پیروان ابن سبا کا یہ گروہ کار خلافت میں دخیل ہوگیا۔ شیعہ عمال قصداً ایسے کام کرتے تھے، جن سے نظام خلافت کو نقصان پہنچے۔ سنی عمال اور اہل کاروں کو بھی غلط راستوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ مامون و معتصم پر ان کا جادو زیادہ موثر ہوا۔ انہوں نے ان دونوں کو ورغلا کر اہلسنت خصوصاً حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مخالفت پر ابھارا۔ اس سے خلافت عباسیہ کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ اس حادثہ فاجعہ میں بڑا دخل معتصم کی بیوی کو تھا جو شیعہ تھی۔ امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ نے خلافت کو روافض سے پاک کرنے کی کوشش کی جو ایک حد تک کامیاب بھی ہوئی، مگر پورے طور پر کامیاب نہ ہوسکی۔ ایک مدت کے بعد یہ منافق پھر دخیل ہوگئے۔ اور بالآخر ان دوست نما دشمنان اسلام نے یہود، اور تاتاریوں کے تعاون سے خلافت عباسیہ کو تباہ کرکے چھوڑا۔

مامون و معتصم کے زمانہ میں جو بلا نازل ہوئی وہ درحقیقت جمہور اہل سنت خصوصاً ان کے قائدین کی غلطی کا نتیجہ تھی۔ اگر وہ شیعوں سے میل جول نہ بڑھاتے، اور شیعہ پروری و شیعیت نوازی نہ کرتے تو شیعہ حکومت اسلامیہ میں اس قدر دخیل نہیں ہوسکتے تھے۔ معتصم شیعہ عورت سے شادی کرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مامون خلیفہ نہ ہوتا اگر ہوتا بھی تو پورا سنی ہوتا۔ اور یہ افسوسناک واقعات نہ پیش آتے۔ مامون کے شیعی رجحانات معلوم تھے۔ اور صاف نظر آرہا تھا کہ اگرچہ وہ پورا شیعہ نہیں ہوا ہے مگر شیعی تحریک میں شریک ہوگیا ہے۔ پھر جمہور اہلسنت نے جن میں علماء و صلحاء بھی شامل تھے۔ اسے خلیفہ کیوں بنایا؟ امین کے مقابلے اس کی مدد کیوں کی؟ اگر اس کا تشیع پہلے مخفی تھا تو ظاہر ہونے کے بعد اسے معزول کیوں نہ کیا؟ وہ جب کلیدی مناصب اور اہم خدمات پر شیعوں کو مقرر کررہا تھا تو اس پر نکیر کیوں نہیں کی اور اسے اس سے روکنے کی کوشش میں کیوں کوتاہی کی؟ معتصم کے بارے میں بھی اس وقت کے جمہور اہلسنت پر یہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

جمہور اہل اسلام اور علماء کرام اور قائدین امت کی ان غلطیوں کی وجہ سے خلافت کی برکتوں میں کمی ہوئی اور مامون و معتصم کو اہل سنت کی سربراہی اور ان کے سر پر مسلط ہوکر انہیں اذیت و نقصان پہنچانے کا موقع ملا یہ اپنا ہی کیا ہوا۔ اور جمہور کا قصور تھا۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی مگر پھر بھی یہ کرم ہوا کہ انعام خلافت ضبط نہیں کیا گیا اور اصلاح کا موقع دیا گیا۔ ان واقعات سے جو جمہور اہل سنت کی غلطی کا نتیجہ تھے یہ لازم نہیں آتا کہ عباسی خلافت موعودہ انعامی خلافت نہ تھی وہ یقیناً موعودہ انعامی خلافت تھی۔ جمہور نے جب اس کی ناقدری کی تو اس کی سزا انہیں ملی۔

قرآن و سنت کی روشنی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ ہماری تاریخ بہت قابل تحسین بلند پایہ، اور مثالی تاریخ ہے۔ دور خلافت راشدہ کی عظمت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کے بعد دمشق، بغداد اور اندلس کی خلافتیں بھی بہت قابل تحسین اور مسلمانوں کے لئے قابل فخر ہیں۔ جمہور اہل سنت اور اور جمہور علماء و فقہاء اہل سنت اخبار متواترہ کی بناء پر یہی رائے رکھتے ہیں۔ شیعوں اور شیعیت سے متاثر سنی مورخین نے اسلامی تاریخ پر جو سیاہی پھیرنے کی کوشش کی ہے، کبار علماء اہلسنّت نے جو مورخ بھی تھے پوری قوت سے اس کی تردید کی ہے۔ اور اس تردید کو بہت اہم کام سمجھا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو شیخ عبدالعزیز حنفی رحمہ اللہ اپنی کتاب شرح العقیدۃ الطحاویہ، میں "خلفاء اثنا عشر" کے متعلق حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"وھو ماخر جاہ فی الصحیحین عن جابر بن سمرۃ دخلت مع ابی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسمعتہ یقول "لایزال امرالناس ماضیا ولیھم اثنا عشر رجلاً ثم تکلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکلمۃ خفیت علیّ فسالت ابی ماذا قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال "کلھم من قریش" وفی لفظ : لا یزال الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفۃ" وکان الامر کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم و الاثنا عشر الخلفاء الراشدون الاربعۃ و معاویۃ وابنہ یزید و عبدالملک بن مروان واولادہ الاربعۃ و بینھم

اور وہ (حدیث ہے) جس کی تخریج (بخاری و مسلم نے) صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں حضرت جابرؓ بن سمرہ سے کی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ " لوگوں کا (خلافت کا) کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ان پر بارہ اشخاص حکومت کریں گے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات فرمائی جو مجھ سے مخفی ہوگئی۔ تو میں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ یہ فرمایا تھا کہ "سب کے سب قریش میں سے ہوں گے" ۔ یہ حدیث دوسرے الفاظ میں یوں ہے : " اسلام بارہ خلفاء کی خلافت تک غالب رہے گا " اور وہی واقع بھی ہوا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ

عمر بن عبدالعزیز ثم اخذ الامر فی الا نحلال وعند الرافضة " ان امرا الامة لم یزل فی ایام هؤلاء فاسدا منغصا یتولی علیهم الظالمون المعتدون بل المنافقون الکافرون واهل الحق اذل من الیهود۔" وقولهم ظاهر البطلان ' لم یزل الاسلام عزیزا فی ازدیاد فی ایام هؤلاء الاثنی عشر" (۱)

وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔ اور خلفاء اثنا عشر میں :۔
چاروں حضرات خلفاء راشدین ' حضرت معاویہؓ اور ان کے بیٹے یزیدؒ عبدالملک بن مروان
اور ان کے چاروں بیٹے ۔ اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز ہیں اور روافض کے نزدیک "امت کا حال ان خلفاء کے زمانہ میں فاسد اور گدلا رہا ان پر حد سے تجاوز کرنے والے ظالم مسلط رہے بلکہ منافق کافر مسلط رہے ۔ اور اہل حق یہود سے بھی زیادہ ذلیل ہے" (رافضہ کا قول ختم ہوا) "اور ان کا (روافض کا) یہ قول واضح طور پر باطل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان بارہ خلفاء کے زمانہ میں اسلام برابر معزز رہا اور برابر ترقی کرتا رہا۔"

ایک فاضل نو مسلم کا تبصرہ :۔

آسٹریلوی نو مسلم محقق عالم دین علامہ محمد مارما ڈیوک پکتھال رحمہ اللہ جن کا انگریزی ترجمہ قرآن مجید مشہور و معروف ہے ' اپنے ایک خطبے میں اموی و عباسی خلافتوں پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں :۔

" یہ امر واقع ہے کہ تاریخی طور پر اسلام بنی امیہ کا بہت کچھ مرہون منت ہے ۔ انہوں نے اسلام کی سادہ اور معقول و پسندیدہ عربی نوعیت کو قائم رکھا ۔ انہوں نے دمشق میں راعی و رعایا کے درمیان مروت و یگانگت کے وہی تعلقات قائم کئے جو خلافت مدینہ کے

---

(۱) ص ۵۵۲ و ص ۵۵۳ شائع کردہ المکتب الاسلامی بیروت
ٹائٹل پر تحریر ہے "حققها و راجعها جماعة من العلماء"
گویا متعدد علماء کی مصدقہ رائے ہے ' بلکہ پوری کتاب متعدد علماء کی مصدقہ ہے۔

طغرائے امتیاز تھے ۔ " (۱)

○ تبصرہ:۔ خلافت بنی امیہ کی جو مدح و ستائش علامہ موصوف کے خطبہ مذکور میں ملتی ہے وہ سراسران کے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ مطالعہ تاریخ پر مبنی ہے ۔ خلافت عباسیہ کے بھی وہ مداح ہیں ۔ لیکن ان کا تبصرہ بے لاگ ہے ۔ اس لئے انہوں نے اس کی کمزوری کی نشاندہی بھی کردی ۔ جو اس کے زوال پر منتج ہوئی ۔ فرماتے ہیں :۔

" تاریخ کے طالبعلم کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بنو عباس کی خلافت بنو امیہ کی سنیت اور فاطمیوں کی شیعیت کے درمیان ایک مفاہمت کی صورت تھی۔" (۲)

○ تبصرہ :۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ " مفاہمت " بہت گراں پڑی ۔ اور بالآخر خلافت عباسیہ کی تباہی کا سبب بنی ۔ لیکن اس غلطی سے قطع نظر، عباسی خلافت کے مبارک ' عادلانہ ' اور قابل فخر ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا ۔

تنبیہ:۔

ہم نے اس سلسلہ میں خلافت اندلس کا تذکرہ اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں کیا جتنا تفصیلی تذکرہ خلافت دمشق و بغداد کا کیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں خلافتوں پر شیعوں اور شیعیت زدہ سنی لوگوں نے حملے زیادہ کئے ہیں۔ اسپین کی خلافت بھی بہت مبارک ' باعظمت اور مثالی تھی ۔ وہ بھی خلافت موعودہ ہی کا ایک حصہ تھی ۔ لیکن ان لوگوں نے اسے مخصوص طور پر مطاعن کا ہدف نہیں بنایا ۔ نیز اس کی ابتداء بھی دور صحابہؓ کے بعد ہوئی اس لئے اس کا مختصر تذکرہ کافی سمجھا گیا ۔ خلافت ترکیہ کا بھی ہم نے تذکرہ نہیں کیا کیونکہ وہ اس دور سے متصل نہیں تھی ۔ نیز اسے بھی شیعوں نے مخصوص طور پر ہدف طعن نہیں بنایا ۔ مگر یہ واضح رہے کہ شیعوں اور یہود کو عداوت اور دشمنی ان دونوں خلافتوں سے بھی ہے ۔ بلکہ انہیں ہر اسلامی سلطنت سے عداوت ہے ۔ اور ان دونوں خلافتوں کا زوال بھی یہود اور شیعوں کی متفقہ سازشوں اور فریب کاریوں سے ہوا ۔ بلکہ چودہ صدیوں میں جتنی اسلامی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں کم از کم ان میں سے پچانوے فیصد کے زوال میں شیعوں کا ہاتھ ضرور رہا ہے۔

---

(۱) '(۲) خطبات مدراس از ' علامہ مارما ڈیوک پکتھال (اردو ترجمہ) مترجمہ شیخ عطاء اللہ ناشر احسن برادرس۔ چوک انارکلی لاہور ۱۹۶۸ء

اموی و عباسی خلافتوں سے علماء و صلحاء کا تعاون

مودودی صاحب نے اپنی کتاب میں "امت کا رد عمل" کا عنوان قائم کر کے ایک بہت ہی فتنہ انگیز بحث چھیڑی ہے ۔ ایک مختصر تمہید کے بعد جس میں حسب معمول خلفاء اسلام پر تبرا اور افتراء کی تکرار کی گئی ہے موصوف نے " قیادت کی تقسیم " کا عنوان قائم کیا ہے ۔ اور اس کے ماتحت یہ دکھانے کی کوشش کی ہے ' کہ اموی و عباسی دور میں مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی ۔ علماء و صلحاء سیاسی قیادت سے مایوس ہو کر ان سے بے تعلق ہوگئے تھے اور ان سے الگ ہو کر مسلمانوں کی دینی رہبری کرتے تھے ۔ خلفاء و امراء سے بے تعلق رہنا ان کا شعار تھا ۔ سیاسی قیادت کے تذکرے کے بعد موصوف لکھتے ہیں :-

> " دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا ' جسے بقایائے صحابہؓ تابعین و تبع تابعین و فقہاء و محدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کرلی۔" (ص ۲۰۲)

اسلامی تاریخ کا طالبعلم موصوف کی یہ تحقیق دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ حادثہ فاجعہ اسلامی تاریخ کے کس دور اور کس زمانہ میں پیش آیا؟ اسے مزید حیرت اس پر ہوگی کہ مودودی صاحب نے ایسی کھلی ہوئی غلط بیانی کی جسارت کیسے کی ؟ تاریخ کا نمایاں اور درخشندہ واقعہ ہے کہ اموی دور خلافت میں ' دمشق اور اسپین میں ہر جگہ اسی طرح عباسی دور خلافت میں علماء و فقہاء ،محدثین اہل سنت و صلحاء امت ہمیشہ خلافت کے ساتھ تعاون کرتے رہے ۔ اور خلفاء و امراء اسلام کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے ۔ یہاں تک کہ خلافت ترکیہ کو بھی جب تک خلافت قائم رہی ۔ علماء و فقہاء و محدثین سب اکابر امت اور دینی مقتداؤں کا تعاون حاصل رہا ۔ مودودی صاحب کا زیر بحث بیان بالکل غلط اور قطعاً خلاف واقعہ ہے ۔ موصوف کا یہ بیان غلط اور خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ فتنہ انگیز اور امت مسلمہ پر ایک جھوٹا الزام بھی ہے ۔

فتنہ انگیز اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کے اس مغرب زدہ طبقے کی ہمت افزائی اور تائید ہوتی ہے۔ جس کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست کو دین سے کوئی واسطہ نہیں ۔ سیاسی قیادت اپنے سیاسی اقدامات میں آزاد ہے ۔ یہ طبقہ دنیا کے سب نہیں تو اکثر اسلامی ملکوں میں

موجود ہے ۔ مودودی صاحب نے اسلامی تاریخ کے بارے میں زیر بحث غلط بیانی کر کے ان کے نظریہ کو تقویت پہنچائی اور ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو ہوا دی ہے ۔

اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ ہماری خلافتیں ' کبھی فقہاء محدثین اور علماء و صالحین سے بے نیاز نہیں رہیں۔ علی ہذا علماء کرام بھی کبھی ان سے بے تعلق نہیں رہے موصوف خود خلافت و ملوکیت ص ۲۰۲ پر زیر عنوان سیاسی قیادت لکھتے ہیں :-

> " ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کرلیا تھا اور چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جاسکتا تھا ' نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی اس لئے امت نے بادل ناخواستہ اسے قبول کرلیا تھا ۔ یہ قیادت کافرنہ تھی کہ اسے رد کرنے کے سوا چارہ نہ ہوتا ۔ اسے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے ۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا ۔ عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے ۔ صرف ان کی سیاست دین کی تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصول حکمرانی سے ہٹ گئے تھے اس لئے امت نے ان کی سیاست اس حد تک قبول کرلی کہ ان کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے ' امن و امان قائم رہے ' سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے ' جمعہ و جماعت اور حج قائم ہوتا رہے اور عدالتوں کے ذریعہ سے اسلامی قوانین کا اجراء برقرار رہے ۔ ان مقاصد کے لئے صحابہ تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ ان بادشاہوں کو امام برحق اور ان کی خلافت کو خلافت راشدہ و مرشدہ مانتے تھے ' بلکہ وہ صرف اس معنی میں تھی کہ اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں۔"

○ تبصرہ :- موصوف نے ایک غلط بیانی کی اور امت کے علماء کرام پر یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے خلفاء اسلام سے تعاون ترک کردیا تھا ۔ لیکن بات بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے اس لئے جب انہیں واقعہ بیان کرنا پڑا تو ان کے کلام میں تناقض پیدا ہوگیا اور انہوں نے

اپنی بات کی تردید خود ہی کر دی ۔ غور فرمایئے کہ جب امت نے (جس میں علماء بھی داخل ہیں) ان خلفاء کو ناظم مملکت ' امن و امان قائم کرنے والا ' سرحدوں کے محافظ ' منتظم جہاد و جمعہ و جماعات و حج تسلیم کرلیا اور یہ بھی مان لیا کہ ان کے زیرِ انتظام عدالتوں کے ذریعہ سے اسلامی قوانین کا اجراء بھی برقرار رہتا ہے ۔ اور ان اکابر علماء و فقہاء امت کی یہ خواہش بھی تھی کہ یہ خلفاء امور مذکورہ کو جن کی انجام دہی شرعاً قیام خلافت کا مقصود ہے انجام دیتے رہیں ' جیسا کہ خود مودودی صاحب نے عبارت مذکورہ میں اقرار کیا ہے تو پھر ترک تعاون ' اور دینی قیادت سے علیحدگی کے کیا معنی ہیں ۔ ؟ کیا مملکت کا انتظام بغیر تعاون علماء چل سکتا تھا؟ کیا جمعہ و جماعات کا قیام ' حج کا انصرام' جہاد کا اہتمام ' علماء و فقہاء سے بے نیاز ہوسکتا تھا ؟ کیا عدالتوں کے ذریعہ اسلامی قوانین کا اجراء بغیر قضاۃ کے ہوتا تھا ؟ پھر کیا یہ قضاۃ علماء نہیں تھے ؟

جب مندرجہ بالا امور انجام دیئے جارہے تھے ۔ اور ان کی انجام دہی بغیر تعاون علماء و فقہاء کرام ممکن نہ تھی تو یقیناً ان خلافتوں کو علماء کرام و فقہاء عظام کا تعاون حاصل رہا ۔ اس تفصیل سے مودودی صاحب کے کلام کا تعارض و تناقض واضح ہوجاتا ہے ۔ وہ مدعی تو اس کے ہیں کہ علماء و صلحاء امت نے اموی و عباسی خلفاء سے تعاون و تعلق ترک کردیا تھا اور ان سے الگ ہوکر ایک دینی قیادت قائم کرلی تھی ۔ لیکن ان کی منقولہ بالا عبارت سے اس تعاون و تعلق کا اقرار و اثبات عیاں ہورہا ہے ۔

حقیقت واقعہ جس کا اقرار خود موصوف کو کرنا پڑا یہ ہے کہ علماء اسلام محدثین کرام و فقہاء عظام ہمیشہ خلفاء اسلام سے تعاون کرتے رہے ۔ جس کام میں ضرورت سمجھتے تھے ' ان کا ہاتھ بٹاتے تھے ' مشورہ مانگا جاتا تھا تو خلوص کے ساتھ مناسب مشورہ دیتے تھے ۔ جو کام ان کے سپرد کیا جاتا تھا اسے فرض شناسی کے ساتھ انجام دیتے تھے ۔ اگر خلفاء یا حکام میں سے کسی سے کوئی غلطی ہوجاتی تھی تو اسے ٹوکتے تھے ۔ اور اصلاح حال کی کوششیں کرتے تھے ۔ مملکت کے حالات پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے ۔ اور اس کی بہی خواہی کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے ۔ مفسرین ' محدثین ' فقہاء و علماء کرام خلفاء دمشق و بغداد اور خلفاء اندلس کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرتے رہے ۔ اور یہ خلفاء ان حضرات علماء کا اعزاز و اکرام کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ عادل خلفاء علماء سے مشورے لیتے تھے۔ ان کے مشوروں کو بہت وزنی سمجھتے تھے ۔ اور ان پر عمل کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جو اسلامی تاریخ کے مبتدی طالبعلم پر بھی روشن ہوجاتی ہے۔ اس کے لئے کسی استدلال کی احتیاج نہیں۔ اوپر

جو دلیل ہم نے پیش کی ہے وہ بھی محض وضاحت میں زیادتی کے لئے ہے ۔ نفس واقعہ ثابت کرنے کے لئے اس کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی ۔

اس مبحث میں چند صفحات پیشتر ہم اکابر فقہاء و اجلہ علماء کے جو آراء خلفاء و خلافت اسلامیہ کے بارے میں نقل کرچکے ہیں ' انہیں پر نظر کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ محدثین و فقہاء کرام اور علماء عظام ہمیشہ خلفاء اسلام اور خلافت اسلامیہ سے پورا پورا تعاون کرتے رہے ۔ خواص صلحاء امت کا طبقہ ہمیشہ ان کی اعانت کرتا رہا ' اور ان کا خیر خواہ رہا ۔ تاریخ سے یہ واقعہ بھی عیاں ہے کہ ان خلفاء اور ان کے عمال کی نظر میں علماء دین کی بہت عظمت و اہمیت تھی ۔ اور وہ ان کے مشورے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے ۔

یہ بات تو بالکل عیاں ہوگئی کہ سیاسی قیادت اور دینی قیادت کی جدائی کی جو داستان مودودی صاحب نے بیان کی ہے اور خلفاء اسلام نیز علماء کرام پر جو الزام لگایا ہے ۔ وہ بالکل غلط اور ان کے ذہن کا ساختہ پرداختہ ہے۔ تاریخ بلکہ تواتر سے ثابت ہونے والے واقعات اس کی تردید و تغلیط کررہے ہیں ۔ خلافت دمشق ' خلافت بغداد اور خلافت اندلس کے مبارک ادوار میں دینی قیادت اور سیاسی قیادت ہمیشہ ایک ہی رہی ۔ علماء و صلحاء امت ہمیشہ خلفاء کرام کے معاون اور خیر خواہ رہے ۔ اگر اس موضوع پر لکھا جائے اور واقعات بطور مثال جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے ۔ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ دین اسلام اور ملت اسلامیہ کے متعدد شعبے ہیں اوران کی نصرت کے مختلف طریقے ہیں ۔ ایک شخص سب شعبوں یا متعدد شعبوں کی خدمت و نصرت نہیں کرسکتا ۔ اس لئے علماء سلف میں ایسے علماء و صلحاء بھی بکثرت نظر آتے ہیں جو درس قرآن مجید یا اشاعت حدیث شریف یا غیر مسلموں کو دعوت اسلام دینے اور کسی غیرسیاسی دینی خدمت میں لگے رہے اور خلفاء یا عمال کے یہاں آمد و رفت ان کا شیوہ نہیں رہا ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انہوں نے خلفاء سے تعاون ترک کردیا تھا ۔ یا سیاسی قیادت کے متوازی ایک دینی قیادت قائم کرلی تھی ' بالکل غلط اور گمراہ کن ہے ۔ غور کیجئے تو ان کا طرز عمل بھی خلافت و خلفاء کے ساتھ ایک قسم کا تعاون ہی تھا۔ مقاصد شرعیہ کا حصول جو قیام خلافت کا مقصود ہے ' اس میں یہ حضرات حکومت کی اعانت کررہے تھے۔ ان مقاصد میں اہم ترین مقصد تحفظ دین ہے ۔ یہ اس کے حصول کے لئے کوشاں اور ساعی تھے ۔ اس طرح خلافت کے ساتھ تعاون کررہے تھے ۔ تعاون کے معنی مصاحبت تو نہیں ہیں۔ اگر یہ حضرات خلفاء کے یہاں زیادہ آمدورفت

نہیں رکھتے تھے' تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہوں ان سے الگ ہو کر اپنی قیادت کی مسند بچھالی تھی ۔ یہ بزرگان دین اپنے کام میں اس قدر مشغول تھے کہ انہیں ارباب حکومت کے پاس آنے جانے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی ۔ مگر یہ سب خلافت اسلامیہ کے خیر خواہ اور اس کے معاون تھے ۔ اور ضرورت پڑنے پر ان کے پاس جاتے بھی تھے ۔ حکومت کی نظر میں ان کا وقار تھا ۔ دونوں طرف سے مخلصانہ تعلقات قائم تھے ۔ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس متبحر علماء تھے۔ یہ اعلیٰ درجہ کے ذہین و فطین 'کبار علماء مجتہدین میں سے تھے۔ مجتہدین زمانہ انہیں مجتہد تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کے فیصلوں اور فتاویٰ کو نظیر قرار دے کر اپنے فتووں اور فیصلوں کی تائید میں پیش کرتے تھے۔ اور یہ اہل علم خلفاء و امراء ان حضرات علماء و فقہاء سے سیاسی و انتظامی امور میں برابر مشورے لیتے رہتے تھے ۔ جس کی مثالیں ہم چند صفحات پیشتر کر چکے ہیں ۔

مختصر یہ کہ مودودی صاحب کی یہ کہانی کہ " علماء و صلحاء نے خلفاء اسلام اور سیاست مملکت سے الگ ہو کر ایک دینی نظام قائم کر لیا تھا اور حکومت و ارباب حکومت سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا " بالکل باطل اور خلاف واقعہ ہے ۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا تھا ۔ مودودی صاحب کی یہ غلط بیانی ' بہت تعجب خیز ہے ۔ لیکن اس میں بھی سب سے زیادہ تعجب خیز اس کا وہ جزو ہے جو صحابہ کرامؓ کے متعلق ہے ۔ موصوف نے ان محترم حضرات کے متعلق بھی لکھا ہے کہ انہوں نے بھی حکومت اسلامیہ سے عدم تعاون کا طریقہ اختیار فرمالیا تھا۔ تاریخ کا مبتدی طالبعلم بھی موصوف کے اس بیان کو سن کر حیرت زدہ رہ جائے کہ اتنی کھلی ہوئی غلط بیانی کی جرات کیسے ہوئی جب تک صحابہ کرامؓ دنیا میں موجود رہے اپنے زمانہ کی حکومت سے برابر تعاون کرتے رہے ۔ مثال کے یہ واقعہ پیش کرنا کافی ہے کہ امیر یزیدؒ کی خلافت کے زمانہ میں مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ اعلیٰ مناصب پر فائز تھے ۔

حضرت نعمان بن بشیر (گورنر کوفہ) 'حضرت ضحاک ابن قیس فہری (گورنر دمشق)

حضرت عقبہ ابن عامر جہنی (سپہ سالار عساکر افریقہ) رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اس کے علاوہ اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جن سے یہ واقعہ بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جب تک صحابہ کرامؓ موجود رہے اس وقت تک کسی حکومت اسلامیہ نے ان کا تعاون حاصل کرنے سے لاپرواہی نہیں برتی ۔ اور انہوں نے بھی تعاون سے دریغ نہیں کیا' بلکہ ہمیشہ تعاون کرتے رہے ۔

مودودی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت میں اس واقعی حقیقت کا اقرار کیا گیا ہے کہ

امت مسلمہ اور اس کے اکابر و قائدین مثل صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے محدثین کرام و فقہاء عظام نے مقاصد قیام خلافت یعنی نفاذ شریعت مطہرہ ۔ اقامت جمعہ و جماعات ، انتظام حج ، اقامہ امن و امان وغیرہ ۔ ان اموی و عباسی حضرات خلفاء و کرام کے سپرد کردیئے تھے ۔ اور مودودی صاحب کے الفاظ میں :

"اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں"

اس اقرار واقعہ کے ساتھ موصوف کا یہ کہنا کہ :

"ان مقاصد کے لئے صحابہ ، تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ انہی بادشاہوں کو امام برحق اور ان کی خلافت کو خلافت راشدہ مانتے تھے۔"

تعجب خیز ہے ۔ غور فرمایئے کہ کسی شخص کو "امام برحق" تسلیم کرنے کے اس کے سوا اور کیا معنی ہیں کہ کار امامت اس کے سپرد کردیا جائے اور فرائض خلافت ادا کرنے کا اسے ذمہ دار بنادیا جائے ۔ کسی قاضی کے یہاں اگر ہم اپنا مقدمہ دائر کردیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم نے اسے قاضی تسلیم کرلیا ۔ کسی حاکم کے سامنے فریاد لے کر جانے کا مطلب اسے حاکم تسلیم کرنا ہے ۔ کسی ڈاکٹر کے مطب میں جاکر اس سے نسخہ لکھانا اور اس کا علاج کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ مریض اسے ڈاکٹر تسلیم کرتا ہے ۔ اسی طرح ان بزرگان دین اور امت کے قائدین نے جب کار امامت ان اموی یا عباسی ائمہ کرام کے سپرد کردیا تو اس کے معنی سوا اس کے کچھ نہیں ہوسکتے کہ ان حضرات نے ان میں سے ہر ایک کو امام تسلیم کرلیا اور یہ مان لیا کہ حدود شرعیہ کے اندر انہیں امر و نہی کا اختیار ہے۔ نیز حدود شریعت کے اندر ان کی اطاعت واجب ہے ۔

کسی کو امام اور خلیفہ تسلیم کرنے کے یہی معنی ہیں ۔ اسلامی تاریخ کا یہ روشن واقعہ مجبوراً مودودی صاحب کو بھی تسلیم کرنا پڑا ۔ لیکن انہوں نے اس کی قدر و قیمت کم کرنے کے لئے امام کے ساتھ "برحق" اور خلیفہ کے ساتھ "راشد" کی بے محل ، اور غیر ضروری قید لگادی ۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ حضرات اکابر علماء نے زیر بحث خلفاء کو امام اور خلیفہ تو تسلیم کرلیا مگر امام برحق اور خلیفہ راشد نہیں تسلیم کیا ۔ یہ افسوسناک مغالطہ دہی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا شریعت نے امام کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ یعنی امام برحق اور امام

بر باطل ؟ - قرآن مجید میں تو لفظ امام سربراہ مملکت کے معنی میں مستعمل ہی نہیں ہوا - البتہ حدیث میں مستعمل ہوا ہے - لیکن کیا کوئی ایسی حدیث پیش کی جاسکتی ہے ' جس میں "امام" بمعنی سربراہ مملکت کی تقسیم کی گئی ہو؟ بعض فقہ کی کتابوں میں امام حق (۱) کی اصطلاح ملتی ہے۔ یہ اصطلاح باغیوں کے ساختہ و پرداختہ امام کے مقابلے میں امام اور خلیفہ کو جھوٹے مدعی امامت و خلافت سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ امام حق ہر اس امام کو کہتے ہیں جسے جمہور اہل اسلام کی اکثریت نے امام اور خلیفہ تسلیم کرلیا ہو - باغی ٹولہ جسے بزعم خود امام اور خلیفہ منتخب کرتا ہے وہ جمہور اہل اسلام اور ان کے مسلمہ ارباب حل و عقد کا منتخب کیا ہوا نہیں ہوتا وہ شریعت کی نظر میں امام و خلیفہ ہی نہیں ہوتا ' لیکن باغی اسے امام یا خلیفہ کہتے ہیں اس لئے امام اور خلیفہ کو اس سے ممتاز کرنے اور غلط فہمی کا انسداد کرنے کے لئے بغاوت کی تعریف میں بعض فقہاء نے امام حق کی اصطلاح استعمال کی ہے - اس سے عیاں ہے کہ جملہ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کو صحابہ ' تابعین ' تبع تابعین ' ان کے بعد آنے والے ائمہ مجتہدین و فقہاء و محدثین متبحرین امام برحق سمجھتے تھے۔ ان کا انہیں امام اور خلیفہ تسلیم کرلینا ہی انہیں امام برحق کہنے کے مترادف ہے۔ اس لئے کسی دلیل کی احتیاج نہیں اس سے واضح ہوگیا کہ مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ حضرات ان خلفاء کو امام برحق نہیں سمجھتے تھے ' بالکل غلط اور قطعاً خلاف واقعہ ہے -

امام برحق سے غالباً مودودی صاحب نے اس لفظ کا وہ مفہوم مراد لیا ہے جو شیعوں نے گڑھا ہے - اور ان کے اس باطل عقیدے پر مبنی ہے کہ امام کا تقرر نصب سے نہیں۔ " نص " سے ہوتا ہے - اور اسے امامت و خلافت کا آسمانی حق DEVINERIGHT حاصل ہوتا ہے اگر ان کی مراد یہی ہے تو ہم اسی کتاب میں اسلامی نظام کی تشریح کے سلسلہ میں واضح کرچکے ہیں کہ یہ شیعوں کا من گھڑت عقیدہ ہے جو قطعاً باطل اور سراپا

---

(۱) فقہ کی اس اصطلاح امام حق کے معنی کی شرح یہ ہے کہ جس شخص کو جمہور اہل اسلام نے خلیفہ اور امام تسلیم کرلیا ' اسے شرعاً حدود شریعت کے اندر امرو نہی اور انتظام مملکت کا حق حاصل ہوگیا - اس شرح کو پیش نظر رکھنے سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ تاریخ کی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام ' تابعین ' تبع تابعین اور اکابر علماء و صالحین ان سب خلفاء کو ان امور کا حق دار سمجھتے تھے اور حدود شرعیہ کے اندر ان کی اطاعت اپنے اوپر واجب سمجھتے تھے - ان کی نافرمانی اور ان کے خلاف خروج کو معصیت جانتے تھے۔ "امام برحق" سمجھنے کے یہی معنی ہیں -

گمراہی ہے اس معنی کے اعتبار سے اہلسنت کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی بھی امام برحق نہیں ہوتا۔

اسلامی نظام کی تشریح ہی کے سلسلہ میں ہم واضح کرچکے ہیں کہ قبل نصب و تقرر شرعاً کسی امتی کے لئے بھی استحقاق خلافت و امامت ثابت نہیں ہوتا۔ امام اور خلیفہ بننے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور امام برحق ان معنی میں کہ امام بننے سے پہلے ہی اس منصب کا مستحق ہے کہ اہل ایمان اسے امام اور خلیفہ بنائیں، کوئی شخص بھی نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے۔ شرعاً اس قسم کے استحقاق کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس معنی کے لحاظ سے بلاشبہ یہ حضرات بزرگان امت اموی و عباسی خلفاء ہی کو نہیں بلکہ خلفاء راشدین کو بھی امام برحق نہیں سمجھتے تھے۔

خلیفہ کے ساتھ بھی مودودی صاحب نے راشد کی قید لگائی۔ یہ بھی ایک نفسی مغالطہ دہی کی کوشش ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ حضرات بزرگان ملت امیرالمومنین عبدالملک یا امیرالمومنین ہارون رشید رحمہما اللہ کو خلیفہ راشد نہیں کہتے تھے۔ اس کا اقرار کرا کے موصوف قاری کے دل میں ان خلفاء کے لئے جذبہ تحقیر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے پیدا ہونے کے بعد اس کا ذہن ان غلط اور جھوٹے الزاموں کو صحیح سمجھنے کے لئے نسبتاً آسانی کے ساتھ تیار ہوجائے گا۔ شیعہ اور متشیعین دلائل سے تہی دست ہونے کی وجہ سے اس قسم کے مغالطے دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ ورنہ "راشد" کی قید کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ حضرات اکابر ان خلفاء کو ائمہ برحق اور خلیفہ حق سمجھتے تھے۔ انتہایات اس واقعہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ یہ بزرگان دین ان سب خلفاء کو صالح، عادل اور خلافت و سربراہی مملکت کا اہل سمجھتے تھے۔ اور ان کی خلافت کی صحت کے قائل ہونے کے ساتھ اس سے خوش اور راضی وار اس کی بقاء کے خواہش مند تھے۔

حصہ دوم

اسلامی حکومت کی حقیقت اور اس کی تشکیل

ہمارے زمانہ میں اسلامی نظام ' اسلامی حکومت اورخلافت کے الفاظ زبان زد و خواص و عوام ہیں۔ مگر جس قدر یہ اصطلاحیں مشہور ہیں اسی قدر ان کے معنی غیر معروف ہیں ۔

ایسے افراد شاذ و نادر ہی نکلیں گے۔ جو اسلامی حکومت کی حقیقت سے واقف ہوں ' یا اس کی عملی شکل و صورت ' اور اس کی تشکیل کے متعلق پیدا ہونے والے صحیح اور بجا سوالات کا صحیح جواب دے سکیں۔ یہ ناواقفیت نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بارہا فتنہ پرور اور فریب کار لوگوں نے ان الفاظ کے جادو سے مسحور کرکے امت مسلمہ کو دینی و دنیوی ہر قسم کے نقصانات پہنچائے ہیں ۔ اور ان پر کشش نعروں کو فساد فی الارض کا ذریعہ بنایا ہے ۔ دور حاضر میں مودودی صاحب نے یہی الفاظ استعمال کرکے امت مسلمہ کو فتنے میں مبتلا کیا اور ایرانی روح اللہ خمینی آنجہانی نے بھی اسی طرز پر فتنہ پردازی کی۔ مودودی تو چھپے ہوئے شیعہ تھے ۔ لیکن خمینی تو اپنے رفض کا اعلان کرتے تھے ۔ باوجود اس کے دین سے ناواقفیت اور اسلامی حکومت کے معنی سے نا آشنا ہونے کے وجہ سے اہلسنت کی ایک کثیر تعداد جس میں بعض علماء و مشائخ بھی داخل ہیں ' ان کے فریب میں مبتلا ہوگئی ' اور ایران میں ان کے قائم کئے ہوئے نظام کو اسلامی نظام اور خمینی کی حکومت ایران کو اسلامی حکومت کہنے لگی ۔ ظاہری فتنہ و فساد اور مسلمانوں کی خونریزی ' شیرازہ ملت میں پراگندگی سے بھی زیادہ شدید ضرر وہ ضرر ہے جو اسلامی نظام کی حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے۔ امت کے عقائد و افکار میں فساد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یعنی امت مسلمہ کے ایک معتدبہ گروہ میں بعض غلط عقیدے اور افکار پھیل گئے ' جنھوں نے اس کے اجتماعی ایمان میں ضعف و اضمحلال پیدا کرکے اسے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے رو بزوال کردیا۔ اسلامی

نظام کی حقیقت واضح کرنے کے دوران یہ بات بھی واضح ہوجائے گی ۔ بہرکیف ان امور کے پیش نظر یہ واجب نظر آتا ہے کہ اس اصطلاح کی حقیقت اور اس کے شرعی معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ تشریح درج ذیل ہے :۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوٰت الشیطن انہ لکم عدو مبین ○ (البقرہ : ۲۰۸)

"اے ایمان والو اسلام میں کامل طور پر داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو ۔ بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم و ہدایت جامع ہے ۔ اور اس نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق قوانین و ضوابط مقرر فرمائے ہیں اور ہدایتیں دی ہیں ۔ مومن کی پوری زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی شریعت اسلامیہ اور احکام الٰہیہ کے تابع ہونا چاہئے۔ سیاسیات بھی ایک شعبہ حیات ہے۔ اور بہت اہم شعبہ ہے۔ اس کے متعلق بھی شریعت نے احکام و ہدایات دیئے ہیں ۔ ان کی تعمیل و اتباع بھی مسلمانوں کے لئے ضروری اور ان کی خلاف ورزی سے احتراز واجب ہے ۔ سب سے بڑا اور اہم ترین سیاسی ادارہ مملکت STATE ہے ۔ جو خود محسوس نہیں ہوتا ۔ حکومت GOVERNMENT کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ اسلام نے اسے قائم کرنے ' اسے باقی رکھنے اور اس کے کردار کے متعلق بھی کچھ احکام دیئے ہیں ۔ جو حکومت ان احکام و ہدایات کے مطابق وجود میں آئے اور اپنے کردار میں انہیں کے تابع ہو اسی کا نام اسلامی حکومت ہے ۔ اسی طرح کے نظام مملکت کو اسلامی نظام کہتے ہیں ۔ خلافت کا اصطلاحی لفظ بھی اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے ۔

اس مجمل تعریف کی شرح کے لئے یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ کتاب و سنت نے حکومت کی کیا کوئی خاص شکل متعین کی ہے ۔ اگر متعین کی ہے تو وہ کیا ہے ؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے تصور مملکت و حکومت کو جامہ عمل پہنانے کے لئے کیا کتاب و سنت نے کوئی مخصوص طریق کار مقرر کیا ہے ؟ اگر مقرر کیا ہے تو وہ کیا ہے ؟ ان دونوں مسائل کے حل ہوجانے سے خلافت اور اسلامی نظام کی حقیقت بالکل واضح ہوجائے گی ۔

اسلام نے حکومت کی کوئی خاص شکل نہیں مقرر کی

اسلام اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان ۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تاج

نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔ ہبوط آدم درحقیقت عروج آدم علیہ السلام تھا ۔ وہ دین اسلام لے کر تشریف لائے تھے ۔ اور انہوں نے اپنی اولاد کو اسی کی تعلیم دی ' مدت دراز تک بنی نوع انسان کا دین اسلام ہی رہا۔ اس کے سوا دنیا میں کسی دین و مذہب کا وجود نہ تھا ۔ حضرت آدم و حضرت حوا **علیہما الصلوۃ والسلام** کی نسل انہیں کی زندگی میں بہت زیادہ ہوگئی تھی ۔ یقیناً انہوں نے ان کی اجتماعی زندگی کے لئے کوئی نظم بحکم الہی مقرر فرمایا ہوگا ۔ اس نظم کو اگر اصطلاحی مفہوم میں مملکت نہ کہیں تو کم از قبائلی درجہ کا نظم تو کہنا ہی پڑے گا۔ مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور اس کی تنظیم انسان کی فطرت میں داخل ہے ' اس کا رجحان اس میں اپنے ابتدائی وجود کے زمانہ سے پایا جاتا ہے ۔ اور اس کے متعلق اسلام کی تعلیم و ہدایت انسان کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہوگئی تھی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں بکثرت انبیاء **علیہم السلام** مبعوث ہوئے۔ بعض نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم فرمائیں۔ وہ سب یقیناً وحی ربانی اور دین حق کی تعلیم کے مطابق تھیں۔ ان سب پر اسلامی مملکت اور اسلامی حکومت کی اصطلاح کا اطلاق قطعی اور یقینی طور پر کیاجائے گا۔

ہمارے نبی کریم **خاتم النبیین** محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو مملکت ' اور سلطنت کا تصور ان کے لئے کوئی نیا تصور نہیں تھا ۔ باوجودیکہ اہل عرب اپنے نظم اجتماعی کے نقطہ نظر سے مملکت اور نظم سیاسی کے درجہ پر نہیں پہنچے تھے۔ مگر مملکت (اسٹیٹ) کے تصور سے نا آشنا نہیں تھے ۔ ان کے گرد و پیش بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں اور ان سے ان کے روابط تھے ۔ ہجرت سے کچھ مدت پہلے ہی مدینہ نے قبیلہ کے درجہ سے ترقی کرکے مملکت قائم کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ بلکہ اس مقصد سے مشہور یہودی منافق عبداللہ ابن اُبی ابن سلول کو بادشاہ بنانے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا ۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد یہ فیصلہ منسوخ کردیا اور عملاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا فرمانروا بنالیا ۔ اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے **مکہ معظمہ** میں تو مملکت قائم فرمانے کا کوئی تذکرہ ہی نہیں فرمایا۔ مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد باوجودیکہ سلطنت قائم ہوگئی تھی۔ اور قبائلی نظم ختم ہوچکا تھا ۔ آنحضور **علیہ الصلوۃ والسلام** نے حکومت کی شکل و صورت کے کسی مخصوص نقشہ کی کوئی تعلیم نہیں دی۔ حالانکہ آنحضورؐ کے مبارک دور ہی میں پورا عرب اسلامی حکومت کے تحت داخل ہوچکا تھا

- اور آنحضور ؐ کو یہ قطعی طور پر معلوم تھا کہ میرے بعد بھی یہ مملکت قائم رہے گی - بلکہ بہت زیادہ ترقی کرے گی - مگر اس سب کے باوجود قرآن مجید یا کسی حدیث صحیح میں ہمیں اسلامی حکومت کی کسی مخصوص شکل کی کوئی تعلیم نہیں ملتی - کسی آیت یا حدیث میں ہمیں یہ نہیں ملتا کہ اسلامی حکومت کی ہیئت اور شکل ایسی ہونا چاہئے - اور اس کے خلاف جو شکل ہوگی وہ اسلامی نہیں کہی جائے گی -

قرآن مجید میں ہمیں حضرت داؤد علیہ السلام کی سلطنت ملتی ہے - ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے وارث ہوتے ہیں - اقتدار وراثتہً منتقل ہوتا ہے - حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے صاحبزادے بادشاہ ہوئے - تورات میں مذکور ہے :-

اور سلیمان اپنے باپ دادوں کے ساتھ سورہا اور اپنے باپ داؤد کے شہر میں گاڑدیا گیا اور اس کا بیٹا رحبعام اس کی جگہ بادشاہ ہوا" (۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام تو اس لئے وارث ہوئے تھے کہ وہ اللہ تعالٰی کے نبی تھے - مگر ان کے بیٹے رجعلم کے متعلق تورات شریف بتاتی ہے کہ :-

" رحبعام سکم کو گیا اس لئے کہ سارے اسرائیل سکم میں اکٹھے ہوئے تھے تاکہ اسے بادشاہ کریں "

(سلاطین ۱۲ : ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کی تخت نشینی کوئی حکم شرعی نہ تھا بلکہ خود بنو اسرائیل میں ایک رسم کی حیثیت رکھتا تھا - جو قوم نے اپنے اجتہاد سے بطور خود مقرر کرلی تھی - بحکم شریعت نہیں مقرر کی گئی تھی، مگر خلاف شریعت بھی نہیں تھی - حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے عہد مبارک میں ہم حضرت بلقیس رضی اللہ عنہا کی سلطنت بھی دیکھتے ہیں (۲)- ان کے اسلام لانے کے بعد بھی ان کے نظام سیاسی اور دستور سلطنت میں نبی

(۱) سلاطین ۱۱ : ۴۳

(۲) حضرت بلقیس رضی اللہ عنہا ملک سبا کی ملکہ اور سربراہ مملکت تھیں - پہلے مشرکہ تھیں پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تبلیغ سے مسلمان ہوگئیں - یہ واقعہ قرآن مجید کی سورۃ النمل میں بیان فرمایا گیا ہے - ان کے اسلام لانے کے بعد ان کی قوم بھی مسلمان ہوگئی - اسلام لانے کے بعد وہ ملک سبا کی سربراہ اور ملکہ رہیں - اس بارے میں علماء دین کا کوئی اختلاف منقول نہیں - لیکن موجود زمانہ میں ایک سیاسی پارٹی کے علماء نے چند غیر اہم اور

وقت نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی ۔ قرآن مجید کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی حکومت شخصی تھی مگر جمہور کی رائے کو بہت اہمیت حاصل تھی ۔ وہ کسی اہم مسئلے میں زعماء جمہ کی رائے کے خلاف فیصلہ نہیں کرتی تھیں ۔ اور ہر اہم مسئلہ میں شوریٰ ضروری سمجھتی تھیں ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دستور مملکت یہی تھا۔ اور ان کی سلطنت کا دستور شخصیہ

کم درجہ کی اہم سیاسی مصلحتوں کے حصول کے لئے اس سے اختلاف کیا ' اور تفسیر بالرا۔ سے کام لے کر یہ دعویٰ کیا کہ بلقیسؓ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے عورت ہونے کے بناء پر سربراہی مملکت سے معزول کردیا تھا ۔ ان حضرات نے آیت مقدسہ کے فقرہ واتونی مسلمین سے سیاسی اطاعت مراد لی ہے ۔ جو آیت کے سیاق و سباق اور اسلوب بیان کے خلاف ہونے کی وجہ سے تفسیر بالرائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آیت میں اطاعت الدین یعنی شرک سے توبہ کرکے ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے کا حکم دیا گیا تھا اطاعت رسولؑ اور اسلام لانے کے عملی ثبوت کے لئے انہیں بارگاہ نبوت میں حاضر ہو۔ کا بھی حکم دیا گیا تھا ۔ نہ کہ سیاسی اطاعت یعنی ملک سے دستبرداری کا۔ علاوہ بریں رہتے ہوئے بھی ان پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت فرض تھی۔ کیونکہ وہ اللہ تعا کے بھیجے ہوئے نبی تھے ۔ اس کے لئے ان کا سلطنت سے معزول ہونا لازم نہیں تھ انہیں معزول کرنے کا مضمون ان حضرات نے اپنی طرف سے اختراع کرلیا۔قرآن مجید کسی حدیث میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا ۔ تاریخ میں بھی اس کا کوئی نام و نشا نہیں ۔ بلکہ تاریخ تو اس کے خلاف یہ بات بتاتی ہے کہ وہ اسلام لانے کے بعد بھی ما رہیں ۔ پھر معلوم نہیں انہیں معزول کرنے کا مضمون ان حضرات کو کہاں سے مل گیا ؟ ا علماء کے زیر بحث قول کے غلط اور خلاف واقعہ ہونے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اس کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ۔ لیکن بات اتنی بھی نہیں ہے بلکہ خود قرآن مجید سے ایسے قرائن سمجھ میں آتے ہیں جن سے ان علماء کے قول کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی ملک سبا کی سربراہ اعلیٰ اور ملکہ رہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے انہ معزول نہیں کیا اور نہ ان کے ملک و مال پر قبضہ کیا ۔ حضرت بلقیسؓ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے نبی ہونے کے لئے یہی قرینہ مقرر کیا تھا کہ وہ اسلام لانے اور شرک توبہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں ۔ فساد و تذلیل ' اور ملک و مال پر قبضہ نہیں چاہتے۔ حضرت سلیمانؑ کا ہدایا واپس کردینا بلقیسؓ کا ایمان لانا اور ان کے حکم پر ان

و جمہوریت کے مناسب امتزاج سے تیار ہوا تھا۔ حضرت بلقیس کے مسلمان ہونے کے بعد یہ بھی اسلامی حکومت ہوگئی تھی ۔ اور اس کا نظام بھی اسلامی تھا ۔ پھر بنو اسرائیل ہی میں ہمیں اسلامی حکومت کی ایک اور شکل بھی نظر آتی ہے ۔ جو ان سب سے مختلف ہے ۔

ایک نبی علیہ السلام کو موجودگی میں حضرت طالوت رضی اللہ عنہ کو ملک بنایا جاتا ہے ۔ اور وہ نبی کی سرپرستی اور نگرانی میں سیاسی نظام کی سربراہی کرتے ہیں ۔ نبیؑ وقت بتاتے ہیں کہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی سربراہی پسندیدہ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ۔ اور ان کی صلاحیت کار کی شہادت دیتے ہیں ۔ مگر باوجود اس کے قوم سے کہتے

خدمت میں حاضر ہوجانا ' اس امر کی روشن دلیل ہے کہ انہوں نے جو معیار مقرر کیا تھا اس پر ... حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پوری اتری ۔ اور ان کا یہ اندازہ صحیح نکلا کہ وہ میرے ملک و مال کے طالب نہیں ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آنحضرت علیہ السلام نے انہیں ان کی مملکت پر بحال رکھا ۔ ان کی حکومت تسلیم کرلی اور وہ مسلمہ ہونے کے بعد بھی حسب سابق ملکہ سبا اور سربراہ حکومت و ملک رہیں۔ اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا برتاؤ بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں ۔ اور انہیں ایک مہمان کی حیثیت دی ۔ اعزاز کے ساتھ قصر میں بلایا ان کے ساتھ نرم انداز میں گفتگو فرمائی ۔ یہ سب قرائن بھی بتاتے ہیں کہ آنحضرت علیہ السلام نے انہیں ملکہ سبا تسلیم کرلیا اور ان کے ملک و مال سے کوئی تعرض نہیں فرمایا ۔ اثبات مدعا کے لئے تو اتنی بات کافی ہے ۔ لیکن اگر اس پر بائبل کی شہادت کا بھی اضافہ کردیا جائے تو مزید وضاحت ہوجائے گی ۔ ملاحظہ ہو۔

" سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو اس کی ساری خواہش کے مطابق جو کچھ اس نے مانگا سو دیا۔ سوا اس کے سلیمان نے اس کو اپنی بادشاہانہ سخاوت سے بہت کچھ عنایت کیا۔ پس وہ رخصت ہوئی اور اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو پھر گئی۔"

(سلاطین ۱۰ : ۱۳)

تورات کی یہ شہادت بحث کا راستہ بند کردیتی ہے ۔ اس میں اس واقعہ کی صراحت ہے کہ حضرت بلقیسؓ اسلام لانے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد بھی ملکہ سبا رہیں ۔ حضرت سلیمانؑ نے انہیں معزول نہیں کیا بلکہ سلطنت پر بحیثیت سربراہ مملکت برقرار رکھا ۔

ہیں کہ باختیار خود انہیں اپنا ملک بنائے۔ قوم کو ان کی سربراہی پر جو شبہ ہوتا ہے اس کا جواب دیتے ہیں۔ بالآخر قوم انہیں کو ملک کا بادشاہ تسلیم کرلیتی ہے ۔ حضرت طالوت ملک تھے مگر ایک نبی علیہ السلام کے تابع تھے۔ گویا اصطلاحی اقتدار اعلیٰ انہیں نہیں حاصل تھا۔ اور ان کی حیثیت وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف کی تھی ، مگر قرآن مجید انہیں ملک کہتا ہے۔ اور ان کے اقتدار کو ملک کے لفظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ یہ اسلامی حکومت کی ایک مخصوص اور ممتاز شکل تھی۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوتے ہیں۔ مہاجرین و انصار جمع ہوکر آں محترم کو سربراہ مملکت اسلامیہ منتخب کرلیتے ہیں ۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فاروق اعظم سیدنا عمر بن **الخطاب** رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بناتے ہیں ۔ پھر مہاجرین و انصار سے استفسار کرکے ان کی تائید و توثیق حاصل کرتے ہیں ۔ اس طرح صدیق اکبرؓ کے بعد وہ خلیفہ اور سربراہ مملکت مقرر ہوتے ہیں ۔ فاروق اعظم نے وفات کے قریب ایک کمیٹی مقرر فرمادی اور اسے اس امر کا ذمہ دار بنایا کہ جمہور مسلمین کی رائے معلوم کرکے کسی خلیفہ کا انتخاب و تقرر کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تقرر و انتخاب بھی جمہور مسلمین کی رائے سے ہوا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی اجتماع اذرح میں جمہور صحابہ کرامؓ نے اسی طرح منتخب کیا ۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خلافت راشدہ کی مذکورہ بالا شکلیں حضرات صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر کی تھیں، کسی شکل کے بارے میں بھی کوئی نص نہیں ہے۔ حکومت کی یہ سب شکلیں اور مملکت قائم کرنے کے یہ سب طریقے قطعاً اسلامی تھے۔ اس سلسلہ میں دو واقعات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے انتخاب کے وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں سردار انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ **منا امیر و منکم امیر** ان کا نظریہ یہ تھا کہ ایک مہاجر اور ایک انصاری پر مشتمل ایک جماعت (کمیٹی) بنائی جائے اور یہ کمیٹی خلیفہ یا ملک اور سربراہ مملکت ہو ۔ جمہور صحابہ نے یہ تجویز منظور نہیں کی مگر اس نظریہ کی تردید بھی نہیں کی ۔ تجویز تو خلاف مصلحت ہونے کی بناء پر انہوں نے رد کردی مگر یہ نہیں کہا کہ کسی کمیٹی اور جماعت کی حکومت اور دو یا زیادہ افراد کے مجموعے کو حکمراں (ملک یا خلیفہ) بنانا شرعاً جائز ہی نہیں ۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ سیدنا فاروق اعظمؓ کی وفات کے بعد سے سیدنا حضرت ذی النورینؓ

ے انتخاب تک فاروق اعظمؓ کی مقرر کردہ ایک جماعت (کمیٹی) سربراہ مملکت یا خلیفہ کے
ائف انجام دیتی رہی۔ اور عملاً حکمراں رہی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت
ی ایک شکل یہ بھی ہے کہ فرد واحد کے بجائے ایک جماعت جو دو یا زیادہ افراد پر مشتمل
د حکمراں اور سربراہ مملکت بنائی جائے۔

اس تفصیل سے یہ بات روشن ہوگئی کہ اسلامی حکومت کی متعدد شکلیں ہوسکتی ہیں۔
ریعت نے اس کے لئے کوئی ایک شکل مقرر و معین نہیں کی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی
یثر تعداد میں اس کی شکلیں کیوں پائی جاتیں؟ ہر اسلامی حکومت کی ایک ہی شکل ہوتی اور
یہ وہی ہوتی جسے شریعت معین کردیتی۔ اس کے ساتھ اس واقعہ پر بھی نظر کرنا چاہئے کہ
رآن مجید یا حدیث شریعت میں کہیں اشارتاً و کنایتہ بھی اسلامی حکومت کی کسی خاص شکل
کا تعین نہیں ملتا۔ اگر اسلام خلافت و حکومت کی کسی مخصوص شکل کا متقاضی ہوتا تو یقیناً
قرآن مجید یا کسی حدیث صحیح میں اس کا حکم دیا جاتا۔ اس سے عیاں ہے کہ شریعت اسلامیہ
نے مملکت (اسٹیٹ) کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں فرمائی ہے۔ بلکہ جمہور مسلمین کو اختیار
دیا گیا ہے کہ وہ احوال و مصالح کو سامنے رکھ کر اپنے اجتہاد سے جو شکل مناسب سمجھیں
اختیار کرلیں۔

اسلامی حکومت کے جو نقشے اور اس کی جو شکلیں ہم نے قرآن مجید اور احادیث و
تاریخ سے نقل کی ہیں وہ سب اس کی جائز صورتیں اور شکلیں ہیں۔ جمہور مسلمین کو اختیار
ہے کہ جسے چاہیں منتخب کرلیں۔ لیکن یہ اختیار انہیں اشکال تک محدود نہیں' بلکہ انہیں یہ
بھی اختیار ہے کہ ان کے علاوہ مصلحت وقت کے پیش نظر کوئی جدید شکل اختیار کریں۔
شرط صحت صرف یہ ہے کہ کسی اصول شریعت کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ مثلاً وہ ملک یعنی
بادشاہی بھی اسلامی نظام حکومت ہے جو اسلامی اصول شریعت کے خلاف نہ ہو۔ اور وہ
مقاصد پورے کرے جو شریعت نے حکومت کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ اگر کسی خطہ ارضی
میں جس پر اہل اسلام قابض ہوں' اور اس میں حکومت قائم کرنے کی استطاعت رکھتے
ہوں' اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں' تو اس کی شکل مقرر کرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اگر
کسی مصلحت سے انہیں یہی مناسب معلوم ہو کہ سربراہ مملکت کے منصب کو کسی ایک
خانوادے کے ساتھ مخصوص کردیا جائے تو انہیں شرعاً اس کا پورا حق اور اختیار ہے۔ یہ
بادشاہی بھی اسلامی مملکت کہلائے گی یہ بھی خلافت ہی کی ایک صورت ہے۔ اسے خلاف
شریعت یا غیر اسلامی حکومت کہنا۔ اسلامی نظام اور اس کے شرعی احکام سے ناواقفیت پر مبنی

ہے ۔

مودودی صاحب نے اموی اور عباسی خلافتوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان ادوار میں خلافت کی جگہ خانوادوں (DYNASTY) نے لے لی اور " ملوکیت " کی ایک مکروہ تصویر کھینچ کر اسے ان خلافتوں پر چسپاں کرنے کی ناپسندیدہ کوشش کی ہے ۔ دوسرے شیعوں کی طرح مغالطہ یہ دیا ہے کہ بقول خود " ملوکیت " یا بادشاہی کا تصور تو غیر اسلامی لیا ہے ۔ اور صرف اس بناء پر کہ ان دونوں خلافتوں میں خلفاء انہیں دونوں خاندانوں سے ہوئے ' اس غیر اسلامی تصور کو ان اسلامی حکومتوں پر چسپاں کردیا ۔ یہ طریقہ ارجاف اور پروپیگنڈہ کا ہنر تو کہا جاسکتا ہے مگر اسے واقعہ نگاری سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ دونوں خلافتیں دو خاندانوں تک محدود رہیں مگر خلافت کے لئے ان خاندانوں کی تخصیص یہ جمہور اہل اسلام کا فیصلہ تھا ۔ جبکہ غیر اسلامی طرز کی بادشاہی میں عوام کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حکمران وراثتاً حکومت حاصل کرتا ہے۔ اور تخت و تاج اس کا قانونی حق سمجھا جاتا ہے اس سے عیاں ہوجاتا ہے کہ ان خلافتوں اور مودودی صاحب کی اصطلاحی ملوکیت یعنی غیر اسلامی بادشاہی میں کتنا فرق ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کرکے اموی و عباسی خلافتوں کو بادشاہی اور ملوکیت کہنا غیر منصفانہ غلط بیانی ہے ۔ اموی خلافت کے متعلق تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ وہ بادشاہی دستور کی طرح کسی ایک ہی خاندان میں باقی رہی۔ خاندان تو بدلتے رہے اگرچہ حکومت قریش ہی کی ایک شاخ میں رہی ۔

اقامت نظام اسلام کا طریقہ

اسلامی حکومت (یا اسلامی نظام) قائم کرنے کے لئے کیا اسلام نے کوئی مخصوص طریق کار (PROCEDURE) مقرر کیا ہے ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اسے دلیل شرعی کے ساتھ پیش کیا جائے ۔ لیکن ایسی دلیل قیامت تک نہیں مل سکتی ۔ کتاب و سنت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے کچھ اصول مقرر فرمائے گئے ہیں ۔ لیکن کسی مخصوص طریقے کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا ۔ منصب خلافت پر حضرات خلفاء راشدینؓ کے تقرر کے مختلف طریق ملتے ہیں جو گذشتہ متصل صفحات میں ضمناً مذکور ہوچکے ہیں اور عام طور پر لوگ ان سے واقف ہیں۔ یہ سب صحابہ کرامؓ نے اپنے اجتہاد سے تجویز فرمائے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی منصوص نہیں۔ کسی دلیل شرعی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اقامت مملکت اسلامیہ (ISLAMIC STATE) کے لئے ان کے سوا کوئی طریقہ نہیں تجویز کیا جاسکتا ۔

خلفاء راشدین کے عمل سے ان کا جواز تو یقیناً ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ کسی طرح نہیں ثابت ہوتا کہ جواز انہیں طریقوں میں محدود اور منحصر ہے۔ اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ممنوع ہے۔

حق یہ ہے کہ یہ مسئلہ جمہور اہل اسلام کے اجتہاد اور صوابدید سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حالات و مصالح ملیہ کے پیش نظر اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے صرف دو شرطیں ہیں اول شرعاً وہ طریقہ فی نفسہ جائز اور مباح عمل ہو۔ ناجائز نہ ہو۔ دوم یہ کہ اس سے جمہور مسلمین کی اکثریت کی مرضی معلوم ہوسکے۔ بلحاظ حالات و ظروف جمہور کی مرضی معلوم کرنے کے لئے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں ایک طریقہ بعض حالات میں مناسب ہوتا ہے مگر حالات بدل جاتے ہیں تو مناسب نہیں رہتا۔ اور جمہور ملت کی مرضی معلوم کرنے کے لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک صحابہ کرامؓ کی معتدبہ تعداد اسلامی ممالک میں باقی رہی اس وقت تک جمہور اہل اسلام انہیں کو اپنا نمائندہ اور مقتدا سمجھتے تھے۔ اور ان کے انتخاب سے سب راضی ہوجاتے تھے۔ جب صحابہ کرامؓ کی تعداد کم ہوگئی تو بعض اکابر تابعین بھی ارباب حل و عقد میں داخل ہوگئے۔ ان کی رائے پر جمہور اہل اسلام کو اعتماد ہوتا تھا۔ جب بحیثیت قوم مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ نئی نسل بڑھی، اور بکثرت نو مسلم امت کا جزو بن گئے۔ عالم اسلامی وسیع تر ہوگیا۔ مگر صحابہ کرامؓ کی تعداد میں مزید کمی ہوئی۔ اکابر تابعین میں سے بھی بہت سے جنت مکان ہوگئے۔ تو استصواب رائے کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوگیا۔

اس دشواری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک تدبیر تو یہ اختیار کی گئی کہ ولی عہدی کو عملاً نظام خلافت کا جزو بنادیا گیا۔ ہر خلیفہ کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی کو ولی عہد بنائے۔ ولی عہد بنانے کے لئے اکابر علماء اور دوسرے ارباب حل و عقد سے شوریٰ کیا جاتا تھا اکثریت کی رائے کے خلاف کسی اموی یا عباسی خلیفہ نے کسی کو بھی ولی عہد نہیں بنایا۔ ولی عہد ایک معتدبہ مدت تک ولی عہدی اور خلافت کے لئے نامزدگی کی حالت میں بسر کرتا تھا۔ اس مدت میں یہ بات واضح ہوجاتی تھی کہ جمہور اہل اسلام اس کی خلافت پر راضی ہیں یا نہیں ؟۔ جمہور کو بھی اسے پرکھنے کا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ اور وہ سوچ سمجھ کر پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

اسی مقصد سے اسی طرح کی ایک تدبیر یہ کی گئی کہ گورنروں کے تقرر میں صوبے کے

باشندوں کی مرضی اور پسندیدگی کو فیصلہ کن اہمیت دی گئی ۔ اس طریقہ کے بانی فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں ۔ آں محترم نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر صوبے کا گورنر اس صوبے کے باشندوں کی رائے اور مرضی سے مقرر کیا جائے ۔ ولی عہدی کی طرح یہ طریقہ بھی دستور اسلامی کا تحریری جزو تو نہیں بنایا گیا لیکن تعامل (CONVENTION) کی حیثیت سے اس کا جزو بن گیا ۔ اور اموی و عباسی خلافتوں کے دور میں اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ ہر گورنر ایک مجلس شوریٰ بنالیتا تھا ۔ اور عوام سے ربط رکھتا تھا ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان ادوار میں گورنر اپنے صوبہ کے عوام و خواص سے اس قدر گھل مل کر رہتے تھے کہ ان کی مرضی سے ان کے سیاسی قائد اور نمائندے بھی بن جاتے تھے ۔ اس طرح ولی عہد جب خلیفہ بنایا جاتا تھا تو عوام کے لئے اجنبی نہیں ہوتا تھا ۔ایسے خلافت کے لئے جمہور کی رضا مندی مسند خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے ہی حاصل ہو چکتی تھی ۔ یہ صحیح معنی میں جمہوریت تھی ۔ مغربی جمہوریت کی طرح نہیں تھی جس میں رضائے عام کے متعلق کوئی اطمینان نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ مسئلہ بھی وضاحت طلب ہے کہ اسلامی دستور میں کسی خلیفہ کے انتخاب پر جمہور اہل اسلام کی رضامندی کے کیا معنی ہیں ؟ اس کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ ہر شخص یا عوام کی اکثریت کسی کے انتخاب پر خوشی و مسرت کا اظہار کرے بلکہ اس کا صرف اتنا درجہ مطلوب ہے کہ جمہور کی اکثریت اسے گوارا کرتی ہو ۔ کسی منتخب خلیفہ کے خلاف اگر جمہو راہل اسلام کی اکثریت ناگواری کا اظہار نہیں کرتی تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پسند کرتی ہے ۔ اور اسے گوارہ کرنے کو تیار ہے ۔ صحت انتخاب کے لئے ازروئے شریعت اتنا کافی ہے ۔ اس طرح منتخب ہونے والے خلیفہ کو جائز خلیفہ کہا جائے گا ۔ حدود شرعیہ کے اندر اس کی اطاعت واجب اور اس کے حکم کی خلاف ورزی حرام ہوگی ۔ اس کے خلاف خروج تو بدرجہ اولیٰ حرام اور معصیت کبیرہ ہوگا ۔ فلسفیانہ بحثیں اور نظری موشگافیاں چاہے کتنی بھی کی جائیں ۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ عملاً مرضی عامہ صرف مذکورہ بالا علامت ہی سے معلوم ہوسکتی ہے ۔ اور رضائے جمہور کا یہی درجہ حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ یہ کیفیت تو شاذ و نادر ہی پیدا ہوسکتی ہے کہ کسی شخص کے سربراہ بننے پر کسی ملک کے عوام جوش مسرت سے اس قدر مغلوب ہوجائیں کہ مبارک باد کے نعرے لگانے لگیں ۔ یا کوئی جلوس نکالیں ۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس طریق اظہار مرضی کی جستجو کرنا تو اور زیادہ بے جا ہے۔ کیونکہ خیر القرون میں اس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی ۔ یہ طرز جب کہیں پایا جاتا ہے

تو مخصوص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اظہار رضا کی علامت لازمہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عوام کا پسندیدہ نظام حکومت قائم ہو ۔ اور حکومت عدل و انصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی ہو تو عوام کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ حکمراں کون ہے ؟ یا یہ تخت حکومت تک کس طرح پہنچا ؟ منصب سربراہی پر اسے کس طرح فائز کیا گیا ؟ جو حکمراں ان کے لئے عدل و انصاف ' امن و امان اور شاہراہ حیات پر چلنے کے لئے ضروری سہولتیں مہیا کردے وہی ان کا پسندیدہ حکمراں ہوتا ہے۔ یہ تو عام قاعدہ ہے اور عوامی نفسیات کا ایک مانا ہوا اصول ہے۔ لیکن مسلم عوام ان سب باتوں کے علاوہ حکومت میں یہ بات بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے ۔ اور عدل و انصاف اسلامی و شرعی معیار و اصول کے مطابق قائم کرے ۔ اور خود بھی پابند شریعت ہو ۔ اگر حکومت سے یہ مقاصد حاصل ہوں ۔ تو عوام اہل اسلام کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ حکمراں کون ہے ؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے ؟ وہ منصب سربراہی حکمرانی تک کس طریقہ سے پہنچا ہے ؟ اسے " بادشاہ " اور " ملک " کہا جاتا ہے یا خلیفہ اور امام ؟ یہ سارے مباحث جمہور اہل ایمان کے نزدیک بالکل فضول اور لغو ہوتے ہیں ۔ یہ بحثیں صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو حب جاہ و اقتدار ' یا حب مال و منال کے روحانی و ذہنی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جب مرض ان میں جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو وہ حکومت قائمہ کے خلاف شورشیں برپا کرتے ہیں ۔ اور تلوار لے کر اس کا تختہ الٹنے کے لئے خروج کرتے ہیں ۔ شرعاً ان کا یہ اقدام بالکل ناجائز اور غلط ہوتا ہے۔

بے محل نہ ہوگا کہ اگر یہاں اجتماعیات کے اس نکتے کا تذکرہ بھی کردیا جائے کہ اگر کسی حکمراں یا شریک حکمران (مثلاً رکن مجلس قانون ساز) کے انتخاب پر عوام کی طرف سے مبارک ' سلامت کی صدائیں بلند ہوں ۔ اور جلسوں جلوسوں وغیرہ کے ذریعہ غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا جائے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں ہوتی کہ اس کا انتخاب عوام کی اکثریت کو پسند ہے ۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا جمہور عوام کی مرضی کے مطابق ہونا مشکوک ہوجاتا ہے اس کی توجیہہ آسان ہے اولاً یہ کہ جوش مسرت کا یہ اظہار اس امر کی علامت ہے کہ عوام کا ایک معتدبہ گروہ ' اس انتخاب سے راضی نہیں ۔ اور جو گروہ راضی ہے وہ اس پر فتح پانے کی خوشی منارہا ہے ۔ عین ممکن ہے یہ فاتح گروہ شکست خوردہ گروہ سے تعداد میں کم ہو۔ مگر اپنی زورا زوری یا تدبیروں کی وجہ سے غالب آگیا ہو۔ جو کچھ بھی ہو اس سے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ جمہور کی غالب اکثریت اس انتخاب سے راضی نہیں ہے۔

ثانیاً :۔ یہ کہ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ حکمران کا انتخاب اس سے جذباتی تعلق کی بناء پر کیا گیا ہے سنجیدگی کے ساتھ مملکت و ملت کے مصالح کے پیش نظر رکھ کر نہیں کیا گیا ہے ۔ کسی جذبہ کے جوش کے وقت جو رضا حاصل ہوتی ہے ۔ وہ قابل اعتبار نہیں ہوتی ۔ جذبات دائمی نہیں ہوتے ۔ عین ممکن ہے کہ حکمران یا شریک حکمرانی عوام کی مرضی کے مطابق نہ ہو ۔ لیکن ان کے بعض قائدین نے وقتی طور پر ان میں کوئی جذبہ پیدا کر کے انہیں راضی کرلیا ہو۔ یہ صرف عقلی احتمال نہیں بلکہ اس کا مشاہدہ جمہوری انتخابات میں ہوتا رہتا ہے ۔ یہ اگرچہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے مگر نادر بھی نہیں بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے ۔ بخلاف اس کے اگر حکمران کے انتخاب پر جمہور مسلمین ساکت ہوجائیں اور کسی اختلاف کا اظہار نہ کریں تو اس امر کا ظن غالب بلکہ یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ سب نہیں تو کم از کم عوام مسلمین کی غالب اکثریت کی مرضی سے انتخاب ہوا ہے ۔ بلکہ جمہور اہل اسلام اس سے راضی اور خوش ہیں ۔ اسی لئے سراپا حکمت شریعت اسلامیہ نے اس سکوت اور گوارہ کرنے کو جمہورعوام کی رضامندی اور پسندیدگی کی علامت قرار دیا ہے ۔ شریعت میں اس کے نظائر بھی ہیں ۔ مثلاً جس شخص کو کسی مکان میں حق شفعہ حاصل ہو وہ اس کی بیع کی اطلاع پانے کے بعد اگر وقت معین کے اندر اس پر معترض نہ ہو اور شفعہ کے دعوے کا ارادہ نہ ظاہر کرے بلکہ سکوت کرے تو اس کا حق شفعہ باطل ہوجاتا ہے ۔ گویا اس کے سکوت کو بیع پر اس کی رضامندی کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظیر بطور مثال پیش کی گئی ۔ اس قسم کے نظائر اور بھی مل سکتے ہیں ۔ ہمارے اس مفصل بیان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ اسلام نے جس طرح اسلامی حکومت کی کوئی مخصوص شکل نہیں متعین کی ہے اسی طرح اسلامی حکومت قائم کرنے کا کوئی خاص طریقہ بھی نہیں مقرر فرمایا ہے ۔ البتہ اس کے لئے ایک اصول کی تعلیم دی ہے جس کی پابندی واجب و لازم ہے ۔ وہ اصول یہ ہے کہ امام کا تقرر نصب سے ہونا چاہئے ۔ فقہاء اہلسنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نصب امام بشرط استطاعت جمہور اہل اسلام پر واجب علی الکفایہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

"وامرھم شوری بینھم" (الشوریٰ)

امر خلافت و امامت امر عظیم ہے اس لئے اس کے لئے شوریٰ واجب ہے ۔ کوئی شخص بغیر شوریٰ خود بخود امام نہیں بن سکتا ۔ کسی کو سربراہ مملکت بننے کا اور منصب امامت و خلافت پر فائز ہونے کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا ۔ یہ حق شرعاً صرف جمہور مسلمین کو حاصل ہے '

کہ وہ جسے چاہیں اس منصب پر فائز کریں ۔ جسے وہ منتخب کریں وہی حق دار ہوتا ہے۔ جب تک جمہور مسلمین کسی کو اس منصب پر فائز نہ کریں اس وقت کسی کو کوئی استحقاق نہیں حاصل ہوتا۔ دستور اسلامی کے اس اصول کو خلیفہ ثانی فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے :۔

فمن بایع رجلا علی غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع ھو ولا الذی بایعہ تغرۃ ان یقتلا (۱)

" جس شخص نے جمہور اہل اسلام کے مشورے کے بغیر کسی شخص سے بیعت کرلی ' تو اسے ایسا نہ کرنا چاہئے نہ (دوسرے کو) بیعت لینا چاہئے۔ اس خوف سے کہ کہیں دونوں قتل نہ کردیئے جائیں ۔"

اس سے ظاہر ہے مملکت اسلامیہ کا حکمران نصب ہی سے مقرر ہونا چاہئے۔ اسے خلیفہ کہئے یا امام یا ملک اس کا تقرر و انتخاب شوریٰ ہی سے ہونا چاہئے۔ نصب کے سوا تقرر حکمراں کا کوئی دوسرا طریقہ مشروع نہیں ہے۔ آیت شوریٰ مذکورہ بالا بھی اس اصول کا ایک اہم ماخذ ہے ۔ شوریٰ عزم اور فیصلہ کے لئے ہوتا ہے ۔ شوریٰ واجب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اہل شوریٰ کا عزم اور فیصلہ نصب امام کی صورت میں ظاہر ہونا چاہئے ورنہ شوریٰ بے معنی اور عبث ہوگا ۔ اس کے سوا کوئی طریقہ تقرر امام کا قرآن و حدیث میں نہیں بتایا گیا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شوریٰ کرکے کسی کو امامت کے منصب پر "نصب" اور مقرر کرنا ' اسلامی دستور حکومت میں تقرر امام کا واحد اصولی طریقہ ہے جس کی تعلیم دی گئی ہے ۔ ہمیں اسے تبدیل کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ ہر شعبہ زندگی میں عملی احکام بعض عقائد پر مبنی ہوتے ہیں ۔ بایں معنی امام کا صرف نصب سے مقرر ہونا اہلسنّت کا سیاسی عقیدہ ہے۔ جو سیاسیات و دستور مملکت کے بکثرت مسائل و احکام شرعیہ کا محور و مرکز ہے۔ اہلسنّت اور شیعوں کے درمیان اہم اور بنیادی اختلافات میں یہ اختلاف بھی داخل ہے 'کہ اہلسنّت کے نزدیک امام کا تقرر صرف نصب سے ہوتا ہے ۔ اور شیعوں کے نزدیک صرف نص سے (۱) اسی بناء پر شیعہ اہلسنّت کو "ناصبی" کہتے ہیں۔ یعنی نصب امام کا قائل و معتقد (۲) (یہ

(۱) بخاری کتاب المحاربین باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت جب ۱۰۰۹ ج ۲۰

(۲) بعض شیعہ علماء نے کہا ہے کہ آیہ استخلاف میں موعودلہ حضرت علیؓ کی خلافت ہے۔ اور یہ آیت ان کی خلافت کے بارے میں نص ہے ۔ ان کی خلافت منصوصہ اس نص سے

بحث ازالۃ الخفاء اور مطولات کتب کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔) یہ واحد اصول ہے جس کا تعلق طریق تقرر امام سے ہے۔ اس کی پیروی ہر حال میں واجب لازم ہے۔ اس اصول کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

ثابت ہے" شیعوں کا یہ قول تو بالکل غلط اور باطل ہے۔ اہلسنّت کے نزدیک آیۃ استخلاف کسی خلیفہ کے بارے میں نص نہیں۔ حضرت علیؓ یا اور کسی خلیفہ کی خلافت کسی نص سے ثابت نہیں بلکہ سب کا قیام نصب ہی سے ہوا۔ شیعوں کے اس مسلک و عقیدے کے بارے میں ہمیں یہاں بحث کرنا مقصود نہیں۔ اس لئے کہ ہماری کتاب رد شیعہ میں نہیں ہے۔ ان کا مسلک نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ بعض اہلسنّت جو یہی بات کہہ رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں یہ آیت نص ہے۔ اور " ان کی خلافت نص سے ثابت ہے۔" ان کے اس غلط قول کا ماخذ و منبع مندرجہ بالا شیعی مسلک ہے۔ جس سے وہ اپنے تشیع خفی کی وجہ سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ ورنہ یہ مسلک اہلسنّت کے اجماعی مسلک اور عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ اپنے اس غلط عقیدے کے لئے یہ حضرات ایک بہانہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اس آیت سے حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ آں محترم کی خلافت کی حقانیت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ان کا یہ بہانہ صحیح نہیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ آیت ان کی خلافت پر نص ہے۔ آیت سے ثابت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آیت اس بارے میں نص ہے۔ یا ان کی خلافت منصوص ہے۔ دونوں باتوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کی صحت اس آیت کے اقتضاء سے ثابت ہوتی ہے۔ **اقتضاء النص** نص سے خارج ہوتا ہے اس کا جزو نہیں ہوتا۔ اس لئے **اقتضاء النص** سے ثبوت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ "یہ نص سے ثابت ہے یا یہ آیت اس بارے میں نص ہے۔" یہ جملے تو اس وقت استعمال ہوتے ہیں جب کوئی مسئلہ **عبارۃ النص** سے ثابت ہو رہا ہو۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی خلافت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ آیت سے ثبوت اور نص سے ثبوت دونوں باتوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں بلکہ الگ الگ ہیں۔

خلافت صدیقؓ پر اس آیت سے وجہ استدلال مختصراً یہ ہے کہ اگر آں محترم کی خلافت صحیح نہ تسلیم کی جائے تو لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہیں ہوا۔ اور یہ بالکل باطل

اس کی عملی شکلیں متعدد ہوسکتی ہیں۔ احوال و ظروف کے اعتبار سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ اور ہوا۔ جس کی تفصیل گذر چکی۔ اس قیمتی اصول کی تعلیم کے سوا اسلام نے اقامت حکومت اسلامیہ کا کوئی خاص طریقہ نہیں بتایا ہے۔ شوریٰ اور نصب سے جو حکومت اہل اسلام قائم کریں وہ اسلامی حکومت ہوگی۔ خواہ اس کے لئے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے البتہ یہ شرط ہے کہ وہ طریقہ فی نفسہ شرعاً جائز اور مباح ہو۔ یعنی کسی دوسری شرعی دلیل کی بناء پر حرام او رمعصیت نہ ہو۔ لیکن یہ شرط تو ہر کام کے لئے ہے۔ اقامت حکومت ہی کے طریقہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ طریق اقامت اختیار کرنے میں آزادی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انعقاد خلافت کے طریقوں کے بیان میں علماء و فقہاء طریق "استیلا" کو بھی ذکر کرتے ہیں (۱) اگر کوئی شخص بذریعہ استیلا (COUP) تخت خلافت پر قابض ہوجائے۔ اور جمہور اہل اسلام کی اکثریت اسے عملاً خلیفہ تسلیم کرلے جس کی حد ہم بیان کرچکے ہیں۔ کہ وہ اس کی مخالفت نہ کریں بلکہ حدود شرعیہ کے اندر اس کی اطاعت کرنے لگیں۔ تو اس کی خلافت قائم ہوجائے گی اور شریعت کی نظر میں بالکل جائز ہوگی۔ خواہ وہ بادل ناخواستہ ہی اس کی اطاعت کریں۔ (۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص تنہا کسی حکومت پر

ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ یہ اقتضاء نص ہے۔ بخلاف اس کے اگر حضرت علیؓ کی خلافت کو نہ تسلیم کیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ کیونکہ ان سے پہلے حسب وعدہ خلافتیں قائم ہوچکی تھیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوچکا تھا۔ اس لئے حضرت علیؓ کی خلافت اقتضاء النص سے بھی نہیں ثابت ہوئی۔ چونکہ جماعت صحابہؓ نے ان کا تقرر منصب خلافت پر کیا تھا اس لئے ہم انہیں خلیفہ برحق سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جب اجتماع اذرح میں جماعت صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کا تقرر منصب خلافت پر کردیا تو وہ بھی خلیفہ ہوگئے تھے۔ ان کو بھی ہم خلیفہ برحق جانتے ہیں۔

(۲) بزمانہ موجودہ وہ سنی صاحبان بھی جو شیعیت سے متاثر ہیں۔ مگر سنی ہونے کے مدعی ہیں یعنی بقول مولانا محمد علی سعید آبادی رحمہ اللہ گلابی شیعہ ہیں' ان اہلسنت کو جو صحیح عقائد اہلسنت رکھتے ہیں۔ ناصبی کہتے ہیں۔ — حاشیہ صفحہ ۱۷۸

(۱) ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء۔ نیز مطولات کتب فقہ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے استیلاء کی مثال میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کو پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مثال صحیح نہیں۔ حضرت معاویہؓ بطریق استیلا خلیفہ نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اجتماع اذرح میں صحابہ کرامؓ نے — حاشیہ صفحہ ۱۸۴

مستولی نہیں ہوسکتا۔ اہل ایمان اور ارباب حل و عقد کی ایک جماعت شوریٰ اسے نصب یعنی اس کا تقرر منصب خلافت و امامت پر کرتی ہے۔ یہ جماعت اس کے ساتھ ہوکر اسے تخت خلافت پر قابض کردیتی ہے۔ اور خلیفہ سابق کو معزول کردیتی ہے۔ خلیفہ سابق کی شکست اس کی جماعت کی کمزوری اور شکست کی واضح علامت ہے۔ اس لئے مستولی امام اور سربراہ مملکت کا تقرر شوریٰ اور نصب ہی سے ہوا۔ پھر جب اکثریت اس کی سربراہی پر راضی ہوگئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جمہور مسلمین کی اکثریت نے سربراہ سابق کو معزول کرکے سربراہ مستولی کو مقرر کردیا۔ اس کے بعد اس کی خلافت و امامت کی صحت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں باقی رہتی۔

ناگواری کے بارے میں بھی یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہی ناگواری معتبر ہے جو کسی ایسے سبب سے ہو جس کی بناء پر شریعت اسلامیہ مقدسہ بھی ناگواری کو بجا اور درست قرار دے۔ اس صورت میں جمہور مسلمین کے لئے خلیفہ کو معزول کردینا جائز ہے۔ لیکن اگر اس قسم کا کوئی سبب موجود نہ ہو تو اس ناگواری کا کوئی اعتبار نہیں۔ خلافت و امامت صحیح ہوگی۔ جمہور اگر اسے معزول کریں گے تو وہ معزول ہوجائے گا۔ لیکن معزول کرنے والے عاصی اور گناہ گار ہوں گے۔ کیونکہ صرف عوام کی اس ناگواری کی وجہ سے اسے معزول کرنا شرعاً جائز نہیں۔ مثلاً اگر امام فاسق ہو اور اس کے فسق و فجور کے وجہ سے جمہو راہل اسلام کو اس کا سربراہ مملکت بننا ناگوار ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ اسے معزول کردیں اور کسی دوسرے خلیفہ کا تقرر کریں۔ بلکہ بعض صورتوں میں ایسا کرنا واجب ہے۔ تاہم خروج بالسیف یعنی تشدد اور مسلح جدوجہد سے کام لینا جائز نہیں۔ صرف آئینی طریقوں سے کام لیا جاسکتا ہے بخلاف اس کے اگر امام فاسق نہیں ہے۔ اور کار منصبی صحیح طریقے سے انجام دے رہا ہے۔ مگر عوام کی اکثریت یا کسی اقلیت کو اس کا امام ہونا صرف اس وجہ سے ناگوار ہے کہ وہ فلاں خاندان سے نہیں ہے' یا فلاں شخص کا بیٹا بھتیجا یا قریبی رشتہ دار

آں محترم کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اظہار حقیقت جلد ثانی میں ہم اسے ثابت کرچکے ہیں۔

(۲) یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر یہ ناخوشگی کسی اقلیت کے دل میں ہے تو اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ کسی حکومت سے سب کے سب راضی ہوں۔ ایسا عادتاً نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں شاید ہزار میں ایک حکومت بھی بمشکل پیش کی جاسکے۔ اگر اقلیتی گروہ کی ناراضگی کا اعتبار کیا جائے تو دنیا میں کوئی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے شرعاً و عقلاً ہر طرح اکثریت ہی کی رضا کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

نہیں ہے تو اس ناگواری کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر اس کے انتخاب کے وقت اکثریت ساکت رہی اور اس کے تقرر کو گوارہ کرلیا ۔ تو اب اس عہد سے پھرنے کا انہیں اختیار نہیں رہا ۔ ایسی صورت میں امام کو معزول کرنا سخت معصیت ہے ۔ اس کی امامت و خلافت صحیح ہے ۔ اور جمہور اہل ایمان پر حدود شرعیہ کے اندر اس کی اطاعت فرض ہے ۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نصب" کے معنی کی تشریح کردی جائے۔

کیونکہ عام طور پر اس سے ناواقفیت ہے۔ نصب کے معنی لغت میں کسی شے کو بلند کرنے یا اسے کسی خاص وضع پر قائم کرنے کے ہیں ۔ انہیں معنی کی مناسبت سے کسی عہدے پر کسی شخص کے تقرر کو بھی نصب کہتے ہیں مثلاً " **نصب الامیر فلا نا** " کے معنی ہیں **ولاہ منصبا** یعنی " امیر نے اس کا تقرر فلاں منصب (عہدے) پر کیا "۔ نصب امام یا نصب خلیفہ کا لفظ دستور اسلامی میں انہیں لغوی معنی اور محاورے کے مطابق استعمال ہوتا ہے ۔ اور اس کے معنی مقرر کرنے (APPOINTMENT) کے ہوتے ہیں ۔ نصب امام یا نصب خلیفہ کا مطلب امام اور خلیفہ کا تقرر ہے ۔

اہم بات یہ ہے کہ نصب کے معنی انتخاب (ELECTION) یا **اجتباء** (SELECTION) نہیں ہیں ۔ اس نکتے سے عام طور پر غفلت و ناواقفیت ہے ۔ عموماً اسے انتخاب (الیکشن) یا **اجتباء** (سلیکشن) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ نصب کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے ' اور نصب ان دونوں شکلوں میں بھی پایا جاسکتا ہے ۔ لیکن لغتہً یا شرعاً اس کے لئے لازم یا اس کے ہم معنی نہیں ہے۔ نصب ان دونوں سے نسبتاً عام ہے۔ اگر انتخاب یا **اجتباء** کے صرف لغوی معنی ملحوظ ہوں تو نصب کا ترجمہ ان دونوں الفاظ سے کرنا صحیح ہے ۔ لیکن ان کے سیاسی معنی کے اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے ۔ مناسب یہ ہے کہ نصب کا ترجمہ تقرر کیا جائے جو اس کے صحیح مفہوم کو ادا کرتا ہے ۔

اسلامی نظام میں نصب خلیفہ کی حقیقت

نصب کے معنی کی یہ تشریح بے فائدہ نہیں۔ اس سے غفلت کی وجہ سے عام طور پر اسلامی نظام کے بارے میں کچھ مزید غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں ۔ اسی غفلت کی وجہ سے کسی شخص کو سربراہ مملکت بنانے کے طریقے کے بارے میں اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظامات کے درمیان جو ایک اصولی اور حقیقی فرق ہے اس سے عام طور پر ناواقفیت پائی جاتی ہے۔

اس کی وضاحت درج ذیل ہے :۔

غیر اسلامی نظاموں کی تعداد کثیر ہے۔ جن کے درمیان اصولی اور بنیادی اختلافات ہیں۔ لیکن کسی شخص یا کچھ اشخاص کو اسٹیٹ کا سربراہ بنانے کے معنی اور اس کی حقیقت ان سب نظاموں میں مشترکہ طور پر یہی ہوتی ہے کہ اقتدار اعلیٰ سربراہ کے سپرد کردیا جائے اور اسے مملکت کا مقتدر اعلیٰ اور حکمراں بنادیا جائے ۔ اس کے بعد اس شخص (یا اشخاص) کے سوا مملکت کے جملہ باشندے اس کے محکوم ہوجاتے ہیں ۔ شاہی میں یہ اقتدار اعلیٰ بادشاہ کے سپرد کیا جاتا ہے ۔ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) میں آمر (ڈکٹیٹر) کے صدارتی طرز کی جمہوریت میں صدر کے یا صدر اور پارلیمنٹ کے مجموعے کے اور پارلیمنٹری طرز حکومت میں پارلیمنٹ کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے ۔ حکومت کی ان شکلوں اور صورتوں میں سربراہ کے انتخاب (ELECTION) یا اجتباء (SELECTION) کے معنی یہی ہیں کہ اسے مملکت (اسٹیٹ) کا حاکم اعلیٰ اس طرح بنایا جارہا ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں آجائے ۔ اور مملکت کے باقی شہری اس کی رعیت بن جائیں ۔

مگر اسلامی نظام میں سربراہ مملکت کے نصب کے خواہ اس کا نام خلیفہ ہو یا ملک یا امام یا صدر یا اور کچھ یہ معنی نہیں ہوتے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے بلکہ اس کا مطلب وہی ہوتا ہے جو کسی حاکم یا قاضی یا کسی دوسرے ملازم حکومت کے تقرر کا ہوتا ہے ' اسلامی حکومت میں اصطلاحی طور پر اقتدار مملکت STATE کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اور اسٹیٹ کتاب و سنت کے ماتحت۔ جمہور اہل اسلام اور حکومت کے مجموعے کا نام اسلامی مملکت (اسٹیٹ) ہے ۔ صرف حکومت یا صرف جمہور مملکت نہیں ہیں ۔ اور ان میں سے کسی ایک کو اقتدار نہیں حاصل ہوتا ۔ سربراہ مملکت بھی اس مملکت کا اسی طرح ایک ملازم ہوتا ہے 'جس طرح پولیس یا فوج کا ایک سپاہی ۔ جمہور مسلمین ایک خدمت پر اسے مامور کرتے ہیں ۔ اور وہ ایک فریضہ ادا کرتا ہے ۔ اور ایک خدمت انجام دیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک سپاہی یا تحصیل دار۔ فرق یہ ہے کہ اس کے خدمات کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا ہے۔ اور حدود شرعیہ کے اندر امر و نہی بھی کرسکتا ہے۔

خلافت کا حق شرعی کسی کو نہیں حاصل ہوتا

اقامت نظام اسلامی کے اصول "نصب" پر مبنی ہونے کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ازروئے شریعت اسلامیہ و دستور مملکت ایمانیہ مملکت کی سربراہی کا حق کسی کو نہیں

حاصل ہوتا۔ سربراہ کو خلیفہ کہئے ' یا ملک ' یا صدر یا امام یا آمر (ڈکٹیٹر) یا اور کسی نام سے موسوم کیجئے ' اس منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی شخص کو اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق یہ کہنے کے کا حق نہیں کہ وہ (یا فلاں) اس کا حق دار یا احق (زیادہ حق دار) ہے۔ واضح کیا جاچکا ہے کہ "نصب" کے معنی تقرر یعنی کسی پر ذمہ داری اور خدمت کا بوجھ رکھنے کے ہیں ۔ اس کے معنی کسی کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے نہیں ہیں۔ اگر کسی کو کوئی نعمت دینا ہو تو استحقاق ' کا سوال پیدا ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے ۔ اگرچہ اس کا پیدا ہونا اس صورت میں بھی ضروری نہیں ہے۔ تاہم اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی خدمت کسی کے سپرد کی جائے اور اس پر کسی ذمہ داری کا بوجھ رکھا جائے تو اس میں استحقاق کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کسی مزدور کے متعلق کبھی یہ نہیں کہا جاتا اور نہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ سر پر وزنی ٹوکرا اٹھانے کا مستحق ہے ۔ نہ کبھی دو مزدوروں کے متعلق یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ ان میں کون زیادہ بوجھ اٹھانے کا "احق" ہے۔ بار خلافت و امامت ' یا زیادہ عام الفاظ میں بار حکومت و ثقل ولایت مملکت بھی اسلام کے نزدیک ایک خدمت ' ذمہ داری اور بوجھ ہے ' جسے اٹھانے میں کسی حقدار کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جمہور اہل اسلام اس منصب پر کسی شخص کا تقرر (APPOINTMENT) کرکے یہ بار اس پر رکھ دیتے ہیں ۔ جسے اٹھانے کے لئے کسی شرعی استحقاق یا شرعی حقدار کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ۔ طریق نصب پر جو اہلسنت کا ایک شعار ہے ۔ اس زاویئے سے بھی غور کیجئے کہ وہ استحقاق و خلافت کے نظریئے کے ساتھ کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا اور اس کے ساتھ جمع ہی نہیں ہوسکتا ۔ اگر کوئی شخص خلافت و امامت کا شرعی استحقاق رکھتا ہے تو اسے نصب کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اس کے نصب کے معنی کیا ہیں ؟ وہ تو خود بخود اس منصب پر فائز ہوجائے گا ۔ اور عام مسلمانوں کو بشمول ارباب حل و عقد اسے خلیفہ تسلیم کرنا پڑے گا ۔ واضح بات ہے کہ تسلیم کرنے کے معنی نصب کرنا نہیں ہیں ۔ اس سے بھی عیاں ہے کہ اہل سنت جو نصب کو اقامت خلافت و حکومت کا طریقہ اور ذریعہ کہتے ہیں ' کسی کے حقدار خلافت ہونے کا تصور ہی نہیں کرسکتے ۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ استحقاق خلافت یا عام الفاظ میں سربراہ مملکت اسلامیہ بننے کا استحقاق ازروئے کتاب و سنت کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے اور ازروئے شریعت بعض افراد بعض دوسروں سے سربراہی مملکت اور منصب خلافت کے لئے دوسروں سے احق ہوسکتے ہیں وہ اپنے دعوے کی دلیل پیش کریں ۔ اور کتاب و سنت سے استحقاق اور احق ہونے کا اپنا نظریہ ثابت کریں۔ حق یہ ہے کہ ایسی کوئی دلیل انہیں

قیامت تک نہیں مل سکتی او ران کا یہ بے دلیل دعویٰ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہی سمجھا جائے گا۔

استحقاق خلافت کا تصور بے دلیل ہونے کے علاوہ خلاف دلیل شرعی بھی ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں ایسے دلائل ملتے ہیں جو اس دعوے کو باطل اور اسلامی تعلیم کے خلاف ثابت کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں حضرت طالوت رضی اللہ عنہ کو ملک بنانے کا واقعہ پڑھئے۔

حضرت سموئیل علیہ السلام نے جب حضرت طالوتؓ کو ان پر ملک مقرر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا کہ:۔

انی یکون لہ الملک علینا و نحن احق بالملک منہ ولم یؤت سعۃً من المال۔ (البقرہ: ۲۴۷)

"ان کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے حالانکہ ان کی نسبت ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی"

اللہ کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی تردید فرمائی اور فرمایا:۔

قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہ بسطۃً فی العلم والجسم واللہ یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم۔ (البقرہ)

"ان نبی (علیہ السلام) نے (جواب میں) فرمایا کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے دوسرے یہ کہ علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہے دے۔ چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ وسعت دینے والا اور خوب جاننے والا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوتؓ کو حکمرانی اور سپہ سالاری کی اعلیٰ صلاحیت دی ہے۔ (۱) اس لئے انہیں ملک بنانا چاہئے۔ ملک کا حق کسی کو نہیں حاصل ہوتا۔ اس

---

(۱) واضح رہے کہ اس آیت میں بعثت سے مراد بعثت تکوینی ہے۔ بعثت تشریعی مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ اول تو بعثت تشریعی انسانوں میں انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہوتی۔ اور طالوتؓ نبی نہیں تھے، دوسرے یہ کہ اگر بعثت تشریعی

لئے کسی کے احق بالملک ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا نہیں ہوتا ۔ تمہارا اقتدار پر اپنا حق جتانا اس کے حقدار ہونے کا دعویٰ کرنا بالکل باطل ہے ۔ کیونکہ کوئی شخص شرعاً اس کا حقدار نہیں ہوتا ۔ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت تکوینی سے جسے چاہتا ہے یہ منصب عطا فرماتا ہے ۔ کسی کو شرعاً اس کا حق نہیں ہوتا اور کوئی اس کا مطالبہ نہیں کرسکتا

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی اسلامی مملکت کی سربراہی کے منصب پر کسی کو کوئی حق نہیں حاصل ہوتا ۔ کسی کو اس پر اپنا یا کسی دوسرے کا حق جتانا بالکل خیال باطل ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہے ۔ نصب امام کا حق جمہور اہل اسلام کو حاصل ہوتا ہے ۔ وہ جسے چاہیں خلیفہ اور امام منتخب کریں ۔ کسی کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ یہ منصب میرا حق ہے۔ نہ کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ فلاں شخص کا حق ہے یا تھا ۔ اور اسی کو ملنا چاہئے تھا ۔ اس قسم کے دعوے اور مطالبے یا اعتراضات شرعاً و عقلاً ہر طرح باطل بلکہ داخل معصیت ہیں ۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیث بھی قابل ذکر ہے :۔

اسمعو واطیعو ولو امر علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ
(بخاری ص ۱۰۵۷ جلد دوم کتاب الاحکام باب السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ)

"اگر تمہارے اوپر کوئی ایسا حبشی امیر مقرر کردیا جائے جس کا سر منقی کی طرح ہو (یعنی بہت چھوٹا ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بہت کم رد اور بے وجاہت و بے وقار ہو) تو بھی اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرتے رہو۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمہور اہل اسلام اگر کسی شخص کو اپنا امیر یا امام و

ہوتی تو بنی اسرائیل کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ باقی رہتی۔ انکار کرتے تو یہ عصیان ہوتا۔ نیز حضرت سموئیل علیہ السلام انہیں اس کی تعمیل کا حکم دیتے۔ مشورہ نہ دیتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت طالوتؑ کی بعثت ملک کے منصب پر بعثت تکوینی تھی۔ حضرت سموئیل علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوتؑ کو منصب امامت و خلافت کی اچھی صلاحیت عطا فرمائی ہے اور وہی ذہنی و جسمانی دونوں اعتبارات سے اس منصب کے لئے موزوں ہیں ۔ اس لئے تم انہیں اپنا سربراہ اور ملک تسلیم کرو ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ملک بنانا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ یہ ہدایت تھی۔ کوئی حکم نہ تھا اسی لئے مخاطبین کو عذر کی ہمت ہوئی اور نبی علیہ السلام نے ان کے عذر کا جواب دیا۔

خلیفہ بنالیں جو بظاہر اس منصب کی کماحقہ ' صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کی امامت و خلافت بھی منعقد ہوجائے گی اور ان کے نصب سے اس امام یا خلیفہ یا صدر وغیرہ کی اطاعت واجب ہوگی۔ اور کسی کو اس مطالبے کا حق نہ ہوگا کہ میں اس سے زیادہ اس منصب کا حق دار ہوں یا یہ حق فلاں شخص کا تھا جو اس سے باعتبار صلاحیت حکمرانی یا تفقہ زیادہ ہے۔ اسی کو ملنا چاہئے۔ اس قسم کے سب اقوال دعاوی و اعتراضات بالکل باطل اور معصیت کے دائرے میں داخل ہیں۔

"نصب" سے پہلے تو کسی شخص کو بھی منصب خلافت و امامت پر فائز ہونے کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا لیکن جب قوم اس کا تقرر کردے اور اسے تخت خلافت پر بٹھادے تو اسے اس منصب امامت پر قائم و باقی رہنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اور کسی فرد یا جماعت ' بلکہ ' جمہور مسلمین کے لئے بھی جائز نہیں رہتا کہ وہ اسے بغیر کسی ضرورت شرعی کے معزول کردیں۔ بغیر ضرورت شرعی اسے اس منصب سے معزول کرنے کی کوشش کرنا شرعاً ممنوع اور معصیت ہے۔ اگر جمہور اہل اسلام کے نمائندے یعنی ارباب حل و عقد اسے بالاتفاق معزول کردیں تو وہ معزول ہوجائے گا لیکن معزول کرنے والے عاصی اور گناہ گار ہوں گے۔ اسے معزول کرنے کے جواز کے لئے دلیل شرعی ہونا چاہئے۔ اگر دلیل شرعی نہیں ہے تو یہ عزل ناجائز اور معصیت ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب امام کا انتخاب مستقل طور پر کیا گیا ہو۔ تقرر اگر عبوری ہے تو اسے بغیر کسی ضرورت شرعی کے بھی معزول کرنا معصیت نہیں ہے۔ جمہور اہل اسلام کو آئینی طریقہ سے امام کو معزول کرنے کا حق ہر حالت میں ہے لیکن بغیر ضرورت شرعی ' اسے معزول کرنا معصیت ہے۔ عبوری تقرر کی صورت میں چونکہ تقرر کامل ہوا ہی نہیں اس لئے خلیفہ کو حق بقاء بھی نہیں حاصل ہوا۔ اس لئے اسے معزول کرنا اس کی اور مملکت (اسٹیٹ) کی حق تلفی اور معصیت نہیں ہے۔

بظاہر شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جو شخص متقی ہونے کے ساتھ حکمرانی کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ رکھتا ہو ' وہ مملکت کی سربراہی کے لئے "احق یعنی زیادہ حقدار ہے۔ اور ارباب حل وعقد پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ بنائیں۔ اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے کہ تقویٰ کے ساتھ صلاحیت کار زیادہ ہونے کی وجہ سے کسی شخص کو منصب امامت پر فائز ہونے کا حق ' حاصل ہوجاتا ہے ' تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حق اخلاقی ہوتا ہے۔ شرعی یعنی قانونی حق نہیں ہوتا۔ اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ شرعاً" وہ خود یہ مطالبہ کرسکتا ہے

کہ وہ منصب امامت کا زیادہ مستحق ہے اور نہ کوئی دوسرا شخص جمہور سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ اسی کو خلیفہ و سربراہ بنانا چاہئے کیونکہ وہ اپنی صلاحیت عمل اور اپنے تقویٰ کی وجہ سے اس کا حق رکھتا ہے نیز اس بارنے میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ شرعاً اس مطالبہ کا اسے یا اس کے لئے کسی دوسرے کو کوئی حق حاصل نہیں ۔ اگر کسی کو دعویٰ ہو کہ اخلاقی حق کے مطالبہ کا حق بھی حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کی کوئی دلیل شرعی پیش کرے ۔ ان شاء اللہ قیامت تک اسے اس کی کوئی دلیل نہ مل سکے گی ۔ ہم نے شرعی حق کی نفی کی ہے ۔ سربراہی کا حق شرعی کسی کو بھی نہیں حاصل ہوتا ۔ اخلاقی حق اگر حاصل بھی ہو تو بے سود ہے کیونکہ اس کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں حکمرانی کی صلاحیت کے اعتبار سے اپنے سب معاصرین پر فائق ہوں یا میرے ملی و دینی خدمات اپنے معاصرین سے زیادہ ہیں یا میں تقویٰ میں بھی ان سب پر فائق ہوں ۔ مگر اس کے اس سمجھنے کے باوجود ارباب حل و عقد نے اسے خلیفہ اور سربراہ مملکت نہیں مقرر کیا ، تو بھی اسے نصب امام کرنے والوں ، پر اعتراض کرنے کا یا اپنے استحقاق کا دعویٰ کرنے کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا ۔ اسی طرح کسی دوسرے کو بھی (خواہ کوئی فرد ہو یا جماعت) یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کے اس فعل پر معترض ہو ، یا ان سے افضل شخص نصب کرنے کا مطالبہ کرے یا **مفضول** شخص کی امارت کو ناجائز کہے۔ شرعاً وہ **مفضول** شخص جس کا انتخاب جمہور اہل اسلام خلافت و امامت یعنی مملکت کی سربراہی کے لئے کریں جائز خلیفہ اور حکمران ہے ۔ اور اس کی اطاعت حدود شرعیہ کے اندر واجب ہے ۔ اور اس کی مخالفت ناجائز اور ممنوع ہے ۔

خلفاء راشدین شرعی استحقاق کی بناء پر نہیں منتخب کئے گئے تھے

حضرات خلفاء راشدین **مھدیین** یعنی حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علی ، حضرت حسن ، حضرت معاویہ رضی اللہ **عنھم** و رضوا عنہ کا منصب امامت و خلافت کے لئے انتخاب اس بناء پر نہیں کیا گیا تھا کہ یہ حضرات اس منصب کا شرعی استحقاق رکھتے ہیں ، یا شرعاً یہ حضرات اس منصب کے لئے " احق " و اقدم ہیں ۔ یعنی ان میں سے کسی بزرگ کو یہ خیال کرکے اس منصب پر نہیں مقرر کیا گیا تھا کہ اگر ہم ان کے سوا کسی دوسرے کو مقرر کریں گے تو اس سے ان کا کوئی حق فوت ہوجائے گا ۔ بلکہ ارباب حل و عقد نے ان کا تقرر مناسب سمجھا اور کیا ۔ انہیں اس کا کوئی استحقاق حاصل نہ تھا ۔ اگر

جمہور مسلمین ان کے بجائے دوسروں کا تقرر کردیتے تو وہ بھی جائز ہوتا ۔ اور ارباب حل و عقد پر کوئی گناہ نہ ہوتا۔ مثلاً اگر صدیق اکبر حضرت ابو بکر کرم اللہ وجہہ کے بجائے وہ حضرت سعد بن عبادہ ' یا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما یا اور کسی کو خلیفہ بنالیتے تو ان کے لئے جائز تھا اور ان حضرات کی خلافت بالکل صحیح ہوتی ۔ لیکن ان حضرات صحابہؓ نے جو اس وقت پوری امت مسلمہ کے قائد او رنمائندے تھے ' ان حضرات میں مختلف وجوہ ترجیح کی بناء پر ان حضرات کو ترجیح دی اور حکمرانی ان کے سپرد کی ۔ اس لئے یہ خلیفہ اور سربراہ مملکت اسلامیہ کے منصب پر فائز ہوگئے ۔ اگر ارباب حل و عقد انہیں نصب نہ کرتے تو یہ اس منصب پر فائز نہ ہوسکتے ۔ اور شرعاً و اخلاقاً انہیں یا ان کے کسی حامی کو کسی شکایت یا اس منصب کے لئے کسی مطالبے کا حق نہ ہوتا ۔ حاصل یہ کہ خلیفہ و امام کا نصب و عزل کلیتہً جمہور مسلمین کے اختیار میں ہے ۔ وہ جسے چاہیں اس منصب پر مقرر کریں ' اور جب چاہیں اسے معزول کردیں ۔ کسی شخص کو کسی صورت میں بھی امامت و خلافت کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا ہے ۔ نہ شرعی نہ اخلاقی ۔ جس طرح یہ حق کسی کو اپنی ذاتی قابلیت و صلاحیت کی بناء پر نہیں حاصل ہوتا اسی طرح نسب ' یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رشتہ ناطہ رکھنے کی وجہ سے بھی نہیں حاصل ہوسکتا ۔ اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار اور غیر دونوں بالکل یکساں ہیں۔ کوئی بھی حقدار خلافت یا " احق بالخلافتہ " نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح سابق امام (حکمراں) سے کوئی رشتہ (مثلاً حکمران کا بیٹا ہونا) بھی اس معاملے میں بالکل بے اثر ہوتا ہے ۔ (۱)

---

(۱) ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض اسلامی مملکتوں میں جہاں قوانین شرعیہ کا پورا نفاذ ہے ۔ یہ قاعدہ مقرر ہے کہ باپ کے بعد بیٹا (یا بھائی) حکمراں ہوتا ہے ۔ جسے وہ اپنی حیات میں جمہور اہل اسلام کے نمائندوں کے مشورے سے ولی عہد مقرر کردیتا ہے ۔ اور اسی کو سلطنت کا حقدار سمجھا جاتا ہے ۔ اور علماء اسے جائز سمجھتے ہیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ التزام خود قوم کرتی ہے اور دستور حکومت میں اس قسم کی دفعہ داخل کی جاتی ہے جس کی بناء پر اسے یہ حق دیا جاتا ہے ۔ شریعت اس کا کوئی حکم نہیں دیتی مگر ایسا دستوری حق دینے سے مانع بھی نہیں اختیار جمہور اہل اسلام ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے اگر وہ چاہیں تو اس دستوری قانون کو منسوخ بھی کرسکتے ہیں ۔ اور اس حق کو واپس بھی لے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ حق جمہور دیتے ہیں ۔ شریعت نہیں دیتی ۔ البتہ شریعت جمہور کو اس حق کے عطا کرنے کا حق دیتی ہے ۔

یہ جواب تو یہ تسلیم کرکے دیا گیا ہے کہ اہلیت منصب (QUALIFICATIONS) میں زیادتی و برتری ہونے کی بناء پر شرعاً" کسی کو اس منصب کا کوئی حق بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ جسے ہم نے "اخلاقی حق" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن غور کرنے اور کتاب و سنت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً اس حق و استحقاق کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔

بالفاظ دیگر اخلاقی حق شرعاً کوئی چیز نہیں۔ تحقیق مقام یہ ہے کہ حقوق عطا کرنا شریعت مقدسہ اسلامیہ کا کام ہے۔ کسی فرد یا جماعت کو کسی دوسرے فرد یا دوسری جماعت پر خود بخود کوئی حق نہیں حاصل ہوجاتا۔ بلکہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس اصول کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ کسی شخص کو دنیا کی کسی شے میں کسی تصرف کا بھی کوئی حق اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک شریعت الٰہیہ اسلامیہ اسے یہ حق عطا نہ کرے۔ ایک نابالغ بچے کو شریعت مقدسہ یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال کسی کو ہبہ کرسکے یا اسے فروخت کرسکے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ بچے کا ہبہ اور اس کی بیع دونوں تصرفات کالعدم ہوں گے۔ اور ولی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اسے ان تصرفات سے باز رکھے۔ حالانکہ وہ مال اسی بچے کی ملکیت ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ جو اس اصول کو خوب واضح کردیتی ہیں۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ فرد یا جماعت کا کوئی حق کسی دوسرے پر اسی وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب اس کا ثبوت شریعت اسلامیہ سے ہو۔ اگر وہ اصول شریعت سے ثابت نہیں تو وہ قابل تسلیم و قابل اعتناءنہیں ہے۔ حق کے وجود کے لئے شریعت اسلامیہ' اور قانون دینیہ سے اس کا ثابت ہونا ضروری ہے۔ عدم ثبوت کے معنی ثبوت عدم سمجھے جائیں گے۔ جو حق شرعاً ثابت نہ ہو اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اور اس کا دعویٰ بالکل باطل ہے۔

اس مسلمہ اصول اور قاعدے کی روشنی میں "منصب امامت" کے "اخلاقی حق" کے مسئلے پر غور کیجئے صلاحیت سربراہی و حکمرانی اور تقویٰ کی بناء پر کسی شخص کے لئے منصب خلافت یا امارت پر فائز ہونے کا حق کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں۔ پورے قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے اور احادیث صحیحہ مقبولہ کا پورا ذخیرہ دیکھ جایئے۔ آپ کو کہیں بھی یہ حکم نہ ملے گا کہ جو شخص متقی اور منصب امامت کی اہلیت رکھتا ہوا اسے اس اہلیت اور اپنے تقویٰ کی وجہ سے اس منصب پر فائز ہونے کا کوئی حق حاصل ہوجاتا ہے۔ یا اس اہلیت و تقویٰ میں دوسروں پر فوقیت و برتری رکھنے کی وجہ سے اس کے اس حق میں کوئی

اضافہ ہوجاتا ہے - جب یہ حق ہی شرعاً ثابت نہیں تو اس کی بناء پر اس منصب کا دعویٰ کرنا خود اس کے لئے یا اس کے کسی حامی کے لئے کس طرح ثابت ہو سکتا ہے ؟ ثابت ہونا تو کجا اس قسم کا دعویٰ اور اسکے حصول کی کوئی کوشش تو شرعاً جائز بھی نہیں کہی جاسکتی - جبکہ وہ صرف اسی مذکورہ بالا بنیاد پر مبنی ہو کسی شخص کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ یہ کہے کہ " میں فلاں شخص یا دوسروں سے زیادہ اس کام کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہوں ' اور متقی بھی ہوں اس لئے مجھے اس منصب پر فائز کرنا چاہئے - یعنی مجھی کو خلیفہ اور امام یا امیر یا صدر مملکت منتخب کرنا چاہئے - یہ میرا حق ہے - " جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ غلط اور شرعاً مردود ہے - بلکہ بعض استثنائی صورتوں میں کو چھوڑ کر معصیت ہے - وہ استثنائی صورت یہ ہے کہ اس دعوے کی محرک جب اقتدار و ملک نہ ہو بلکہ یہ مبنی بر خلوص ہو یعنی وہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی اسی میں سمجھتا ہو کہ وہ خود ان کا سربراہ بن جائے - تاکہ دین و ملت کی خدمت کرسکے - اس کے نزدیک کوئی دوسرا اس خدمت کا اہل نہ ہو - اس صورت میں وہ اپنے خدمات پیش کرسکتا ہے مگر اس منصب پر فائز ہونے کا مطالبہ نہیں کرسکتا - دوسری استثنائی صورت یہ ہے کہ وہ خود اس منصب کا طالب نہ ہو لیکن جمہور اہل اسلام اس سے یہ خدمت لینا چاہیں اور اس سے باصرار کہیں کہ اس خدمت اسلام کے لئے تیار اور راضی ہوجاؤ - ایسی صورت میں اس کے لئے جائز ہے کہ اس منصب کے لئے خود کو پیش کردے - ان صورتوں میں اسے معصیت کا مرتکب نہیں کہا جائے گا مگر اس دعوے اور مطالبے کا حق اسے حاصل نہ ہوگا - اس کے دعوے اور مطالبے کو بہرحالت غلط ' بے جا' اور خلاف شریعت قرار دیا جائے گا اور بظاہر خلاف شریعت ہونے کی وجہ سے اسے معصیت ہی کہا جائے گا۔

اس مسئلے کی ہم نے جو تفصیل پیش کی ہے اس کی صحت میں جسے شک ہو وہ اپنی دلیل پیش کرے۔ ہم نے ایک دعوے کی نفی کی ہے - ہم نے یہ کہا ہے کہ صلاحیت عمل اور تقویٰ کی بناء پر شرعاً کسی کو منصب خلافت و سربراہی مملکت پر فائز ہونے کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا - اس لئے اخلاقی حق ' درحقیقت اس مسئلے میں لفظ بے معنی ہے ' اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ شریعت اسے تسلیم ہی نہیں کرتی - ہم نے کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے - اس لئے جو اس حق کی صحت یا اس کے وجود کے دعویدار ہوں بار ثبوت ان پر ہے - اگر ان کے پاس اس کی کوئی دلیل شرعی ہو تو پیش کریں - اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو ان کا

دعویٰ باطل ہے۔ اور ہم نے جو کچھ اس سلسلہ میں عرض کیا ہے وہ حق ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ محض عقلی دلیل کافی نہیں۔ دلیل شرعی ہونا چاہئے۔ اس حق کے مدعیوں کو اپنا دعویٰ کتاب و سنت سے ثابت کرنا چاہئے۔ دلیل شرعی کے بغیر ان کا دعویٰ نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔

مسئلہ اہم ہے اس لئے ہم نے اس کی بحث میں یہ طوالت گوارہ کی۔ مندرجہ بالا بحث اگرچہ فیصلہ کن ہے مگر اس پر اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ زیر بحث مسئلے میں مدعیان استحقاق کا دعویٰ محروم ثبوت ہونے کی وجہ سے تو باطل ہے ہی۔ اس کے خلاف بھی دلیل شرعی موجود ہے اس دلیل کے تذکرے سے اس کا بطلان اور ہمارے بیان کا حق اور صحیح ہونا اور زیادہ روشن ہوجائے گا۔

حضرت طالوت رضی اللہ عنہ کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں اس بحث کے دوران ہوچکا ہے۔ جب بنی اسرائیل کے بعض خاندانوں نے سلطنت اور ملک پر اپنا حق جتایا تو اس دور کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام نے اس کے جواب میں حضرت طالوتؓ کے امتیازی اوصاف اور اہلیت (QUALIFICATIONS) کا تذکرہ فرماکر ارشاد فرمایا :۔

" واللہ یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم ○ "

" اللہ تعالٰی اپنا ملک جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالٰی خوب جاننے والا ہے۔ "

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان کے دعوے کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ ان ان اوصاف کی وجہ سے طالوتؓ " احق بالملک " ہیں۔ ان کی صلاحیت کار اور ان کے تقویٰ کی بناء پر ان کے لئے حکمرانی، اور ملک و سربراہی مملکت کے منصب کا حق نہیں ثابت کیا۔ اگر ان کی صلاحیت عمل کی وجہ سے انہیں " حق سربراہی " حاصل ہوتا تو حضرت ممدوح ضرور یہ فرماتے کہ وہ اس منصب کے لئے تم سب سے " احق " یعنی زیادہ مستحق ہیں۔ انہوں نے " احق بالملک " ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس کا جواب یہی تھا کہ تم نہیں بلکہ " طالوتؓ احق بالملک " ہیں۔ کیونکہ ان میں حکمرانی کی ایسی اعلیٰ صلاحیت ہے جو تم سے کسی میں نہیں ہے۔ حضرت سموئیل علیہ السلام کا یہ جواب نہ دینا اس امر کی دلیل ہے کہ اس صلاحیت کی وجہ سے طالوتؓ کو حقِ ملک نہیں حاصل ہوا تھا، اور آنحضرت علیہ السلام بھی اس بناء پر ان کا کوئی حق نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالٰی کے اس ارشاد سے کہ " اللہ تعالٰی اپنا ملک جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے " اس دلیل کو مزید تقویت و

تائید حاصل ہوتی ہے ۔ اس آیت نے یہ بات صاف کردی کہ " ملک " (خواہ اسے منصب خلافت و امامت کہئے یا صدارت و سلطنت وغیرہ) کے اوپر صلاحیت سربراہی یا تقویٰ و دینداری ' یا اور کسی وجہ سے کسی کو حکمرانی و سربراہی کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا ۔ یہ جمہور اہل اسلام اور ارباب حل و عقد یعنی ان کے قائدین اور نمائندوں کا حق ہے کہ وہ جسے چاہیں سربراہ مملکت مقرر کریں ' کسی کو اپنا یا کسی دوسرے کا حق جتانے یا جمہور یا ان کے نمائندوں پر اعتراض کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے ۔ ارباب حل و عقد ' (یعنی جو لوگ جمہور اہل اسلام کے نمائندے اور قائد ہوں) دو شخصوں یا چند اشخاص میں سے جو سربراہی مملکت کے لئے موزوں اور مناسب معلوم ہوتے ہیں ایک شخص کو خلیفہ مقرر کرتے ہیں ۔ دوسرا شخص اس سے زیادہ اس منصب کی صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے اور اس سے زیادہ متقی بھی ہے ۔ مگر یہ لوگ اسے نظر انداز کرکے ایک ایسے شخص کو اس منصب پر مقرر کرتے ہیں جو صلاحیت کار تو رکھتا ہے اور جس حد تک تقویٰ مسلمان پر فرض ہے ' اس حد تک تقویٰ کی صفت سے بھی موصوف ہے مگر ان اوصاف میں اول الذکر (یعنی جسے نظر انداز کیا گیا ہے) کے برابر نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے فروتر ہے ۔ اس صورت میں ان ارباب حل و عقد کا یہ فعل جائز سمجھا جائے گا یا نہیں ؟ جواب یہ ہے کہ ان کا یہ فعل بالکل جائز ہے ' شرعاً ان پر کوئی ملامت نہیں ۔ شریعت نے یہ اختیار اور حق انہیں کو دیا ہے کہ وہ جسے چاہیں منتخب کریں ان پر کسی کو کسی اعتراض کا کوئی حق نہیں زیادہ صلاحیت کار (**کوالیفکیشنز**) رکھنے کی وجہ سے کسی کو شرعاً کوئی حق اس منصب کا نہیں حاصل ہوجاتا ۔ جمہور اہل اسلام کو اختیار ہے کہ جسے چاہیں مقرر و منتخب کریں ۔ کسی کو اپنا یا کسی دوسرے کا حق جتانے کا حق نہیں ۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مسئلے میں (یعنی مسئلہ خلافت و سربراہی مملکت میں) اخلاقی حق شرعاً کوئی چیز نہیں ہے ۔ اور صلاحیت یا کوئی خاص فضیلت رکھنے کی بناء پر کسی شخص کے لئے مملکت اسلامیہ کا سربراہ بننے کا کوئی حق سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا نہ شرعی نہ اخلاقی ۔ جو ہمارے اس بیان کو غلط کہے اور اس کے خلاف کا دعویٰ کرے وہ اپنے دعوے کی دلیل پیش کرے ۔ اور ہماری دلیل کی مدلل تردید کرے ۔

وجہ اشتباہ

صلاحیت کار اور قابلیت کی زیادتی اور برتری کی وجہ سے اخلاقی حق حاصل ہونے کا

وہم و شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ وجہ ترجیح اور حق کے درمیان فرق کرنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ حالانکہ یہ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں ۔ وجہ ترجیح کے معنی استحقاق اور ثبوت حق نہیں ہیں ۔ کسی کی صلاحیت کار (کوالیفکیشنز) نسبتاً زیادہ ہونے کی بناء پر ارباب حل و عقد (جمہور اہل ایمان) کو اسے دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے ایک وجہ اور دلیل حاصل ہوجاتی ہے ۔ جس کی بناء پر انہیں حق ترجیح حاصل ہوجاتا ہے ۔ یہ حق جمہور او راس کے نمائندوں کو ملتا ہے نہ کہ اس شخص کو جسے نصب کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے ۔ دونوں باتوں کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص میں تقویٰ کے ساتھ صلاحیت حکمرانی زیادہ معلوم ہو اسے منصب امامت و قیادت پر فائز ہونے کا کوئی حق حاصل ہوتا ہے ۔ اور وہ اس کے لئے احق ہوتا ہے ۔ جسے اخلاقی حق سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ فی الحقیقۃ اسے کوئی بھی حق نہیں حاصل ہوتا نہ قانونی اور نہ اخلاقی بلکہ حق ترجیح اسے منتخب کرنے والوں ' یعنی جمہو راہل اسلام کے نمائندوں اور قائدین کو (جنہیں ارباب حل و عقد کہا جاتا ہے) حاصل ہوجاتا ہے ۔ انہیں اختیار ہے کہ وہ اس حق سے کام لیں یا نہ لیں ۔ دونوں صورتوں میں ان پر کوئی ملامت نہیں ۔ وہ اگر کسی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے کو نظر انداز کرکے کم صلاحیت رکھنے والے کو سربراہ مملکت مقرر کردیں تو انہیں اسکا حق ہے۔ اور وہ کسی معصیت یا ناانصافی کے مرتکب نہیں کہے جاسکتے ۔ مرتکب معصیت اس وقت کہے جائیں گے جب وہ دیدہ و دانستہ ایسے شخص کو اس منصب پر مقرر کریں جو اس کے لئے بالکل نا اہل ہو ' یا متقی ہونے کے بجائے فاسق و فاجر ہو ۔

یہ اصول ایسا ہے جو عام طور پر نظم مملکت کے بارے میں عملاً تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ایک مثال یہ ہے کہ سول سروس کے اعلیٰ امتحان میں بیٹھنے کے لئے گریجویٹ ہونا لازم ہے ۔ فرض کیجئے دو امیدوار پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہوتے ہیں ۔ ایک صرف بی اے ہے ۔ دوسرا ایم اے پی ایچ ڈی ہے ۔ اگر کمیشن اس گریجویٹ کو پی ایچ ڈی پر ترجیح دیتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بی اے کو اس سے اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے پر ترجیح دی جاتی ہے اور اسکا یہ حق نہیں تسلیم کیا جاتا کہ وہ اونچی ڈگریاں اور کوالیفکیشنز رکھنے کی وجہ سے اس سروس کا ' یا اس کے امتحان میں شریک ہونے کا اس بی اے سے زیادہ حقدار ہے ۔ اسے اس قسم کے دعوے کا کوئی حق

نہیں ہوتا۔

اس مثال سے زیر بحث مسئلہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ جس طرح موجودہ زمانہ اور حالات میں پبلک سروس کمیشن پر انتخاب و تقرر ملازمین حکومت کے بارے میں صرف اتنی پابندی عائد ہے کہ وہ امیدوار میں ان اوصاف (QUALIFICATIONS) کو تو ضرور ملحوظ رکھے جو ازروئے دستور ملکی اس میں پائے جانے لازم ہیں۔ لیکن نفس ان اوصاف کا پایا جانا کافی ہے۔ یہ کسی دوسرے امیدوار سے زیادہ ہیں یا کم؟ اس سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ وہ کم کوالیفکیشنز رکھنے والے کو مقرر کردے اور زیادہ صلاحیت اور ڈگریاں رکھنے والے کی درخواست رد کردے۔ اس کا اسے پورا اختیار اور حق حاصل ہے۔ اس کے بارے میں اس سے کوئی باز پرس نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح اسلامی نظام میں ارباب حل و عقد کو پورا پورا اختیار اور حق حاصل ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے کو نظرانداز کرکے، اس سے کم اور معمولی صلاحیت رکھنے والے کو خلافت و امامت کے لئے نامزد کر دیں۔ اس بارے میں ان پر بھی اس کے سوا کوئی پابندی نہیں عائد ہوتی کہ وہ اس امیدوار میں اس کام کی اہلیت اور عدالت دیکھیں۔ یہ اوصاف مفقود ہوں تو اس کا تقرر تو ہوجائے گا مگر اسے مقرر کرنے والے گناہ گار ہوں گے لیکن اگر یہ اوصاف اس میں فی نفسہ موجود ہیں تو ان کی اضافی کمی بیشی کا کوئی اثر ان کے اختیار پر نہیں پڑسکتا۔ حق تقرر و انتخاب انہیں پورے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہوتا۔

مندرجہ ذیل احادیث اس مضمون پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:۔

(۱) "۔۔۔ قال حدثنا عبدالرحمن بن سمرة قال قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم یا عبدالرحمن بن سمرة لاتسئل الامارة فان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اعطیتها من غیر مسئلة اعنت علیها"

(بخاری شریف ج ۲ " کتاب الاحکام باب من سال الامارہ وکل الیها")

۔۔۔ کہا کہ ہم سے (حضرت) عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ نے بیان کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبدالرحمٰن بن سمرہ امارت کا سوال نہ کرنا اگر تمہاری طلب کے بعد وہ تمہیں ملی تو تم اس کے سپرد کئے جاؤ گے اور اگر تمہیں وہ تمہارے سوال کے بغیر (یعنی بغیر طلب اور بغیر کوشش) مل جائے تو اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی لئے) تمہاری اعانت کی جائے گی۔"

(۲) ــ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیمہ فنعم المرضعۃ و بئست الفاطمۃ"
(بخاری باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ)

ــ (حضرت) ابو ھریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ وسلم نے فرمایا بیشک تم لوگ امارت کی خواہش کرو گے اور وہ سبب ندامت ہوگی قیامت کے دن ۔ وہ (امارت) مرضعہ (دودھ پلانے والی) تو بہت اچھی ہے مگر دودھ چھڑانے والی (کی حیثیت سے) بہت بری ہے ۔" (یعنی جب امارت زائل ہوتی ہے تو اندیشہ قوی ہوتا ہے کہ امیر پر بہت سی کوتاہیوں اور حق تلفیوں کا بار ڈال جاتی ہے۔ جو قیامت کے دن اس کے لئے وبال ہوگا ۔ خطرے سے عام حالات کے اعتبار سے آگاہ فرمایا گیا ہے ورنہ متقی، عادل اور محتاط امراء پر یہ بار نہیں ہوتا اور انہیں بہت اجر و ثواب ملتا ہے ۔ ممانعت اس کی طلب سے کی گئی ہے ۔ نہ کہ اس کے قبول کرنے سے)

(۳) " ــ عن ابی موسیٰؓ قال دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا ورجلین من قومی فقال احد الرجلین امّرنا یا رسول اللہ وقال الاخر مثلہ فقال انا لا نولی ھذا من سألہ ولا من حرص علیہ "
(ایضاً)

ــ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی قوم کے دو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا (میرے ساتھ جو دو آدمی تھے) ان میں سے ایک نے عرض نے کیا یا رسول اللہ مجھے کہیں کا امیر (حاکم) بنا دیجئے اور دوسرے شخص نے بھی یہی عرض کیا ۔ (ان کے جواب میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم اس عہدے پر کسی ایسے شخص کو نہیں مقرر کرتے

جو اس کا سوال کرے یا اس کی حرص
کرے۔" (۱)

---

(۱) یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ دور حاضر میں تو مختلف ملازمتوں اور سول سروس وغیرہ کے لئے اسلامی ممالک میں بھی درخواستیں طلب کی جاتی ہیں ۔ اور بغیر طلب بھی لوگ درخواست کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا تقرر بھی ہوجاتا ہے۔ اور اس وقت علماء دین ان سب باتوں کو جائز کہتے ہیں کسی نے بھی ان کو ناجائز نہیں کہا ۔ اس کی توجیہ کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حالات بدلنے کی وجہ سے موجودہ طریق کار کو اختیار کرنے کی ضرورت و احتیاج شرعی پیدا ہوگئی۔ اس احتیاج و ضرورت کی بناء پر حکم شرعی میں بھی اصول شریعت کے مطابق تبدیلی ہوئی۔ اور " **الضرورات تبیح المحذورات** " کے اصول کی اتباع کرکے درخواست ملازمت کو جائز قرار دیا گیا ہے جس طرح دین کی تعلیم دینے والے اساتذہ و علماء کے لئے تنخواہ لینا جائز قرار دیا جاتا ہے ۔ اور اسے تعلیم کے بجائے "حبس وقت " کا معاوضہ سمجھا جاتا ہے ۔ تعلیم علم دین کا معاوضہ لینا اب بھی ناجائز ہے ۔ مگر حالات یہ ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد اس وقت نسبتاً بڑھ چکی ہے۔ بلکہ پوری دنیا کی انسانی آبادی کئی گنی بڑھ چکی ہے۔--

مقاصد شرعیہ اور مصالح امت کے حصول اور اسے مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لئے نظام حکومت قائم کرنا اور اسے چلانا موجودہ زمانہ میں افرادی قوت کی کثرت چاہتا ہے ۔ حکومت کے لئے خود اتنی تعداد میں اہل افراد کا انتخاب کرنا اور عوام کے جم غفیر میں سے انہیں شناخت اور ممتاز کرکے باہر لانا عادتاً غیر ممکن اور محال ہے ۔ اس کے علاوہ اس صورت میں حکومت پر جانب داری ' دوست پروری وغیرہ کی بدگمانی بھی ہوسکتی ہے ' جس سے فتنہ و فساد پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے ۔ مزید یہ کہ بدور موجودہ عوام کے معاشی مسئلہ کا حل کرنا اور بے روزگاری کو دور کرنا ' بھی حالات نے بڑی حد تک حکومت کے ذمہ کردیا ہے ۔ اور حصول ملازمت کی درخواست کرنے والے اکثر وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں معاشی ضرورتیں ملازمت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ ان امور پر نظرکرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بدور موجودہ حکومت کی ملازمت کی طلب اور درخواست کرنا " **الضرورات تبیح المحذورات** " کے اصول شرعی کے پیش نظر بلا شبہ جائز اور مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحب ' یا واجب ہے۔ علی ہذا حکومت کے لئے بھی طالب ملازمت کو' ملازمت

ان احادیث میں " امارت " طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ سے کسی ایسے منصب اور عہدے پر اپنے تقرر کی درخواست کرنا یا اور کسی دوسرے ذریعہ سے اس کے حصول کی کوشش کرنا جس میں اقتدار حاصل ہوتا ہو ' خواہ اس اقتدار کا دائرہ بہت تنگ ہو ' شرعاً جائز نہیں۔ اور حکومت اسلامیہ کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس منصب پر کسی ایسے شخص کا تقرر نہ کرے جو اس کا خواہش مند اور طالب ہو ' جب نسبتاً چھوٹے عہدوں اور مناصب کے متعلق شریعت کا یہ ضابطہ ہے تو منصب امامت و خلافت اور سربراہی مملکت پر تو اس ضابطہ کا اطلاق بدرجہ اولیٰ ہوتا ہے۔ اس کی طلب کرنا تو بدرجہ اولیٰ ناجائز اور ممنوع ہے۔ (۱) یہ حکم دوسرے دلائل سے بھی ثابت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سربراہی مملکت اور خلافت و امامت کا حق کسی کو بھی نہیں حاصل ہوتا۔ اگر شریعت میں اس کے استحقاق کا کوئی تصور ہوتا تو اس کی طلب کی مخالفت کیوں کی جاتی؟ ازروئے اصول شریعت اپنے حق کو طلب کرنے اور اس کے حصول

پر فائز کرنا مباح اور جائز ہے۔

لیکن خلافت و امامت اور سربراہی مملکت یا اس قسم کے دوسرے مناصب مثلاً وزارت ' وغیرہ کی طلب اب بھی ممنوع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ اسے طلب کرنے کی کوئی ضرورت موجود نہیں۔ ماتحت ملازمین سے ان کا معاملہ اور ان کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ عام ملازمین حکومت کو منتخب کرنا دشوار ہے ' بخلاف اس کے سربراہ مملکت یا وزراء کا انتخاب کچھ مشکل نہیں۔ نیز اول الذکر کا انتخاب حکومت کرتی ہے بخلاف اس کے سربراہ مملکت کا انتخاب جمہور اہل اسلام کرتے ہیں۔ وہ اس انتخاب سے عاجز نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ سربراہ مملکت خود مملکت (اسٹیٹ) کا نمائندہ ہوتا ہے۔ کسی کو اس کی نمائندگی طلب کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ بخلاف اس کے ملازمین حکومت ' اسٹیٹ کے نمائندے نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ حکومت (گورنمنٹ) کے نمائندے کہے جاسکتے ہیں۔ حکومت اور مملکت میں بہت فرق ہے۔ دونوں کا مفہوم و مصداق الگ الگ ہے۔ مزید یہ کہ اس زمانہ میں حکومت خود ملازمت کے لئے درخواستیں طلب کرتی ہے۔ یہ صورت درحقیقت اس ممانعت کے تحت آتی ہی نہیں۔ اگر حکومت درخواست طلب کرے تو ملازمت کی درخواست کرنا بھی علی الاطلاق جائز ہے ' بخلاف اس کے حکومت کی سربراہی کے لئے حکومت شرعاً درخواست طلب کرنے کی مجاز ہی نہیں۔

کی کوشش کرنے کا حق تو ہر شخص کو ہر صورت میں حاصل ہوتا ہے ۔ اس کے طلب کی ممانعت کرنا اس امر کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ خلافت و امامت اور سربراہی مملکت کا کوئی حق شرعاً کسی کو بھی نہیں حاصل ہوتا ۔ خواہ اس کی طمع کرنے والا اس کی بہترین صلاحیت رکھتا ہو ۔ اخلاقی حق بھی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ اس کی بناء پر بھی اس منصب کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں ' اور اس مطالبے کا کوئی حق کسی کو نہیں حاصل ہوتا ۔ او راس منصب کے لئے کسی کے استحقاق یا حق ہونے کا کوئی تصور ہی اسلام میں نہیں ۔

---

(۱) احادیث مذکورہ بالا کی شرح میں بعض شارحین نے ایک اشکال پیش کرکے اس کا جواب دیا ہے ۔ اشکال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ سے ایک اعلیٰ منصب طلب کیا ۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے ۔ ممکن ہے کہ انہوں نے وحی الہی کی بناء پر منصب طلب کیا ہو ۔ اور یہ ان کی خصوصیت ہو ۔ یا انبیاء اس ضابطے سے مستثنیٰ ہوں ۔ ۔ انہیں اس طلب کا حق حاصل ہو ۔ ان پر دوسروں کو قیاس نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ جواب اپنی جگہ صحیح ہے ۔ لیکن میرے نزدیک یہ اشکال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا ۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود منصب پر تقرر طلب نہیں کیا تھا ' نہ اس کی خواہش تھی ۔ خود بادشاہ نے ان کے سامنے یہ پیشکش کی تھی کہ و حکومت کا کوئی منصب و عہدہ قبول کرلیں اور منصب کے تعین کا خود انہیں اختیار دیا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے اس اس واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے ۔

" قال انک الیوم لدینا مکین امین " ○

" (بادشاہ نے) کہا کہ (اے یوسف) آج سے آپ ہمارے پاس صاحب عزت اور امانت دار ہیں ۔"

(سورہ یوسف)

بادشاہ کی طلب اور خواہش دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے لئے منصب اور عہدے کا انتخاب کرکے اسے مطلع فرمادیا کہ اگر تم مجھے کوئی منصب دینا چاہتے ہو تو مجھے شعبہ مالیات کا افسر اعلیٰ بنا دو ۔ طلب بادشاہ کی طرف سے ہوئی ان کی طرف سے نہیں ۔ انہوں نے صرف منصب کا تعین کیا" وہ بھی اسی کی درخواست پر ۔ اس لئے سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیش آتا ۔ دوسرا اشکال یہ کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ملک اور حکومت ملنے کی دعا کی تھی ۔ اس کا جواب سوال میں موجود ہے ۔

عدالت حکمران کا مسئلہ

اخلاقی حق خلافت و امامت کے مغالطے میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ اس مسئلے سے ان کی ناواقفیت ہے۔ ہم نے جو بحث اس مسئلہ پر کی ہے وہ انہیں اس مغالطے سے نجات دینے کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ انصاف سے کام لیں اور قبول حق سے نہ ہچکچائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خلیفہ کے لئے عدالت شرط ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے متقی ہونا چاہئے۔ لیکن عدالت یا تقویٰ کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ وہ زاہد شب زندہ دار یا تاریک الدنیا درویش ہو۔ یا کمال زہد کی وجہ سے مباحات سے بھی گریزاں ہو۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اس کی زندگی اس طرز حیات کے مطابق گزر رہی ہو جو شریعت مقدسہ نے ایک عام اور ادنیٰ مسلم کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ عقائد درست ہوں۔ فرائض واجبات اور مسنونات موکدہ کا پابند ہو۔ کبائر سے کلیتہً محترز ہو۔ صغائر پر مصر نہ ہو۔ یعنی کسی معصیت صغیرہ کا عادی نہ ہو۔ اگر کبھی شامت نفس سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ سرزد ہوجائے تو اس پر نادم و شرمسار ہو اور صدق دل سے استغفار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے غضب سے خائف ہونے کے ساتھ اس کی رحمت کا امید وار بھی ہو۔ جو شخص اس معیار پر پورا اترتا ہو اسے عادل و متقی کہا جائے گا اور اس سے عدالت کی شرط امامت

حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکومت اور ملک کی طلب مخلوق سے نہیں کی تھی۔ اپنی قوم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے ملک بنالو بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی۔ اس کے لئے دعا کرنے کی ممانعت نہیں فرمائی گئی ہے۔ مخلوق سے طلب کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس فعل سے کوئی اشکال ہی نہیں واقع ہوتا۔ یہ اس موضوع ہی سے خارج ہے۔ علاوہ بریں حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے رسول تھے۔ اس کے ساتھ پہلے ہی سے خلیفہ اور بادشاہ تھے۔ انہوں نے ملک اور سلطنت کی قوت و وسعت بڑھنے کی دعا کی۔ نہ کہ ابتداء سے ملک حاصل کرنے کی۔ اس لئے ان کا معاملہ زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ یہ بھی ملحوظ رہے نبی و رسول کو تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق امارت و سلطنت حاصل ہوتا ہے اس لئے انبیاء کا معاملہ بھی ہمارے مبحث سے خارج ہے

پوری ہوجاتی ہے ۔ اس میں اور ایک زاہد شب زندہ دار قائم اللیل و صائم الدہر میں تکمیل شرط امامت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں باقی رہتا ۔ اس شرط کے بعد اہم ترین اور بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ کار مفوضہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر ایک قائم اللیل و صائم الدہر ' علوم دینیہ میں مجتہد وقت و امام زمانہ اس صلاحیت حکمرانی (STATESMANSHIP) سے محروم ہے اور ایک دوسرا شخص جو علم و کتاب و سنت کے لحاظ سے اوسط درجہ کا عالم ہو اور عملاً عام مسلمان کے مندرجہ بالا معیار پر پورا اترتا ہو ' اس کے ساتھ سیاست و حکمرانی کی صلاحیت رکھتا ہو ' ان دونوں میں سے کسی ایک کو منصب خلافت و امامت کے لئے منتخب کرنا ہو تو ازروئے اصول شریعت دوسرا شخص قابل ترجیح ہے ۔ اول الذکر کی کثرت عبادات اور شدت زہد و اتقاء آخرت میں اس کے درجہ کی رفعت اور اس کے رتبہ کی بلندی کی ضامن ہوسکتی ہیں ۔ لیکن اسے امارت یا کسی منصب حکومت پر فائز ہونے کے لئے وجہ ترجیح نہیں بن سکتیں ۔ دین کی جس خدمت کے لئے نصب خلیفہ ہوتا ہے ' خلیفہ کو اسکا اہل ہونا چاہئے ۔ حکمراں کو جمہور مسلمین عبادات نافلہ کے لئے نہیں مقرر کرتے ' بلکہ تدبیر مملکت کے لئے منتخب کرتے ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حکمرانی اور تدبیر مملکت کی صلاحیتوں میں تفاوت ہوتا ہے کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ارباب حل و عقد کو اسے سب اشخاص پر تقابلی انداز سے نظر کرکے ان میں سے نسبتاً بہترین اور اعلیٰ ترین صلاحیت رکھنے والے کو منصب امامت و خلافت پر فائز کرنا چاہئے ۔ اس مسئلے پر ہم بعنوان مختلف پہلے ہی روشنی ڈال چکے ہیں ۔ اس التزام اور پابندی پر دلیل شرعی کا فقدان یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ شریعت نے جمہور اہل اسلام یا ارباب حل و عقد کو اس کا مکلف نہیں بنایا ہے ' اور ان پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ نصب خلیفہ کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ تدبیر مملکت کی فی الجملہ صلاحیت رکھتا ہو ۔ خواہ یہ صلاحیت ادنیٰ ہی درجہ کی ہو۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ اس حیثیت سے دوسروں پر فضیلت اور فوقیت بھی رکھتا ہو۔ ایک اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے کو نظرانداز کرکے اگر ارباب حل و عقد نے نسبتاً ادنیٰ صلاحیت رکھنے والے کو امام اور خلیفہ مقرر کردیا تو ان پر شرعاً کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ان کا انتخاب صحیح سمجھا جائے گا ۔ اور مقرر شدہ خلیفہ جائز خلیفہ اور امام متصور ہوگا ۔ جب اس کا نصب ہوجائے اور وہ منصب خلافت پر فائز ہوجائے تو اس کی خلافت کی مخالفت شرعاً ممنوع ہوگی ' اور مخالفت کرنے والوں کو مفسد سمجھا جائے گا ۔

اسلامی نظام کی شکل و صورت اور اسے قائم کرنے کے طریق پر مندرجہ بالا بحث سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ خلافت و امامت اور " ملک " میں کوئی فرق نہیں ۔

حکمراں دین اسلام اور ملت اہلسنّت والجماعت کا " ہیرو " ہو۔ قوت و اقتدار پر اسی دین و ملت کے متبعین کا غلبہ ہو ' حدود مملکت میں احکام شرعیہ نافذ ہوں۔ تو وہ مملکت اسلامی کہی جائے گی۔ حکمراں کا لقب خلیفہ ہو یاامام ' یا امیریا سلطان یا ملک یا او رکوئی مناسب لقب ۔ پھر جس طرح حکمراں کے لقب سے شرعاً کوئی عملی اور محسوس فرق نہیں پڑتا اور حکومت (گورنمنٹ) و مملکت (اسٹیٹ) کے متعلق کسی حکم شرعی میں کوئی تغیر نہیں ہوتا ۔ اسی طرح " طریق نصب " یعنی حکمراں کے تقرر کے طریق کے اختلاف سے بھی اس میں کوئی فرق پیش نہیں نمایاں ہوتا ۔ سربراہ مملکت اور جمہور اہل اسلام کے درمیان روابط کی نوعیت ہر حال میں یکساں رہتی ہے ۔ اور دونوں کے شرعی حقوق ' فرائض ' اور اختیارات ہر صورت میں بدستور باقی رہتے ہیں ۔ اصول شریعت کی روشنی میں مملکت کا جو دستور تیار کیا جائے گا وہ ہر حالت میں ان امور کی تقسیم اور ان کا تعین کرے گا ۔

مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا " خلافت " و " ملک " (جسے مودودی صاحب ملوکیت کہتے ہیں) میں فرق پر بہت زور دیتے ہیں ۔ نظام خلافت کو اسلامی اور نظام ملک (یا بقول مودودی صاحب " ملوکیت ") کو غیر اسلامی کہتے ہیں ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی (۱) قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان فرمایا گیا ہے :۔

" یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالقسط " (ص)

" اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے تو آپ لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ فرمایا کیجئے ۔ "

سورہ بقرہ میں انہیں کے متعلق ارشاد ہے :۔

" وقتل داود جالوت واٰتٰہ اللہ الملک والحکمۃ وعلمہ مما یشاء ○ "

(البقرہ : ۲۵۱)

---

(۱) مودودی صاحب نے ملوکیت کا نقشہ تو غیر اسلامی کھینچا پھر اسے خلافت کا قسیم اور مقابل بناکر علی الاطلاق مردود اور مذموم کہہ دیا حالانکہ مذموم اور ناجائز غیر اسلامی ملوکیت ہے نہ کہ ملوکیت علی الاطلاق ۔

" اور (حضرت) داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ تعالی نے انہیں (حضرت داؤد کو) ملک عطا فرمایا اور حکمت عطا فرمائی ' اور جو علم عطا فرمانا چاہا وہ انہیں عطا فرمایا "

آیات سے ظاہر ہے کہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام بیک وقت خلیفہ بھی بنائے گئے اور ملک بھی ۔ اس سے عیاں ہے کہ ملک اور " خلافت " میں محض لفظی فرق ہے ۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں ۔ خلافت اور مملکت کی سربراہی اگر جمہور اہل اسلام کسی خاندان کے ساتھ مخصوص کردیں تو اس سے اس کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اسے خلافت بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اور ملک بھی (یا مودودی صاحب کے الفاظ میں ملوکیت بھی) حکمراں کے لئے لقب تجویز کرنا جمہور مسلمین کے اختیار میں ہے ۔ وہ اسے خلیفہ ' امام ' ملک ' سلطان جو چاہیں کہیں ۔

یہاں ہم اس امر کی طرف مکرر توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ باپ کے بعد بیٹے کے حکمراں ہوجانے یا نصب امام کو ایک خاندان تک محدود کردینے سے کوئی اسلامی مملکت غیر اسلامی مفہوم میں ملک (یا مودودی صاحب کے الفاظ میں ملوکیت) نہیں بن جاتی ۔ دونوں کے درمیان اصولی و عملی واضح فرق عظیم سے قطع نظر طریق قیام کے اعتبار سے بھی دونوں میں واضح فرق ہوتا ہے ۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ غیر اسلامی ملک (بادشاہی یا ملوکیت) میں جسے بادشاہ بنایا جاتا ہے ' اسے اس منصب کا مستحق اور حقدار سمجھا جاتا ہے ۔ بخلاف اس کے اسلام میں کوئی بھی سربراہی مملکت کا حقدار اور مستحق نہیں ٹھہرتا ۔ اسلامی دستور میں کسی کے استحقاق کا کوئی باب ہی نہیں ہے ۔ جیسا کہ ہم مفصل بیان کرچکے ہیں ۔ دونوں کے درمیان یہ بہت اہم بنیادی فرق ہے ۔ دوسرا اصولی فرق یہ ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کا ملک (بادشاہ) ہو جانا غیر اسلامی ملک (یا ملوکیت) میں کسی ایسے مخصوص سبب کی بناء پر ہوتا ہے جس میں جمہور کے ارادے اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ اس قسم کے مختلف نظاموں کے درمیان اس سبب کے تعین میں اختلاف ہے بعض غیر اسلامی بادشاہتوں میں بنیادی تصور یہ ہوتا ہے کہ حدود مملکت کی پوری زمین اور دولت درحقیقت بادشاہ کی ملک ہوتی ہے بانی سلطنت کی یہ مملوکہ سلطنت وراثتاً اس کے جانشین کے طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جسے بادشاہ بنایا گیا ہے وہ بربناء توریث اس منصب کا قانوناً و اخلاقاً مستحق ہے۔ بعض بادشاہتوں میں اسے حق

خداداد (DEVINERIGHT) سمجھا جاتا تھا۔ اسلام میں سرے سے "استحقاق" کا کوئی سوال ہی نہیں نہ کسی کو حق خداداد حاصل ہوتا ہے اور نہ حق وراثت نہ اور کسی وجہ سے حق امامت حاصل ہوتا ہے۔ جمہور مسلمین کسی خاندان کی تخصیص کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ جمہور نے امام کو اسی خاندان سے "نصب" کرنے کا التزام اور اپنے دائرہ انتخاب کو محدود کر لیا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے اس خاندان کو کوئی حق نہیں حاصل ہو جاتا۔ پھر یہ کہ جمہور جب چاہیں اپنے اس فیصلے کو بدل سکتے ہیں۔ نصب شدہ امام کو معزول کرسکتے ہیں۔ اور کسی دوسرے خاندان سے امام منتخب کرسکتے ہیں۔ شرعاً وہ اپنے التزام کے پابند نہیں ہیں۔ ان کی آزادی رائے، اور آزادی انتخاب بدستور قائم رہتی ہے۔ خود ارباب حل و عقد کسی مصلحت شرعی کی بناء پر نصب سربراہ کے دائرے کو کسی خانوادے تک محدود کردیں۔ یعنی دستور خلافت میں اس دفعہ کا اضافہ کردیں کہ سربراہ مملکت فلاں مخصوص خاندان ہی سے مقرر کیا جائے گا۔ تو اس سے مملکت کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسے خلافت کہئے یا ملک۔ سربراہ کو خلیفہ، امیرالمومنین، ملک، سلطان جو چاہے کہئے عملاً اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور متعلقہ شرعی احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جس نظام سیاسی میں سربراہ مملکت دین اسلام اور ملت اہلسنت والجماعت کا تبع ہو اور، حدود مملکت میں احکام شرعیہ اسلامیہ کا نفاذ و رواج ہو۔ تو ایسا نظام اسلامی نظام اور یہ مملکت (STATE) اسلامی مملکت (ISLAMIC STATE) ہے۔

اس کی شکل و صورت جیسی بھی ہو، اور کسی طریقہ سے بھی قائم ہوئی ہو۔ اسلام کے نزدیک مملکت کی شکل و صورت اور اس کے وجود میں آنے کے طریقوں کی فی نفسہ اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کی بناء پر اسٹیٹ کی نوعیت بدل جائے۔ یا متعلقہ احکام شرعیہ میں تغیر ہوجائے۔

اسلام کا سیاسی نظام اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ بضرورت ہے۔ اس لئے بقدر ضرورت پر اکتفاء مناسب ہے۔ مزید تفصیل کی احتیاج نہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ :۔

۱:۔ شریعت اسلامیہ نے اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے۔ نہ کسی مخصوص شکل و صورت کا حکم دیا ہے۔ بلکہ صرف اصول کی تعلیم دی ہے۔ شکل و صورت کو امت کے اجتہاد پر چھوڑدیا ہے۔

۲:۔ اسلام نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے کسی مخصوص طریق کار کا بھی حکم نہیں

دیابلکہ اس کے لئے بھی اصول مقرر فرمادیئے ہیں ۔ ان کی پیروی لازم ہے ۔ طریقہ اقامت امت کے اجتہاد کے سپرد فرمادیا ہے ۔

۳ :۔ نصب امام انتخاب (الیکشن) یا اجتباء (سلیکشن) کے مرادف نہیں ہے بلکہ تقرر (اپوائنٹمنٹ) کے ہم معنی ہے۔

۴ :۔ امامت و خلافت یا عام الفاظ میں مملکت کی سربراہی کے لئے کسی کو کوئی حق نہیں حاصل ہوتا ۔ اور شریعت میں استحقاق سربراہی و حکمرانی کا کوئی تصور ہی سرے سے موجود نہیں ۔ دستور اسلامی کے متعلق یہ اصولی امور میں نے مدلل طور پر بیان کردیئے ہیں ۔ اگر کسی کے نزدیک ان میں سے کوئی بات غلط ہے تو اپنا دعویٰ دلیل شرعی سے ثابت کرے ۔ اور میرے دلائل کا جواب دے ۔

حقیقت مطلوب ہے نہ کہ صورت

اسلامی نظام سیاسی کے ان قوانین دستوری پر نظر کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلام کو اپنے بتائے ہوئے نظام سیاسی کی حقیقت مطلوب ہے نہ کہ اس کی صورت ۔ اس کی حقیقت مسلمانوں کی انفرادی زندگی کی طرح ان کی اجتماعی زندگی میں بھی شریعت مقدسہ کا نفاذ ہے ۔ جس نظام مملکت میں یہ حقیقت موجود ہو وہ اسلامی مملکت اور اسلامی نظام ہے ۔ آپ اسے خلافت کہیں یا ملک اس سے اس کی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اسی طرح اس کی شکل و صورت اور اس کے طریق اقامت کی بھی کوئی اہمیت شریعت کی نظر میں نہیں ہے ۔

اسلامی نظام کے متعلق ہماری ان **توضیحات** کو ذہن میں رکھ کر ان اعتراضات و مطاعن پر نظر کی جائے جو روافض اور **ناصبیت** پسند سنی نما یا تقیہ باز سنی نما روافض نے اموی و عباسی خلفاء کی خلافت پر کئے ہیں تو ان کے اعتراضات و مطاعن بالکل غلط بے جان اور اسلامی نظام کے صحیح تصور سے بے خبری پر مبنی نظر آئیں گے ۔ (۱)

---

(۱) خلیفہ کے معنی ہیں جانشین ۔ کوئی شخص یا شے جب کسی شخص یا شے کے جانے کے بعد اس کی جگہ آئے تو ثانی کو اول کا خلیفہ کہتے ہیں ۔ یہ اس کے لغوی اور عرفی معنی ہیں ۔ مگر سیاسیات میں یہ لفظ سربراہ مملکت اسلامیہ کے ایک لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔

خلافت راشدہ ' ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح ہم مودودی صاحب کے سوالات کے جوابات کے سلسلہ میں کرچکے ہیں ۔ اس اصطلاح کے لحاظ سے حضرت معاویہؓ آخری خلیفہ راشد تھے ۔ اور انہیں پر خلافت راشدہ کا خاتمہ ہوگیا ۔ اس لئے مذکورہ بالا

خواہ کسی دوسرے کا جانشین ہو یا نہ ہو جس طرح قیصر' جرمنی کے بادشاہوں کا اور زار روس کے سلاطین کا لقب تھا ۔ تاریخ اسلام میں جب یہ لقب خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے استعمال کیا گیا تو اس کے لغوی و عرفی معنی ملحوظ تھے ۔ یعنی سیدنا صدیق اکبرؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنایا گیا تھا ۔ یہی وجہ ہوئی کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس لقب کو اختیار کرنے سے انکار فرمادیا ۔ اور فرمایا کہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خلیفہ (جانشین) ہوں نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ۔ آنحضور علیہ **الصلوۃ والسلام** کے خلیفہ (جانشین) صدیق اکبرؓ تھے ۔ اس توجیہ سے آں محترم نے اپنے لئے خلیفہ کے بجائے امیرالمومنین کا لقب منظور فرمایا ۔ آں محترم کے بعد خلفاء کے لئے امیرالمومنین کے ساتھ خلیفہ کا لقب بھی استعمال ہوتا رہا ۔ لیکن اس میں لغوی و عرفی معنی ملحوظ نہیں رہے بلکہ یہ دستور اسلامی کی ایک اصطلاح اور سربراہان مملکت

اسلامیہ کا لقب بن گیا ان کے لئے کبھی "خلیفہ " اور کبھی " **خلیفۃ المسلمین** " کا لقب استعمال ہوتا تھا جو اس کی علامت ہے کہ اس کے لغوی اور عرفی معنی سے قطع نظر کرلی گئی ہے ۔ ورنہ " **خلیفۃ المسلمین** " کہنے کے کیا معنی ؟ جمہور مسلمین تو موجود ہیں ان کی خلافت (جانشینی) کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ؟ قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے جو لفظ خلیفہ استعمال فرمایا گیا ہے ۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی سربراہ مملکت اور سربراہ قوم حضرت آدم علیہ السلام کو جو خلیفہ فرمایا گیا ہے اس میں لغوی و عرفی معنی بھی ملحوظ ہیں ۔ یعنی آنحضرت علیہ السلام سے پہلے جو مخلوق زمین میں آباد تھی اس کا خلیفہ (قائم مقام) ۔ اس کے ساتھ یہ ان کے لئے ایک شرف عظیم بھی تھا ۔ کیونکہ اس تقرر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب فرمائی ۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تو حاضر و ناظر ہے اس کا خلیفہ (قائم مقام ۔ جانشین) کون ہوسکتا ہے ۔؟ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ لقب ان کی شرافت و کرامت کے اظہار کے لئے عطا فرمایا گیا ۔ اس میں لغوی و عرفی معنی بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں ۔ باوجود اس کے وہ آنحضرت ؑ کا ایک لقب ہے جو ان کے مرتبہ عظیمہ کو بتانے کے ساتھ زمین پر انہیں اتارنے کی حکمت کی طرف واضح اشارہ کررہا ہے ۔ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر احکام

بزرگان ملت ان کے بعد کسی کو خلیفہ راشد کیوں کہتے ؟ مگر اس سے زیر بحث خلفاء کی خلافت یا ان کی عدالت میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا ۔ (۱) وہ انہیں ان حضرات خلفاء راشدین کا درجہ نہیں دیتے تھے اور نہ دینا چاہئے تھا لیکن ان کو امام برحق اور خلیفہ عادل

الٰہی پہنچانے کے بعد انہیں نافذ کرنے کے لئے اتارے گئے تھے ان معنی میں بھی انہیں خلیفتہ اللہ کہا جاتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ خلیفہ سربراہ مملکت کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی استعمال ہوا ہے ۔ خلافت اسلامیہ کے ادوار میں بھی یہ ان معنی میں استعمال ہوا ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مبارک زمانے تک اس کے استعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں پیدا ہوا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب ان کے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ۔ اور اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے اجتماع اذرح میں صحابہ کرامؓ نے خلافت تقسیم کردی ایک حصے میں حضرت علیؓ خلیفہ رہے دوسرے حصے میں حضرت معاویہؓ کو خلیفہ بنایا گیا ۔

جو حضرات اجتماع اذرح میں کسی عذر کی بناء پر شریک نہیں ہوسکے تھے ۔ انہیں اجتماع کی پوری کاروائی کا علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا علم نہ ہوسکا ، کہ اجتماع صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کو خلیفہ کا لقب دیا یا ملک کا ۔ ہم جلد ثانی میں لکھ چکے ہیں کہ اجتماع اذرح کے فیصلے کے بعد بعض لوگوں نے جاکر حضرت معاویہؓ کو خلافت کی مبارک باد دی ۔ مگر جو لوگ اس میں شریک نہ تھے ۔ ان میں سے بعض کو اس کا علم نہ ہوا ۔ اسلئے انہوں نے یہ خیال کیا کہ اجتماع نے آں محترم کو ملک کا لقب دیا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ خیال اس بناء پر پیدا ہوا ہو کہ وہ خلافت میں وحدت کے خواہ ہوں ۔ اور انہوں نے یہ خیال کیا ہو کہ اجتماع میں شریک ہونے والے اور فیصلہ کرنے والے اکابر صحابہؓ کا بھی یہی خیال ہوگا ۔ اس وجہ سے انہوں نے حضرت معاویہؓ کو ملک کہا ۔ جو لوگ پوری روئداد اجتماع سے واقف تھے ۔ انہوں نے انہیں خلیفہ بھی کہا ۔ یہ اختلاف محض لفظی تھا ۔ ہم واضح کرچکے ہیں کہ عملی اور خارجی شکل میں خلیفہ اور ملک کے درمیان کوئی فرق نہیں ۔ دونوں قسم کے حضرات اس پر متفق تھے کہ حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کی طرح ملک کی ایک خطے میں خود مختار حکمران مقرر کیا گیا ہے ۔ شوریٰ کے بعد نصب سے ان کی خلافت بھی حضرت علیؓ کی خلافت ہی کی طرح وجود میں آئی ہے ۔ ملک کہنے والوں کا مقصد حضرت معاویہؓ پر کوئی طعن کرنا نہیں تھا ۔ اور لفظ ملک کے وہ معنی جو مودودی صاحب نے اختراع فرمائے ہیں کسی کے

سمجھتے تھے۔

ایک سیاسی بدعت

حدیث شریف ہے :۔ ایا کم و محدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ و کل بدعۃ

حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھے۔ بلکہ آج بھی کسی عربی داں ' اور تلاوت قرآن کریم کرنے والے کے لئے قابل فہم نہیں ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے ولا جانتا ہے کہ حضرت طالوت ؓ کو ملک کہا گیا ہے۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو ملک عطا فرمانے کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔ اس قسم کی مثالیں دیکھنے والا ملک کے وہ معنی کیسے سمجھ سکتا ہے جو مودودی صاحب نے اختراع کرکے اس لفظ کو پہنائے ہیں؟

مودودی صاحب نے ایک روایت ص ۱۴۷ پر کامل ابن اثیر سے نقل کی ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ ؓ کو ایھا الملک کہہ کر سلام کیا اور جب آں محترم نے فرمایا کہ " آپ امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا " تو حضرت سعد ؓ نے جواب دیا کہ " خدا کی قسم جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی اس طریقہ سے اگر یہ مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا " بظاہر یہ روایت غلط اور موضوع معلوم ہوتی ہے۔ اول تو ابن اثیر روایات کے بارے میں بہت غیر محتاط ہیں۔ نیز ان کے ذہن پر تشیع کا بھی اثر ہے۔ جسے وہ مخفی رکھتے ہیں مگر بعض اوقات ظاہر ہوجاتا ہے۔ درایتاً تو اس کی غلطی اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ حضرت سعد ؓ اجتماع اذرح میں قصداً شریک نہیں ہوئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ خلافت کے لئے ان کا نام نہ پیش کردیا جائے اور وہ اس معاملے سے بالکل الگ رہنا چاہتے تھے۔ پھر جس کاروائی سے وہ ناواقف تھے اس کے اوپر انہوں نے رائے زنی کیسے فرمائی؟ مزید یہ کہ اگر نصب باطریق نصب ناجائز تھا اور اس کی بناء پر وہ ان کے تقرر کو ناجائز سمجھتے تھے تو انہیں ملک کیوں تسلیم کیا؟ اگر ان کی خلافت ناجائز تھی تو ملک بھی ناجائز تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ ؓ کو ملک تسلیم کرلیا اور ملک کہہ کر سلام کیا مگر خلیفہ نہیں تسلیم کیا؟ دونوں صورتوں میں فرق کی کیا وجہ ہے؟

جب انہوں نے حضرت معاویہ ؓ کو ملک تسلیم کرلیا تو خلیفہ بھی تسلیم کرلیا۔ بالفرض اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سعد ؓ ' حضرت معاویہ ؓ کی

ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار " (ترجمہ) "محدثات یعنی دین میں نئی چیزوں سے بچو ' بیشک (دین میں) ہر نئی بات بدعت ہے ' اور ہر بدعت گمراہی ہے ۔ اور ہر گمراہی جہنم نصیب ہے"

بدعت ہر ایسے قول یا فعل کو کہتے ہیں جسے بغیر کسی دلیل شرعی کے شریعت کا جزو بنا کر

حکومت کو ناپسند کرتے تھے ۔ یہ بات کہ " جس طرح آپ کو حکومت ملی اس طرح مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا " صرف اپنے ذوق احتیاط کا اظہار ہے ۔ انسانی طبائع اور مزاجوں کا اختلاف مانی ہوئی بات ہے ۔ بعض حضرات اس قدر محتاط ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اقتدار و حکومت سے دور رہنا چاہتے ہیں ۔ اور ایسی کوئی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے ۔ جس کی وجہ سے بہت سے حقوق ان پر عائد ہوجاتے ہوں ۔ اور ان کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی تو اور آخرت میں اس کی سخت باز پرس ہو ۔ اس خوف سے غلبے کی وجہ سے وہ خود حکومت لینا پسند نہیں کرتے ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی صالح اور متقی شخص کے لئے حکمراں ہونا پسند نہیں کرتے ۔ صحابہ کرام؄ میں بھی اس ذوق کے حضرات تھے ۔ اور بعد کو بھی بکثرت ایسے صالحین ہوتے رہے ہیں جن کا ذوق یہ تھا کہ وہ اپنے لئے ادنیٰ اقتدار بھی نہیں پسند کرتے تھے ۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقتدار کو کلیتہً ناروا اور ناجائز سمجھتے تھے ۔ حضرت سعد؄ کا یہی ذوق تھا ۔ آں محترم نے اسی کا اظہار فرمایا ۔ حضرت معاویہ؄ پر طعن کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا ۔ سبائی ذہن اسے طعن پر محمول کرے تو یہ اس کا قصور ہے ۔ پھر یہ کہ امیر المومنین کا لقب تو ملک کے لقب سے نیچے درجہ کا ہے ۔ حضرت عمر فاروق؄ نے یہ لفظ اپنے لئے ازراہ تواضع پسند فرمایا تھا ۔ حضرت سعد؄ کا حضرت معاویہ؄ کو ملک کہنے پر اصرار کرنا تو ان کی تعظیم کی غرض سے تھا ۔ اسے اعتراض پر محمول کرنا معترض کی کج فہمی کی دلیل ہے ۔ حضرت معاویہ؄ نے اس لقب کی تلقین تواضعاً فرمائی تھی ۔ اسے کسی طنز کا جواب اور ناگواری پر محمول کرنا بھی صرف سبائی بدظنی ہے ۔ درحقیقت نہ طنز کا کوئی وجود تھا اور نہ اس کے جواب کا ۔

کئی صدیوں تک لفظ خلیفہ سربراہ مملکت اسلامیہ کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ۔ مگر جب خلافت عباسیہ کمزور ہوئی ۔ اور بہت سے صوبے بالکل آزاد ہوگئے ۔ تو اس کے معنی میں ایک اور تغیر ہوا ۔ صوبے آزاد اور خود مختار تھے ۔ وہ علاقہ جو براہ راست خلیفتہ المسلمین کے زیر نگین تھا بہت تھوڑا رہ گیا تھا ۔ سب اسلامی ممالک کو ایک حکومت کے ماتحت نہیں لایا جاسکتا تھا ۔ ان حالات میں امت مسلمہ کی قوتوں کے اجتماع اور ان کے

اس میں داخل کرلیا جائے ۔ یا جس کے حکم شرعی کا درجہ بغیر کسی دلیل شرعی کے بڑھایا

درمیان ربط باقی رکھنے کے لئے جملہ اسلامی مملکتوں کا ایک نیم وفاق CONFEDERATION تشکیل دیا گیا جس کے سربراہ کو خلیفہ اور دوسرے اسلامی ممالک کے سربراہوں کو ملک کا لقب دیا گیا ۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اسی اصطلاح کے مطابق ' خلافت کی تشریح فرمائی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک لفظی فرق تھا ۔ ورنہ خارجی وجود کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا ۔ اور شریعت مقدسہ بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتی ۔ اس خصوصیت کی کیفیت و حیثیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے ۔ صدیوں تک ہندوستان میں سیاسی عرف یہ رہا ہے کہ جو شخص دلی پر حکمراں ہوتا تھا صرف اس کا لقب شہنشاہ ہوتا تھا ۔ ملک کے کسی دوسرے حصے کا حکمراں خواہ اس کا رقبہ حکومت کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو شنہشاہ کا لقب نہیں اختیار کر سکتا تھا ۔ شاہ عالم جن کی حکومت کے متعلق مشہور کہاوت ہے کہ " سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم یعنی صرف ۱۵ میل تک) انہیں بھی شہنشاہ کہا جاتا تھا۔ اور دوسرے بڑے بڑے خود مختار حکمرانوں میں سے کسی کو بھی یہ لقب نہیں دیا جاتا تھا۔

اسی طرح اگر بعض حضرات نے حضرت معاویہ ؓ کو خلیفہ کے بجائے ملک کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے انہیں خلیفہ ہی کہا ۔ کیونکہ عملاً خلافت و ملک میں کوئی فرق نہیں اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ وہ انکی خلافت کو ناپسند کرتے تھے ۔ یا ان کے تقرر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ص ۱۴۸ پر مودودی صاحب نے حافظ ابن کثیر کا جو قول نقل کیا ہے کہ " سنت یہی ہے کہ انہیں خلیفہ کے بجائے بادشاہ کہا جائے " محض غلط فہمی پر مبنی اور غلط ہے ۔ خلافت صرف ۳۰ سال باقی رہنے والی روایت ثابت ہی نہیں ۔ اور اگر بالفرض ثابت ہو تو علماء محققین کے نزدیک ظاہر پر محمول نہیں ۔ بلکہ مؤول ہے ۔ بعض علماء نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ تیس سال جو خلافت رہے گی وہ بہت اہم اور ممتاز درجہ کی ہوگی ۔ یوں خلافت اس کے بعد بھی رہے گی ۔ مقصد کلام دلوں میں اس زمانہ کی خلافت کی عظمت زیادہ کرنا ہے نہ کی ۳۰ سال کے بعد نفس خلافت کی نفی کرنا۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ حدیث ثابت ہی نہیں ۔ اس لئے کسی تاویل ہی کی ضرورت نہیں ۔

جائے ۔" مثلاً جو کام شرعاً مباح ہے اسے بغیر کسی دلیل شرعی کے مستحب یا واجب قرار دینے سے وہ فعل بدعت ہو کر واجب الترک ہوگا ۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بدعت صرف عمل تک محدود نہیں ۔ کسی خیال کو جس کی صحت و صداقت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے ۔ یا ثابت ہے مگر دلیل قطعی سے ثابت نہیں ۔ بلکہ دلیل ظنی سے ثابت ہے مظنون کے بجائے عقیدے کا درجہ دے دیا جائے تو اس عقیدہ کو بدعت کہا جائے گا ۔ اور واجب ہوگا کہ اسے صرف درجہ ظن میں رکھا جائے ۔ اسے عقیدہ نہ کہا جائے ۔ نیز اس کے ساتھ وہ معاملہ نہ کیا جائے جو عقیدہ کے ساتھ کرنا چاہئے ۔ جو شخص ایسے خیال کو بغیر دلیل شرعی

---

(۱) ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو تو بعض علماء نے خلیفہ راشد کہا ہے ۔ حالانکہ دوسرے اموی اور عباسی خلفاء کو خلفاء راشدین نہیں کہتے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے تھی جمہور علماء کی رائے نہیں تھی ۔ اور عام طور پر علماء نے اس کی صحت تسلیم نہیں کی ۔ پھر یہ کہ ان علماء نے بھی انہیں خلیفہ راشد کے عام اور لغوی معنی میں کہا تھا ۔ نہ کہ اس کے اصطلاحی معنی میں ۔ جن معنی میں وہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو خلیفہ راشد کہتے تھے ان معنی میں عمر بن عبدالعزیز کو راشد نہیں کہا ۔ ان کی نظر میں ان کی وقعت بہت سے دوسرے خلفاء سے زیادہ تھی اس لئے ان کی امتیازی شان ظاہر کرنے کے لئے فرط عقیدت سے انہیں خلیفہ راشد کہہ دیا ۔ جمہور اکابر علماء کی نظر میں انہیں کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا ۔ اس لئے انہوں نے انہیں دوسرے غیر صحابی خلفاء کے برابر سمجھا اور جس طرح دوسروں کے لئے راشد کا لقب نہیں استعمال کیا تھا اس طرح ان کے لئے بھی نہیں استعمال کیا ۔ اس لئے اس سے ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اور ہمارا بیان بے غبار رہتا ہے ۔

اگر بالفرض ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ بعض علماء عمر بن عبدالعزیزؒ کو انہیں معنی میں خلیفہ راشد کہتے تھے جن معنی میں حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ کو کہتے تھے تو بھی ہمارے بیان کی صحت میں شبہ نہیں پیدا ہوتا ۔ کیونکہ اولاً تو ہم کہیں گے کہ ان علماء کی رائے مذکور غلط تھی ۔ ثانیاً اس سے زیادہ سے زیادہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر صحابی اموی و عباسی خلفاء کو مرتبہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے برابر نہیں سمجھتے تھے ۔ مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے وہ انہیں ائمہ برحق اور خلفاء اسلام نہیں سمجھتے تھے ۔

کے عقیدے کا درجہ دیتا ہے وہ بدعت اعتقادی کے گناہ کا مرتکب ہو کر بلحوائے حدیث شریف جتلائے ضلالتہ ہوتا ہے۔

دوسری امتوں کی طرح امت مسلمہ میں بھی عوام نے بدعتیں ایجاد کیں۔ لیکن علماء اہلسنت نہیں متنبہ کرتے رہے اور ان سے منع کرتے رہے۔ عموماً یہ چیز عبادات اور معاشرت تک محدود رہی۔ کیونکہ ان میں بدعات نمایاں ہوتی ہیں۔ دین کے شعبہ سیاسیات میں جو بدعتیں پیدا ہوئیں ان کی طرف بہت کم علماء کی توجہ منعطف ہوئی۔ جس کے سبب پر روشنی ڈالنا یہاں غیر ضروری ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے اسے نظر انداز کرکے ہم ایک سیاسی بدعت کا تذکرہ کرتے ہیں جو شیعوں کی ایجاد ہے مگر اسے بہت سے سنیوں نے بھی قبول کرلیا۔ اور اس میں جتلا ہونے والے صرف عوام نہیں ہیں بلکہ بکثرت علماء اہلسنت بھی ہیں۔ "خلافت و ملوکیت" کی مندرجہ ذیل عبارت اس بدعت کا تعارف کررہی ہے۔

"یہاں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمانوں کی آزادی مشاورت کے بغیر جو خلافت یا امارت بزور قائم ہوگئی وہ آئینی طور پر منعقد ہوجاتی ہے یا نہیں۔ اصل سوال منعقد ہونے یا نہ ہونے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسلام میں نصب خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے جس سے خلفاء راشدین خلیفہ ہوئے یا وہ جس سے حضرت معاویہ اور ان کے بعد لوگ خلیفہ بنے؟ ایک طریقہ کسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کی اسلام نے ہم کو ہدایت کی ہے۔ دوسرا طریقہ اسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کے مطابق اگر وہ کام کرڈالا جائے تو اسلام اسے برداشت کرلینے کی ہمیں صرف اس لئے تلقین کرتا ہے کہ اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کہیں اس سے زیادہ بدتر حالات نہ پیدا کردے۔ بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ دے اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں۔ ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ دوسرا اگر جائز ہے تو قابل برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی حیثیت سے۔" (ص ۱۴۰)

تبصرہ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب اجتماع اذرح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اور اجلہ تابعین نے اجماعی طور پر کیا تھا۔ امیر یزیدؒ کا انتخاب آزادانہ استصواب رائے عامہ سے ہوا۔ اور جیسی آزادانہ مشاورت ان کے لئے ہوئی ویسی مشاورت کسی خلیفہ کے نصب کے لئے نہیں ہوئی۔ پورے عالم اسلامی نے انھیں خوشی کے ساتھ **ولیعہد** تسلیم کیا۔ جس کے معنی یہ ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد انھیں خلیفہ منتخب کرلیا۔ آں محترم کی وفات کے بعد ان کے لئے شرعاً کسی مشاورت کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ بلا ضرورت شرعی جائز بھی نہ تھی۔ مبینہ طور پر ان کی **ولیعہدی** سے صرف چار حضرات نے اختلاف کیا تھا۔ (۱) مگر یہ اختلاف شرعاً بالکل بے وزن تھا۔ اتنی بڑی اکثریت کی رائے کے مقابلے میں چار حضرات کی رائے کی کوئی قیمت نہیں باقی رہتی۔

علاوہ بریں، ہم واضح کرچکے ہیں کہ یہ اختلاف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے **ولیعہد** بنانے کے مسئلہ میں تھا۔ امیر یزید رحمہ اللہ کی خلافت سے نہیں تھا۔ چنانچہ جب **امیر المومنین** یزید مغفور سریر آرائے خلافت ہوئے تو ان حضرات نے جنھوں نے ان کی ولی عہدی سے اختلاف کیا تھا ان کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں کیا بلکہ ان سے بیعت کرلی۔ جن میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بہت نمایاں ہیں۔ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بیعت نہیں فرمائی۔ مگر اول تو اس روایت کی صداقت میں کلام ہے۔ اس کا قوی شبہ ہے کہ یہ کسی سبائی کی گڑھی ہوئی ہو۔

لیکن اگر یہ صحیح ہو تو بھی اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان کی خلافت سے انکار تھا۔ آں محترم ان کی ماتحتی میں قسطنطنیہ پر اس حملے میں شریک تھے جس کے شرکاء کو حدیث صحیح میں **مغفور لھم** کی بشارت دی گئی ہے۔ پھر جب آں محترم نے اس جہاد میں ان کی سربراہی اور افسری تسلیم کرلی تھی تو انھیں خلیفہ اور سربراہ مملکت تسلیم کرلینے میں کیوں تکلف ہوتا؟ بیعت نہ کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ امور مملکت میں شرکت نہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ بیعت ہر مسلمان سے تو نہیں لی جاتی تھی۔ بیعت تو صرف ان لوگوں سے لی جاتی تھی جو امور مملکت میں خلیفہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے پر تیار ہوتے تھے۔ بیعت اسی تعاون کے عہد اور وعدے کا ایک طریقہ تھا (۲) جو اس زمانے کے رواج اور عرف کے مطابق اس عہد کو پختہ بنا دیتا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عبادت الہی، اور اطراف و امصار میں دین کی تعلیم و اشاعت میں مشغول ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے امور خلافت اور سیاسی و انتظامی معاملات سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ اس مصلحت کے پیش

نظر انھوں نے بیعت نہ کی ہوگی۔ بیعت نہ کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آں محترم خلیفۃ المسلمین یزید مغفور کی خلافت کو ناپسند فرماتے تھے۔ یا موصوف کو ان کی اطاعت سے انکار تھا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیعت نہیں کی۔ تو کیا ممدوح نے آں محترم کی خلافت تسلیم نہیں کی؟۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور وہ آں محترم کے مطیع رہے اختلاف ایک اصول میں تھا وہ اپنی جگہ باقی رہا۔

امیر یزید کے بعد دوسرے خلفاء کا تقرر بھی آزادانہ شوریٰ اور نصب ہی کے ذریعہ ہوا۔ اور احکام شرعیہ کے مطابق ہوا۔ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ اگر کسی کو دعویٰ ہے کہ حضرات خلفاء تخت خلافت تک کسی ناجائز طریقے سے پہنچے تھے تو وہ اس کی دلیل شرعی پیش کرے۔ ان امور پر ہم صفحات سابقہ میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں ان کا مکرر تذکرہ **استحضار** کے لئے کردیا گیا۔ در حقیقت اس جگہ ہمیں اس بدعت کا چہرہ بے نقاب کرنا ہے جو سبائی ذہن کی اختراع ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بہت فساد انگیز اور ملت اسلامیہ کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوئی۔

مودودی صاحب کی منقولہ بالا عبارت سے عیاں ہے کہ ان کے نزدیک اسلام نے خلافت و امارت قائم کرنے کا کوئی خاص طریقہ مقرر کیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ ہم واضح کرچکے ہیں کہ اس بارے میں اسلام نے صرف اصول کی تعلیم دی ہے کوئی طریقہ نہیں مقرر فرمایا ہے۔ یہ کہنا کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت جن طریقوں سے قائم ہوئی انھیں طریقوں کا اختیار کرنا واجب ہے۔ اعتقادی بدعت ہے۔ جس چیز کو شریعت اسلامیہ نے واجب نہیں قرار دیا اسے واجب کہنا کھلی ہوئی بدعت ہے۔ جو شخص اسے بدعت نہیں تسلیم کرتا تو اس کے وجوب کی دلیل شرعی پیش کرے۔ ان حضرات کی خلافت کے لئے کسی طریقے کے اختیار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے علاوہ کوئی طریق انعقاد خلافت جائز ہی نہیں' ہم واضح کرچکے ہیں کہ " شوریٰ " اور نصب دو اصول ہیں جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔ ان کی عملی شکلوں میں احوال و ظروف کے اعتبار سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ اور کسی مخصوص عملی شکل اور طریقے کا اختیار کرنا شریعت نے امت کے اجتہاد کے سپرد کردیا ہے۔

شوریٰ جسے موصوف نے "آزادانہ مشاورت" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ضروری

ہے مگر اس کے بعد یہ کہنے کے کیا معنی ہیں کہ:

"اسلام میں نصب خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے جس سے خلفاء راشدین خلیفہ ہوئے یا وہ جس سے حضرت معاویہ اور ان کے بعد کے لوگ خلیفہ بنے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "شوریٰ" کا وہی طریقہ اختیار کرنا واجب ہے جس سے "خلفاء راشدین خلیفہ ہوئے"۔ حالانکہ شوریٰ کے طریقے متعدد ہوسکتے ہیں اور قطعاً ضروری نہیں کہ وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو حضرات خلفاء راشدین کو خلیفہ بنانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ یہ سیاسی عقیدہ حدود بدعت میں داخل ہے۔ اگر کوئی دلیل وجوب ہو تو پیش کی جائے۔ نفس شوریٰ واجب ہے نہ کہ اس کا کوئی مخصوص طریقہ۔ وہ نفس شوریٰ کے وجوب سے جو ایک اصول عام ہے اس کے ایک مخصوص طریقے کا وجوب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ استدلال غیر فقہی غیر منطقی اور غلط ہے۔ دلیل عام سے دعویٰ خاص نہیں ثابت ہوتا۔

اس سیاسی بدعت کی تقویت کے لئے موصوف کا یہ کہنا کہ "اسلام اسے برداشت کرنے کی ہمیں صرف اس لئے تلقین کرتا ہے کہ اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کہیں اس سے زیادہ بدتر حالات نہ پیدا کردے" شریعت اسلامیہ کی غلط ترجمانی بلکہ حکم شرعی میں تحریف کی کوشش ہے۔ ان کی عبارت سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شرعاً "اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش" کرنا تو واجب ہے۔ لیکن بدتر مفاسد کے خطرے کی وجہ سے اس واجب پر عمل سے منع فرمادیا گیا ہے۔ گویا اگر کسی "بدتر" مفسدہ کا خطرہ نہ ہو تو اسے "مٹانے اور بدلنے کی کوشش واجب ہوگی۔ اگر یہ کوشش نہ کی جائے تو سب مسلمان' گنہگار ہوں گے۔ موصوف کے قول مذکور کا مطلب و مقصد یہی ہے لیکن یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ یہ شریعت اسلامیہ کا حکم نہیں ہے۔ اسلام نے کہیں بھی یہ نہیں کہا۔ جو شخص اس حکم کو اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے وہ کوئی آیت یا حدیث اس کے ثبوت میں پیش کرے۔

اگر کوئی شخص کسی ایسے طریقے سے برسر اقتدار ہوجائے جو فی نفسہ شرعاً ممنوع اور ناجائز ہو تو جمہور اہل اسلام اور ارباب حل و عقد کو شرعاً اختیار ہے کہ وہ اس کی خلافت کو نہ تسلیم کریں اور اس کی اطاعت سے انکار کردیں۔ لیکن اس کی خلافت و امامت تسلیم کرنے سے انکار کرنا' واجب پھر بھی نہیں۔ لیکن جب جمہور اہل اسلام کی اکثریت ایک مرتبہ اس کی امامت و خلافت پر راضی ہوجائے۔ جس کی کم سے کم حد یہ ہے کہ وہ اسے

گوارہ کرلے خواہ بادل ناخواستہ گوارہ کرے ' جس کی علامت یہ ہے کہ اس سے اختلاف کا اظہار نہ کرے تو اس کی خلافت و امامت منعقد ہوجائے گی ۔ اس کے بعد صرف اس بناء پر کہ اس کا طریق نصب یا طریق شوریٰ ناجائز تھا ' اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کرنا قطعاً واجب نہیں بلکہ مستحب بھی نہیں ۔ بلکہ بعض صورتوں میں جائز بھی نہیں ' جس نے انتخاب کا ناجائز طریقہ اختیار کیا وہ گناہ گار ہوا جن لوگوں نے اس کی اعانت کی اور اسے ناجائز طریقہ سے مسند اقتدار تک پہنچایا وہ سب بھی مرتکب معصیت ہوئے ۔ اس کی باز پرس ان سے آخرت میں ہوگی ۔ ان کا وہ فعل منکر ' ختم ہوچکا اور مٹ چکا ' اسے مٹانے کی کوشش تحصیل حاصل ہے ۔ اسے مٹانے کا نام لے کر قائم شدہ نظام خلافت او راجتماع مسلمین کو درہم برہم کرنے کی کوشش شرعاً و عقلاً کسی طرح بھی درست و مناسب نہیں کہی جاسکتی ۔ کسی نے کسی دوسرے کی زمین پر بغیر اس کی اجازت کے مسجد تعمیر کردی اور جب تعمیر ہوچکی تو مالک زمین نے بھی اس کی اجازت دے دی تو کیا صرف اس بناء پر کہ ابتداء میں مسجد ارض مغصوبہ پر تعمیر کی گئی تھی ' مالک زمین کی اجازت حاصل ہونے کے بعد بھی اسے منہدم کرکے دوبارہ تعمیر کرنا واجب یا مستحب ہے ؟

مندرجہ بالا بحث و تحقیق سے شیعوں اور شیعیت پسندوں کی ان سب کج بحثیوں اور ان کے جملہ بے جا مطاعن کا خاتمہ ہوجاتا ہے جو مذکورہ بالا بدعت پر مبنی ہیں۔ مثلاً امیر یزید مغفور کی خلافت کے متعلق بعض حضرات نے ایک بحث یہ پیدا کی کہ اہل عراق نے ان سے بیعت نہیں کی تھی اس لئے ان کی خلافت منعقد نہیں ہوئی ۔ ہماری بحث مذکور سے اس بحث اور اس قسم کی سب بحثوں کا لچر اور پوچ ہونا خوب نمایاں ہوجاتا ہے ۔ اول تو معترض کا یہ قول غلط بیانی اور کذب پر مبنی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل عراق کے نمائندوں نے بھی امیر یزید سے بیعت کی تھی ۔ (۱) لیکن اس سے قطع نظر جب امیر موصوف کی ولی عہدی کو پورے عالم اسلام نے تسلیم کرلیا تھا اور جملہ اسلامی ممالک کے نمائندوں نے ان

---

(۱) اگر اہل عراق سے مراد وہاں کے اہل سنت ہیں تو معترض کا قول بالکل غلط اور دروغ صریح ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان سب نے یزید مرحوم سے بیعت کی تھی اور ان کی خلافت خوشدلی کے ساتھ قبول کی تھی اور اگر معترض کی مراد وہاں کے مفسد سبائی رافضی ہیں تو وہ شرعاً حق رائے دہی رکھتے ہی نہ تھے ۔ اگر انہوں نے بیعت نہیں کی تو اس سے کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا ۔ مگر واقعہ یہ ہے کے کہ انہوں نے بھی امیر المومنین یزید مغفور کی خلافت تسلیم کرلی تھی اور ان سے بیعت کی تھی ۔ خواہ بطور تقیہ کی ہو ۔

کی ولیعہدی کی بیعت کرلی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں وہ باتفاق ارباب حل و عقد و باتفاق جمہور اہل اسلام خلیفہ منتخب ہوگئے تھے ۔ پانچ حضرات نے اگر اختلاف کیا تو اتنی بڑی اکثریت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ اس متفق علیہ نصب کے بعد انہیں عملاً خلیفہ بننے کے بعد کسی بیعت کی ضرورت نہیں تھی ۔ اگر پوری مملکت اسلامیہ میں ایک شخص بھی بیعت نہ کرتا تو بھی وہ خلیفہ رہتے ۔ اس وقت بعض لوگوں سے جو بیعت لی گئی اس کا مقصد امور خلافت میں ان کا تعاون حاصل کرنا تھا ۔ نہ کہ نئے سرے سے نصب خلیفہ ۔ اس لئے بلاشبہ وہ جائز خلیفہ تھے ۔

دوسرے اموی و عباسی خلفاء کے متعلق بھی اس گروہ نے اسی قسم کی بحثیں اٹھائی ہیں ۔ ان پر ہماری بحث مذکور کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو ان کا لغو اور لچر ہونا بالکل واضح ہوجاتا ہے ۔ اس مقام پر اس افسوسناک واقعہ کا ' جس کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے ' تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بارہا اقتدار کے حریص افراد اور خلافت اسلامیہ کے مخالفین نے اپنی ہوس اقتدار و جاہ کو اسلامی نظام ' اقامت دین اور اقامت کتاب و سنت کے خوشنما اور جاذب نظر نعروں کے غلاف میں ملفوف کرکے نظام خلافت کے خلاف فتنے برپا کئے ہیں

اور مسلمانوں کا خون بہایا ہے۔ یہ نعرے یا تو کلیتہ" مذکورہ بالا بدعت پر مبنی ہوتے ہیں یا مذکورہ بالا مبتدعانہ نظریہ اس کی بناء کا ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ بحث کے اس مرحلے پر یہ مستحضر کرلینا چاہئے کہ یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے جب صرف امام یا خلیفتہ المسلمین کے نصب اور اس کے بارے میں شوریٰ کا طریقہ ان طریقوں سے مختلف ہو جو حضرات خلفاء راشدین کے نصب یا اس کے متعلق شوریٰ کے لئے اختیار کیا گیا تھا ۔

اگر اس کے بجائے کوئی دوسری بات ایسی نظر آئے ' جو بظاہر نصب خلیفہ یا انعقاد خلافت سے مانع ہو تو وہ اس بحثوں کے موضوع سے خارج ہے ۔ اس کے شرعی احکام الگ ہیں ' جب کوئی ایسی صورت سامنے آئے تو اس کے احکام کتاب و سنت کی روشنی میں معلوم کئے جائیں گے ۔ اس بحث کو اس قسم کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

خلط مبحث

اختتام بحث کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خلط مبحث کی نشاندہی بھی کردی

جائے جو مودودی صاحب نے اس بحث میں کیا ہے۔ اور جو مغالطہ انگیز ہے۔

یہاں زیر بحث مسئلہ یہ ہے، کہ نصب خلیفہ اگر کسی ایسے طریقے سے ہوا ہو، جو خلفاء راشدین کے طریق نصب سے مختلف ہے تو اسے معزول کرکے دوبارہ صحیح طریقے سے انتخاب خلیفہ واجب ہے یا نہیں؟ مگر مودودی صاحب نے حکم اس صورت کا بیان کیا ہے۔ جب منتخب شدہ خلیفہ، صلاح و تقویٰ چھوڑ کر فاسق ہوجائے، یا غلطی سے کسی فاسق کو خلیفہ بنالیا جائے، اس وقت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس معزولی اور دوبارہ انتخاب سے کوئی مفسدہ شرعیہ پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو تو یہ واجب ہے۔ لیکن اگر اس کا خطرہ ہو تو جائز بھی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔ اور خروج بالسیف ہرحال میں ممنوع اور ناجائز ہے۔ اس حکم کو زیر بحث صورت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ زیر بحث صورت کی نوعیت کے مسئلے میں اس کے خلاف حکم موجود ہے۔ شریعت مقدسہ کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص بطور استیلاء خلیفہ بن جائے، تو جب اسے جمہور مسلمین سربراہ مملکت تسلیم کرلیں، خواہ بادل ناخواستہ تسلیم کریں تو وہ جائز خلیفہ ہوجاتا ہے۔ اور اسے بلا ضرورت شرعیہ معزول کرنے کی کوشش کرنا جائز بھی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔ جب حضرت طالوت رضی اللہ عنہ "ملک" منتخب کئے گئے تو بنی اسرائیل کی اکثریت ان کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ان لوگوں نے ابتداء ہی میں ان کی خلافت اور سربراہی سے اختلاف کیا تھا۔ مگر اس زمانہ کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام کے اصرار پر بادل ناخواستہ ان کی حکومت منظور کرلی تھی۔ باوجود اس کے نہر پر پہنچ کر حضرت طالوتؓ نے ان سے اطاعت کا مطالبہ کیا، اور ان کی آزمائش کی۔ اکثریت نے ان کی بات نہیں مانی۔ معلوم ہوا کہ اکثریت اس وقت بھی ان کے "ملک" بننے سے خوش نہ تھی۔ اس سب کے باوجود ازروئے قرآن مجید ان کی امامت و سربراہی بالکل صحیح تھی۔ اور ان کی اطاعت فی المعروف بنی اسرائیل پر واجب تھی۔

خلافت تا ملوکیت

گزشتہ صفحات میں ہم یہ بات صاف کرچکے ہیں کہ تاریخ اسلام میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خلافت عرفی ملوکیت (بادشاہی) کی صورت میں تبدیل ہوگئی ہو۔ خلافت ہمیشہ خلافت ہی رہی۔ جب تک قائم رہی خلافت ہی رہی، اور جب ختم ہوئی تو خلافت ہی کی شکل میں ختم ہوئی۔ عرفی شاہی، یا آمریت کی شکل اس نے کبھی نہیں اختیار کی۔ مگر یہ بھی ناقابل انکار واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسی حکومتیں اور سلطنتیں بھی وجود میں آئیں اور صدیوں تک باقی رہیں۔ جن میں خلافت کی کوئی خو بو نہ تھی، انھوں نے خلافت ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا، اور جنھیں عرفی بادشاہی، یا شہنشاہی (ملوکیت) ہی کہا جاسکتا ہے۔ بطور مثال ہندوستان میں ہمایوں یاشاہجہاں یا جہانگیر کی سلطنتوں کے لئے سوا سلطنت اور شاہی کے کوئی لفظ موزوں نہیں ہوسکتا۔ برصغیر کا مغلیہ دور تاتاری طرز حکومت کا نمونہ تھا۔ تعزیرات میں بعض اسلامی قوانین رائج تھے۔ لیکن مالی اور دیوانی کے اکثر وبیشتر قوانین غیر اسلامی تھے۔ یہاں تک کہ اسلام کے قانون وراثت پر بھی پورا عمل درآمد نہیں ہوتا تھا اور رواج CONVENTION کو اس پر ترجیح دی جاتی تھی۔ سلطنت میں وراثت جاری تھی۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا پیدائشی طور پر تخت وتاج کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔ کسی شوریٰ یا نصب کی احتیاج نہ تھی۔ نسب اور وراثت اسے مستحق سربراہی بنادینے کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔ وہ کتنا ہی نا اہل ہو اس کا استحقاق زائل نہیں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی اس ملک اور خلافت میں بہت سی باتوں میں فرق تھا جس کا تذکرہ باعث طوالت ہے۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا تذکرہ بطور مثال کیاگیا ہے ورنہ تاریخ اور موجودہ دور میں اس قسم کی بکثرت اسلامی سلطنتیں ملتی ہیں۔ جنھیں اسلامی حکومت صرف اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ اس کے حکمران مسلمان ہیں ورنہ حقیقی معنی میں انھیں اسلامی حکومت ہی نہیں کہا جاسکتا۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی صرف ایک سلطنت ایسی ہے جو صحیح معنی میں اسلامی سلطنت ہے۔ اور جسے خلافت اسلامیہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ عرب کی سعودی حکومت ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت

(۱۴۰۷ھ ۱۹۸۷ء) دنیا میں مسلمانوں کی کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جس میں خلافت کا رنگ ہو یا جسے صحیح معنی میں اسلامی حکومت کہا جاسکے اس ناقابل انکار واقعہ کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت اور اسلامی اصول حکومت سے واقفیت اور ان کی خوبی کے اعتراف کے باوجود مسلمانوں میں اس قسم کی حکومتیں' جو مودودی صاحب کی اصطلاحی ملوکیت کی مصداق ہیں کیوں قائم ہوئیں؟ دوسرے عنوان سے' امت مسلمہ کے ذہن نے خلافت اور اسلامی نظام سے نظر ہٹاکر اپنا رخ "ملوکیت" کی طرف کیوں کرلیا؟ مودودی صاحب کا سوال نمبر۵ اسی نوعیت کا ہے لیکن ان کا مقصد صرف خلافت بنی امیہ وخلافت بنی عباس پر الزام لگانا تھا اس لئے انھوں نے غلط عنوان سے سوال کیا۔ ان کا سوال اور اس کا جواب مذکور ہوچکا۔ ان کے سوال کا جواب وہی ہے جو ہم نے دیا ہے۔ ہمارے سوال کا عنوان دوسرا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ اس کے جواب کا عنوان بھی اسی کے مناسب ہوگا۔
اس جواب میں ہم انشاء اللہ یہ واضح کردیں گے کہ جو قوم ایک خاص نظام سیاسی کی طرف داعی تھی' اور صدیوں تک اس نظام کو قائم رکھ کر اس کی افادیت' خوبیوں اور دوسرے جملہ سیاسی نظاموں پر اس کی برتری تجربہ کی روشنی میں ظاہر وثابت کرچکی تھی' اس نے پانچ چھ سو سال تک اس سے مستفید ہونے کے بعد اسے کیوں ترک کردیا؟ اور اس کے بجائے ایسا نظام سلطنت کیوں اختیار کیا جو اسلامی تعلیمات واصول کے مخالف اصول وتعلیم پر مبنی تھا؟ امت مسلمہ کے فکر سیاسی اور ذوق آئینی میں یہ تغیر کن اسباب سے ہوا؟۔ اور امت کا وہ طبقہ یا گروہ کون تھا جس نے ان سے ذوقِ شریعت یا ذوقِ خلافت چھین کر ان میں اسلامی ذوق کے خلاف بد ذوقی پیدا کی؟ سوال کی اس تشریح وتفصیل سے قاری کو اس کی غیر معمولی اہمیت کے اندازے کے ساتھ اس کے جواب کی ضرورت کا اندازہ بھی ہوگیا ہوگا۔ اس کے صحیح اور واقعی جواب سے عام طور پر مورخین نے گریز کیا ہے۔ ان میں تین گروہ ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس نے دیدہ ودانستہ اس کے صحیح جواب کو نظر انداز کرنے' بلکہ اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حقیقت واقعہ ظاہر کرنے میں انھیں اپنے غلط عقائد وتصورات کے خلاف کہنا پڑتا۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اس سوال کے مضمرات اور اس کے صحیح جواب کو سمجھنے . ہی سے . . قاصر رہا۔
تیسری جماعت ایسے فضلاء وعلماء پر مشتمل ہے جنھوں نے مخالفت اور ملامت کے خوف سے یا بعض متعلقہ اشخاص کے ساتھ کورانہ عقیدت کی بناء پر حقیقت واقعہ اور سوال کے صحیح جواب کو چھپایا اور سمجھ بوجھ کر اسے ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ اور راہ فرار اختیار

کی۔ اختلاف محرکات کے باوجود مورخین یا علماء کے ان سب افراد اور گروہوں کا رویہ یکساں رہا۔ یعنی انھوں نے اس سوال کے جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مورخین وفضلاء کی ان تینوں جماعتوں کے علاوہ بعض ایسے فضلاء ومورخین بھی ہیں جنھوں نے مختلف عنوانات سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا جواب بھی اطمینان بخش نہیں اور حقیقت کے چہرے کو بے نقاب نہیں کرتا۔ سب سے اچھی بحث یگانہ روزگار مورخ علامہ ابن خلدون کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی حقیقت نما اور کامل طور پر تسکین بخش نہیں۔

امت مسلمہ کے عروج وزوال پر سی علماء وفضلاء نے بہت قیمتی بحثیں کی ہیں۔ جو فی نفسہ بہت مفید ہیں۔ لیکن زوال امت کے ایک اہم سبب کے اظہار سے یہ سب بحثیں خالی ہیں۔ وہ اہم سبب اس سوال کے جواب سے معلوم ہوگا اور اس جواب میں انشاء اللہ مزید افادیت محسوس ہوگی۔

اجنبی تصور

دین اسلام کے اولین خدام عرب تھے۔ حریت ان کے مزاج اور ان کی فطرت میں داخل تھی۔ نظام خلافت ان کے مزاج کے بالکل موافق تھا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں رہا انھوں نے اس کے مزاج کو قائم رکھا اور بہت سلیقہ کے ساتھ اسے چلاتے رہے۔ عجمی اور رومی قسم کی بادشاہی MONARCHY کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یہ اجنبی تصور ان میں اجنبیوں ہی کی طرف سے درآمد کیا گیا۔ اور ایسے پر فریب طریقے سے ان میں پھیلایا گیا کہ ان کے ایک گروہ نے بھی اسے قبول کرلیا۔ اگرچہ ان کی غالب اکثریت نے اسے آج تک نہیں قبول کیا۔ لیکن جب پر فریب تدبیروں سے عجمی اجانب نے اقتدار ان کے ہاتھ سے چھین لیا تو وہ بادل ناخواستہ اجانب کے اقتدار اور بعض بدترین قسم کی بادشاہیوں' اور آمریتوں کو عملاً تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ تاہم نظری طور پر باستثناء قلیل انھوں نے انھیں کبھی نہیں تسلیم کیا۔

مسلمانوں میں اس اجنبی تصور کی درآمد کی داستان مختصراً یہ ہے کہ نظام خلافت اور اس کی فکری بنیادیں یعنی وہ سیاسی عقیدے جن پر خلافت کی عملی شکل اور اس کا ظاہری نظام مبنی تھا اس وقت دنیا کے لئے بالکل اجنبی اور نئے تھے۔ دنیا ان سے ناآشنائے محض تھی۔ اس سے جو فوائد ومنافع حاصل ہو رہے تھے اور اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو

جو فروغ حاصل ہو رہا تھا' انھیں دیکھ دیکھ کر یہود' حسد وبغض کی وجہ سے انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔

انھوں نے اپنی قوم کے ایک چالاک اور فریب کار شخص عبد اللہ ابن سبا کو مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور خلافت اسلامیہ کو برباد کرنے کے لئے خفیہ ساز باز کرنے پر مقرر کیا' اس شخص نے شیعہ مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اور ان کے ذہنوں میں مختلف قسم کے باطل عقیدے بھرے۔ منجملہ ان کے تصور خلافت میں استحقاق' وراثت' وغیرہ کے غلط' بے بنیاد اور خلاف کتاب وسنت' تصورات مروج کردیئے۔ مگر حقیقت کے بالکل برخلاف اس کا نام خلافت اور امامت ہی باقی رکھا۔

ابن سبا کی پیروی کرنے والوں کا لقب ابتداء میں شیعان علی رضی اللہ عنہ تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد یہ صرف شیعہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور آج تک شیعہ یا رافضی کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں نے ان سبائی افکار کی اشاعت کو اپنا مشن بنالیا۔ اور ان کی بنیاد پر خلافت اسلامیہ پر قبضہ کرنے اور اگر قبضہ نہ ہوسکے تو اسے تباہ کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ اس صورت حال سے شیعوں نے فائدہ اٹھانا چاہا حضرت حسنؓ کو اپنا اصطلاحی امام اور حضرت علیؓ کا وارث مشہور کیا۔ خلافت کے حق کے عطیہ الٰہی یا آسمانی حق DEVINERIGHT ہونے کا تصور ان کی خلافت کے ساتھ وابستہ کیا۔ مگر حضرت حسنؓ نے خلافت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوکر ان کے ان سب باطل نظریات کا ابطال کردیا۔ جس کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کرچکے ہیں۔ پھر انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ورغلانے کی کوشش کی اور امامت ووراثت' اور استحقاق کی بنیاد پر خلافت بنو امیہ کے خلاف خروج کی ترغیب دی۔ لیکن آں محترم نے ان کی بات رد کردی اور خروج کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ان بزرگوں کے اس قابل ستائش طرز عمل کی وجہ سے شیعوں کے نظریات امامت' وراثت خلافت وغیرہ جانکنی میں مبتلا ہوگئے۔ اس موقع پر سبائی پارٹی نے یہود کی سرپرستی ورہنمائی میں یہ منصوبہ تیار کیا کہ حضرت حسینؓ کو حصول ارشاد وتعلیم کا مقصد ظاہر کرکے کوفہ بلایاجائے۔ انھیں قتل کرکے ان کی اس آمد کو خلافت کے خلاف خروج مشہور کیا جائے۔ اور سبب خروج وہی پیدائشی استحقاق بر بناء نص و وراثت بتایا جائے۔ اس طرح یہ نظریات زندہ رہ جائینگے آئندہ ثار حسینؓ کے نام سے

خلافت بنو امیہ کے خلاف شورش برپا کی جائے۔ پروپیگنڈے اور فساد انگیزی سے کام لے کر حضرت حسینؓ کی اولاد اور اولاد در اولاد تک اس تحریک اور مذکورہ بالا نظریات کو جو اس تحریک کی اساس اور بنیاد ہیں پہونچایا جائے۔ تاکہ وہ انھیں قبول کرکے ہمیشہ خلافت اسلامیہ کے خلاف شورش برپا کرنے پر آمادہ رہیں۔

شیعہ ان افکار فاسدہ اور نظریات باطلہ کی تبلیغ مسلمانوں میں کرتے رہے۔ عرب تو ان سے بہت کم متاثر ہوئے۔ لیکن ایران' ترکستان وغیرہ کی نو مسلم غیر عربی قومیں ان سے متاثر ہوئیں۔ اس تاثر کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے مزاج کے مطابق تھیں۔ وہ جابر وقاہر نسلی وخاندانی مطلق العنان حکومتوں کے خوگر تھے' ان کی پوری تاریخ اسی قسم کی سلطنتوں پر مشتمل تھی۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کی اتنی تربیت نہیں ہوئی تھی کہ ان کا مزاج قومی بدل جاتا۔ اس کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی تھے' جن کی بنا پر شیطان نے ان باطل افکار کو ان کی نظر میں خوشنما بنادیا تھا۔ مگر ان سب اسباب پر روشنی ڈالنا بے ضرورت اور موجب طوالت ہے۔

شیعوں کی اس تبلیغ نے جو عموماً خفیہ طور پر کانا پھوسی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ نو مسلموں کی ایک معتد بہ تعداد کو متاثر کرلیا۔ اور اہل عرب کی ایک تعداد بھی اس سے متاثر ہوئی جن میں مخصوص طور پر قابل ذکر علوی خاندان ہے۔ ان حضرات کی طرف سے اموی وعباسی خلافت کے خلاف بار بار بغاوتیں ہوتی رہیں' جو عموماً انھیں نظریات پر مبنی ہوتی تھیں اور اگر واقعتاً ان نظریات پر مبنی نہ بھی ہوتی تھیں تو شیعہ یہی مشہور کرتے تھے کہ خروج انھیں نظریات پر مبنی ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں مطلق العنان شاہی' موروثی اور خاندانی حکومت' یا بالفاظ مختصر مودودی صاحب کی اصطلاحی "ملوکیت" کا تصور جس نے ایک مدت کے بعد عملی شکل بھی اختیار کرلی' اسی گروہ کے ذریعہ آیا جس کی حمایت کرنے والے آج اموی اور عباسی خلافتوں پر "ملوکیت" بن جانے کا غلط ' بے اصل اور بے دلیل' بہتان لگا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان باطل نظریات کو فروغ نہ دیتے اور ان کی بنیاد پر سیاسی کامیابی حاصل کرنے کے لئے انھیں اپنا سیاسی نعرہ نہ بناتے تو تاریخ کسی دوسرے عنوان سے لکھی جاتی۔ اور امت مسلمہ میں کبھی ملوکیت نہ قائم ہوتی۔

مندرجہ بالا سطروں میں ہم نے جس المناک حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے اس کے ثبوت سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ بطور مثال اور نمونہ ہم جناب زید بن علی مرحوم کی بغاوت کا واقعہ ذکر کرتے ہیں' جنھوں نے امیر المومنین ہشام بن عبد الملک رحمہ اللہ کے عہد

خلافت میں خلافت اسلامیہ کے خلاف خروج کیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ:

"جب زید کے ان طرفداروں کو جنھوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی معلوم ہوا کہ زید کے ارادے کا علم یوسف بن عمرو کو ہوگیا ہے اور اس نے زید کے پاس اپنے جاسوس لگادیئے ہیں۔ اور وہ ان کے حال کی تفتیش کرتا رہتا ہے۔ تو ان کے سربر آوردہ لوگوں کی ایک جماعت زید کے پاس آئی اور انھوں نے زید سے پوچھا کہ ابو بکرؓ و عمرؓ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ زید نے کہا کہ: "اللہ ان پر رحم کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ میں نے اپنے خاندان والوں میں سے کسی کو ان پر تبرا کرتے ہوئے نہیں سنا۔ اور نہ کوئی شخص ان کے لئے کبھی برے الفاظ استعمال کرتا ہے"۔ ان لوگوں نے کہا کہ: "آپ اہل بیت کا بدلہ لینے کے لئے اسی لئے طالب ہوئے ہیں کہ یہ دو دونوں آپ کے اور حکومت کے درمیان حائل ہوگئے اور آپ کے ہاتھوں سے اسے نکال لیا"۔

"زید نے کہا کہ: اس معاملے میں سخت سے سخت بات جو میں کہہ سکتا ہوں وہ صرف اتنی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہم تھے۔ مگر قوم نے دوسرے کو ہم پر ترجیح دی اور ہمیں ہٹادیا"۔ (۱)

جناب زید نے اپنے خروج کا اصل محرک واضح کردیا ہے۔ یعنی وہی "احق" ہونے کا تصور۔ ان کے بیان سے عیاں ہے کہ وہ خود کو بر بناء وراثت پیدائشی طور پر امامت اور خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر انھوں نے حکومت بنی امیہ کے خلاف بغاوت کی۔ استحقاق کا یہ اسلامی تصور' اور سیاسی عقیدہ "ملوکیت" کا اساسی اصول ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور جسے نظام خلافت سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس تصور کے ساتھ ولایت و وصایت کے غلط اور غیر اسلامی تصورات اتنا گہرا ربط رکھتے ہیں کہ اس کے آتے ہی خود بخود ذہن میں داخل ہوجاتے ہیں "استحقاق" کا یہ غیر اسلامی تصور جناب زید رحمہ اللہ کے ساتھ مخصوص نہ تھا' بلکہ اموی اور عباسی خلافتوں کے خلاف جن علوی حضرات نے خروج کیا ان سب کے درمیان مشترک

---

(۱) طبری احوال ۱۲۲ھ

طور پر پایا جاتا ہے۔ جو اسلامی تاریخ کے کسی طالب علم سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ اس کا ایک نمونہ ہم نے نقل کردیا۔ اس کا تعلق اموی دور سے ہے۔ اب ہم عباسی دور خلافت کا ایک واقعہ بھی بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نمونہ اس سے زیادہ مفصل اور واضح ہے۔ اور اس تحریک کے پورے خدوخال واضح کردیتا ہے جو علوی حضرات شیعوں کی ترغیب واعانت سے خلافت اسلامیہ کو ملوکیت' بنانے' اور اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے چلا رہے تھے' ہم وہ خط وکتابت طبری سے نقل کرتے ہیں جو امیر المومنین ابو جعفر منصور' اور محمدؒ بن عبد اللہؒ بن حسنؓ بن حسنؓ بن علیؓ کے درمیان اس وقت ہوئی تھی جب آخر الذکر نے امیر المومنین منصور کے خلاف خروج کیا تھا' وھوھذا

(منصور کا خط محمد بن عبد اللہ کے نام):

"اللہ کے بندے امیر المومنین منصور کی طرف سے محمد بن عبد اللہ کو لکھا جاتا ہے:

"انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض' ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم' الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم" ○

ترجمہ:۔ میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے یہ عہد کرتا ہوں اور ذمہ لیتا ہوں کہ اگر تم قبل اس کے کہ میرا قابو تم پر چلے تائب ہوکر اپنے حرکات سے باز آجاؤ تو میں تم کو' تمہاری اولاد کو' تمہارے سب بھائیوں ' اہل خاندان' اور پیرؤوں کو ان کی جان ومال کے متعلق امان دیتا ہوں۔ دریں اثناء تم نے جو خون بہا یا جتنے روپے پر قبضہ کیا ہے۔ اسے چھوڑ دوں گا اور اس کے متعلق کوئی مطالبہ نہ کروں گا' اس کے علاوہ تم کو دس لاکھ درہم نقد دوں گا اور تمام وہ ضروریات جن کا تم مطالبہ کروگے پوری کروں گا اور جس علاقہ میں تم سکونت اختیار کرنا چاہوگے وہیں تم کو فروکش کروں گا۔ نیز تمہارے ان سب اعزا' واقرباء کو جو میرے پاس قید ہیں رہا کر دوں گا۔ جس شخص نے تم سے بیعت کی ہوگی' اور تمہارا ساتھ دیا ہوگا اور اس معاملے میں تمہارا شریک رہا ہوگا'

اسے بھی امان دوں گا۔ نیز اس سے اس کی وجہ سے تمام عمر کوئی مطالبہ یا مواخذہ نہ کروں گا۔ اگر تم اپنے لئے اس دعوائے امان کی توثیق چاہتے ہو' تو جسے چاہو' میرے پاس بھیج دو۔ وہ اسی طرح عہد وپیمان کرلے جس پر تم کو اعتماد ہوسکے۔"

امیر المومنین منصور کے اس خط کے جواب میں محمد بن عبد اللہ حسنی مذکور الصدر نے

جو خط لکھا تھا وہ درج ذیل ہے:

محمدؒ بن عبد اللہ بن حسنؓ بن حسنؓ بن علیؓ کا جواب۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ خط عبد اللہ (۱) المہدی محمد بن عبد اللہ کی طرف سے عبداللہ بن محمد کے نام لکھا جاتا ہے۔"

"طسم تلک ایت الکتب المبین نتلو علیک من نبأ موسی وفرعون بالحق لقوم یؤمنون' ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طآئفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحی نساءھم' انہ کان من المفسدین' ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون و ھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون"(۲)

"جو وعدہ امان تم نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہی تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خلافت ہمارا حق ہے۔ اور تم نے بھی ہماری ہی خاطر اس کا دعویٰ کیا تھا۔ ہمارے ہی پیروؤں کے ساتھ تم نے اس کے حاصل کرنے کے لئے خروج کیا اور ہمارے اثر اور بزرگی کی وجہ سے تم کو یہ خلافت نصیب ہوئی۔ ہمارے دادا علیؓ وصی اور امام تھے۔ ان کی اولاد کی موجودگی میں تم کیونکر ان کی ولایت کے وارث بن گئے؟ علاوہ بریں تم جانتے ہو کہ آج تک اس خلافت کا مدعی کوئی ایسا شخص نہ ہوا' جو شرافت نسبی اور فضیلت ذاتی کی بناء پر ہمارے مماثل ہو۔

ہم ان کی اولاد میں نہیں ہیں جن پر لعنت بھیجی گئی ہو یا جن کو جلا وطن کیا گیا ہو یا ان کی ماؤں کو طلاق دی گئی ہو۔ کسی ہاشمی کو قرابت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام لانے میں سبقت کرنے میں' اور ذاتی حیثیت سے وہ فضیلت حاصل نہیں ہے جو ہم کو ہے۔ ہمارا رشتہ رسول اللہ سے جاہلیت اور اسلام دونوں میں ملتا ہے۔ ہم جاہلیت میں ان کی ماں فاطمہ بنت عمرو کی اولاد ہیں۔ اور یہ

---

(۱) خلیفہ منصور عباسی کا نام (۲) القصص ۱:۶

شرف صرف ہم کو حاصل ہے تم کو نہیں حاصل ہے۔ اللہ نے ہم کو ان کی اولاد میں اور انہیں ہمارے اسلاف اختیار کیا ہے۔ ہمارے نانا انبیاء میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ ہمارے دادا سب سے پہلے اسلام لانے والے علیؓ ہیں۔ ہم رسول اللہ کی سب سے افضل بیوی خدیجہؓ طاہرہ کے بطن سے ہیں۔ جنھوں نے سب پہلے قبلہ رو ہوکر نماز پڑھی۔ نیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سب سے بہتر صاحبزادی فاطمہؓ کی اولاد سے ہیں۔ جو تمام جنتیوں کی سیدہ ہیں اسی طرح ہم عہد اسلام میں پیدا ہونے والے حسنؓ کی اولاد ہیں جو جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔"

"علیؓ دو طرح سے ہاشم کی اولاد ہیں۔ اسی طرح حسنؓ دو طرح سے عبد المطلب کی اولاد ہیں۔ اور میں حسن رضی اللہ عنہ اور حسینؓ عنہ کی طرف سے دو طرح سے رسول اللہ کی اولاد ہوں۔ ننہالی اور ددھیالی دونوں رشتوں کے اعتبار سے تمام بنی ہاشم میں اشرف اور **نجیب الطرفین** ہوں۔ کسی عجمی عورت اور باندی کا خون میری رگوں میں نہیں ہے، اللہ نے جاہلیت اور اسلام دونوں عہدوں میں میرے باپ اور ماں بہتر بنائے یہاں تک کہ دوزخ میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ اس شخص کا نواسہ ہوں جس کا مرتبہ جنت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اور اس کا پوتا ہوں جس پر دوزخ میں سب سے سہل عذاب ہوگا۔ میں نیکوں میں سب سے بہتر کی اولاد ہوں، اور بروں میں بھی جو برائی میں سب سے کم برا تھا اس کی اولاد میں ہوں۔ جس طرح میں سب سے اعلیٰ جنتی کا نواسا ہوں اسی طرح سب سے بہتر دوزخی کا پوتا ہوں"۔

"اگر تم میری اطاعت اختیار کرو تو میں اللہ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ تمہاری جان ومال کے لئے امان دیتا ہوں اور اس اثناء میں سوائے اللہ کے محارم اور حقوق العباد کے چاہے وہ مسلمان کے ہوں یا معاہدین کے، جو تم نے کیا ہوگا، اس پر تم سے کوئی باز پرس نہ کروں گا۔ البتہ اللہ کے محارم اور حقوق العباد کے متعلق تم میری

ذمہ داری سے ....

واقف ہو کہ اسے میں خود معاف نہیں کرسکتا۔ کیونکہ تمہارے مقابلے میں میں خلافت کا زیادہ مستحق ہوں۔ نیز مجھے اپنے عہد کا تم سے زیادہ پاس ہے۔ کیونکہ تم نے مجھ سے پہلے کئی آدمیوں کو عہد امان دیا تھا مگر اس کا لحاظ نہیں رکھا۔ اب تم مجھے کس قسم کا وعدہ امان دیتے ہو' ابن ہبیرہ کا' یا اپنے چچا عبد اللہ بن علی کا' یا ابن مسلم کا؟".

امیر المومنین ابو جعفر منصور کا جواب الجواب:

"امیر المومنین منصور العباسی نے محمد بن عبد اللہ الحسنیؒ موصوف کے مندرجہ بالا خط کا جو جواب دیا وہ درج ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ میں نے تمہارا خط پڑھا۔ اور مجھے تمہارے مطلب سے آگاہی ہوئی تم نے اپنے فخر نسبی کی بنیاد زیادہ تر عورتوں کی تعریف پر رکھی ہے۔ تاکہ اس سے جاہل عوام کو گمراہ کرو۔ تم کو معلوم ہو کہ اللہ نے عورتوں کا وہ حق نہیں مقرر کیا ہے جو چچا' دادا یا عصبات اور اولیاء کا ہے۔ اللہ نے چچا کو باپ کا مرتبہ عطا کیا ہے' اور اپنی کتاب میں حقیقی ماں پر بھی چچا کو ترجیح دی ہے۔ اگر اللہ عورتوں کے حق ان کی قرابت کی وجہ سے قائم کرتا تو سب سے زیادہ حق اور مرتبہ اس دنیا میں اور آخرت میں دخول جنت کا شرف اولیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ کو عطا فرماتا۔ لیکن اللہ نے اپنے علم کے باوجود یہ شرف دوسروں کو دیا"۔

"تم نے ابو طالب کی ماں فاطمہ کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہو۔ حالانکہ اس کی اولاد میں سے چاہے بیٹا ہو یا بیٹی کسی کو اسلام لانے کا شرف نہیں نصیب ہوا۔ اگر کسی کو محض قرابت رسول کی وجہ سے شرف اسلام نصیب ہوا ہوتا تو وہ عبد اللہ کو ہوتا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء میں دنیا و آخرت دونوں جگہ سب سے قریب تر ولی رسول تھے۔ مگر اللہ جسے چاہتا ہے

اپنے دین مبین کے لئے پسند فرماتا ہے۔ اس نے فرمایا:

"انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء وھواعلم بالمھتدین"۔

"اور جب اللہ تعالیٰ نے محمد علیہ السلام کو نبی مبعوث فرمایا اس وقت آپ کے چار چچا موجود تھے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:۔

"وانذر عشیرتک الاقربین"

چنانچہ آپؐ نے ان کو اللہ کا پیام پہنچایا۔ اور دعوت اسلام دی۔ دو نے قبول کیا۔ ان میں سے ایک میرے دادا تھے۔ دو نے اسلام قبول نہیں کیا۔ ان میں سے ایک تمہارے دادا ہیں۔ اس وجہ سے اللہ نے تمہارے دادا کو ان دونوں یعنی اسلام لانے والے میرے دادا' اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت میراث عہد وذمہ داری سے محروم کردیا"

"تم نے دعویٰ کیا ہے کہ تم اس شخص کی اولاد میں ہو جسے دوزخ میں سب سے کم عذاب ہوگا یا جو اشرار میں بہترین تھا۔ حالانکہ نہ کفر میں چھوٹائی اور بڑائی ہے اور نہ اللہ کے عذاب میں کمی اور خفت ہے۔ بھلا شر میں خیر کہاں۔ کسی مومن کو جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو یہ زیب نہیں کہ وہ دوزخ کی حالت پر کسی سے فخر کا اظہار کرے اور جو ایسا کرے گا وہ عنقریب دوزخ میں جائے گا۔ اور اس وقت اسے حقیقت معلوم ہوجائیگی۔

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"

تم نے علیؓ کی ماں فاطمہ پر فخر کیا اور لکھا ہے کہ اس طرح دو طرح سے ہاشم کی اولاد ہیں' اس طرح حسنؓ دو واسطوں سے عبدالمطلب کی اولاد ہیں' اور یہ کہ تم نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ تم دو واسطوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہو' تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو اگلوں اور پچھلوں میں سب سے افضل ہیں ایک ہی واسطے سے ہاشم کی اولاد ہیں اور ایک ہی واسطے سے عبدالمطلب کے پوتے ہیں"۔

"تم نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ تم بنی ہاشم میں نسب کے اعتبار سے اوسط ہو اور نجیب الطرفین ہو اور یہ کہ نہ تم کسی عجمی بیوی کی اولاد ہو' اور نہ باندیوں کا خون تمہاری رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ یہ دعویٰ کر کے تم نے تمام بنی ہاشم پر اپنی فضیلت کا ادعا کیا ہے۔ تم پر افسوس ہے کہ فردائے قیامت تم اللہ کو اس فخر کا کیا جواب دوگے۔ تم اپنی حد سے متجاوز ہوگئے۔ اور تم نے اس کے مقابلے میں اپنے نسب پر فخر کیا ہے۔ جو ذاتی طور پر اور اپنے باپ کی وجہ سے اول و آخر تم سے بہتر ہے۔ یعنی ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں بھی تم اپنا نسبی فخر جتایا ہے۔ حالانکہ خود تمہارے دادا کی بہترین اولاد باعتبار اپنی ذاتی بزرگی کے وہی ہے جو باندیوں کے بطن سے ہے"

تمہارے خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علیؓ بن حسینؓ سے بہتر کوئی آدمی نہیں پیدا ہوا' باوجودیکہ وہ باندی کے بطن سے ہیں۔ مگر وہ تمہارے دادا حسنؓ بن حسنؓ سے بہتر تھے ۔ اس طرح تمہارے خاندان میں ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن علیؓ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کی دادی ام ولد تھیں اور وہ تمہارے باپ سے بہتر ہیں ۔ ان کے بیٹے جعفرؓ ہیں ۔ ان کا ایسا بھی تمہارے خاندان میں کوئی نہیں ہوا۔ ان کی دادی بھی ام ولد تھیں ۔ مگر وہ تم سے بہتر ہیں ۔"

" تمہارا یہ دعویٰ کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ہو کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے :-

" ما کان محمد ابا احد من رجالکم (ترجمہ آیت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں)

البتہ تم انکی صاحبزادی کے بیٹے ضرور ہو ۔ اور یہ بہت قریب کی رشتہ داری ہے۔ مگر اس سے تم کو میراث نہیں مل سکتی۔ اور نہ اس سے تم ان کی ولایت کے وارث ہوسکتے ہو۔ اور چونکہ لڑکی کو امامت

نہیں ملتی ۔ نظر بریں تم امامت کے وارث کیسے بن سکتے ہو ؟ تمہارے دادا نے اس کا مطالبہ کیا تھا اور علانیہ و خفیہ طور پر اس کے لئے ہزاروں جتن کئے مگر لوگوں نے ان کے اس دعوے کو قبول نہیں کیا۔ اور شیخینؓ کو ان پر فضیلت دی۔ نیز تمام مسلمانوں میں بلا اختلاف ' یہ طریقہ رائج ہے کہ نانا ' ماموں اور خالہ ورثہ نہیں پاتے ۔"

"تم نے علیؓ کی وجہ سے ہم پر اپنا فخر جتایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلام میں ان کو دوسروں پر سبقت حاصل تھی ' تو یہ بھی کوئی فخر کی بات نہیں ہو سکتی ۔ وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ کر دوسرے کو امامت جماعت کا حکم دیا تھا پھر ان لوگوں کے بعد لوگوں نے اور دوسرے شخص کو اپنا امام بنالیا اور علیؓ کو امام نہیں بنایا ۔ اسی وجہ سے وہ ان چھ آدمیوں میں نامزد کئے گئے تھے۔ ان سب نے بھی علیؓ کو خلافت و امامت کا مستحق نہیں سمجھا۔ بلکہ عبدالرحمٰنؓ نے تو عثمانؓ کو علیؓ پر ترجیح دی ۔ جب عثمانؓ شہید ہوئے تو علیؓ پر ان کے قتل میں شرکت کا شبہ تھا۔ طلحہؓ اور زبیرؓ تو ان سے لڑ ہی پڑے۔ سعدؓ نے ان سے بیعت سے انکار کردیا اور اپنا دروازہ بند کرلیا اور پھر ان کے بعد سعدؓ نے معاویہؓ سے بیعت کرلی۔ اس کے بعد علیؓ نے ان لوگوں سے بیعت لینے کے لئے اپنا پورا زور صرف کردیا بلکہ جنگ بھی کی ۔ جس میں خود ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑدیا اور حکومت حاصل ہونے سے پہلے خود ان کی شیعہ جماعت نے ان کی اہلیت پر شبہ ظاہر کیا ۔ پھر انہوں نے دو حکموں کے فیصلے پر اپنا معاملہ چھوڑدیا۔ ان کے انتخاب کو پسند کرکے ان لوگوں کے سامنے یہ عہد کرلیا کہ وہ ان کے فیصلے کو مان لیں گے ۔ ان دونوں نے متفقہ طور پر ان کی علیحدگی کا تصفیہ کیا ۔ اس کے بعد حسنؓ نے معاویہؓ کے ہاتھ چند چیتھڑوں اور درہموں کے کے عوض خلافت بیچ دی ۔ خود حجاز جارہے ' اپنے طرف

داروں کو معاویہؓ کے حوالے کردیا ۔ اس طرح انہوں نے حکومت ایسے شخص کے حوالے کردی جو اس کا اہل نہ تھا ۔ نیز ایسے شخص سے خلافت کے عوض قیمت قبول کرلی جو اسکا جائز وارث نہ تھا ۔ اگر خلافت کا تم کو کچھ بھی حق تھا تو وہ تم نے پہلے ہی روپے کے عوض فروخت کردیا ۔ تمہارے چچا حسینؓ بن علیؓ نے بھی ابن مرجانہ کے مقابلے پر خروج کیا مگر جمہور نے حسینؓ کے خلاف ابن مرجانہ کا ساتھ دیا ۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان کو قتل کردیا اور خود ان کا سر لے کر اس کے پاس حاضر ہوئے ۔ پھر تم نے بنی امیہ کے خلاف خروج کیا مگر انہوں نے تمہیں بری طرح قتل کرکے کھجوروں کے تنوں پر سولی دے دی ۔ تم کو آگ میں جلایا ' اور اپنے سب علاقوں سے نکال دیا ۔ انہوں نے تمہارے مردوں کو قتل کرکے عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا اور بغیر گدے اور تکئے کے **محملوں** پر سوار کرکے حاصل کردہ باندیوں اور غلاموں کی طرح شام لے گئے۔ ہم نے ان پر خروج کرکے تمہارے خون کا مطالبہ کیا۔ اور واقعی ہم نے ان سے تمہارا بدلہ لے لیا۔ ہم نے تم کو ان کے علاقے اور آبادی کا مالک بنادیا۔ ہم تمہارے آباء کی سنت پر چلے اس طرح ہم نے ان کی بڑائی ثابت کردی ۔ اب تم ہمارے اسی فعل کو ہمارے خلاف بطور حجت پیش کرتے ہو۔ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم نے تمہارے دادا کا جو ذکر کیا یا ان کی فضیلت کا اظہار کیا یہ اس لئے کہ تھا کہ ہم ان کو حمزہؓ ' جعفرؓ ' عباسؓ سے افضل سمجھتے ہیں؟ اگر تمہارا ایسا خیال ہے تو یہ غلط ہے ۔ کیونکہ ان سب ہمارے بزرگوں نے جب اس دنیا کو خیرباد کہا تو وہ اپنی موت مرے ' نہ ان کو کسی نے قتل کیا نہ انہوں نے کسی کو نقصان پہنچایا 'سب لوگ بالاتفاق ان کی بزرگی کے قائل تھے ۔ اس کے برخلاف تمہارے دادا ہمیشہ جنگ و جدل ہی میں مشغول رہے ۔ بنی امیہ کا یہ حال تھا کہ وہ ان پر اس طرح لعنت بھیجتے جس طرح کفار اپنی مکتوبہ نماز میں لعنت کرتے ہیں ۔ ان کی حمایت میں ہم نے مناقشہ کیا اور بنی امیہ کو

تمہارے دادا کی فضیلت یاد دلائی اور ان پر زور دے کر ان کو اس حرکت سے روک دیا ۔"

" تم کو معلوم ہے کہ عہد جاہلیت میں زمزم کی تولیت ان کے اور بھائیوں میں سے صرف عباسؓ کو ملی اس بارے میں تمہارے دادا نے ہم سے تنازع کیا ۔ مگر عمرؓ نے ہمارے حق میں فیصلہ کیا۔ اس طرح ہم جاہلیت اور اسلام دونوں عہدوں میں زمزم کے مالک رہے۔ ایک مرتبہ مدینہ میں بارش نہ ہونے سے قحط پڑا۔ عمرؓ نے ہمارے ہی دادا کو اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ بنایا اور ان سے دعا کرائی ۔ اللہ نے اہل مدینہ کو قحط کی مصیبت سے نجات دی ۔ اور رحمت باراں نازل فرمائی ۔ اس وقت اگرچہ تمہارے دادا وہاں موجود تھے مگر عمرؓ نے ان کو اس کام کے لئے وسیلہ نہیں بنایا ۔ تم کو معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے صرف عباسؓ زندہ تھے۔ اس وجہ سے وہ چچا ہونے کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہوئے۔ بنی ہاشم کے ایک سے زیادہ اشخاص نے اس حق کو طلب کیا مگر ان کے بیٹے کے سوا اور کسی کو وہ نہ ملا۔ اس لئے سقایہ بھی انہیں کو حاصل رہا ۔ اور نبی کی میراث بھی ان کو پہنچی ۔ اور خلافت بھی انہیں کی اولاد کو ملی ۔ اس طرح عہد جاہلیت ہو یا عہد اسلام دنیا ہو یا آخرت 'کوئی شرف اور فضل ایسا نہ تھا کہ عباسؓ اس کے وارث اور مورث نہ ہوئے ہوں۔"

تم نے بدر کے واقعہ کا ذکر کیا ہے ۔ اس کا حال یہ ہے کہ اسلام آیا تو اس وقت عباسؓ نے ابو طالب کو پناہ دی اور سخت عسرت میں وہ ابوطالب کے گھر کے کفیل رہے ۔ اور اگر عباسؓ بادل ناخواستہ دوسروں کی زبردستی سے بدر نہ جاتے تو ابوطالب اور عقیل بھوک سے مرجاتے اور ان کو شیبہ و عتبہ کی دیگیں چاٹنا پڑتیں۔ مگر چونکہ عباسؓ بڑے فیاض کھلانے والے تھے اس وجہ سے انہوں نے اس ذلت سے تمہیں بچادیا۔ تمہارے سارے اخراجات خود برداشت کئے ۔ پھر جنگ بدر میں انہوں نے عقیل کو فدیہ دے کر

انہیں رہا کرایا ۔ اب تم کس بات کی وجہ سے ہمارے مقابلے میں فخر کرتے ہو ؟ کفر کے زمانہ میں بھی ہم تم سے بڑے تھے او رہمارا ہاتھ اوپر تھا ۔ ہم نے تم کو فدیہ دے کر قید سے رہائی دلوائی۔ جو مکارم اور شرف ہمارے آباء کو حاصل ہوئے وہ تم کو نہیں ملے۔ تم نہیں بلکہ ہم خاتم الانبیاء کے وارث بنے ۔ ہم نے تمہارے خون کا عوض طلب کیا اور اسے لے لیا ۔ حالانکہ تم خود اس کے حاصل کرنے سے عاجز رہے ۔ والسلام علیکم۔"

(تاریخ طبری حوادث ۱۴۵ دور خلافت عباسیہ)

فریقین کے منقولہ بالا خطوط میں متعدد ایسے افکار و عقائد کا اظہار کیا گیا ہے جو قطعاً خلاف کتاب و سنت ہیں۔ اور یقیناً باطل ہیں ۔ مثلاً محمدؒ بن عبداللہؒ کے خط میں ولایت علیؓ کا جو عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے وہ سراسر باطل اور زیغ و ضلال ہے ۔ اسی طرح منصورؒ کے خط میں بعض صحابہؓ کرام کی شان میں جو گستاخانہ کلمات ہیں وہ بھی قابل نفرت اور گمراہ کن ہیں۔ ان دونوں باتوں کا تذکرہ بطور مثال کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ان خطوط کے متعدد مندرجات غلط اور قابل اعتراض ہیں ۔ اگر ہم ان کی غلطی کی وضاحت کریں تو اپنے موضوع سے دور ہوجائیں گے۔ ان پر تنقید کا یہ محل بھی نہیں ۔ اس لئے ہم اس وقت تنقید و تردید کو قلم انداز کرتے ہیں۔ ان خطوط کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ امت مسلمہ میں "ملوکیت" کا تصور کیسے پیدا ہوا ؟ اور اس کے پیدا کرنے والے کون لوگ ہیں ؟

آیئے اس زاویہ نظر سے فریقین کے منقولہ بالا خطوط کا جائزہ لیں :۔

خلیفۃ المسلمین ابو جعفر المنصورؒ کے پہلے خط میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سوالات مذکورہ کے جواب کی طرف مشیر ہو۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات بھی نہیں معلوم ہوتی ۔ البتہ اس سے ان کی **کریم النفسی** ' **وسیع العقلی** ' اور مروت و سخاء نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے قرآن مجید سے استدلال کرکے ابن عبداللہ کی غلطی واضح کی اور ان کے اقدام کو حرام و معصیت ثابت کرکے نہایت فراخ دلی کے ساتھ انہیں معاف کردینے کا وعدہ کیا ہے بشرطیکہ وہ اپنی روش ترک کردیں اور اپنی غلطی سے باز آجائیں ۔ یہ سب باتیں حدود شرعیہ کے اندر ہیں ۔ ان کا کوئی قدم ان حدود سے باہر نظر نہیں آتا ' حق خلافت و امامت بربناء وراثت یا قرابت کا کوئی تذکرہ اس میں اشارتاً و کنایتاً بھی نہیں ہے ۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ بقیہ دونوں خطوط میں اہم تر خط محمد بن عبداللہ حسنیؒ کا ہے۔ جو ان کے سیاسی عقائد و افکار کا آئینہ دار ہے۔ جن کا وہ پرچار کرتے تھے۔ ان کے خط کے ایسے حصّوں پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے۔ اس اجمالی اشارے کی شرح درج ذیل ہے:۔

خط کی ابتداء ہی میں ابن عبداللہ لکھتے ہیں "خلافت ہمارا حق ہے" چند صفحات پیشتر میں ثابت کرچکا ہوں کہ ازروئے کتاب و سنت خلافت کا مستحق کوئی بھی نہیں ہوتا۔ "حق کا دعویٰ قطعاً باطل اور خلاف اصول شریعت ہے۔ استحقاق کا یہ اصول غیر اسلامی ملک (یا ملوکیت) کے جسم کا ایک اہم عنصر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ دعویٰ امویوں اور عباسیوں کے خلاف خروج کرنے والے علویوں کے درمیان مشترک رہا ہے۔ علوی حضرات نے خلافت بنو امیہ و بنو عباسؓ کے خلاف ساٹھ بار سے زائد خروج کیا۔ ان سب کی دعوت کی بنیاد اسی باطل دعوے پر قائم تھی۔ محمد بن عبداللہ حسنی المعروف بہ الارقط کے منقولہ بالا خط پر ایک نظر ڈالئے۔ مہدی ہونے کا دعویٰ سرنامہ موجود ہے۔ مہدی کے متعلق جو تصورات عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں ان سے سب واقف ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھئے تو مہدی ہونے کا دعویٰ مطلق العنان عالمگیر بادشاہی کے استحقاق کا دعویٰ ہے۔ اور استحقاق بھی اخلاقی نہیں بلکہ حق عطیہ الٰہی DEVINE RIGHT مگر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی اور شیعی تصورات کے مطابق ولی کہہ کر اس آسمانی اور عطیہ الٰہی حق کو تین گنا کرکے دکھایا ہے۔ روم و ایران کے شہنشاہ بھی اپنے مشرکانہ عقائد سے مناسبت رکھنے والے اسی قسم کے تصورات رکھتے تھے۔ ان کا بھی اعتقاد یہی تھا اور انہوں نے اپنی قوم کو یہی باور کرایا تھا کہ سلطنت کرنا ان کا حق ہے۔ اور یہ حق انہیں قادر مطلق نے دیا ہے اس لئے دوسروں پر ان کی اطاعت کرنا فرض ہے۔ اگر وہ ان کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان پر اللہ کا غضب نازل ہوگا۔ یہ تصور نظریہ ملوکیت کا جزو اہم ہے۔ پھر آں محترم کو "امام" کہہ کر اس کی تقویت مزید کردی بلکہ تصریح کردی کہ امامت یا خلافت ہمارا موروثی اور پیدائشی حق ہے۔ امامت و ولایت کو موروثی قرار دے کر خلافت کے تصور کا قلع قمع ہی کردیا۔ شرافت نسبی کا تکبر بے جا ان نظریات کے تکملہ کا کام دے رہا ہے۔ وراثت امامت برنباء شرافت نسب کا نظریہ اختلاف شکل کے ساتھ اپنے اصل جوہر کے لحاظ سے وہی نظریہ ہے جس پر فراعنۂ مصر نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ "رع" کے معنی قبطی زبان میں آفتاب کے ہیں۔ یہ فراعنہ خود کو آفتاب کی اولاد کہتے تھے

۔ اور قبطی مشرکین کے اعتقاد میں آفتاب (معاذ اللہ) سب سے بڑا دیوتا اور معبود تھا ان کے اسی عقیدہ باطلہ سے استدلال کرکے اس نے اپنی قوم پر یہ بات واضح کردی تھی کہ وہ اپنے اعلیٰ نسب ' ذاتی شرف ' اور وراثت کی وجہ سے مصر پر حکمرانی کا استحقاق رکھتا ہے ۔ کوئی بھی اس کے حق کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ اس کی مطلق العنانی اسی اساس پر قائم تھی ۔

مختصر یہ کہ مطلق العنان شاہی کے جملہ عناصر محمد الارقط کے تحریک میں موجود تھے اور وہ انہیں نظریات کی بنیا دپر اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے ۔ اس لئے ان کی تبلیغ و اشاعت کرکے انہیں پوری قوم کے ذہن پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ان غلط نظریات کی بنیاد پر جو حکومت قائم کی جائے وہ غیر اسلامی اور مطلق العنان شاہی کسرویت و قیصریت کی نوع ہی کی ہوسکتی ہے ' اسلامی خلافت نہیں ہوسکتی۔

خلیفتہ المسلمین ابو جعفر منصورؒ کے خط میں ولایت ' وصایت اور امامت کے تصورات و نظریات کا تو کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن اس کے بعض جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی استحقاق خلافت بربناء وراثت کے قائل تھے ۔ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت عباسؓ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے خود کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے ۔ عہد بنی امیہ میں عباسیوں نے اپنی خلافت کی جو دعوت دی تھی اس کی روح بھی یہی استحقاق بربناء وراثت و قرابت کا نظریہ تھا ۔ لیکن جہاں تک منقولہ بالا خط کا تعلق ہے ' اسے غور سے دیکھنے سے عیاں ہوجاتا ہے کہ منصور نے صرف الزامی اور ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے وراثت کا تذکرہ کیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ خلافت کا کسی کو شرعی حق حاصل ہوتا ہے اور یہ حق بربناء وراثت و قرابت حاصل ہوتا ہے تو خود تمہاری دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسی خلافت کے مستحق ہیں ۔ اور تم کسی طرح بھی اس کے مستحق نہیں ہو۔ یہ صرف محمد الارقط کے استدلال کا جواب اور ان کے دعوے کا ابطال ہے ۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امیر المومنین منصور بھی محمد الارقط کی طرح استحقاق بربناء وراثت کے قائل تھے یا خود ان کا یہ عقیدہ اور نظریہ تھا ۔

عباسیوں نے اپنی دعوت بھی اسی استحقاق بربناء قرابت و وراثت کے باطل نظریئے کی قوت سے پھیلائی ۔ لیکن حالات مابعد سے واضح ہوگیا کہ یہ ان کا ایک سیاسی نعرہ اور اسٹنٹ تھا۔ جسے انہوں نے بطور تدبیر وقتی طور پر اختیار کیا تھا ۔۔ یہ ان کا عقیدہ اور اصول نہ تھا ۔ جب وہ تخت خلافت پر متمکن ہوگئے تو انہوں نے یہ نعرہ ترک کردیا۔ اور ان کے حالات سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اس کے قائل تھے ۔ ان میں سے کسی نے بھی کبھی اس کا

دعویٰ نہیں کیا ۔ بلکہ ان کی خلافت میں اسی شوریٰ اور نصب کے اسلامی طریقے کام میں لائے گئے ۔ اور ہر خلیفہ جمہور اہل اسلام کی مرضی ان کے رہنماؤں اور نمائندوں کی رائے سے مقرر ہوا۔

امیر المومنین منصور" شیعی ارجاف و تشہیر سے متاثر ہوکر یہ سمجھے تھے کہ خلفاء بنی امیہ نے بنو ہاشم خصوصاً بنی فاطمہ علویوں پر ظلم کیا ہے ۔ جیسا کہ ان کے منقولہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ مگر جب خود انہیں ان حضرات سے واسطہ پڑا ۔ تو ان کی غلط فہمی دور ہوگئی ۔ اور وہ خود وہی کرنے پر مجبور ہوگئے جو بنو امیہ نے کیا تھا ۔ ان کی سمجھ میں آگیا کہ بنو امیہ پر ظلم کا الزام بالکل غلط ہے ۔ انہوں نے بغاوتوں کا مقابلہ کیا یہ شرعاً و عقلاً ان پر واجب تھا۔ چنانچہ منصور نے بھی بغاوت کو کچلنے اور فساد فی الارض کو دور کرنے کے لئے سیف و سناں سے کام لیا ۔ اور شرعاً و عقلاً انہیں یہی کرنا چاہئے تھا ۔

علویین کا ایک گروہ اموی خلافت کی طرح عباسی خلافت کے خلاف بھی بار بار بغاوت کرتا رہا۔ لیکن ایک دوسرے گروہ نے اس طریقے کو پسند نہیں کیا ۔ بلکہ انہوں نے یہ پالیسی اختیار کی بنو عباس کی مخالفت کے بجائے ان سے تعلقات بڑھائے جائیں۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلافت میں شریک ہوجائیں اور جس حد تک ممکن ہو اقتدار میں حصہ حاصل کرلیں ۔ انہوں نے خلافت عباسیہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ دستور خلافت میں ان کے لئے امتیازات PREROGATIVES تسلیم کرلئے گئے ۔ اور اس میں ایک دفعہ ایسی داخل کی گئی جو اصول خلافت کے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ علامہ ماوردی" اپنی مشہور کتاب **الاحکام السلطانیہ** میں جو فقہ دستوری میں ایک اہم مقام رکھتی ہے ۔ ' تحریر فرماتے ہیں :۔

" الباب الثامن : فی ولایۃ النقابۃ علی ذوی الانساب وھذہ النقابۃ موضوعۃ علی صیانۃ ذوی الانساب الشریفۃ عن ولایۃ من لایکافئھم فی النسب ولایساویھم فی الشرف لیکون علیھم احبی وامرہ فیھم امضی "

" آٹھواں باب **شریف النسب** لوگوں کے لئے "ولایۃ نقابت" کے بیان میں۔ اس نقابت کا مقصد یہ ہے کہ **شریف النسب** افراد ایسے لوگوں کی ماتحتی اور سربراہی میں نہ رہیں جو نسب اور شرف میں ان کے برابر نہیں ہیں ــــــــــــــــ

ـــ تاکہ وہ (شریف نقیب) ان اشرفاء)

میں زیادہ پسندیدہ ہو اور اس کا حکم ان لوگوں پر بہتر طریقہ سے نافذ ہو سکے" (۱)

پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں :-

فاذا اراد المولی ان یولی علی الطالبین نقیبا او علی العباسیین یخیر منهم اجلهم بیتا واکثر هم فضلا و اجزلهم رأیا فیولی علیهم لتجتمع له شروط الریاسة والسیاسة فیسرعوا الی اطاعته" (۲)

" پس جب والی (نقیب) بنانے والا طالبیوں (اولاد ابی طالب) یا عباسیوں پر کوئی نقیب مقرر کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ ان میں سے ایسے شخص کا انتخاب کرے جو گھرانے کے اعتبار سے ان میں سب سے زیادہ باعزت ہو سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہو اور سب سے زیادہ صائب الرائے ہو ' پس ایسے شخص کو ان پر والی نقیب) بنائے - تاکہ اس میں ریاست سرداری) اور سیاست (دونوں)کے شرائط جمع ہوجائیں - پس وہ (یعنی طالبین و عباسیین اس کی اطاعت کی طرف دوڑیں-"

اس اقتباس سے تو اتنا ہی ظاہر ہورہا ہے کہ نسب اور خاندان کی اہمیت اور نسلی شرف کا پندار بے جا ' جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے - اس مکروہ صورت میں ظاہر ہورہا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے خاندان کے سوا کسی کو اپنا سربراہ تسلیم کرنا بھی گوارہ نہیں تھا- مگر جاہ و اعزاز کی حرص و ہوس ' اور نسلی تکبر نے جس میں دوسرے مسلمانوں کی تحقیر بھی شامل تھی- ان کے قدم کو اور آگے بڑھایا - علامہ ماوردی اس سلسلہ میں فرائض ولایت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

---

(۱) خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ایک عہدہ ہوتا تھا - عہدے دار کو نقیب کہتے تھے - جس نقیب کا تذکرہ یہاں ہے اس کا لقب نقیب الاشراف تھا - نقاب کو ہمارے زمانہ کی وزارت کے ہم معنی سمجھنا چاہئے -

(۲) الاحکام السلطانیہ ' مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب" البصری البغدادی الماوردی المتوفی ۴۵۰ ھ شرکت مصطفے البابی واولادہ مصر - ۱۳۸۶ھ ۱۹۶۶ء

والحادی عشر ان یقوم ذوی الھفوات منھم سوی الحدود بما لایبلغ بہ حدا ولا ینھر بہ دما ویقیل ذاالھیئۃ منھم عثرتہ ' ویغفر بعد الوعظ زلتہ" (ص ۹۶)

گیارھواں مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں (طالبیوں و عباسیوں) سے جو جرائم سرزد ہوں ان میں حدود کے سوا سب سزاؤں میں ایسی سزا اختیار کرے جو کسی حد شرعی کے درجہ کو نہ پہنچتی ہو' (اور کسی جرم) کی پاداش میں) خون نہ بہائے ۔ او ران میں سے معززین کی لغزشوں سے درگذر کرے اور نصیحت کرکے اس کی لغزش کو معاف کردے ۔

پھر ص ۹۸ پر لکھتے ہیں:۔

وان کان فی ولایۃ النقیب صرف القاضی عن النظر بین اھل ھذا النسب لم یجز للقاضی ان یتعرض النظر فی احکامھم سواء استعدی الیہ منھم مستعدا ولم یستعد

اور اگر نقیب کے اختیارات منصبی میں قاضی کو اس نسب والوں (طالبین اور عباسین) کے معاملات میں دخل اندازی سے روک دینا بھی داخل ہو تو قاضی کے لئے ان کے متعلق احکام میں نظر کرنا جائز نہیں خواہ ان لوگوں میں سے کوئی اعانت طلب کرنے والا اس سے اعانت طلب کرے یا نہ کرے ۔"

اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ ابو طالب کی اولاد ' اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ ز) اولاد کو معاشرے اور قانون دونوں کی نظر میں دوسرے مسلمانوں پر برتری اور امتیاز حاصل ہے۔ان کے معاملات کے انصرام اور ان کی امتیازی شان کے اظہار اور اس کی بقاء کے لئے نقیب الاشراف' کا تقرر عمل میں آیا۔ جو تاریخ الاسلام میں بالکل اجنبی اور نیا منصب تھا ۔ اس قانون کی رو سے ان خاندانوں پر کسی قاضی و حاکم کو اختیار باقی نہیں رہا ۔

گویا جملہ ملکی قوانین سے انہیں مستثنیٰ کردیا گیا انہیں بربناء نسب سب مسلمانوں سے اشرف و افضل تسلیم کرلیا گیا ۔ یہی نہیں بلکہ سرکاری طور پر جمہور مسلمین سے تسلیم کرایا گیا ۔

اسلام میں بربناء نسب شریف و رذیل کی کسی تقسیم کا نام و نشان بھی نہیں ملتا ۔ قرآن مجید اور احادیث نبویہ ناطق ہیں کہ سب انسان اللہ تعالیٰ کی نظر میں یکساں ہیں ۔ نسب کی

وجہ سے نہ کوئی شریف ہوتا ہے نہ رذیل ۔ انسانوں کے درمیان فرق مراتب عنداللہ صرف تقویٰ کی کمی بیشی کی وجہ سے ہوتا ہے ۔ خطبہ حجتہ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرمادیا کہ " عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ۔ تم سب حضرت آدم ' کی اولاد ہو اور حضرت آدم ' مٹی سے پیدا ہوئے تھے ۔ "

کسی گروہ کو عام قضاۃ و حکام کے دائرہ نفاذ قانون سے اس لئے باہر کردینا بھی کہ دوسروں پر اس کا تفوق اور اس کی برتری ظاہر ہو ' اسلامی تعلیمات اور اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

یہ قانون بھی علوی (فاطمی) حضرات ہی کی زورا زوری سے وجود میں آیا۔ عباسیوں کا یہ مزاج ہی نہ تھا۔ اگر ان کا یہ مزاج ہوتا تو وہ اپنی خلافت کی ابتداء ہی سے یہ امتیازات حاصل کرلیتے ۔ مگر ان کی طرف سے اس قسم کی کسی تحریک کا پتہ نہیں چلتا۔ انہوں نے کبھی ولایت ' وصایت ' امامت وغیرہ نظریات باطلہ کی تبلیغ نہیں کی نہ کبھی ان کی صحت تسلیم کی ۔ اس لئے انہیں اس غلط قانون کا ابتدائی واضع نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے آخردور میں جب شیعہ اور علوی ' خلافت پر چھاگئے تھے ' ان کے دباؤ کی وجہ سے عباسیوں کو بھی دستور میں ان غیر اسلامی دفعات کو داخل کرنا پڑا ۔

یہ علوی حضرات صرف ان اصول کے قائل ہی نہ تھے بلکہ ان کی طرف دعوت بھی دیتے تھے اور ان کی تبلیغ و اشاعت بھی کرتے تھے ۔ یہ افکار و عقائد پھیلتے رہے ۔ غیر عربی قومیں ترکی و ایرانی وغیرہ تو پہلے ہی اس قسم کے سیاسی عقیدے رکھتی تھیں۔ انہوں نے آسانی کے ساتھ انہیں قبول کرلیا ۔

خلافت عباسیہ میں ضعف پیدا ہوا تو آل بویہ کی شیعی سلطنت انہیں کسروی اصول کی بنیاد پر قائم ہوگئی ۔ اگرچہ اس کا قیام اسی علوی فاطمی جماعت کی اعانت کا رہین منت تھا ۔ اور انہیں کے نام سے عمل میں آیا تھا مگر آل بویہ بہت ہوشیار تھے ۔ انہوں نے بزعم خود امام وقت کو تو بطور تبرک رکھا ' زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ جب خلافت عباسیہ کمزور ہوگئی اور بہت سے صوبوں کے گورنر خود مختار ہوگئے ۔ تو انہوں نے اپنی حکومتیں ان علوی حضرات کے مذکورہ بالا سیاسی عقائد و اصول کو اپنے سانچے میں ڈھال کر خلافت اسلامیہ کے بجائے قیصر و کسریٰ ۔ کے طرز پر قائم کرلیں ۔ اور صوبوں کے والی کے بجائے ملک و سلطان بن گئے ۔

اس سوال کا کہ اسلام نے تو نظام خلافت کی تعلیم دی ہے پھر مسلمانوں میں ایسی

بادشاہتیں کیسے قائم ہوگئیں جنہوں نے اپنا نظام حکومت نظام خلافت کے بجائے، کسریٰ و قیصر کے اصول پر قائم کیا؟ صحیح جواب یہی ہے جو ہم نے اوپر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی اصطلاحی ملوکیت کی تعلیم عبداللہ ابن سبا نے دی۔ اس تعلیم کو بعض علوی فاطمی حضرات نے قبول کیا اور اس کی نشر و اشاعت کی۔ انہیں اصول کو اپنے سانچوں میں ڈھال کر مسلمانوں کے بعض گروہوں نے "ملوکیتیں" قائم کردیں۔ اس طرح مسلمانوں میں بھی یہ اجنبی شیعی سیاسی نظام در آمد ہوگیا۔

یہاں اس غلط فہمی کو دور کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خلافت عباسیہ کے ضعف یا اس کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں نے جو حکومتیں شاہی طرز کی قائم کیں یا جو خلافت کے صوبے مستقل سلطنت کی صورت اختیار کرکے رومی و ایرانی طرز کی شاہی میں تبدیل ہوگئے ان کی سلطنتیں سب کی سب یکساں تھیں اور سب کی سب ہوبہو قیصرو کسریٰ کی جیسی تھیں۔ یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ جس کا پروپیگنڈہ شیعوں اور شیعہ نواز سنیوں کی طرف سے ہماری تاریخ کا چہرہ بگاڑنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عباسیہ ختم ہونے کے بعد شاہی قسم کی جو حکومتیں قائم ہوئیں انہیں دو قسموں پر منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں بعض تو واقعی ایسی تھیں جن پر نظام خلافت کا سایہ بالکل نہیں پڑا تھا۔ اور وہ قیصرو کسریٰ کی حکومتوں کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ مگر بکثرت ایسی تھیں جن کا نظام اگرچہ نظام خلافت نہ تھا مگر عملاً وہ نظام خلافت ہی کا نمونہ تھیں۔ ان کے سربراہ شوریٰ اور نصب کے طریقہ سے اس منصب تک نہیں پہنچے تھے۔ لیکن انہوں نے حکومت خلفاء ہی کے طرز و طریق سے کی۔ شرعی احکام و قوانین نافذ کئے۔ عدل و انصاف سے کام لیا۔ اور ایسا انتظام کیا کہ کمزور سے کمزور کو بھی عدل و انصاف میسر ہوسکے۔ رعایا کے خیر خواہ رہے۔ اور خود کو ان کا خادم سمجھتے رہے۔ اس لئے ان کی تکلیفیں دور کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اور یہ سلاطین و ملوک اپنے عوام میں مقبول و محبوب تھے۔ ان کی ذاتی زندگی متقیانہ تھی۔ اس قسم کی سلطنتیں ہماری تاریخ میں ایک دو نہیں بکثرت ہیں۔ مگر ان سب سلطنتوں کے سربراہ اسلام یعنی مذہب اہلسنت و الجماعت کے پیرو تھے۔

قسم اول یعنی وہ سلطنتیں جو اصول اور عمل دونوں کے اعتبار سے کسرویت اور قیصریت کا نمونہ تھیں اکثر و بیشتر شیعہ سلطنتیں تھیں پوری تاریخ دیکھ لی جائے اور آج مشاہدہ کرلیجئے کسی شیعہ سلطنت کو آپ چنگیزیت سے پاک نہ پائیں گے۔

ہر شیعہ سلطنت میں ظلم و جور کا دور دورہ اور عدل و انصاف کا فقدان اور بے حیائی اور بدکرداری کا رواج ہوتا ہے۔ قیصریت و کسرویت بلکہ چنگیزیت و نمرودیت کے مکروہ نمونے شیعہ سلطنتوں میں نظر آتے ہیں۔ پوری تاریخ اس کی شاہد ہے اور آج کے واقعات بھی اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ بطور مثال ایران کے تازہ حوادث و انقلاب کو پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۷۹ء سے پہلے وہاں پہلوی خاندان کا ایک بادشاہ حکمراں تھا۔ جو خود کو شہنشاہ کہلواتا تھا۔ نہایت ظالم و جابر تھا ہزاروں بے گناہوں کا خون ناحق اس نے بہایا۔ عوام اس کے مظالم سے تنگ آگئے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں روح اللہ خمینی نامی ایک شیعہ مجتہد کی سرکردگی میں امریکہ اور اسرائیلی حکومت یہود کی امداد سے اس کے خلاف انقلاب ہوگیا۔ شاہ ملک سے چلاگیا اور دربدر پھر کر مرگیا۔ لیکن جتنے مظالم شاہ نے اپنے پورے زمانہ میں حکومت میں کئے تھے اس سے کئی گنے زیادہ مظالم خمینی نے آٹھ سال کے اندر کئے ہیں۔ جتنا خون ناحق شاہ نے اپنے پورے دور سلطنت میں بہایا تھا اس سے دس گنے زیادہ انسانوں کا خون ناحق خمینی ان آٹھ سال کے اندر بہاچکا ہے۔ (۱) اور ابھی اس کی خونخواری و خونریزی کا سلسلہ جاری ہے یہ شخص انسانوں خصوصاً مسلمانوں (اہلسنت) کے خون میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہے۔ خمینی اور

اس کے پیرو ہم مذہب سب کے سب دشمن اسلام کافر ہیں۔ یہ اس وقت کھلم کھلا یہود سے مل کر قرآن مجید کے خلاف سازشیں کررہے ہیں۔ قاتلهم الله انی یؤفکون یہ انقلاب اسلام کے نام سے کیا گیا تھا اور انقلاب کرنے والوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اسلامی نظام قائم کررہے ہیں۔ بظاہر بعض اصلاحیں بھی نافذ کی گئیں، مثلاً عورتوں کی بے پردگی کو روک دیا گیا۔ شراب پر پابندی لگادی گئی۔ مگر یہ سب وقتی اور ظاہری چیزیں تھیں دنیا کو فریب اور انقلاب کو پسندیدہ بنانے کے لئے کی گئیں تھیں۔ انہیں کے ساتھ ساتھ وہ مظالم ڈھائے گئے کہ جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بہت سے اہلسنت پر غلط الزام لگا کر گولی ماری دی گئی۔ نہ ان کا بیان سنا گیا۔ نہ الزام کا کوئی ثبوت پیش کیا گیا۔ ایسے واقعات بکثرت ہیں کہ شام کو الزام تراشی کرکے کسی کی گرفتاری ہوئی۔ رات ہی کو عدالت کے سامنے برائے نام پیشی ہوئی اور فیصلہ ہوگیا اور صبح کو اسے گولی مار دی گئی نہ الزام کا کوئی ثبوت پیش کیا گیا نہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیا گیا۔ یہ بے قصور مقتولین اہلسنت ہی ہوتے تھے۔

۔ دوسری ضروری وضاحت یہ ہے کہ علوی فاطمی خاندان کے متعلق میں نے جو رائے

ظاہر کی ہے کہ اسی خاندان کے لوگ مسلمانوں میں خاتمہ خلافت کے بعد کسریٰ و قیصر کی طرز کی حکومتیں قائم ہونے کے محرک تھے۔ اگر یہ اپنے غلط سیاسی عقائد و افکار نہ پھیلاتے اور مسلمان صرف نظام خلافت کو دیکھتے رہتے تو قیامت تک دنیا میں مسلمانوں کی کوئی حکومت بھی ایرانی کسرویت یا رومی قیصریت کے رنگ کی ملوکیت نہ ہوتی ہمارے اس بیان سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ علوی خاندان کے سب حسنی و حسینی افراد اس کسرویت سازی ' اور خلافت شکنی میں شریک اور متفق تھے۔ دشمنان بنی امیہ و بنی عباس کا ایک گروہ یہی ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس مسئلے میں پورا علوی خاندان متفق تھا۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ بکثرت حسنی و حسینی حضرات کو ان لوگوں سے جنھوں نے خلافت اسلامیہ امویہ یا عباسیہ کے خلاف خروج کیا ' سخت اختلاف رہا۔ اور انھوں نے ان کے خروج کو شرعاً بالکل ناجائز اور معصیت سمجھا۔ آج بھی ایسے حسنی و حسینی حضرات کی خاصی تعداد موجود ہے جو اموی و عباسی خلافت کی تعریف کرتے ہیں ' اور ان کے خلاف خروج کرنے والوں یا ان کی مذمت کرنے والوں کی روش کو ناجائز اور مذموم سمجھتے ہیں۔

اس بحث کے آخر میں حضرت طالوت رضی اللہ عنہ کے ملک منتخب ہونے کا واقعہ نقل کرنا ان شاء اللہ موجب بصیرت ہوگا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ جب اس زمانہ کے نبی علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوتؓ کو تمہارے اوپر ملک مبعوث فرمایا ہے (۱)

تو بنی اسرائیل نے انہیں ملک بنانے سے انکار کردیا اور کہا کہ :-

نحن احق بالملک منه ہم حکومت کے اس سے زیادہ حق دار ہیں۔ (البقرہ)

یہی " احق " ہونے کا دعویٰ اور اس کی بنیاد پر منتخب خلیفہ وقت کی خلافت کی مخالفت ان علوی حضرات نے کی۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل پیشین گوئی پوری ہوئی۔ حدیث شریف ہے :-

لتتبعن سنن من قبلکم تم ضرور ان امتوں کی پیروی کروگے جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں (۲) (مراد یہود و نصاریٰ ہیں) (بخاری شریف ج ۲ کتاب الاعتصام ص ۱۰۸۸)

---

(۱) یہ بعثت تکوینی تھی نہ کہ تشریعی۔ اگر تشریعی ہوتی تو انکار کی مجال ہی نہ باقی رہتی۔ سورہ بقرہ جزو اول میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

(۲) یہ مطلب نہیں کہ پوری امت ایسا کرے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ امت میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو اس فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔

امامت ' ولایت اور وصایت کے باطل افکار یہود ہی سے ان لوگوں میں آئے تھے ان افکار باطلہ کو قبول کرلینا یہ اتباع کا پہلا درجہ تھا ' دوسرا درجہ نحن احق بالملک منہ ("اقتدار کے مستحق ہم ان سے زیادہ ہیں") تھا جو عملی تھا۔ بنو اسرائیل کے اس دعوے " استحقاق " کو اللہ تعالیٰ نے مقام " ذم " میں ذکر فرمایا ہے اور ان کے اس فعل کو ناپسند فرمایا ہے۔ واقعات کی نوعیت میں یکسانیت کے پیش نظر قیاس جلی کہتا ہے کہ خلافت اسلامیہ کے مقابلے میں مندرجہ بالا ہاشمی علوی حضرات کا " احق بالملک " ہونے کا دعویٰ بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں مذموم اور ناپسندیدہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تکملہ

بحمداللہ اظہار حقیقت مکمل ہوگئی۔ جن مباحث کی ضرورت تھی وہ سب اس میں آگئے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر بقدر ضرورت مکرر روشنی ڈالی جائے۔ اس کی ضرورت ان مباحث پر نظر کرنے سے انشاء اللہ واضح ہوجائے گی۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو اظہار حقیقت جلد ثالث کے ساتھ بطور تکملہ یا ضمیمہ ضم کردیا جائے۔ اس تکملہ میں ان دو مسئلوں کا بیان مقصود ہے۔ (۱) جمل و صفین (۲) ام المومنینؓ بحیثیت قائد جیش

جمل وصفین

جمل و صفین کے واقعات پر جلد ثانی میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے یہاں مجھے ان کے بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ ان دونوں واقعات کو جنگ کہنا اصطلاحی طور پر توصحیح ہے ۔ لیکن حقیقت واقعہ کے لحاظ سے صحیح نہیں ان کے مقتولین و مجروحین کے بارے میں سبائی راویوں اور مورخوں نے صرف مبالغہ نہیں بلکہ دروغ بافی اور افتراء پردازی سے کام لیا ہے۔

اگرچہ یہ حقیقت ہماری گذشتہ بحث سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے مگر اتنی وضاحت کے ساتھ نہیں ظاہر ہوتی کہ غور و فکر کی ضرورت نہ پڑے بلکہ اسے سمجھنے کے لئے واقعات پر غور کرنا پڑتا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بحث مذکور کے اس نتیجہ کو مستقل طور پر صراحت و تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے۔

ابن سعد نے "الطبقات الکبری" میں لکھا ہے کہ یوم جمل میں مقتولین کی تعداد تیرہ ہزار تک پہنچ گئی ۔ البدایہ و النہایہ میں تین ہزار کم کر دیئے ہیں یعنی مقتولین کی تعداد دس ہزار لکھی ہے ۔ یہ ملحوظ رہے کہ ابن سعد واقدی کے کاتب تھے۔الطبقات الکبری ان

کی تالیف نہیں ہے بلکہ واقدی کی تالیف ہے۔ ابن سعدؒ اس میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ لکھ سکتے تھے۔ یہ تعداد واقدی کی بتائی ہوئی ہے اور واقدی کی متعلق اظہار حقیقت جلد اول میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ شخص جمہور علماء اہل سنت کی نزدیک قطعاً" قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ چھپا ہوا شیعہ اور تحریک شیعیت کا اہم رکن تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ ان کے متعلق بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہ سنی تھے مگر واقدی وغیرہ تقیہ باز شیعہ مورخین پر حد سے زائد اعتماد کرتے تھے۔ اس کے ساتھ "نقل راچہ عقل" کے بھی قائل تھے۔ انھوں نے محض تقلیداً" مقتولین کی یہ تعداد لکھی ہے۔ تاہم تیرہ ہزار جھوٹ بہت نمایاں تھا اس لئے انھوں نے ڈرتے ڈرتے تین ہزار کم کر دیئے۔

خود حافظ ابن کثیرؒ واقعہ جمل کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کی روانگی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فلما بلغه قصد طلحة و الزبير البصرة خطب الناس و حثهم على المسير الى البصرة ليمنع اولئک من د خولها ان امکن او يطر دهم عنها ان کا نوا قد دخلوها فتثا قل عنه اکثر اهل المدينة و استجاب له بعضهم ــــــــ و خرج علیؓ من المدينة في نحو من تسعمائة مقاتل" (۱)

جب حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ بصرے جا رہے ہیں تو آپ نے خطبہ دیا جس میں لوگوں کو بصرے چلنے کا مشورہ دیا تاکہ اگر ممکن ہو تو ان لوگوں ۔(طلحہؓ و زبیرؓ) کو اس میں (بصرے میں) داخل ہونے سے روکا جائے یا (اگر وہ بصرے کے اندر پہنچ چکے ہوں تو) انھیں وہاں سے نکالا جائے' پس اکثر اہل مدینہ نے ان کے ساتھ جانے اور ان سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ صرف بعض نے ان کی بات (جو اوپر کہی گئی) مانی ــــــــ اور حضرت علیؓ تقریباً" نو سو جنگ کرنے والے اپنے ہمراہ لے کر (مدینہ سے) نکلے۔"

اس بیان میں تصریح ہے کہ اکثر اہل مدینہ نے حضرت علیؓ کا ساتھ نہیں دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر صحابہ و تابعین اسے ایک فتنہ سمجھ رہے تھے اور اس خانہ جنگی کو اچھا

---

(۱) البدایہ والنہایہ جلد سابع ص ۲۳۳۔ زیر عنوان "ابتداء واقعۃ الجمل" ناشر دارالفکر بیروت۔

نہیں جانتے تھے۔ اس لئے وہ اس میں حصہ لینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مدینہ منورہ کی اکثریت کے اس رویہ کی وجہ سے حضرت علیؓ جب مدینہ منورہ سے نکلے ہیں تو صرف نو سو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ راستہ میں قیام فرما کر انھوں نے کوفہ سے آدمی بلوائے مگر وہاں بھی وہ حضرات موجود تھے جو اس اختلاف میں کسی فریق کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس سے روک رہے تھے۔ اس لئے وہاں سے بھی حسب دل خواہ کوئی بڑی تعداد لڑنے والوں کی نہ آئی ہوگی۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ وہاں سے ۲ ہزار آدمی آکر لشکر میں شامل ہوئے تو بھی لشکر کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین ہزار تک پہنچی ہوگی۔ دوسری طرف حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ کے لشکر میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنے ہی آدمی ہونگے۔ گویا فریقین کے لشکروں کے افراد کی مجموعی تعداد چھ ہزار تھی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ شرکاء جنگ کی تعداد تو چھ ہزار ہو اور مقتولین کی تعداد تیرہ ہزار یا دس ہزار؟ **للعجب**۔ اس سے عیاں ہے کہ سبائیوں نے کھلا ہوا جھوٹ بولا ہے۔

جلد ثانی میں حوالوں کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے کہ فریقین باہمی جنگ سے سخت متنفر تھے۔ جنگ کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ جب سبائی مفسدوں نے فریب کاری سے جنگ برپا کرنا چاہی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد فریقین ان کے فریب سے آگاہ ہوگئے اور جنگ روکنے کی کوشش میں لگ گئے۔ دونوں طرف کے اکابر اور قائدین اپنی فوج کو جنگ سے منع کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں اتنا شدید قتال ہونا جس میں مقتولین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائے بالکل خلاف عقل و قیاس ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مورخین کا بیان بالکل غلط ہے۔

حضرت زبیرؓ کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ جب جنگ ختم ہوگئی تو وہ لشکر سے الگ ہو کر ایک وادی میں جا کر سو رہے اور وہاں عمرو بن جرموز نامی ایک سبائی بدباطن نے سوتے میں انھیں تیر مار کر شہید کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اتنی بڑی جنگ ہوئی تھی جس میں ہزاروں آدمی مارے گئے اور زخمیوں کی تعداد بھی ہزاروں ہی ہوگی' بالفرض ختم ہوگئی تو اس کے ختم ہونے کے بعد حضرت زبیرؓ کو اتنی جلد ایسا اطمینان کیسے ہوگیا کہ وہ **وادی السباع** میں آکر اطمینان کے ساتھ سو رہے؟ نیز یہ کہ ایسے وقت میں جبکہ بقول شیعہ مورخین اہل جمل کو شکست ہوگئی تھی آں محترم اپنی فوج اور اپنے ماتحتوں کو چھوڑ کر ان سے الگ کیسے ہوگئے؟ یہ تو فوجی اخلاق بلکہ عام اخلاق کے بھی خلاف ہے۔

انکے علاوہ اور بھی ایسے قرائن ملتے ہیں جن پر نظر کرنے کے بعد یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ سبائی مورخین جھوٹے ہیں' سنی مورخین نے بغیر غور و فکر ان کے بیانات اور ان کی روایتیں نقل کر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جمل کے واقعہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ سبائیوں نے فتنہ و فساد برپا کرنے کی کوشش کی کچھ مسلمانوں کو شہید کیا کچھ سبائی بھی **فی النار والسقر** ہوئے۔ اس کے بعد انکے فریب کا پردہ چاک ہوگیا اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہونے پائی۔ سبائی اپنے مقصد میں بالکل ناکام ہوگئے۔ اپنی کامیابی ظاہر کرنے اور صحابہ کرام ؓ کو بدنام کرنے کے لئے ان سبائیوں نے اس واقعہ کے بارے میں مبالغے اور جھوٹ کے انبار لگائے ہیں۔

صفین کے بارے میں تو شیعہ مورخین اور **رواۃ ابو مخنف' جابر جعفی** وغیرہ نے جو اپنے رفض کی وجہ سے جھوٹ بولنے میں بہت بے باک تھے۔ بہت زیادہ مبالغہ آرائی اور دروغ بانی سے کام لیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی جلد ثانی میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ فریقین میں سے کوئی بھی جنگ کا خواہش مند نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے بعض صحابہ کو اس جنگ کے جواز ہی کے بارے میں شرح صدر نہیں ہوا تھا۔ مسلمان خصوصاً' صحابہ کرام ؓ کی اکثریت اس جنگ کو ناپسند کرتی تھی اور اس سے گریزاں تھی اس لئے انھوں نے فریقین میں سے کسی کی رفاقت و تائید نہیں کی اور بالکل غیر جانبدار ہو کر اپنے گھر کے دروازے بند کرکے' خاموش بیٹھا رہنا پسند کیا۔ ان حالات میں مورخین کا یہ بیان کہ حضرت علیؓ کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی جس میں سے چالیس ہزار مقتول ہوئے لشکر شام کی تعداد ساٹھ ہزار تھی جس سے بیس ہزار مقتول ہوئے' بالکل مصنوعی اور جھوٹ نظر آتا ہے۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد دنیا میں خصوصاً ان عربی ممالک میں کتنی تھی؟ تاریخ دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کی تعداد اس وقت کی پوری دنیا میں ایک کروڑ بھی نہیں تھی۔ ان کی اکثریت غیر جانبدار اور جنگ سے گریزاں تھی۔ اس صورت میں جبکہ نصف عالم اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبضہ سے نکل گیا تھا اور ان کے خلاف تھا۔ آں محترم کو اتنی بڑی تعداد میں فوجی کہاں سے مل گئے؟ ایک لاکھ بیس ہزار آدمی کہاں سے پیدا ہوگئے؟ حضرت معاویہؓ کے لئے بھی ان حالات میں ساٹھ ہزار فوج مہیا کر لینا بعید از قیاس ہے۔ ایک صاحب بصیرت شخص کی تو رائے یہی ہوگی کہ یہ اعداد **من گھڑت** ہیں اور سبائی راویوں اور مورخوں نے پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے۔

مؤرخین کی اس غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کے کھلنے کے بعد ان پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے "صفین" کے واقعہ کو جنگ کہہ کر اور اس میں شدید معرکہ آرائیاں دکھا کر تاریخ نگاری کی بجائے افسانہ نگاری کی ہے اور فریقین پر بہتان و افتراء کیا ہے۔

حق یہ ہے کہ واقعہ جمل کی طرح صفین میں بھی کوئی جنگ سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ صرف رئیس الاشرار مالک اشتر اور اس کی پارٹی کے لوگ ادھر ادھر خواہ مخواہ کے جھگڑے پیدا کر کے بار بار شعلہ جنگ بھڑکانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ہر مرتبہ ناکام رہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے حالات قابو میں کر لئے جنگ نہیں ہونے پائی رئیس المفسدین مالک اشتر ناکام و نامراد ہوا۔ **التلخیص الحبیر** میں حافظ ابن حجرؒ نے علماء کی ایک پوری جماعت سے نقل کیا ہے کہ دونوں مواقع پر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ شرح مواقف میں بھی یہ مضمون مذکور ہے حق یہ ہے کہ ان علماء و مورخین کا یہ بیان بالکل صحیح ہے۔

درحقیقت دونوں مواقع پر صرف فریقین کے لشکروں کا اجتماع ہوا۔ دونوں میں سے کسی کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا۔ سارے معاملات گفت و شنید سے طے پائے "یوم جمل" میں تو اختلافات ہی ختم ہو گئے۔ "یوم صفین" میں اختلافات ختم تو نہیں ہوئے، مگر انہیں ختم کرنے کا ایک طریقہ تلاش کر لیا گیا یعنی تحکیم جس پر دونوں فریق متفق ہو گئے اور مسئلہ ختم ہو گیا کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ کی من گھڑت خبر، سبائیوں نے گڑھ کر، اس کی خوب تشہیر کی انکا مقصد مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنا اور صحابہ کرامؓ اور اجلہ تابعین کو بدنام کرنا تھا۔ چونکہ اولین مورخین مثل واقدی و محمد بن اسحاق وغیرہ رافضی تھے اس لئے انہوں نے اس غلط اور سراپا جھوٹی خبر کو بہت اچھالا۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

ام المومنین سیدۃ النساء حضرت عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا بحیثیت قائد جیش

اظہار حقیقت جلد ثالث اختتام کو نہ پہنچی تھی کہ پاکستان میں ایک سیاسی زلزلہ نمودار ہوا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک خاتون حکومت کے ایک اونچے منصب پر پہنچ گئیں۔ سیاسی علماء اور دانشوروں کی اکثریت سیاسی نظریات ومقاصد میں ان سے شدید اختلاف رکھتی تھی۔ علماء اہل سنت کی ایک قلیل تعداد ان کے موافق بھی تھی۔ دانشوروں کی ایک تعداد بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس سیاسی کشمکش میں بہت سے علماء اور دانشوروں نے قوم کے مذہبی جذبات ابھار کر ان سے کام لینا چاہا۔ اور فتویٰ شائع ہوا کہ عورت کی سربراہی شریعت اسلامیہ میں بالکل ناجائز ہے۔ اس لئے خاتون مذکورۃ الصدر کو فورا مستعفی ہوجانا چاہئے۔ بعض علماء اور دانشوروں نے جو خاتون مذکورہ کے حامی تھے' اس کو غلط قرار دیا۔ اور ان علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اور بطور دلیل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سربراہی کا واقعہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں اول الذکر علماء اور ان کی اتباع کرنے والے تعلیم یافتہ اور دانشور اہل قلم' حدود سے گذر گئے' ان کو چاہئے تھا کہ وہ خاتون مذکورہ کے بارے میں واضح کرتے کہ وہ اپنے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کی اہل نہیں اور ان میں اور ام المومنین میں جو زمین و آسمان نہیں بلکہ فرش وعرش کا فرق عظیم ہے بیان کرکے مخالفین کی دلیل کو کمزور بلکہ بے جان کہہ کر رد کردیتے۔ تو ان کا دعویٰ ہر عاقل کے نزدیک ثابت ہوجاتا۔ راقم سطور کو بھی ان مخصوص خاتون کے بارے میں' ان علماء کی رائے سے اتفاق تھا اور اب بھی ہے۔ میں اطمینان کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان مخصوص خاتون کا یا ان جیسی کسی خاتون کا سربراہ مملکت ہونا یقینا ناجائز ہے۔ لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں کیا۔ بلکہ ایک تو یہ دعویٰ کیا کہ عورت کی سربراہی علی الاطلاق ناجائز اور حرام ہے۔ اس غلط دعوے کے ساتھ حدود سے تجاوز کرکے ام المومنین سلام اللہ علیہا کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ لشکر کی قیادت و سربراہی کرنا آں معظمہ رضی اللہ عنہا کی اجتہادی غلطی تھی۔" ان لوگوں کا یہ قول بہت افسوسناک ہے جلد ثانی میں ہم نے واضح کردیا ہے کہ ام المومنین کا لشکر اسلام کی قیادت کرنا اور دستور اسلامی کی حفاظت اور سبائی فتنہ کا قلع قمع

کرنے کے مقصد سے بصرے کا سفر کرنا' ان کا ایک عظیم کارنامہ اور پوری امت مومنہ پر ان کا احسان عظیم ہے۔ اس خیر عظیم کو اجتہادی غلطی کہنا سنی ذہن سے محرومی اور فہم دین کے نقص کی دلیل ہے۔ ان علماء کا رویہ بھی غلط تھا جنہوں نے مذکورہ بالا سیاسی مسئلے میں ام المومنین سلام اللہ علیہا کے طرز عمل کو بطور دلیل پیش کیا۔ اور مخالفین کو آں معظمہ پر غلط اعتراضات دہرانے اور شیعی ذہنیت کو فروغ دینے کا موقع دیا۔ مگر ان علماء اور دانشوروں کا طرز عمل تو بہت ہی قابل مذمت ہے جنہوں نے ایک گھٹیا درجہ کے سیاسی مقصد کے حصول کے لئے آپے سے باہر ہوکر ام المومنین سلام اللہ علیہا کے خلاف وہ غلط اور لچر اعتراضات نشر کرنا شروع کردیئے جن کا جواب بارہا دیا جاچکا ہے۔ اور جن کا لغو اور سفیہانہ ہونا خوب واضح ہوچکا ہے۔

ان لوگوں کا یہ دعویٰ کہ "عورت کی سربراہ مملکت یا قائد جیش بننا علی الاطلاق ناجائز ہے" بالکل غلط ہے۔ اس کے لئے وہ پرکاہ کے برابر بھی دلیل شرعی نہیں پیش کرسکے۔ جن علماء نے عورت کی سربراہی کو ناجائز کہا ہے انہوں نے اجتہاد کی بناء پر کہا ہے نہ کہ کسی نص کی بناء پر اور اس میں جو طبعی عقلی، نفسی موانع اور مفاسد ہیں۔ ان کی بناء پر اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ آئمہ مجتہدین سے اس مسئلہ سے کوئی مفصل بات منقول نہیں ساری بحثیں متاخرین فقہاء نے کی ہیں۔ حققین نے اور مجتہدین نے امام یعنی خلیفۃ المسلمین کے لئے ذکورۃ کی شرط لگائی ہے۔ مگر ام المومنین سلام اللہ علیہا کو تو خلیفۃ المسلمین نہیں بنایا گیا تھا۔ پھر اس مسئلہ پر استدلال کرکے ان پر اعتراض کرنے کے کیا معنی؟ اور اس سے تو یہ لازم نہیں آتا کہ عورت کے لئے کسی قسم کی سربراہی کسی وقت بھی جائز نہ ہو۔ اگر کسی مخصوص صورت میں وہ موانع مفقود ہوں۔ یا ان مفاسد کو روکنے کا انتظام ہوسکے تو عورت کی سربراہی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ انگریزی دور میں مرحومہ بیگم صاحب بھوپال کے متعلق یہی سوال پیدا ہوا تھا دیوبند ' سہارنپور اور بریلی کے علماء سب نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ ان کا بیگم بننا اور والی ریاست ہونا جائز ہے۔

حضرت بلقیس رضی اللہ عنہا کا "ملکہ" ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ان کا واقعہ ہم اسی جلد ثالث میں تفصیل کے ساتھ پیش کرچکے ہیں۔ یاد فرمالیا جائے۔ اس کا مکرر تذکرہ غیر ضروری ہے۔ اس کی یہ تفسیر کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں اس بناء پر کہ وہ عورت ہیں معزول کردیا تھا۔ بالکل لچر اور مہمل ہے۔ ایسی تفسیر کو تفسیر بالرائے اور تحریف

معنوی کہتے ہیں جو ممنوع اور معصیت ہے۔ غور تو فرمایئے کہ اول تو انبیاء علیہم السلام سب سے پہلے ایمان و اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ کسی کی معزولی کا حکم نہیں دیتے تو یہ فرعی چیز ہے جس کا مرحلہ بہت دیر کے بعد آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کفار و مشرکین فروع کے مکلف نہیں ہیں پھر انہیں معزولی کا حکم کیسے دیا جاسکتا تھا؟ تیسرے اطاعت کے مطالبے کے معنی معزول کرنا نہیں ہیں۔ بادشاہوں سے اطاعت کے مطالبے کے معنی عرفاً یہ ہوتے ہیں کہ وہ بادشاہ رہتے ہوئے مطیع رہیں۔ دوسرے الفاظ میں باجگذار بن جائیں انگریزی دور میں ریاستیں حکومت برطانیہ کی مطیع تھیں تو کیا ان کی حکومتیں بالکل ختم کردی گئی تھیں؟

گذشتہ صفحات میں ہم یہ بحث بھی تحریر کرچکے ہیں۔ ملاحظہ کرلی جائے وہاں یہ بھی ہم نے دکھایا ہے کہ تورات شریف ' نیز خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ وہ اپنی سلطنت پر برقرار رہیں۔ اور بحیثیت ملکہ ملک پر حکومت کرتی رہیں۔انہیں کسی نے معزول نہیں کیا۔ مزید یہ کہ اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ حضرت سلمان علیہ السلام نے انہیں معزول کردیا تھا تو ان کی کیا دلیل ہے کہ انہیں عورت ہونے کی وجہ سے معزول کیا تھا ممکن ہے کہ مشرکہ ہونے کی وجہ سے معزول کیا ہو۔ بلکہ اس مفروضہ کی صورت میں توجیہ صحیح ہوگی۔

غرض یہ کہ ملعی معترض کا مدعا کسی صورت سے بھی نہیں ثابت ہوتا۔ وہ آیت مقدسہ کی غلط تفسیر کرکے بھی اپنا دعویٰ ثابت نہیں کرسکے۔

بعض لوگوں نے مندرجہ ذیل حدیث سے استدلال کرکے ام المومنین سلام اللہ علیہا کی قیادت کو ان کی خطا اجتہادی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سربراہ مملکت بنالیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا : **لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ** (وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنی زمام اقتدار ایک عورت کے سپرد کردی ہو۔")

اس کا جواب ہم اسی جلد ثالث کے گزشتہ حواشی میں دے چکے ہیں' قاری کی نظر سے گزرچکے ہوں گے۔ یاد دہانی کے لئے مکرر عرض ہے کہ یہ حدیث مخصوص طور پر اس وقت کے ایران کے بارے میں تھی اس میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بیان کیا گیا ہے۔ "قوم" سے مراد اس وقت کی ایرانی مجوسی قوم ہے۔ یہ اگر چہ نکرہ ہے مگر محاورے میں ایسے موقع پر معرفہ ہی کے معنی دیتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ارشاد فرمائیں اس کے خلاف واقع نہیں ہوسکتا۔ اور آنحضور علیہ السلام کا قول غلط نہیں ہوسکتا۔ اگر اسے ہم قاعدہ کلیہ سمجھیں تو معاذ اللہ اس کا غلط ہونا لازم آتا ہے۔

قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت بلقیس رضی اللہ عنہا ملکہ سبا تھیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان کی قوم نے ان کی سربراہی کی وجہ سے فلاح پائی۔ ان کی قوم تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے جنگ کے لئے تیار تھی۔ لیکن انھوں نے حکمت و تدبر سے کام لے کر ان کے غصہ کو ٹھنڈا کیا اور انھیں صلح جوئی پر آمادہ کرکے خود آنحضرت علیہ السلام کے متعلق تحقیق کرکے معلوم کیا کہ یقیناً آنحضرت علیہ السلام اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ پھر مسلمان ہوکر اپنی قوم کو بھی اسلام لانے کی دعوت دی اور ان کی وجہ سے پوری قوم کو اسلام وایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ اسلام سے بڑھ کر اور فلاح کیا ہوگی؟۔ ایک دانشمند عورت کی بادشاہت سے ان کی قوم کو کتنی بڑی "فلاح" نصیب ہوئی اس سے عیاں ہے کہ حدیث مذکور کو قاعدہ کلیہ سمجھنا غلط ہے۔ اور اس سے عورت کی سربراہی کا عدم جواز علی الاطلاق ثابت نہیں ہوتا۔ اور اس حدیث سے استدلال کرکے ام المومنین سلام اللہ **علیہا** پر اعتراض کرنا سخت اور افسوسناک غلطی ہے۔ مزید یہ کہ اس حدیث کی بنیاد پر اگر بالفرض اعتراض ہوسکتا ہے تو ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہوسکتا ہے جنھوں نے آں **معظمہ** کو سربراہ بنایا آں **معظمہ** رضی اللہ عنہا پر اعتراض کرنے کے کیا معنی ؟ اس میں "امرأۃ" کو سربراہ بننے سے تو منع نہیں کیا گیا ہے۔ قوم کو منع کیا گیا ہے۔ آں **معظمہ** رضی اللہ عنہا پر اعتراض بالکل بے جا اور معترض کی بدفہمی کی دلیل ہے۔

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ آں **معظمہ** کو سربراہ مملکت کب بنایا گیا تھا؟ قیادت جیش یا قیادت عوام اور مملکت کی سربراہی ہم معنی تو نہیں ہیں؟ پھر اعتراض کے کیا معنی؟

علاوہ بریں امہات المومنین کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے **"لستن کاحد من النساء"** (تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو) یعنی تمہاری شان عند اللہ دنیا کی سب عورتوں سے اعلیٰ وافضل واشرف ہے۔ اس لئے بالفرض حدیث میں عام عورتوں کے بارے میں خبر مذکور دی گئی ہو تو بھی وہ امہات المومنین کے متعلق نہیں ہوسکتی۔ آں **معظمات** یقیناً اس سے مستثنیٰ ہوں گی کیونکہ بنص قرآنی وہ عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کا رتبہ سب سے بلند وبرتر ہے۔

سیاسی مخالفت کے طیش اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی حرص وہوس نے ان **معترضین** کے ذہن ودماغ پر مسلط ہوکر فہم وادراک کی قوتوں کو مغلوب کرلیا تھا۔ حد ہوگئی کہ بغیر سمجھے بوجھے بعض لوگوں نے، مندرجہ ذیل آیت شریفہ پیش کرکے ام المومنین سلام

اللہ علیہا پر اعتراض کیا ہے کہ سربراہی وقیادت سے قطع نظر آں معظمہ کا گھر سے باہر جانا اور حضرات اصحاب جمل کے ساتھ بصرے کی طرف جانا ہی ازروئے آیت جائز نہیں تھا' کیونکہ ارشاد الہی ہے:

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاہلیۃ الاولی

"اے عورتو! تم اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح زیب وزینت نہ کرتی پھرو"

معترض اس آیت کا مطلب نہیں سمجھے اور اسے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے مبارک سفر پر منطبق کردیا۔ اور اس کوتاہ فہمی کی وجہ سے سخت بے ادبی کے مرتکب ہوگئے۔ بات واضح ہے کہ آیت میں "تبرج جاہلیہ" سے منع فرمایا گیا ہے نہ کہ مطلق خروج یعنی نکلنے سے۔ دین کی خدمت ونصرت کے لئے نکلنے یا مسلمانوں کے اجتماع کو فساد سے بچانے ان کی اصلاح اور صلاح کی تدبیر کرنے کے لئے نکلنا قطعاً اس آیت کے ذیل میں داخل نہیں اور اس کی کوئی ممانعت اس سے نہیں ثابت ہوتی۔ بلکہ اس کی ممانعت کا شبہ بھی اس سے نہیں پیدا ہوتا۔ پھر کیا آں معظمہ سلام اللہ علیہا کا یہ نکلنا' "تبرج جاہلیہ" تھا؟۔ "العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ" آیت موصوفہ کو اس مسئلہ سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں اسے پیش کرنا بالکل بے محل ہے۔

اس سلسلہ میں جھنجھلائے ہوئے معترضین نے ام المومنین حضرت ام سلمہ سلام اللہ علیہا کا ایک خط العقد الفرید سے نقل کیا ہے۔ اس خط کا ماحصل یہ ہے کہ آں معظمہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اعتراض فرماتی ہیں کہ آپ نے یہ سفر فرما کر سخت غلطی کی ہے۔ اور یہ آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

جواب میں عرض ہے کہ یہ خط بالکل جعلی ہے۔ کسی سبائی کا گڑھا ہوا ہے۔ جس نے ام المومنین سیدہ حضرت ام سلمہ سلام اللہ علیہا پر افترا کیا ہے۔ آں معظمہ نے یہ خط نہیں لکھا۔ علماء رجال لکھتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ایک آزاد کردہ غلام تھا وہ بکثرت روایتیں وضع کرکے آں معظمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کیا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اسی بد باطن کی افتراء پردازی ہو یا کسی دوسرے سبائی کی۔ بہرحال خط یہ جعلی اور وضعی ہے۔ آں معظمہ رضی اللہ عنہا اس سے بری ہیں۔ اس کے جعلی ہونے کے قرائن مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) **العقد الفرید** ادب اور ملح کی کتاب ہے۔ تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس میں قصے' کہانیاں اور افواہیں وغیرہ جمع کرلی گئی ہیں۔ اس لئے اس کی روایتوں اور کہانیوں کا قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔

(۲) **العقد الفرید** کا مولف بھی رافضی ہے۔ پھر اس کی روایتوں پر اعتبار کیسے ہوسکتا ہے؟ بلکہ اس قسم کی روایتوں کے متعلق تو یقین ہوجاتا ہے کہ جھوٹی ہیں ممکن ہے کہ خود اس رافضی مولف ہی نے گڑھی ہوں۔

(۳) خط میں یہ بھی مذکور ہے کہ "ان میں (عورتوں میں) اگر جہاد کی اہلیت ہوتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور ان کو جہاد کی وصیت کرجاتے"۔

یہ جملے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے نہیں ہوسکتے اس لئے کہ بات بالکل غلط ہے۔ آں معظمہ رضی اللہ عنہا کو علم تھا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کو جہاد میں اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے۔ خود آں معظمہ رضی اللہ عنہا نے بھی جہاد میں شرکت فرمائی ہوگی۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا غزوہ احد میں شریک ہونا اور زخمیوں کو پانی پلانا بخاری شریف نیز دوسری کتب حدیث وسیر میں مذکور ہے اور عام طور پر مشہور ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسری صحابیات سے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد میں شرکت ثابت ہے۔ یہ سب آں معظمہ کو یقیناً معلوم تھا پھر ان بدیہی باتوں کے خلاف وہ یہ کیسے کہہ سکتی تھیں کہ عورتوں میں جہاد کی اہلیت ہی نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ خط ان کا نہیں ہے کسی سبائی کذاب نے اپنی طرف سے لکھ کر ان کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۴) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المومنین سلام اللہ **علیہن اجمعین** کو دینی ضرورت' اور مصلحت اسلام وامت کے لئے بھی نکلنے کی ممانعت فرمائی تھی؟ اگر ایسا تھا تو نفل حج کے لئے نکلنا بدرجہ اولی ممنوع ہوگا۔ پھر ام المومنین ام سلمہ سلام اللہ **علیہا** اور دوسری ازواج مطہرات رضی اللہ **علیہن** حج نفل کے لئے کیوں تشریف لے گئیں؟ اگر یہ نکلنا ناجائز تھا تو آں معظمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اعتراض کرنے کا کیا حق تھا؟ اور وہ اعتراض کیسے کرسکتی تھیں؟ اور اگر جائز تھا تو ام المومنین کا اصلاح امت' حفاظت دین' اطفاء فتنہ سبائیت کے لئے نکلنا بدرجہ اولی جائز تھا۔ کیونکہ ام المومنین سیدتنا حضرت عائشہ نے جن مقاصد حسنہ

کے لئے سفر فرمایا تھا ان کا درجہ حج نفل سے بدرجہا زائد اور بلند وبرتر ہے اور ان کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس کی تفصیل جلد ثانی میں کرچکا ہوں۔ اس سے یہ بات بالکل عیاں اور قطعی ہوجاتی ہے کہ ام المومنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ خط نہیں لکھا اس خط اور اس کے مضمون کی ان کی جانب نسبت ان پر افترا اور بہتان ہے۔

معترضین حضرت جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ کے ایک خط کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ جس کے مضمون کا ماحصل بھی یہی ہے۔ اس خط کو سند بناکر ام المومنین رضی اللہ عنہا پر اعتراض کرنا افسوسناک جسارت ہے۔ اول تو اس خط کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ یقیناً یہ جعلی ہے اور کسی سبائی کا وضع کیا ہوا ہے۔ حضرت جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ اس سے بری ہیں۔ حضرت جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ کا شمار صغار صحابہ میں ہے۔ وہ ام المومنین سلام اللہ علیہا کی جوتیوں کی خاک کی برابری بھی نہیں کرسکتے۔ وہ ایسی جسارت اور ہمت نہیں کرسکتے تھے کہ آں معظمہ رضی اللہ عنہا کو اس طرح کا خط لکھیں جس میں آں معظمہ سے اس طرح خطاب کیاگیا ہو جس طرح برابر کے مخاطب سے خطاب کرتے ہیں۔ بیٹا ماں سے اس طرح کلام نہیں کرسکتا۔ پھر ماں بھی کون ہے جن کی خاک پا پر ہماری مائیں قربان ہوجائیں۔ اس لئے یہ خط یقیناً جعلی ہے۔ اور اگر بالفرض حضرت جاریہ رضی اللہ عنہ نے یہ خط واقعی لکھا تھا تو غلطی کی۔ آں معظمہ رضی اللہ عنہا پر ان کا اعتراض بھی غلط' اور ان کی رائے بھی غلط۔ ام المومنین سلام اللہ علیہا کے خلاف اس خط سے حجت پکڑنا معترض کی سخت غلطی ہے۔

ایک گھٹیا درجہ کے سیاسی مقصد کی طلب میں یہ لوگ ایسے "مغلوب الطلب" ہوگئے کہ "حو آب" کی جھوٹی کسی سبائی کی گڑھی ہوئی کہانی بھی نقل کرکے ام المومنین سلام اللہ علیہا پر اعتراض کردیا۔ روایت کا راوی بھی مجہول ہے۔ مگر طبری نے اپنے رفض کی وجہ سے جذبہ بغض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مغلوب ہوکر اپنی کتاب میں درج کرلی۔ بعد کے سنی مورخین چونکہ تحریک شیعیت سے متاثر تھے اس لئے انہوں نے بھی اس سراپا کذب ودروغ قصہ کو نقل کرلیا یہ لوگ ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو اس روایت کا کذب دروغ ہونا ان پر واضح ہوجاتا اور وہ اس افتراء کو نقل کرنے کے گناہ سے بچ جاتے۔ اس کے جھوٹ ہونے کے دلائل ملاحظہ ہوں:

(ا) اس کا راوی مجہول ہے اس لئے اسے صحیح سمجھنے کے لئے ثبوت درکار ہے جو مفقود ہے۔ بغیر ثبوت کے اسے جھوٹ ہی کہنا پڑے گا۔ رسول اللہ علیہ وسلم کی طرف بغیر ثبوت

کے کسی قول یا فعل کی نسبت کرنا جائز نہیں۔
(۲) اس میں بیان کیا گیا ہے کہ "حوآب" پر پہنچ کر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے واپس ہونا چاہا۔ مگر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ جگہ "حوآب" نہیں ہے۔ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی تائید کی"۔
اس طرح راوی کذاب نے کئی صحابہ کرام کو دیدہ و دانستہ جھوٹ بولنے کا مرتکب کہا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سراپا صداقت تھے۔ ان کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا خبث نفس کی دلیل ہے۔ اور کسی سنی کا اسے باور کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص کے ذہن میں رفض و نفاق کا زنگ لگا ہوا ہے۔ اس لئے یقیناً و قطعاً یہ روایت جھوٹی اور غلط ہے۔ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا جھوٹ بولنا عادتاً غیر ممکن اور محال ہے۔
(۳) انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیاں فضول اور لایعنی نہیں ہوتیں۔ ان میں کوئی افادیت اور حکمت ہوتی ہے۔ اور جب اس پیشین گوئی کا ظہور ہوتا ہے تو وہ حکمت و افادیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے یہ اس لئے تھا کہ اس ظہور سے ایک دلیل نبوت کا ظہور ہو اور اہل ایمان اس کی افادیت سے بہرہ ور ہوں۔ اب یہ فرمایا جائے کہ اس پیشین گوئی میں کیا افادیت تھی؟ قافلہ پر کتوں کا بھونکنا کوئی عجب بات نہیں۔ دیہات اور جنگلوں میں جو چھوٹی آبادیاں ہوتی ہیں۔ ان کے کتے عام طور پر راستہ سے گذرنے والے قافلوں پر بھونکتے ہیں۔ یہ حوآب کے کتوں کی کوئی خصوصیت تو نہیں تھی۔ پھر اس پیشین گوئی میں عجب بات کیا تھی؟ اور اس سے فائدہ کیا تھا؟ یقیناً یہ ایک بے فائدہ بات تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قول فضول سے بری ہیں۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء ہے۔ اس جھوٹی کہانی کو شہرت دینا سبائی پروپیگنڈے کے آرٹ کا ایک نمونہ ہے۔ خیال تو فرمائیے کہ اگر اس جھوٹی روایت کو سچ ہی سمجھ لیں تو اس سے ام المومنین سلام اللہ علیہا کے قائد ہونے' یا زیر بحث سفر کرنے پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟۔ اگر راستہ سے کسی گذرنے والے شخص یا قافلے پر کتے بھونکیں' جو عام طور پر بھونکتے ہی ہیں' تو کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے سفر کر کے غلطی کی؟ کوئی احمق ہی مسافر کو الزام دے سکتا ہے۔ پھر اس مبینہ پیشین گوئی سے آں معظمہ کے زیر بحث سفر کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ ہونا کیسے ثابت ہو گیا؟۔ اس جھوٹی کہانی کا سہارا لے کر آں معظمہ پر اعتراض کرنا نہایت ہی سفیہانہ اور احمقانہ حرکت ہے۔ ہاں' اس سے اگر ناگواری اور مذمت ظاہر

ہوتی ہے تو وہ سبائی مفسدوں کے اعمال سے ناگواری اور ان کی مذمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس پہلو سے نظر کریں تو روایت کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ اس امت میں ایک خبیث و بد باطن گروہ ایسا پیدا ہوگا جس کے بپا کئے ہوئے فتنہ کو مٹانے کے لئے میری ازواج مطہرات سے کسی کو جانا پڑے گا۔ اور یہ اشارہ اس سبائی گروہ کی طرف ہوگا جس نے یہ فتنے پیدا کئے تھے اور جس کے فساد کو مٹانے کے لئے ام المومنین رضی اللہ عنہا نے زیر بحث سفر کیا تھا۔ گویا روایت میں اشارہ سبائیوں کی خباثت کی طرف فرمایا گیا ہے۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ان سبائی منافقوں پر

ایک عذاب تو ان کی فتنہ پردازیوں کا ہوگا اور دوسرا عذاب اس بات کا ہوگا کہ ان کی وجہ سے ام المومنین حرمتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زحمت سفر وجہاد اٹھانا پڑے گی۔ انھیں اذیت پہنچانا ایسا ہی ہے جیسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانا۔ گویا ایذاء رسولؐ کے گناہ عظیم کا عذاب بھی انھیں ہوگا **وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔**

اسلامی کتب خانہ کی ایک نئی پیشکش

جواہر الفتاویٰ ج-۲

تصنیف محترم مولانا مفتی عبدالسلام صاحب
چاٹگامی دامت برکاتہم

یہ کتاب حضرت مفتی صاحب موصوف کے ان علمی شاہکاروں میں سے ہے جس کا تعلق جدید فقہی مسائل سے ہے، عمدہ کتابت، بہترین طباعت، خوبصورت جلد کے ساتھ انشاء اللہ چند یوم میں منظرِ عام پر آرہی ہے جبکہ کتاب کی پہلی جلد گذشتہ سال ہمارے ہمارے ہی کتب خانہ سے شائع ہو کر علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

جواہر الفتاویٰ جلد دوم کے مندرجات یہ ہیں۔

- مروجہ طریقہ پر پاکستان و دیگر ممالک میں غائبانہ نماز جنازہ اور اسکی شرعی حیثیت۔
- مختلف ممالک کے کاغذی سکّے اور کرنسیوں کی شرعی حیثیت۔
- زکوٰۃ ٹیکس ہے، یا عبادت، پھر اس موضوع کے سلسلہ میں پیش آنے والے بیشمار شکوک و شبہات کے جوابات۔
- مجلس واحدہ میں تین طلاقیں دینے سے ایک طلاق ہوتی ہے یا تین؟۔
- شرعی حد رجم کا انکار اور اس کے نتائج۔
- حکومت یا عدالت کے غیر شرعی فیصلوں پر تنقید کرنا توہینِ عدالت نہیں۔
- جھینگا مچھلی حرام ہے یا حلال؟۔

خوشخبری

ہمارے ہاں دیگر تصانیف

(۱) تعلیم الایمان شرح فقہ الاکبر

اس کتاب کے بارے میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی کی رائے گرامی :-

" مولانا نجم الغنی صاحب رامپوری بڑے کامل عالم فاضل تھے، طب میں شاندار کتابیں تصنیف فرمائیں اور اکثر فنون میں کام کی کتابیں تالیف فرمائی، مادیت کے اس دور میں اکابر کی تالیفات اکسیر ہیں، مولانا رحمۃ اللہ کی یہ کتاب تعلیم الایمان جو حضرت ملا علی قاریؒ کی کتاب شرح فقہ الاکبر کا اردو ترجمہ ہی نہیں بلکہ شرح ہے، کتاب بڑی مبارک ہے انشاء اللہ العزیز۔ موجودہ دور میں مفید اور نافع رہے گی، اللہ تعالیٰ مقبول فرمائے اور نوجوان نسل کو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

(۲) تقریر الحاوی شرح اردو تفسیر بیضاوی ..

(۳) جامع الفصولین، (عربی دو جلدیں)

(۴) دین کامل الاسلام کی مختصر تصویر، از محمد میاں صاحبؒ

اس کے علاوہ درسی غیر درسی مستند کتب بارعایت دستیاب ہیں۔

ملنے کا پتہ

اسلامی کتب خانہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

مفکر اسلام مولانا محمد اسحاق صدیقی
کی چند اہم تصانیف

- اظہارِ حقیقت جلد اوّل
- اظہارِ حقیقت جلد دوم
- اسلام کا سیاسی نظام
- دینی نفسیات (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)
- تنویر العینین فی تفسیر المعوذتین
- نورِ حیات
- التنویر
- الفکرة السنة والحاجة إلیها
- ایمان و ایمانیات
- مسئلہ ختم نبوت عقل کی روشنی میں (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)
- اسلامی ذہن
- حفاظت دین کا فریضہ
- BEHIND THE CURTAIN (پردہ کے پیچھے)